سورۃ آل عمران

آیاتہا ۲۰۰ ۳ سورۃ آل عمران مدنیۃ ۸۹ رکوعاتہا ۲۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

الٓمّٓ ۟ۙ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ۲

''الف-لام-میم۔ اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے، زندہ ہے سب کو زندہ رکھنے والا ہے''۔

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: الٓمّٓ ۟ۙ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ؕ۲ یہ بالاجماع مدنی سورت ہے۔ نقاش نے بیان کیا ہے کہ تورات میں اس کا نام طیبہ ہے(1)، اور حسن، عمرو بن عبید، عاصم بن ابی النجود اور ابوجعفر الرواسی نے الٓمّٓ۔ اللّٰہُ الف وصل کو قطع کے ساتھ پڑھا ہے، اس تقدیر پر کہ الٓمّٓ پر وقف ہے۔ جیسا کہ وہ اسماء اعداد مثلاً واحد، اثنان، ثلاثۃ اور اربعۃ وغیرہ میں وقف مقدر کرتے ہیں، حالانکہ وہ انہیں اکٹھا اور ملا کر پڑھتے ہیں۔

اخفش سعید نے کہا ہے: الٓمّٓ ۟ۙ اللّٰہُ التقاء ساکنین کی وجہ سے میم کو کسرہ کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ غلطی ہے۔ ثقیل ہونے کی وجہ سے عرب اس طرح نہیں کہتے۔ نحاس نے کہا ہے: پہلی قرأت ہی قرأت عامہ ہے اور متقدمین علمائے نحو نے اس میں گفتگو کی ہے۔ پس سیبویہ کا مذہب یہ ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے میم کو فتحہ دیا جائے اور انہوں نے اس کے لئے فتحہ کو اختیار کیا ہے تاکہ کسرہ اور یا اور اس کے ماقبل کے کسرہ کے درمیان اسے جمع نہ کر دیا جائے۔

اور کسائی نے کہا ہے: حروف تہجی کے ساتھ الف وصل مل جائے اور تو الف وصل کو حذف کر دے تو اسے الف کی حرکت کے ساتھ حرکت دے گا اور یہ کہے گا: الٓمَّ اللہ، والمُ اذکر، والمِ اقتربت۔

اور امام فراء نے کہا ہے: الٓمّٓ ۟ۙ اللّٰہُ کی اصل وہی ہے جسے رواسی نے پڑھا ہے پھر ہمزہ کی حرکت میم پر ڈال دی گئی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اَلۡحَیُّ الۡقَیَّامُ پڑھا ہے(2) اور خارجہ نے کہا ہے: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں الحیُّ القَیِّمُ ہے۔ وہ حروف جو سورتوں کے اوائل میں آئے ہیں ان کے بارے علماء کی آراء سورۃ البقرہ کے شروع میں بیان ہو چکی ہیں۔ اس حیثیت سے اس سورت میں اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ایسا جملہ آیا ہے جو قائم بنفسہ ہے۔ اور اس میں وہ تمام اقوال متصور ہو سکتے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 396، دار الکتب العلمیہ

2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 397

مسئلہ نمبر 2۔امام کسائی نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور سورۂ آل عمران شروع کی اور پڑھا الٓمّٓ ۔ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیام اور پہلی رکعت میں سو آیات تلاوت کیں اور دوسری رکعت میں بقیہ سو آیات پڑھیں (1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: دو رکعتوں میں ایک سورت نہیں پڑھی جائے گی اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اس کے لئے جائز ہے۔اور امام مالک نے المجموعہ میں کہا ہے: اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ (مہتم) بالشان نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں صحیح یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز مغرب میں سورۃ الاعراف تلاوت فرمائی اور اسے دو رکعتوں میں تقسیم کر دیا (2)۔ اسے نسائی نے بھی بیان کیا ہے اور ابو محمد عبد الحق نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔اس سورت کی فضیلت میں کئی آثار واخبار موجود ہیں اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ یہ سورت سانپوں سے امان ہے۔اور فقراء اور محتاجوں کے لئے یہ خزانہ ہے۔اور یہ آخرت میں اپنے قاری کی جانب سے جھگڑا کرے گی اور رات کے وقت جس نے اس کی آخری آیات پڑھیں اس کے لئے ساری رات قیام کرنے کی طرح کا ثواب لکھا جائے گا۔ وغیرذالک۔ دارمی ابو محمد نے اپنی مسند میں ذکر کیا ہے کہ ہمیں ابو عبید قاسم بن سلام نے بیان کیا، انہوں نے کہا مجھے عبید اللہ اشجعی نے بتایا، انہوں نے کہا مجھے مسعر نے بیان کیا، انہوں نے کہا: مجھے جابر نے اس حالت میں واقع ہونے سے پہلے بتایا جس میں وہ واقع ہوئے کہ حضرت شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: فقراء اور محتاجوں کے لئے سورۂ آل عمران کتنا بہترین اور اچھا خزانہ ہے جو رات کے آخری حصہ میں اس کے ساتھ قیام کرتا ہے (3)۔ (یعنی نوافل میں اس کی تلاوت کرتا ہے۔)

محمد بن سعید نے، عبد السلام نے جریری سے انہوں نے ابی السلیل سے بیان کیا ہے: ایک آدمی وسیع جنگل میں پہنچا اور اس نے وادی مجنہ میں پناہ لی اور یہ وہ وادی ہے جس میں جو بھی چلتا تھا اسے سانپ ڈس لیتے تھے اور اس وادی کے کنارے پر دو راہب تھے۔ پس جب شام ہوئی تو ان میں سے ایک نے دوسرے کو کہا: قسم بخدا! یہ آدمی ہلاک ہو گیا! راوی کا بیان ہے۔ پس اس آدمی نے سورۂ آل عمران پڑھنی شروع کر دی۔ دونوں راہبوں نے کہا: اس نے سورۃ طیبہ پڑھی ہے شاید نجات پا جائے گا۔ راوی کہتا ہے: پس اس آدمی نے صحیح سالم صبح کی۔اور مکحول سے روایت ہے: جس نے جمعہ کے دن سورۂ آل عمران پڑھی رات تک ملائکہ اس کے لئے استغفار کرتے ہیں۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: جس نے رات کے وقت سورۂ آل عمران کی آخری آیات پڑھیں تو اس کے لئے پوری رات کے قیام کا ثواب لکھ دیا گیا اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے۔

اور مسلم نے نواس بن سمعان کلابی سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''اسے قیامت کے دن قرآن کے ساتھ اور ان اہل قرآن کے ساتھ لایا جائے گا جو اس کے مطابق عمل کرتے رہے اور اس کے آگے سورۃ البقرہ اور آل عمران ہوں گی...... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے لئے تین مثالیں بیان فرمائیں جنہیں میں ابھی تک نہیں بھولا فرمایا: گویا کہ یہ دونوں دو بال ہیں یا دو سیاہ سائے ہیں جن کے درمیان روشنی اور چمک ہے یا گویا

1۔سنن نسائی، کتاب الافتتاح، جلد 1، صفحہ 154 2۔ایضاً 3۔فضائل القرآن، سور القرآن و آیاتہ، صفحہ 238

یہ دونوں پرندوں کا گروہ ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں اپنے اپنے قاری کی جانب سے جھگڑیں گی (1)۔

مسلم نے ہی حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''قرآن کریم پڑھا کرو کیونکہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لئے شفیع بن کر آئے گا تم زَهْرَاوَين (یعنی) سورۃ البقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھا کرو کیونکہ یہ دونوں قیامت کے دن اس حال میں آئیں گی گویا کہ یہ دو بادل ہیں یا گویا کہ یہ دو سائے ہیں یا گویا کہ یہ دونوں پرندوں کے غول ہیں جو صفیں باندھے ہوئے ہیں اور یہ اپنے پڑھنے والوں کی جانب سے جھگڑا کریں گی۔ سورۃ البقرہ پڑھا کرو کیونکہ اسے لے لینا برکت ہے اور اسے چھوڑنا حسرت ہے اور جادوگر اس کی استطاعت نہیں رکھیں گے۔'' معاویہ نے کہا ہے: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ البطلہ سے مراد جادوگر ہیں (2)۔

مسئلہ نمبر 4۔ سورۃ البقرہ اور آل عمران کا نام الزہراوین رکھا گیا ہے اس بارے میں علماء کے تین اقوال ہیں:

(۱) بلاشبہ یہ دونوں روشن کرنے والیاں ہیں۔ (زہراوین) الزَّهْر اور الزُّهْرَةُ سے بنایا گیا ہے چونکہ ان کی ہدایت اور راہنمائی کی وجہ سے ان کے قاری کے لئے ان کے انوار یعنی معانی ظاہر اور روشن ہو جاتے ہیں۔ (اس لئے ان کا نام زہراوین رکھا گیا)

(۲) پھر اس لئے کہ ان کی قرأت پر قیامت کے دن نور تام مرتب ہوگا۔ اور یہی دوسرا قول ہے۔

(۳) ان دونوں کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اسم اعظم کو متضمن ہونے میں شریک ہیں، جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دونوں آیتوں میں ہے والھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرّحمن الرحیم اور وہ آیت جو آل عمران میں ہے اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (3) اسے ابن ماجہ نے بھی نقل کیا ہے۔ الغمام کا معنی ہے وہ بادل جو اکٹھا اور گھنا ہو۔ اور الغیایۃ کا معنی بھی یہی ہے جب کہ وہ سر کے قریب ہو۔ اور یہی ظُلَّة بھی ہے اور روایت کا معنی یہ ہے کہ ان دونوں کی تلاوت کرنے والا ان کے ثواب کے سائے میں ہوگا جیسا کہ ایک آدمی اپنے صدقہ کے سائے میں آئے گا۔'' اور قولہ تُحاجّان کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے ملائکہ پیدا فرمائے گا جو ان کے ثواب کے عوض پڑھنے والے کی جانب سے جھگڑا کریں گے (4)۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے۔ ''بلاشبہ جس نے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الآیہ پڑھی اللہ تعالیٰ ستر فرشتے پیدا فرما دے گا وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔''

اور قولہ: بینھما شَرْقٌ اسے را کے سکون اور اس کے فتحہ کے ساتھ مقید کیا گیا ہے اور یہ روشنی پر تنبیہ ہے، کیونکہ جب فرمایا: سَوْدَاوَان اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ یہ دونوں تاریک ہیں تو اپنے قول بینھما شرق سے اس کی نفی کی گئی۔ یعنی یہ

1۔ صحیح مسلم، فضائل القرآن، جلد 1، صفحہ 270 2۔ ایضاً

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 210۔ ایضاً، باب الدعاء، حدیث نمبر 1278، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 6، صفحہ 371، حدیث نمبر 16109

دونوں اپنی کثافت کے سبب ان کے درمیان جو ان کے نیچے ہوں گے اور سورج کی حرارت اور تپش کی شدت کے درمیان حائل ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس سورت کا ابتدائی حصہ وفد نجران کے سبب نازل ہوا اس بارے میں محمد بن اسحاق نے محمد بن جعفر بن زبیر سے نقل کیا ہے: وہ نصاریٰ تھے جو ساٹھ سواروں پر مشتمل وفد بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ ان کے اشراف میں سے چودہ افراد ان میں تھے، ان چودہ افراد میں تین آدمی ایسے تھے جن کی طرف ان کا امر لوٹتا تھا۔ (یعنی جملہ معاملات کا انحصار تین افراد پر تھا۔) ایک عاقب تھا جو قوم کا امیر اور ان میں صاحب رائے تھا۔ اور اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ اور ایک ان کا معاون و مددگار سردار تھا اور انہیں اکٹھا کرنے والا تھا اس کا نام الأیہم تھا، اور ابو حارثہ بن علقمہ بکر بن وائل میں سے ایک تھا وہ ان کا بشپ اور ان کا عالم تھا، وہ عصر کی نماز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے، وہ یمنی کپڑوں کے جبے اور چادریں پہنے ہوئے تھے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا: ہم نے ان کی مثل جمال و جلال والا کوئی وفد نہیں دیکھا، ان کی نماز کا وقت ہوا، وہ اٹھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں مشرق کی طرف انہوں نے نماز پڑھی۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انہیں چھوڑ دو'' پھر وہ کئی دنوں تک وہاں ٹھہرے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مناظرہ کرتے رہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ وہ ابن اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کے بیٹے) تھے۔ علاوہ ازیں وہ اضطراب میں ڈالنے والی شنیع باتیں کرتے رہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم براہین ساطعہ کے ساتھ ان کا رد کرتے رہے اور ان کی کوئی مدد نہ کی گئی اور انہیں کے بارے میں اس سورت کی ابتدائی تقریباً اسی آیات نازل ہوئیں، یہاں تک کہ ان کا معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دے دی۔ جیسا کہ سیرت ابن اسحاق وغیرہ میں مذکور ہے (1)۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝

''نازل فرمائی اس نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ تصدیق کرنے والی ہے ان (کتابوں) کی جو اس سے پہلے (اتری) ہیں اور اتاری اس نے تورات اور انجیل، اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے اور اتارا فرقان کو۔ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیتوں کے ساتھ ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ غالب ہے بدلہ لینے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے بِالْحَقِّ اس سے مراد صدق (سچائی) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حجت غالبہ ہے اور قرآن کریم کو بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل فرمایا، سو اسی لئے فرمایا: نَزَّلَ اور تنزیل یکے بعد دیگرے مرۃ بعد مرۃ نازل کرنے کو کہتے ہیں۔ اور تورات اور انجیل دونوں یکبارگی نازل ہوئیں۔ سو اسی لئے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 396، دار الکتب العلمیہ

(ان کے بارے) ارشاد فرمایا اَنۡزَلَ اور بِالۡحَقِّ میں باالکتاب سے حال کے محل میں ہے۔ اور با محذوف کے متعلق ہے، تقدیر عبارت ہے آتیا بالحق اور یہ نَزَّلَ کے متعلق نہیں ہے، کیونکہ وہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے ان میں سے ایک حرف جر کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ تیسرے کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور مُصَدِّقًا حال مؤکدہ ہے حال منتقلہ نہیں، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ وہ غیر مصدق یعنی غیر موافق ہو، یہ جمہور کا قول ہے اور بعض نے اس میں الانتقال کو مقدر مانا ہے، اس معنی کی بنا پر کہ وہ مصدق لنفسہٖ بھی ہے اور مصدق لغیرہٖ بھی۔

قولہ تعالیٰ: لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ یعنی ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل کی گئی ہیں۔ اور تورات کا معنی روشنی اور نور ہے۔ یہ مشتق ہے وَرَى الزَّنْد اور وَرِيَ سے یہ دونوں لغتیں ہیں جب چقماق سے آگ نکلے (تو کہا جاتا ہے وَرَى الزند) اور اس کی اصل تَوۡرِيَةٌ بروزن تَفۡعَلَة ہے۔ تا زائدہ ہے اور یا متحرک ہے اس کا ماقبل مفتوح ہے اسے الف سے بدل دیا گیا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تَفۡعِلَةٌ ہو اور پھر را کسرہ سے فتحہ کی طرف منتقل ہو جائے، جیسا کہ انہوں نے جارية میں جَارَاة اور ناصية میں ناصاة کہا ہے اور یہ دونوں وزن فراء سے منقول ہیں۔

اور خلیل نے کہا ہے: اس کا اصل وزن فَوۡعَلَةٌ ہے۔ پس اصل وَوۡرَيَةٌ ہوئی، پھر پہلی واؤ کو تا سے بدل دیا گیا جیسا کہ تَوۡلَجٌ میں بدلا گیا ہے اور یہ اصل میں وَوۡلَجٌ تھا فَوۡعَلٌ کے وزن پر اور یہ وَلَجۡتُ سے ماخوذ ہے (1)، اور پھر یا متحرک ماقبل مفتوح کو الف سے بدل دیا گیا۔ اور فَوۡعَلَةٌ کا وزن تَفۡعَلَةٌ کی نسبت زیادہ (قابل استعمال) ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ التوراة یہ التَّوۡرِيَة سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی ہے کسی شے کے بارے تعریض کرنا اور اسے دوسرے سے چھپانا، تو گویا تورات میں زیادہ کنایات ہیں اور بغیر کسی تصریح اور وضاحت کے اشارات ہیں، یہ مورج کا قول ہے۔

اور جمہور نے پہلا قول اختیار کیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَد اتينا موسى و هارون الفرقان و ضياء و ذكرا للمتقين مراد تورات اور انجیل ہیں۔ انجیل اِفۡعِيۡلٌ کے وزن پر النَّجَل سے ماخوذ ہے اور یہی اصل ہے۔ اور اس کی جمع أناجيل اور توراة کی توارِ بنائی جاتی ہے۔ پس انجیل علوم اور حکم (کے معنی) کے لئے اصل ہے۔ اور کہا جاتا ہے: لعن الله نَاجِلَيۡه یعنی اللہ اس کے والدین پر لعنت کرے۔ کیونکہ والدین اس کی اصل ہیں (اس لئے انہیں ناجلیہ کہا گیا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نَجَلۡتُ الشَّيۡءَ سے بنا ہے جب تو کسی شے کو نکالے (تو یہ جملہ بولتا ہے) پس انجیل کے ساتھ علوم و حکم نکالے گئے ہیں اور اس معنی میں اولاد اور نسل کو اس کے نکلنے کی وجہ سے نجلاً کہا جاتا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

الى مَعۡشَرٍ لَم يُورِثِ اللُّؤۡمَ جَدُّهم　　أصاغِرَهم و كلُّ فَحۡلٍ لهم نَجۡلُ

اس میں لفظ نَجۡلُ نکالنے کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اَلنَّجۡلُ سے مراد وہ پانی ہے جو زمین سے پھوٹ کر نکلتا ہے اور اِسۡتَنۡجَلَتِ الۡاَرۡضُ کا معنی ہے زمین پانی رسنے کی وجہ سے دلدلی ہو گئی۔ اور اسی کو نِجَالٌ کہتے ہیں جب اس سے پانی نکلنے لگے۔ پس اسی معنی کی بنا پر اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 398، دار الکتب العلمیہ

تعالیٰ نے اسے حق کا درس دینے والا عافیت بنا کر نازل کیا ہے۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ النَّجَلُ فی العین سے ہے۔ اس کا معنی ہے آنکھ کا وسیع اور کشادہ ہونا (1) اور طعنة نجلاء ہے۔ یعنی بڑا نیزہ۔ شاعر نے کہا ہے:

رُبَّما ضَرْبَةٍ بسیفٍ صقیلٍ من بُصْرٰی و طعنة نَجْلاء

اس میں طعنة نجلاء بڑے نیزہ کے معنی میں مذکور ہے۔
اور اس کے ساتھ انجیل کا نام رکھا گیا ہے، کیونکہ یہ اصل ہے اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے لئے نکالا ہے اور اسے ان پر نور اور ضیاء کے ساتھ پھیلا دیا ہے، وسیع کر دیا ہے۔
اور کہا گیا ہے: کہ التَّنَاجُل کا معنی التنازع (جھگڑا کرنا) ہے۔ اور لوگوں کے اس جھگڑا کرنے کی وجہ سے اس کا نام انجیل رکھا گیا ہے۔ اور شمر نے بعض سے بیان کیا ہے: انجیل سے مراد ہر کتاب ہے جو لکھی ہوئی ہو اور اس کی سطریں وافر ہوں اور یہ بھی کہا گیا ہے: نجل بمعنی عمل اور صنع ہے۔ یعنی کام کرنا۔ کسی نے کہا ہے۔ وانجل فی ذاك الصنیع كما نجل (اس کاروبار میں تو بھی کام کر جیسے اس نے کیا۔)
اور یہ قول بھی ہے کہ تورات اور انجیل سریانی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور کہا گیا ہے کہ انجیل سریانی میں انکلیون ہے، اسے ثعلبی نے بیان کیا ہے۔ جوہری نے کہا ہے: انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے اسے مذکر و مونث دونوں طرح ذکر کیا جاتا ہے۔ پس جس نے مونث ذکر کیا ہے اس نے صحیفہ کا ارادہ کیا ہے اور جس نے مذکر ذکر کیا ہے اس نے کتاب مراد لی ہے۔ کئی دوسروں نے کہا ہے: کبھی قرآن کو انجیل بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے قصہ میں مروی ہے کہ انہوں نے کہا: یا رب أری فی الألواح اقواما أناجیلهم فی صدورهم فاجعلهم امتی (اے میرے رب! میں تختیوں میں کئی اقوام کو دیکھ رہا ہوں ان کی کتابیں ان کے سینوں میں ہیں پس تو انہیں میرا امتی بنا دے) تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرمایا تلك أمة احمد وہ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔ بلاشبہ اس میں آپ نے اناجیل سے قرآن مراد لیا ہے۔ اور حسن نے والأنجیل ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (2) اور باقیوں نے کسرہ کے ساتھ مثلاً اِنْجِیل۔ اس میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ ان میں سے ہو جنہیں عربوں نے اسماء عجمیہ میں سے عربی بنایا ہے۔ اور اس کی ان کے کلام میں کوئی مثال نہ ہو۔
قولہ تعالیٰ: مِنْ قَبْلُ یعنی قرآن کریم سے پہلے هُدًى لِّلنَّاسِ (لوگوں کی ہدایت کے لئے) ابن فورک نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے هدى للناس المتقين (3) یعنی متقی لوگوں کی راہنمائی کے لئے۔ اور اس کی دلیل سورۃ البقرہ میں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہے۔ پس اس عام کو اس خاص کی طرف لوٹا دیا گیا ہے اور هُدًى یہ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں واقع ہے اور الْفُرْقَانَ سے مراد قرآن کریم ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 424 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 399، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پوشیدہ رہتی اس پر کوئی چیز زمین اور نہ آسمان میں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اشیاء کے بارے تفصیلی علم رکھنے کی خبر ہے اور اس کی مثل قرآن کریم میں کثیر آیات ہیں۔ پس وہ جانتا ہے اسے بھی جو ہو چکا، اسے بھی جو ہوگا اور اسے بھی جو نہ ہوگا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الہٰ یا اس کے بیٹے ہو سکتے ہیں حالانکہ ان پر کئی اشیاء مخفی ہیں۔

هُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ①

''وہی ہے جو تمہاری تصویریں بناتا ہے (ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے کوئی معبود نہیں بغیر اس کے (وہی) غالب ہے حکمت والا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ اللہ تعالیٰ نے ماؤں کے رحموں میں انسان کی تصویریں بنانے کی خبر دی ہے۔ اور رحم کی اصل رحمۃ سے ہے، کیونکہ یہ ان میں سے ہے جن کے ساتھ ایک دوسرے پر رحم کیا جاتا ہے اور صورۃ کا اشتقاق صارہ الی کذا سے ہے جب وہ اس کی طرف مائل ہو جائے، پس صورت مائل ہوتی ہے ایک شبیہ اور ہیئت کی طرف۔ اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان کو بیان کرتی ہے اور اس کے ضمن میں نجران کے عیسائیوں کا رد ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے ہیں جن کی تصویریں بنائی گئیں اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی عقلمند انکار نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحج اور المومنون میں تصویر کی شرح اور وضاحت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ (1) میں اس کی وضاحت کی ہے، جیسا کہ وہاں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور اس میں طبائعیین کا بھی رد ہے کیونکہ وہ اسے مستقل فاعل بناتے ہیں اور ان کا رد آیۃ التوحید میں گزر چکا ہے اور مسند ابن سنجر میں حدیث ہے۔ (ان کا نام محمد بن سنجر ہے) ''بے شک اللہ تعالیٰ جنین کی ہڈیاں اور اس کی غضاریف (کچی ہڈیاں جو کھائی جا سکتی ہیں) مرد کی منی سے اور اس کی چربی اور گوشت عورت کی منی سے پیدا فرماتا ہے (2)''۔

اور اس میں اس پر بہت بڑی دلیل ہے کہ بچہ مرد اور عورت کے پانی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں صریحاً موجود ہے: یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ وَّ اُنۡثٰی (الحجرات: 13) (اے لوگو! ہم نے پیدا کیا ہے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے) اور صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ''کہ ایک یہودی نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میں ایک شے کے بارے آپ سے سوال کرنے کے لئے آیا ہوں۔ سوائے نبی یا ایک آدمی یا دو آدمیوں کے اہل زمین میں سے کوئی اسے نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے نفع ہوگا اگر میں تجھے بتا دوں؟'' اس نے کہا: میں کان لگا کر پورے غور سے سنوں گا۔ پھر اس نے کہا: میں بچے کے بارے آپ سے پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کا پانی سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی زرد۔ اور جب وہ دونوں جمع ہو جائیں اور مرد کی منی عورت کی منی پر غالب

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

ہوتو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچہ (مذکر) پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب ہو تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے بچی پیدا ہوتی ہے (1)۔'' الحدیث، اس کا بیان سورۃ الشوریٰ کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: كَيْفَ يَشَآءُ یعنی جسے وہ چاہتا ہے خوبصورت یا بدصورت۔ سیاہ اور سفید، طویل القامت یا پستہ قد، اعضاء کے اعتبار سے صحیح سالم یا اپاہج (پیدا کرتا ہے) یہاں تک کہ اس کا شقی (بدبخت) ہونا اور سعید ہونا وغیرہ۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا گیا کہ قرآء آپ کے پاس جمع ہیں تا کہ جو احادیث آپ کے پاس ہیں وہ انہیں سنیں، تو آپ نے انہیں فرمایا: میں تم سے چار چیزوں کے سبب مشغول ہوں اور میں روایت حدیث کے لئے فارغ نہیں ہوں۔ تو آپ سے عرض کی گئی: وہ مشغولیت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان میں سے ایک یہ ہے میں یوم میثاق میں غور وفکر اس حیثیت سے کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ جنت میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے اور یہ جہنم میں ہوں گے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔'' اور میں نہیں جانتا اس وقت میں کون سے فریق میں تھا۔ اور دوسری یہ ہے کہ رحم میں میری صورت بنائی گئی تو اس فرشتے نے کہا جو رحموں پر متقرر ہے: ''اے میرے رب! یہ شقی ہے یا سعید ہے (2)'' تو میں نہیں جانتا اس وقت اللہ تعالیٰ نے کیا جواب دیا۔ اور تیسری چیز یہ ہے کہ جس وقت ملک الموت میری روح قبض کرے گا تو وہ کہے گا: ''اے میرے رب! کفر کے ساتھ یا ایمان کے ساتھ'' تو میں نہیں جانتا جواب کیسا ہوگا۔ اور چوتھی شے یہ ہے کہ وہ کہے گا: وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۹﴾ (یٰسین) (اور (حکم ہوگا) اے مجرمو! (میرے دوستوں سے) آج الگ ہو جاؤ) تو میں نہیں جانتا میں کون سے فریق میں ہوں گا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یعنی اس کے سوا کوئی خالق نہیں اور نہ کوئی مصور (تصویر بنانے والا) ہے اور یہ اس کی وحدانیت پر دلیل ہے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے الہ مصور ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کی تصویر بنائی گئی ہے یعنی وہ مصور ہیں۔ الْعَزِيْزُ سے مراد وہ ہے جو مغلوب نہیں ہو سکتا۔ الْحَكِيْمُ سے مراد ذوالحکمت (صاحب حکمت) یا مُحْكِم (حکم (دانا بنانے والا) دینے والا) ہے۔ یہ اس کے مقابلہ میں اخص ہے جو تصویر کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

''وہی ہے جس نے نازل فرمائی آپ پر کتاب اس کی کچھ آیتیں محکم ہیں وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں، پس وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے سو وہ پیروی کرتے ہیں (صرف) ان آیتوں کی جو متشابہ ہیں قرآن سے (ان کا مقصد) فتنہ انگیزی اور (غلط) معنی کی تلاش ہے اور نہیں جانتا اس کے صحیح معنی کو بغیر اللہ تعالیٰ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں ہم ایمان لائے ساتھ اس کے سب ہمارے رب کے پاس سے ہے اور نہیں

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 146 2۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکہ، حدیث نمبر 2969، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نصیحت قبول کرتے مگر عقلمند"۔

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ امام مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ام المومنین نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو قرآن کریم کی متشابہ آیتوں کی پیروی کرتے ہیں تو وہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ نام دیا ہے لہٰذا تم ان سے بچو(1)"۔

ابو غالب نے بیان کیا ہے: میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ اپنے گدھے پر سوار تھے، یہاں تک کہ جب وہ مسجد دمشق کے راستے تک پہنچ کر رکے تو وہاں کچھ سر کھڑے کئے گئے، تو آپ نے پوچھا: یہ سر کن کے ہیں؟ تو بتایا گیا: یہ خوارج کے سر ہیں جو عراق سے لائے گئے ہیں۔ تو حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: آگ کے کتے ہیں۔ آگ کے کتے ہیں، آگ کے کتے ہیں! آسمان کے سائے کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، اچھائی اور مبارک اس کے لئے جس نے انہیں قتل کیا اور انہوں نے اسے قتل کیا۔ انہوں نے یہی جملہ طوبی لمن قتلهم و قتلوہ تین بار کہا۔ پھر رونے لگے۔ تو میں نے عرض کی: اے ابوامامہ! رضی اللہ عنہ کون سی شے تمہیں رلا رہی ہے؟ تو انہوں نے کہا: ان کے لئے رحمت ہو، بے شک وہ اہل اسلام میں سے تھے پھر اس سے نکل گئے، پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ الی آخر الآیات۔ پھر یہ آیت تلاوت کی: وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ (آل عمران: 105) (اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آچکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں)

تو میں نے کہا: اے ابوامامہ! کیا یہ وہ لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا: ہاں۔ پھر میں نے کہا: کیا یہ ایسی شے ہے جو تم اپنی رائے سے کہہ رہے ہو یا ایسی شے ہے جسے تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا ہوں، بلاشبہ تب تو میں جرأت کرنے والا! (نہیں) بلکہ میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (کئی بار) سنا ہے نہ ایک بار، نہ دو بار، نہ تین بار، نہ چار بار، نہ پانچ بار، نہ چھ بار، نہ سات بار اور انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں پر رکھ لیں۔ بیان کیا: ورنہ انہیں خاموش کرا دیا جاتا(2)...... انہوں نے یہ تین بار کہا...... پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "بنی اسرائیل اکہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور بقیہ تمام فرقے جہنم میں ہوں

1۔ صحیح مسلم، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 339۔ ایضاً صحیح بخاری، باب منه آیات محکمات، حدیث نمبر 4183، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 267، حدیث نمبر 8034۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب و من سورۃ آل عمران، حدیث 2926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے اور یقیناً یہ امت ان پر ایک فرقے کا اضافہ کرے گی ایک جنت میں ہوگا اور باقی تمام جہنم میں ہوں گے (1)''۔

مسئلہ نمبر 2۔ محکمات اور متشابہات کے بارے میں متعدد اقوال پر علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے اور وہی حضرت شعبی اور حضرت سفیان ثوری وغیرہما کے قول کا مقتضا بھی ہے کہ محکمات قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن کی تاویل معروف ہو اور اس کا معنی و تفسیر سمجھے جا سکیں۔ اور متشابہ وہ ہے جسے جاننے کے لئے کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہو یہ ان میں سے ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا ہے نہ کہ اپنی خلق کے ساتھ۔ بعض علماء نے کہا ہے: ان کی مثال میں قیامت قائم ہونے کا وقت ہے، یاجوج اور ماجوج اور دجال کا نکلنا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے اور اسی طرح سورتوں کے اوائل میں حروف مقطعات ہیں (2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ احسن قول ہے جو متشابہ کے بارے کیا گیا ہے اور ہم نے سورۃ البقرہ کے اوائل میں ربیع بن خثیم سے پہلے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کو نازل فرمایا اور اس میں سے جو چاہا اسے اپنے علم کے ساتھ خاص کر لیا (3)، الحدیث۔

اور ابو عثمان نے کہا ہے: محکم سے مراد وہ سورۃ فاتحہ ہے جس کے بغیر نماز جائز نہیں ہوتی۔ اور محمد بن فضل نے بیان کیا ہے کہ اس سے مراد سورۃ اخلاص ہے کیونکہ اس میں فقط توحید کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور کبھی یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن سارے کا سارا محکم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ (ہود: 1) (یہ وہ کتاب ہے محفوظ و مستحکم بنا دی گئی ہیں جس کی آیتیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تمام کا تمام متشابہ ہے، کیونکہ ارشاد گرامی ہے: کتابا متشابھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: آیت کے معنی میں سے اس میں کوئی شے نہیں ہے، کیونکہ قول باری تعالیٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ یعنی نظم اور وصف میں اس کی آیات پختہ اور مضبوط ہیں اور یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حق ہیں اور کتابا متشابھا کا معنی ہے کہ اس کی بعض آیات بعض کے مشابہ ہیں اور بعض بعض کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ اور وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ سے مراد یہ معنی نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں متشابہ احتمال اور اشتباہ کے باب سے ہے جو اس قول میں ہے ان البقر تشابہ علینا یعنی وہ گائے ہم پر ملتبس ہوگئی۔ یعنی یہ (لفظ) گائیوں میں سے بہت سی انواع کا احتمال رکھتا ہے۔ اور محکم سے مراد وہ ہے جو اس کے مقابلہ میں ہو۔ اور وہ وہ ہے جس میں کوئی التباس نہ ہو اور وہ سوائے ایک وجہ کے اور کوئی احتمال نہ رکھتا ہو۔

اور کہا گیا ہے: بے شک متشابہ وہ ہے جو کئی وجوہ کا احتمال رکھتا ہے، پھر جب ان وجوہ کو ایک وجہ کی طرف لوٹا دیا جائے اور باقی باطل قرار دی جائیں تو وہ متشابہ محکم ہو جاتا ہے۔ پس محکم ہمیشہ اصل ہوتا ہے اور فروع اس کی طرف لوٹائی جاتی ہیں اور متشابہ وہی فرع ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: محکمات سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ تین آیات تک، اور سورۃ بنی اسرائیل میں یہ ارشاد ہے: وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ

1۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 273، حدیث نمبر 8051

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 401، دار الکتب العلمیہ

3۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 400

اِحْصَانًا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ میرے نزدیک ایک مثال ہے جو آپ نے محکمات کے بارے میں بیان فرمائی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی بیان کیا: محکمات سے مراد قرآن کریم کی ناسخ آیات، احکام حرام کو بیان کرنے والی اور اس کے فرائض کو بیان کرنے والی وہ آیات ہیں جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور جن کے مطابق عمل کیا جاتا ہے اور متشابہات سے مراد اس کی منسوخ آیات، اس کی مقدم و مؤخر آیات، اس کی امثال، اس کی اقسام اور وہ جن کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے اور ان کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: محکمات سے مراد ناسخ آیات ہیں اور متشابہات سے مراد منسوخ آیات ہیں۔ اور یہی حضرت قتادہ، ربیع اور ضحاک نے کہا ہے(1)۔

محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: محکمات وہ آیات ہیں جن میں رب کریم کی حجت، بندوں کی عصمت اور جھگڑوں اور باطل کو دور کرنے کا ذکر ہے، جس معنی پر انہیں وضع کیا گیا ہے اس سے نہ انہیں پھیرا جاسکے اور نہ اس میں کوئی تحریف کی جاسکے۔ اور متشابہات وہ ہیں جن میں تصریف و تحریف اور تاویل ہوسکتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بندوں کو آزمایا ہے، مجاہد اور ابن اسحاق نے یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس آیت کے بارے میں سب سے احسن قول یہی ہے(2)۔

نحاس نے کہا ہے: جو کچھ محکمات اور متشابہات کے بارے کہا گیا ہے ان میں احسن یہ ہے کہ محکمات وہ ہیں جو قائم بنفسہ ہیں ان میں کسی اور کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی جیسا کہ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (الاخلاص: 4) اور وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) اور متشابہات مثلاً ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً میں ان ارشادات کی طرف رجوع کیا جاتا ہے: وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ (طٰہٰ: 82) اور اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ (النساء: 48)

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ نحاس نے کہا ہے وہ اس کی وضاحت کرتا ہے جسے ابن عطیہ نے اختیار کیا ہے اور وہی وضع زبان پر جاری ہے اور وہ یہ کہ محکم احکم سے اسم مفعول ہے اور الاحکام کا معنی الاتقان (پختہ کرنا) ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لفظ واضح المعنی ہو اس میں کوئی اشکال اور تردد نہیں ہوتا۔ بلاشبہ وہ (محکم) اپنے مفرد کلمات کے واضح ہونے اور ان کی ترکیب کے پختہ اور مضبوط ہونے میں اسی طرح ہوتا ہے اور جب دو امروں میں سے کوئی ایک مختل ہوجائے تو اس میں تشابہ اور اشکال آجاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن خویز منداد نے کہا ہے: متشابہ کی کئی وجوہ ہیں، ایک وہ ہے جس کے ساتھ حکم متعلق ہوتا ہے وہ یہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہو کہ دو آیتوں میں سے کون سی آیت نے دوسری کو منسوخ کردیا ہے، جیسا کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کا ایسی حاملہ عورت کے بارے جس کا خاوند فوت ہوجائے یہ نظریہ ہے کہ یہ دونوں مدتوں میں سے زیادہ کے ساتھ عدت گزارے گی اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی عدت وضع حمل ہے، اور وہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 401

کہتے ہیں: چھوٹی سورۂ نساء (1) (یعنی سورۂ طلاق) نے چار مہینے اور دس دن عدت والے حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کہتے ہیں یہ حکم منسوخ نہیں ہوا۔ اور اسی طرح ان کا وارث کے لئے وصیت کرنے کے بارے میں اختلاف ہے کیا وہ منسوخ کر دی گئی ہے یا منسوخ نہیں کی گئی؟ اور اسی طرح دو آیتوں میں تعارض کی صورت میں اختلاف ہے کہ ان میں سے اولیٰ کون سی ہے کہ اسے مقدم کیا جائے جب نسخ نہ پہچانا جائے اور نہ اس کی شرائط پائی جائیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء: 24) یہ تقاضا کرتا ہے کہ ملک یمین کی حیثیت سے دو قریبی عورتوں کو اپنے پاس جمع کرنا مباح ہے، جبکہ ارشاد باری تعالیٰ: وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (النسا: 23) اس سے منع کرتا ہے اور اسی میں سے وہ تعارض بھی ہے جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں پایا جاتا ہے اور وہ جو قیاس میں پایا جائے، پس وہی متشابہ ہے اور ایک آیت کو دو قراءتوں سے پڑھنا متشابہ میں سے نہیں ہے اور اسم کبھی محتمل یا مجمل ہوتا ہے وہ تفسیر کا محتاج ہوتا ہے، کیونکہ اس میں سے واجب اتنی مقدار ہی ہوتی ہے جسے وہ اسم یا پوری آیت شامل ہوتی ہے اور دو قرأتیں دو آیتوں کی طرح ہوتی ہیں اور دونوں کے موجب کے مطابق عمل واجب ہوتا ہے، جیسا کہ پڑھا گیا ہے: وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ (المائدہ: 6) (اَرْجُلَكُمْ) کی قرأت فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ ہے، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ المائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 3۔ بخاری نے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو کہا: میں قرآن کریم میں ایسی اشیاء پاتا ہوں جو مجھے مختلف نظر آتی ہیں۔ (یعنی ان میں اختلاف ہے) آپ نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ اس نے بیان کیا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَىٕذٍ وَّ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ ۝ (المومنون) (تو کوئی رشتہ داریاں نہ رہیں گی ان کے درمیان اس روز اور نہ وہ ایک دوسرے کے متعلق پوچھ سکیں گے۔) اور فرمایا: وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ (الطور) (اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے) اور کہا: وَ لَا یَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِیْثًا (وہ اللہ تعالیٰ سے کوئی بات نہیں چھپائیں گے) اور پھر کہا: وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ ۝ (انعام) (قسم بخدا! اے ہمارے رب ہم مشرک نہ تھے) تو انہوں نے اس آیت میں (اپنے شرک کو) چھپایا۔ اور سورہ النازعات میں ہے اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝ وَ اَغْطَشَ لَیْلَهَا وَ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝ وَ الْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ پس اس میں زمین کی تخلیق سے پہلے آسمان کی تخلیق کا ذکر کیا، پھر فرمایا اَىٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىٕلِیْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىٕعِیْنَ ۝ (فصلت) سو اس میں آسمان کی تخلیق سے پہلے زمین کی تخلیق کا ذکر کیا اور فرمایا: وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝ (النسا) اور وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ (النسا) اور وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ۝ (النسا) تو گویا کہ وہ تھا پھر

1۔ صحیح بخاری، باب تفسیر سورۃ الطلاق، حدیث نمبر 4529، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گزر گیا۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: فلا انساب بینھم نفخہ اولیٰ کے بارے میں ہے پھر صور میں پھونکا جائے گا اور جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہوگا وہ گر پڑے گا سوائے اس کے جس کے بارے اللہ تعالیٰ چاہے گا۔ اس وقت ان کے درمیان نہ نسب ہوں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کے بارے پوچھیں گے۔ پھر دوسرے نفخہ میں ان میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔

اور جہاں تک ما کنا مشرکین اور ولا یکتمون اللہ حدیثا کا تعلق ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ اخلاص والوں کے گناہوں کی مغفرت فرمادے گا، تو مشرکین کہیں گے! آؤ ہم کہتے ہیں: ہم مشرک نہیں تھے، تو اللہ تعالیٰ ان کے مونہوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے اعمال کے بارے ان کے اعضاء گفتگو کریں گے تو اس وقت یہ معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی بات کو نہیں چھپائے گا اور اس وقت کفار یہ خواہش کریں گے کاش وہ مسلمان ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں تخلیق فرمایا، پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی تو دو دنوں میں انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمان بنا دیا، پھر زمین کو بچھایا اور اس سے پانی اور کھیتی نکالی اور ان میں پہاڑ، درخت، ٹیلے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے وہ سب دوسرے دو دنوں میں تخلیق فرمادیا۔ پس اس لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝ (نازعات) نتیجتاً زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ چار دنوں میں تخلیق کیا گیا اور دو دنوں میں آسمان بنایا گیا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: و کان اللہ غفورا رحیما (یعنی وہ ذاتی طور پر غفور اور رحیم ہے یعنی وہ ہمیشہ رہا اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا)۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی شے کا ارادہ نہیں کیا مگر اسے اسی کے مطابق کیا جو ارادہ فرمایا۔ تجھ پر افسوس ہے! چاہیے کہ تجھ پر قرآن مختلف نہ ہو، کیونکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ اس میں اُخَرُ غیر منصرف ہے۔ کیونکہ اسے الف لام سے معدول کیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اصل یہ ہے کہ یہ الف لام کے ساتھ صیغہ صفت ہو جیسا الکبر اور الصغر، پس جب اسے الف لام کے جاری ہونے کی جگہ سے معدول کر دیا گیا تو یہ غیر منصرف ہو گیا۔ ابو عبید نے کہا ہے: انہوں نے اسے منصرف نہیں کہا کیونکہ اس کا واحد منصرف نہیں ہوتا چاہے وہ معرفہ ہو یا نکرہ۔ اور مبرد نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: اس بنا پر یہ لازم آتا ہے کہ غضاب اور عطاش بھی منصرف نہ ہوں۔ اور امام کسائی نے کہا ہے: یہ غیر منصرف ہے کیونکہ یہ صفت ہے۔ اور مبرد نے اس کا بھی انکار کیا ہے اور کہا ہے: بے شک لبدًا اور حطمًا بھی دونوں صفتیں ہیں اور یہ دونوں منصرف ہیں۔

سیبویہ نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ اُخَرُ الف لام سے معدول ہو، کیونکہ اگر یہ الف لام سے معدولہ ہوتا تو یہ معرفہ ہوتا، کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ سَحَرَ تمام اقوال میں معرفہ ہے کیونکہ یہ السحر سے معدول ہے اور اَمْسِ اس کے قول کے مطابق جس نے کہا: ذھب اَمْسِ یہ الاَمْس سے معدول ہے، پس اگر اخر بھی الف لام سے معدول ہوتا تو وہ بھی معرفہ ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے نکرہ کے ساتھ اس کی صفت بیان کی ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 712

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ پس الَّذِیۡنَ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور خبر فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ہے۔ اور زَیۡغٌ کا معنی جھکاؤ اور کجی ہے اور اسی سے زاغت الشمس (سورج کا ڈھلنا) اور زاغت الابصار (آنکھوں کا تھکنا) ہے۔ اور کہا جاتا ہے: زاغ یزیغ زیغا جب وہ قصد وارادہ ترک کردے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوۡۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ (الصف: 5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کردیا) اور یہ آیت کفار، زندیق، جاہل، بدعتی تمام گروہوں کو عام ہے۔ اگرچہ اس وقت اس سے اشارہ نجران کے عیسائیوں کی طرف تھا۔ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر یہ حروریہ اور خارجیوں کے گروہ نہیں ہیں تو پھر میں نہیں جانتا وہ کون ہیں (1)۔

میں کہتا ہوں: یہ تفسیر حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث سے گزرچکی ہے۔ وہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ہمارے شیخ ابو العباس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: متشابہ کی پیروی کرنے والے اس سے خالی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی پیروی کریں اور اسے جمع کرتے رہیں قرآن کریم میں تشکیک تلاش کرنے کے لئے اور عوام کو گمراہ کرنے کے لئے، جیسا کہ زنادقہ اور قرآن کریم میں طعنہ زنی کرنے والے قرامطہ نے کیا، یا وہ متشابہ کے ظواہر کے مطابق اعتقاد رکھنے کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، جیسا کہ ان مجسمہ نے کیا جنہوں نے قرآن کریم اور احادیث طیبہ سے ان آیات و روایات کو جمع کیا جن کا ظاہر (اللہ تعالیٰ کی) جسمیت پر دلالت کرتا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے یہ اعتقاد رکھا کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم مجسم ہے اور وہ صورت مصورہ ہے اس کا چہرہ، آنکھ، ہاتھ، پہلو، پاؤں اور انگلیاں سبھی اعضاء ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ان سے مبرہ اور بلند ہے یا وہ متشابہ کی پیروی کرتے ہیں ان کی تاویلات کو ظاہر کرنے کے لئے اور ان کے معانی کی وضاحت کرنے کے لئے یا جیسا کہ صبیغ نے کیا جس وقت اس نے عمر پر کثرت سے اس بارے سوال کئے۔ پس یہ چار اقسام ہوئیں:

(۱) ان کے کفر میں کوئی شک نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کئے بغیر ان کے بارے میں قتل کا حکم دیا ہے۔

(۲) صحیح قول ان کی تکفیر کا ہے، کیونکہ ان کے اور بتوں اور تصویروں کی عبادت کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اور اگر انہوں نے توبہ کی تو ان کی توبہ قبول کی جائے گی، ورنہ یہ قتل کردیئے جائیں گے جیسا کہ مرتد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

(۳) چونکہ اس کی تاویل کے جواز میں اختلاف ہے لہٰذا اسی بنا پر اس کے جائز ہونے میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ سلف کا مذہب متشابہ کی تاویل کے لئے تعرض کو ترک کرنا ہے باوجود اس کے کہ انہیں ان کے ظاہر معنی کے محال ہونے کا یقین تھا۔ پس وہ کہتے: تم اس سے گزرجاؤ جیسے وہ آئے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کی تاویلات کا اظہار کرنا چاہیے اور اسے ایسے معنی پر محمول کیا جائے بغیر یقین کے جس پر لغۃً محمول کرنا صحیح ہو جیسا کہ مجمل کی تعیین کی جاتی ہے۔

(۴) اس میں حکم ادب بلیغ کا ہے، جیسا کہ حضرت عمر نے صبیغ کے ساتھ کیا اور ابوبکر انباری نے کہا ہے: ائمہ سلف اسے سزا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 402، دار الکتب العلمیہ

دیتے تھے جو قرآن کریم کے مشکل حروف (متشابہ) کی تفسیر کے بارے سوال کرتا تھا۔ کیونکہ سائل اگر اپنے سوال سے بدعت کو دوام بخشنے اور فتنہ برپا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ درحقیقت انکار اور بہت بڑی تعزیر کا مستحق ہے اور اگر اس کا یہ قصد نہیں تب بھی وہ گناہ کا جرم کرنے کے سبب عتاب کا مستحق ہے، کیونکہ اس نے منافقین ملحدین کے لئے اس وقت ایک راستہ ایجاد کر دیا ہے کہ وہ تاویل کے حقائق اور قرآن کریم کے مناہج سے انحراف کرتے ہوئے قرآن کریم میں تحریف کرنے کے بارے کمزور مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان میں تشکیک پیدا کرنے کا قصد و ارادہ کریں۔ اور اسی سے وہ روایت ہے جو اسماعیل بن اسحاق القاضی نے ہمیں بیان کی کہ ہمیں سلیمان بن حرب نے حماد بن زید عن یزید بن حازم عن سلیمان بن یسار کی سند سے یہ خبر دی ہے کہ صبیغ بن عسل مدینہ طیبہ آیا اور وہ قرآن کریم کی متشابہ (آیات) اور دیگر اشیاء کے بارے سوال کرنے لگا تو اس کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے اسے بلا بھیجا۔ پس اسے حاضر کیا گیا تو آپ نے اس کے لئے کھجور کے گچھوں کی جڑیں تیار کی ہوئی تھیں۔ پس جب وہ حاضر ہوا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فرمایا: تو کون ہے؟ اس نے کہا: میں عبداللہ صبیغ ہوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں عبداللہ عمر ہوں، پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس جڑ کے ساتھ اس کے سر پر ضرب لگائی اور اسے زخمی کر دیا، پھر لگاتار اسے مارا یہاں تک کہ اس کا خون اس کے چہرے پر بہنے لگا، تو اس نے کہا: یہ کافی ہے اے امیر المومنین! قسم بخدا! جو میں اپنے سر میں پاتا تھا وہ نکل گیا ہے (1) اور اس کے ادب کے بارے میں روایات مختلف ہیں ان کا ذکر سورۃ الذاریات میں آئے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی طرف متوجہ کیا اور اسے اس کے دل میں ڈال دیا۔ پس اس نے توبہ کر لی اور اس کی توبہ انتہائی اچھی اور حسین تھی۔ اور ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ کا معنی ہے مومنین کے لئے التباس اور شبہات کو طلب کرنا تاکہ وہ ان کے درمیان فساد پیدا کر دیں اور وہ لوگوں کو اپنی کجی کی طرف لوٹا لائیں اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: ابْتِغَآءَ تَأْوِيْلِهٖ کا معنی ہے کہ انہوں نے اپنے دوبارہ اٹھائے جانے اور زندہ کئے جانے کے بارے تاویل تلاش کی، تو اللہ تعالیٰ نے آگاہ فرما دیا کہ اس کی اور اس کے وقت کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا: اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ یعنی جس دن وہ اسے دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جارہا ہے یعنی دوبارہ زندہ کیا جانا، قبروں سے اٹھایا جانا اور عذاب...... يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ...... یعنی انہوں نے تو اسے چھوڑ دیا ہے ...قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (اعراف: 53) یعنی تحقیق ہم نے اس کی تاویل دیکھ لی جس کے بارے ہمیں رسل علیہم السلام نے آگاہ کیا تھا۔ فرمایا: پس وقف اس قول باری تعالیٰ پر ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ دوبارہ کب اٹھایا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ، کہا جاتا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت جن میں حی بن اخطب بھی تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ہمیں خبر پہنچی ہے کہ آپ پر الٓمّٓ نازل ہوئی ہے۔ پس اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں تو پھر آپ کی امت کی بادشاہی اکہتر برس ہوگی، کیونکہ حساب الجمل میں الف سے مراد ایک ہے، لام سے مراد تیس ہیں

1۔ سنن دارمی، کتاب مقدمہ باب، من هاب الفتیا و کرہ التنطع والبدع، جلد اول، حدیث نمبر 144 مکتبہ مدینہ منورہ

اور میم سے مراد چالیس ہیں۔ تب یہ آیت نازل ہوئی وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ اور یہاں تاویل بمعنی تفسیر ہوگا۔ جیسا کہ تیرا یہ قول ہے: تاویل هذه الكلمة على كذا (یعنی اس کلمہ کی تفسیر اس معنی پر ہے) اور یہ مایؤول الأمر اليه کے معنی میں بھی ہوسکتا ہے۔ (یعنی جس کی طرف امر لوٹتا ہے۔) اور اس کا اشتقاق آل الأمر إلى كذا يؤول اليه سے ہے یعنی بمعنی صار۔ اور اَوَّلْتُهٗ تَاْوِيْلًا بمعنی صَيَّرْتُهٗ ہے۔ (یعنی میں نے اس کی تاویل کی) اور بعض فقہاء نے اس کی تعریف کی اور کہا: هو ابداء احتمال فى اللفظ مقصود بدليل خارج عنه۔ یعنی کسی لفظ میں مقصود احتمال کو خارجی دلیل کے ساتھ ظاہر کرنا۔ اور تفسیر سے مراد لفظ کا بیان اور اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ یعنی اس میں کوئی شک نہیں۔ اور تفسیر کی اصل فسر ہے اور اس کا معنی بیان ہے، کہا جاتا ہے: فسرت الشئ (بالتخفيف) أفسره (بالكسر) فسرا اور تاویل معنی کا بیان ہوتا ہے، جیسا کہ یہ قول لاشك فيه عند المومنين یعنی مومنین کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں یا چونکہ یہ فی نفسہ حق ہے لہٰذا اس کی ذات شک کو قبول نہیں کرتی۔ اور بلاشبہ شک کرنے والے کا وصف ہے اور جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دادا کے بارے میں اب (باپ) ہونے کا قول ہے، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں تاویل کی ہے: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ میں علماء کا اختلاف ہے، کیا یہ ابتداء کلام ہے اور اس کا ماقبل سے تعلق منقطع ہے، یا یہ اپنے ماقبل پر معطوف ہے اور واؤ جمع کے لئے ہے۔ اکثر کا موقف یہ ہے کہ یہ ماقبل سے منقطع ہے اور یہ کہ قول باری تعالیٰ اِلَّا اللّٰهُ پر پہلا کلام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ قول حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم اور کئی دوسروں کا ہے، اور یہی امام کسائی، اخفش فراء اور ابوعبید وغیرہم کا مذہب ہے۔ ابونہیک اسدی نے کہا ہے: بے شک تم اس آیت کو ملاتے ہو حالانکہ یہ اس سے منقطع ہے۔ اور راسخین کے علم کی انتہا نہیں مگر ان کے اس قول پر اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اور اسی کی مثل حضرت عمر بن عبد العزیز نے کہا ہے اور علامہ طبری نے اسی طرح یونس بن اشهب عن مالک بن انس سے بیان کیا ہے(1)۔ اور اس بنا پر يَقُوْلُوْنَ، الرّٰسِخُوْنَ کی خبر ہے۔

علامہ خطابی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ کتاب جس کے ساتھ ایمان لانے اور جس کی تصدیق کرنے کا ہمیں حکم ارشاد فرمایا ہے اس کی آیات کی دو قسمیں بنا دی ہیں، ایک محکم اور دوسری متشابہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے قائل سے فرمایا: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڼ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا پس بتا دیا کہ کتاب میں متشابہ کو اپنے علم کے ساتھ خاص کرلیا ہے اور اس کے بغیر کوئی بھی اس کی تاویل کو نہیں جانتا، پھر اللہ تعالیٰ نے راسخین فی العلم کی تعریف بیان فرمائی کہ وہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے۔ اور اگر ان کی طرف سے ایمان صحیح نہ ہوتا تو وہ اس پر تعریف کے مستحق نہ ہوتے۔ اور اکثر علماء کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت میں وقف تام اس قول پر ہے: وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ اور جو اس کے بعد ہے وہ دوسرا نیا کلام ہے اور وہ یہ قول ہے: وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ

اٰمَنَّا بِهٖ اور یہی حضرات ابن مسعود، ابی بن کعب، ابن عباس اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

اور حضرت مجاہد سے یہ روایت ہے کہ الرّٰسِخُوْنَ کا اپنے ماقبل پر عطف نسق ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ بھی اس کا علم رکھتے ہیں۔ اور اس کے بارے میں بعض اہل لغت نے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے: اس کا معنی ہے والراسخون فی العلم یعلمونہ قائلین امنا (راسخون فی العلم اسے جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے) اور یہ گمان ہے کہ یَقُوْلُوْنَ حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور عام اہل لغت اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے بعید سمجھتے ہیں، کیونکہ عرب فعل اور مفعول کو اکٹھا مضمر نہیں کرتے اور حال مذکور نہیں ہوتا مگر تبھی جب فعل ظاہر ہو اور جب فعل ظاہر نہیں تو وہ حال نہیں ہو سکتا اور اگر یہ جائز ہے تو پھر یہ کہا جانا بھی جائز ہے۔ عبد اللہ راکباً، یعنی اقبل عبد اللہ راکباً۔ بلاشبہ فعل مذکور کے ساتھ یہ جائز ہوتا ہے جیسا کہ یہ قول: عبد اللہ یتکلم یصلح بین الناس (عبد اللہ کلام کر رہا ہے درآنحالیکہ وہ لوگوں کے درمیان صلح کرا رہا ہے۔) تو اس میں یصلح اس کے لئے حال ہے۔ اسی طرح شاعر کا قول ہے ..... ابو عمر نے یہ مجھے سنایا ہے اور اس نے کہا ہمیں ابو العباس ثعلب نے سنایا ہے:

ارسلتُ فیها قَطِمًا لُکَالِکَا یَقْصُرُ یَمْشِی ویطول بَارِکَا

بمعنی یقصر ماشیاً (یعنی یمشی حال واقع ہو رہا ہے۔) پس عام علماء کا قول علمائے نحو کے مذاہب کی تائید سے اکیلے حضرت مجاہد کے قول سے اولیٰ اور ارجح ہے اور یہ بھی کہ یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ مخلوق سے کسی شے کی نفی کرے اور اسے اپنی ذات کے لئے ثابت کرے اور پھر اس میں کوئی اس کا شریک ہو۔ کیا آپ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں دیکھتے: قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ (النمل: 65) (آپ فرمائیے (خود بخود) نہیں جان سکتے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں غیب کو سوائے اللہ تعالیٰ کے۔) اور یہ ارشاد: لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ (الاعراف: 187) (نہیں ظاہر کرے گا اسے اپنے وقت پر مگر وہی) اور یہ ارشاد: كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص: 88) (ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے) پس یہ سب انہیں میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے اور اپنے سوا کسی کو اس میں شریک نہیں کیا۔ اور اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ اور اگر "والراسخون" واؤ عطف نسق کے لئے ہوتو پھر اس قول کا کوئی فائدہ نہیں كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا۔ واللہ اعلم۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ خطابی نے بیان کیا ہے انہوں نے حضرت مجاہد وغیرہ کے قول کے سبب نہیں کہا، تحقیق انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ الرّٰسِخُوْنَ اسم جلالت پر معطوف ہے اور وہ بھی متشابہ کا علم رکھنے میں شامل ہیں۔ اور بلاشبہ وہ اس کے بارے اپنے علم کے ساتھ ہی کہتے ہیں اٰمَنَّا بِهٖ (ہم اس کے ساتھ ایمان لائے)، اور ربیع، محمد بن جعفر بن زبیر اور قاسم بن محمد وغیرہم نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر یَقُوْلُوْنَ، الرّٰسِخُوْنَ سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے (1)، جیسا کہ شاعر نے کہا:

الریح تبکی شجوها والبرق یلمع فی الغمامه (2)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دار الکتب العلمیہ

2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 5

یہ شعر دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے، پس یہ بھی جائز ہے کہ والبرق مبتدا ہو، اور تاویل اول کی بنا پر یلمع خبر ہو اور یہ ماقبل سے منقطع ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الریح پر معطوف ہو، اور یلمع دوسری تاویل کی بنا پر حال کے محل میں ہو بمعنی لامعا۔ اور یہ قول کرنے والوں نے بھی اس طرح استدلال کیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسوخ فی العلم کے ساتھ ان کی مدح کی، پس وہ کیسے ان کی مدح کرسکتا تھا جبکہ وہ جاہل اور ناواقف ہوتے؟ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: أنا ممن یعلم تأویله (1) (میں بھی ان میں سے ہوں جو اس کی تاویل جانتے ہیں) اور حضرت مجاہد نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: انا ممن یعلم تأویله۔ اسے ان سے امام الحرمین ابوالمعالی نے بیان کیا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بعض علماء نے اس قول کو پہلے قول کی طرف ہی لوٹایا ہے اور کہا ہے: کلام مکمل ہو رہا ہے عند اللہ پر اس کا معنی ہے یعنی متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور راسخون فی العلم اس کے بعض کو جانتے ہیں درآنحالیکہ وہ یہ کہتے ہیں ہم اس کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے (اور ان کا یہ علم) ان دلائل کے سبب ہے جو محکم آیات میں بیان کئے گئے ہیں اور اسے اس کی قدرت دی گئی ہے جس نے اسے اس کی طرف لوٹایا ہے۔ پس جب انہوں نے بعض تاویل کو جان لیا اور بعض کو نہ جانا اور انہوں نے یہ کہا: ہم تمام کے ساتھ ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی جانب سے ہے، اور ان مخفی چیزوں میں سے جو اس کی شرع صالح میں ہیں جنہیں ہمارا علم محیط نہیں تو ان کا علم ہمارے رب کے پاس ہے۔ اور اگر کوئی کہنے والا کہے کہ راسخین پر بعض کی تفسیر مشتبہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نہیں جانتا الاواہ کیا ہے اور نہ جانتا ہوں کہ غسلین کیا ہے، تو کہا جائے گا: یہ کوئی الزام نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے بعد اسے جان لیا اور اس کی تفسیر بیان فرمائی جس پر واقف ہوئے۔ اور اس سے زیادہ پختہ اور مضبوط جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا وکل راسخ۔ کہ اس سے یہ ثابت ہو۔ پس جب ایک کو اس کا علم نہیں ہوا تو دوسرے نے اسے جان لیا۔ اور ابن فورک نے اسے ترجیح دی ہے کہ راسخون فی العلم تاویل جانتے ہیں اور انہوں نے اس میں خوب بیان کیا ہے (2) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد میں، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے ہے۔ اللهم فقهه فی الدین وعلمه التاویل (3) (اے اللہ! اسے دین میں فقاہت عطا فرما اور اسے تاویل کا علم عطا فرما) وہ جسے تیرے لئے وہ بیان کرے، یعنی اسے اپنی کتاب کے معانی کا علم عطا فرما۔ اور اس بناء پر وقف وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ پر ہوگا۔ ہمارے شیخ ابوالعباس احمد بن عمر نے کہا ہے: اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ انہیں راسخین کا نام دینا اس کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس محکم سے زیادہ علم رکھتے ہیں جسے جاننے میں وہ تمام لوگ برابر ہوتے ہیں جو کلام عرب کو سمجھتے ہیں اور پھر کون سی شے میں ان کا رسوخ ہے جب وہ اتنا ہی جانتے ہیں جتنا سب جانتے ہیں! لیکن متشابہ متنوع قسم ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے جسے یقینا کوئی نہیں جانتا جیسا کہ روح اور قیامت کا علم کہ یہ ان میں سے ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم غیب کے ساتھ خاص کیا ہے۔ اور اس کا علم کوئی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 403، دارالکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، صفحہ 404، دارالکتب العلمیہ
3۔ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی، جلد 14، صفحہ 435، دارالکتب المصریۃ۔ ایضاً، بخاری، کتاب الوضو، حدیث 140، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نہیں حاصل کر سکتا نہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور نہ کوئی اور۔ پس حذاق اور متبحر علماء میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ راسخین متشابہ کا علم نہیں رکھتے تو انہوں نے متشابہ کی اسی نوع کا ارادہ کیا ہے اور رہا وہ جسے وجوہ لغت پر اور کلام عرب کی طرز پر محمول کرنا ممکن ہوتا ہے تو اس میں تاویل کی جاسکتی ہے اور اس کی صحیح تاویل جانی جاسکتی ہے اور اس سے اسے زائل کیا جاسکتا ہے جس کا تعلق غیر صحیح تاویل کے ساتھ ہو، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا قول: وَ رُوْحٌ مِّنْهُ، الی غیر ذالک۔ پس کسی کو راسخ کا نام نہیں دیا جاسکتا مگر تبھی جب وہ (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) دی گئی قدرت و استطاعت کے مطابق اس نوع میں سے کثیر کا علم رکھتا ہو۔ اور جو یہ کہتے ہیں کہ متشابہ سے مراد منسوخ ہے تو اس قول کی بنا پر راسخین کو تاویل کے علم میں داخل کرنا صحیح ہے لیکن متشابہات کو اس نوع کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے (1)۔

الرُّسُوْخ کا معنی ہے کسی شے میں ثابت ہونا۔ اور ہر ثابت راسخ ہوتا ہے۔ اور اجرام میں اس کی اصل یہ ہے کہ اس نے پہاڑ اور درخت زمین میں راسخ کر دیئے (2)، شاعر نے کہا ہے:

لقد رَسَخَتْ فی الصدر منّی مودّةٌ لِلَیلَیٰ ابَتْ آیاتها أنْ تَغَیَّرا

میری طرف سے لیلیٰ کے لئے محبت سینے میں راسخ ہوگئی اس کی علامات نے انکار کر دیا کہ وہ متغیر ہوں۔

اور رسخ الایمان فی قلب فلان یَرسَخُ رسوخاً۔ فلاں کے دل میں ایمان راسخ ہوگیا۔

اور بعض نے بیان کیا ہے: رسخ الغدیر: اس کا معنی ہے تالاب کا پانی بہہ پڑا۔ اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے پس یہ اضداد میں سے ہے۔

اور رَسَخَ و رَضَخَ و رَصَنَ و رَسَبَ تمام ثبت فیہ کے معنی میں ہیں۔ اور حضور نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم سے راسخین فی العلم کے بارے پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ''وہ وہ ہے جس کی قسم سچی ہو، اس کی زبان سچ بولے اور اس کا دل مستقیم اور سیدھا ہو۔'' ھو من برّت یمینہ و صدق لسانہ و استقام قلبہ (3) اور اگر کہا جائے: قرآن کریم میں متشابہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ (النحل: 44) (اور (اسی طرح) ہم نے نازل کیا آپ پر ذکر تاکہ آپ کھول کر بیان کریں لوگوں کے لئے (اس ذکر کو) جو نازل کیا گیا ہے ان کی طرف) تو اللہ تعالیٰ نے کیونکر تمام قرآن کو واضح نہیں بنایا؟ تو اسے کہا جائے گا: حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر اس میں حکمت علماء کی فضیلت کا اظہار ہے، کیونکہ اگر سارا قرآن واضح ہوتا تو علماء میں سے بعض کی بعض پر فضیلت ظاہر نہ ہوتی۔ اور اسی طرح وہ کرتا ہے جو کوئی شے تصنیف کرتا ہے کہ اس کے بعض مقامات کو واضح ذکر کرتا ہے اور بعض کو مشکل بنا دیتا ہے اور اس میں (علماء کی) جماعت کے لئے جگہ چھوڑ دیتا ہے، کیونکہ وہ شے جسے پانا آسان ہو اس کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا اس میں ضمیر ہے جو کتاب اللہ کے محکم و متشابہ سبھی کی طرف لوٹ رہی ہے اور تقدیر عبارت ہے: کلہ من عند ربنا۔ اور لفظ کُلٌّ کے اس پر دلالت کرنے کی وجہ سے ضمیر کو حذف کر دیا گیا ہے،

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، صفحہ 404 3۔ جامع البیان للطبری، جل 3-4، صفحہ 217

کیونکہ یہ لفظ اضافت کا تقاضا کرتا ہے۔ پھر فرمایا: وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ یعنی صاحب عقل ہی یہ کہتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور جہاں وقف ہو وہاں وقف کرتا ہے اور متشابہ کی اتباع چھوڑ دیتا ہے۔ اور لُب کا معنی عقل ہے اور لُبّ کل شئ سے مراد ہر شے کا مغز اور اس کا خالص ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے عقل کو لب کہا گیا ہے اور اُولو، ذُو کی جمع ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○

"اے ہمارے رب! نہ ٹیڑھے کر ہمارے دل بعد اس کے کہ تو نے ہدایت دی ہمیں اور عطا فرما ہمیں اپنے پاس سے رحمت بے شک تو ہی سب کچھ بہت زیادہ دینے والا ہے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا اس کلام میں حذف ہے۔ تقدیر کلام ہے یقولون وہ کہتے ہیں۔ اور یہ راسخین کی جانب سے بطور حکایت ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ معنی اس طرح ہو قل یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم (اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہیے) اور کہا جاتا ہے: ازاغۃ القلب (دل کو ٹیڑھا کرنے) سے مراد فساد برپا کرنا اور دین سے اعراض برتنا ہے۔ کیا وہ خوفزدہ ہو رہے تھے حالانکہ انہیں ہدایت دے دی گئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں فساد کی طرف منتقل کر دے گا؟ تو جواب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی فرما دی تو وہ یہ التجا کرنے لگے کہ وہ انہیں اعمال میں سے کسی ایسے عمل کے ساتھ نہ آزمائے جو ان پر ثقیل اور بھاری ہو اور وہ اس سے عاجز آ جائیں، جیسا کہ ارشاد ہے: وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ (النساء:66) (اور اگر ہم فرض کر دیتے ان پر کہ قتل کرو اپنے آپ کو یا نکل جاؤ اپنے اپنے گھروں سے۔)

ابن کسان نے کہا ہے: انہوں نے التجا کی کہ وہ ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دے، جیسے یہ ارشاد ہے: فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (الصف:5) (پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا) یعنی تو ہمیں اپنی ہدایت پر ثابت قدم رکھ جب تو نے ہمیں ہدایت عطا فرما دی ہے اور یہ کہ ہم ٹیڑھے نہ ہو جائیں کہ ہم مستحق بن جائیں کہ تو ہمارے دلوں کو ٹیڑھا کر دے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ماقبل کلام سے منقطع ہے اور وہ یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے اہل الزیغ (ٹیڑھا ہونے والے) کا ذکر کیا تو اس کے پیچھے اسے لائے کہ اس کے ساتھ اپنے بندوں کو اپنی بارگاہ سے مانگنے کی دعا سکھائی کہ وہ اس برے گروہ میں سے نہ ہو جائیں جس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور وہ اہل زیغ ہیں۔

اور الموطا میں حضرت ابو عبداللہ الصنابحی سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور مغرب کی نماز آپ کے پیچھے ادا کی، تو آپ نے پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ قصار مفصل میں سے ایک سورت کی قرأت کی، پھر جب تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آپ کے اتنا قریب تھا کہ میرے کپڑے آپ کے کپڑوں کے ساتھ مس کرنے کے قریب ہو گئے، تو میں نے آپ کو سورۂ فاتحہ کے ساتھ یہ

آیت رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا الآیہ پڑھتے ہوئے سنا (1)۔ علماء نے کہا ہے: آپ کا یہ آیت پڑھنا قنوت اور دعا کی ایک قسم ہے کیونکہ آپ کے دور میں مرتدین کا معاملہ (خاصا پریشان کن) تھا۔ اور اہل علم کی ایک جماعت کے نزدیک مغرب کی نماز میں قنوت پڑھنا جائز ہے اور ہر نماز میں بھی جب مسلمانوں پر ایسا شدید امر چھا جائے جو انہیں خوفزدہ اور مضطرب کر دے اور وہ اس سے اپنے آپ پر خوف محسوس کرنے لگیں۔

اور ترمذی نے شہر بن حوشب کی حدیث روایت کی ہے انہوں نے بیان کیا میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کہا: اے ام المومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر کون سی دعا مانگا کرتے تھے جب آپ کے پاس ہوتے؟ تو انہوں نے بیان فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ ہوتی یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك (اے دلوں کو بدلنے والے میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ) تو میں عرض کرتی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ اکثر یہ دعا مانگتے ہیں یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینك! تو آپ نے فرمایا: یا أم سلمة انه لیس آدمی الا و قلبه بین اصبعین من أصابع الله فمن شاء اقام و من شاء أزاغ (اے ام سلمہ! بے شک کوئی آدمی نہیں مگر اس کا دل رب العالمین کے دست قدرت کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے پس وہ جسے چاہے اسے سیدھا رکھے اور جسے چاہے ٹیڑھا کر دے) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت کی: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے (2) اور یہ آیت معتزلہ کے اس قول میں ان کے خلاف حجت ہے: بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کو گمراہ نہیں کرتا۔ اگر دلوں کو ٹیڑھا کرنا اس کی جانب سے نہ ہو تو پھر یہ جائز نہیں کہ اسے دور کرنے کے بارے دعا، اس سے کی جائے جس پر اس کا کرنا جائز ہی نہیں ہوتا۔

ابو واقد الجراح نے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبُنَا فعل کی نسبت قلوب کی طرف کرتے ہوئے قرأت کی اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف انتہائی رغبت اور میلان ہے اور دونوں قرأتوں پر آیت کا معنی یہ ہے کہ تیری جانب سے زیغ (ٹیڑھا پن) کو دلوں میں پیدا کرنا نہ ہو کہ وہ ٹیڑھے ہو جائیں (3)۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً یعنی اپنے پاس سے اور اپنی جانب سے فضل و رحمت عطا فرمانا کہ ہمارے کسی سبب سے اور نہ عمل سے۔ اس میں تابعداری اور عجز و انکساری کا اظہار ہے (4)۔ اور لَدُنْ میں چار لغتیں ہیں۔ ایک لَدُنْ یعنی لام کے فتحہ، دال کے ضمہ اور نون کی جزم کے ساتھ۔ اور یہی زیادہ فصیح ہے۔ اور دوسری لام کے فتحہ، دال کے ضمہ اور نون کے حذف کے ساتھ (یعنی لَدُ)، اور تیسری لام کے ضمہ، دال کی جزم اور نون کے فتحہ کے ساتھ (یعنی لُدْنَ) اور چوتھی لام کے فتحہ، دال کے سکون اور نون کے فتحہ کے ساتھ (یعنی لَدْنَ)

شاید جاہل متصوفہ اور زنادقہ باطنیہ اس آیت اور اس کی مثل آیات سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: علم تو وہی ہے جو بغیر کسب کے ابتداءً اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور کتابوں اور اوراق میں دیکھنا تو حجاب ہے۔ یہ (نظریہ) مردود ہے اس کا بیان

1۔ موطا امام مالک، کتاب الصلوٰۃ، صفحہ 63، وزارت تعلیم، اسلام آباد　2۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 190
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 404، دار الکتب العلمیہ　4۔ ایضاً

اپنے محل میں آئے گا۔

اور آیت کا معنی ہے: ہمیں رحمت سے صادر ہونے والی نعمتیں عطا فرما، کیونکہ رحمت صفت ذات کی طرف راجع ہے اور اس میں ہبہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا (1)۔ کہا جاتا ہے: وَھَبَ یَھَبُ، یہ اصل میں یَوْھِبُ ھا کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور جس نے کہا ہے کہ یہ یَوْھَبُ ھا کے فتحہ کے ساتھ ہے تو اس نے خطا اور غلطی کی ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا جیسے اس نے کہا ہے تو پھر واو حذف نہ ہوتی، جیسا کہ یَوْجَلُ میں حذف نہیں ہوئی۔ بلاشبہ واؤ کسرہ اور یا کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے حذف کر دی گئی پھر اس کے حذف کے بعد کسرہ کو فتحہ میں بدل دیا گیا کیونکہ اس میں ھا حروف حلقی میں سے ایک ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

''اے ہمارے پروردگار! بے شک تو جمع کرنے والا ہے سب لوگوں کو اس دن کے لئے نہیں کوئی شبہ جس (کے آنے) میں، بے شک اللہ تعالیٰ نہیں پھرتا اپنے وعدہ سے۔''

یعنی تو لوگوں کے متفرق ہونے کے بعد انہیں اٹھانے والا اور انہیں لانے والا ہے اور اس میں قیامت کے دن کے لئے دوبارہ اٹھائے جانے کا اقرار ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہی وہ تاویل ہے جس کا علم راسخین فی العلم کو ہوا اور انہوں نے اس کا اقرار کیا اور انہوں نے اختلاف کیا جنہوں نے اس کی اتباع کی جو ان پر دوبارہ اٹھائے جانے کے معاملہ میں متشابہ ہو گیا یہاں تک کہ انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ اور الرَّیْبُ کا معنی شک ہے (2) اور اس کے محامل (محمول ہونے کے محل) سورۃ البقرہ میں گزر چکے ہیں، اور میعاد مفعال کے وزن پر الوعد سے ماخوذ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝

''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے کچھ بھی۔ اور وہی (بدبخت) ایندھن ہیں آگ کا۔''

اس کا معنی بیّن اور واضح ہے۔ یعنی ان کے اموال اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے عذاب میں سے کوئی شے ہرگز ان سے دور نہ کر سکیں گے۔ اور سلمی نے لن یُغْنِیَ یاء کے ساتھ پڑھا ہے (3)۔ اس لئے کہ فعل متقدم ہے اور فعل اور فاعل کے درمیان فصل موجود ہے اور حسن نے یُغْنِیْ یاء کے ساتھ قرأت کی ہے مگر آخری یاء کو تخفیف کے لئے ساکن کیا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

كفى باليأس من اسماء كافي و ليس لسقمها اذ طال شافي

اس میں حق یہ تھا کہ وہ کافیا کہتا، پس اس نے یا کو چھوڑ دیا۔

اور اسی کی مثل فراء نے شعر کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کانّ ایدیھنّ بالقاعِ القرِقِ أیدِی جوَارٍ یتَعاطَین الورق

القَرِقُ اور القَرِقَۃ القاع میں دونوں لغتیں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد مِنَ اللہِ میں مِنْ بمعنی عند ہے، ابوعبید نے یہی کہا ہے۔ اُولٰٓئِکَ ھُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ، الوقود یہ جلنے والی لکڑی کا اسم ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ حسن، مجاہد اور طلحہ بن مصرف نے وُقُوۡد واؤ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام ہے حطب وُقود النار۔ (1) اور عرب کلام میں یہ جائز ہے کہ جب واؤ مضموم ہو تو اسے ہمزہ سے بدل دیا جائے لہٰذا اُقُوۡد پڑھنا جائز ہے جیسا کہ اُقِتَتۡ۔

اور وُقُود واؤ کے ضمہ کے ساتھ مصدر ہے اور وَقَدَتِ النار تقد کہا جاتا ہے جب آگ بھڑک اٹھے۔ ابن مبارک نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ دین غالب آئے گا یہاں تک کہ سمندروں کو عبور کر لے گا اور یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاز کرتے ہوئے) گھوڑے سمندروں میں ڈال دیئے جائیں گے، پھر کچھ قومیں آئیں گی وہ قرآن کریم پڑھیں گے اور جب وہ اسے پڑھیں گے تو کہیں گے: کون ہم سے بڑھ کر قاری ہے اور کون ہم سے بڑھ کر عالم ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تم ان میں کوئی خیر اور بھلائی دیکھتے ہو؟ انہوں نے عرض کی: نہیں۔ تو آپ نے فرمایا: ''وہ تم میں سے ہوں گے اور وہ اس امت میں سے ہوں گے اور وہی آگ کا ایندھن ہوں گے (2)''۔

كَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوۡبِهِمۡ ؕ وَ اللّٰهُ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ۝۱۱

''(ان کا طریقہ) مثل طریقہ آل فرعون کے اور ان لوگوں کے تھا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔''

الدأب کا معنی عادت اور طریقہ ہے۔ اور دأب الرجل فی عملہ یدأب دأبا و دؤبا کہا جاتا ہے جب وہ اپنے کام میں کوشش کرے اور خوب محنت کرے اور أدابتہ أنا اور أداب بعیرہ جب وہ اونٹ کو چلانے میں خوب تھکا دے۔ اور الدائبان سے مراد رات اور دن ہیں۔ ابوحاتم نے کہا ہے: میں نے یعقوب کو یہ ذکر کرتے ہوئے سنا ہے کَدَأَبِ کہ یہ ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ ہے اور انہوں نے مجھے کہا درآنحالیکہ میں نوجوانی کی حالت میں تھا۔ کون سی شے پر کَدَأب جائز ہو سکتا ہے؟ تو میں نے کہا: میرا گمان ہے کہ یہ دَئِبَ یَدۡأَب دَأَباً سے ہے۔ تو انہوں نے میری بات کو قبول کر لیا اور میرے چھوٹا ہونے کے باوجود میری عمدہ وضاحت پر اظہار تعجب و مسرت کیا اور میں نہیں جانتا کیا یہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ نحاس نے کہا ہے: یہ قول غلط ہے، بالیقین دَئِبَ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ کہا جائے گا دَأَبَ یَدۡأب دُؤُباً [ودَأۡباً]، اسی طرح نحویوں نے بھی بیان کیا ہے، ان میں سے امام فراء نے اسے کتاب المصادر میں بیان کیا ہے، جیسا کہ امرؤ القیس نے کہا ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ 2۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 212، حدیث نمبر 29121

كَدَأْبِكَ مِنْ أُمِّ الْحُوَيْرِثِ قَبْلَهَا وجارتِهَا أُمِّ الرَّبَابِ بِمَأْسَلِ

پس رہا الدّأب تو یہ کہنا جائز ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شَعْرٌ و شَعَرٌ، نَهْرٌ و نَهَرٌ کیونکہ اس میں حروف حلقی میں سے ایک حرف ہے، البتہ الکاف میں اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے: یہ محل رفع میں ہے تقدیر کلام ہے دَأْبُهُمْ كَدَأْبِ آلِ فرعون، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کفار کا رویہ اسی طرح ہے جیسے آل فرعون کا رویہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ اور فراء کا خیال ہے کہ معنی یہ ہے: عرب آل فرعون کے کفر کی طرح کافر ہو گئے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: یہ جائز نہیں کہ کاف کفروا کے متعلق ہو، کیونکہ کفروا صلہ میں داخل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اَخَذَهُمُ اللّٰهُ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں شدید پکڑ لیا جیسا کہ اس نے آل فرعون کو پکڑا تھا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اس ارشاد کے متعلق ہے: لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ یعنی انہیں دولت نے کوئی فائدہ نہ دیا جیسا کہ آل فرعون کو ان کے مال اور اولاد نے کوئی فائدہ نہ دیا۔ اور یہ ان کے لئے جواب ہے جو جہاد سے پیچھے رہ گئے۔ اور انہوں نے کہا: ہمارے مالوں اور ہمارے گھر والوں نے ہمیں مشغول رکھا۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس میں لفظ وقود سے مقدر شدہ کوئی فعل عامل ہو۔ اور تشبیہ نفس احتراق (جلنے) میں ہو۔ اور اس معنی کی تائید اس ارشاد سے ہوتی ہے۔ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (المومن) (اور ہر طرف سے گھیر لیا فرعونیوں کو سخت عذاب نے۔ دوزخ کی آگ ہے پیش کیا جاتا ہے انہیں اس پر صبح و شام اور جس روز قیامت قائم ہوگی (حکم ہوگا) داخل کر دو فرعونیوں کو سخت تر عذاب میں)

پہلا قول ارجح ہے(1) اور علماء میں سے کئی ایک نے اسے اختیار کیا ہے۔ ابن عرفہ نے کہا ہے: كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ کا معنی ہے جیسا کہ آل فرعون کی عادت اور رویہ تھا، وہ کہہ رہے ہیں: ان کافروں کا الحاد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اسی طرح ہے جیسا کہ آل فرعون نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ سرکشی اور سختی کا رویہ اپنایا اور کہا: یہ معنی ازہری نے بیان کیا ہے۔ اور رہا وہ قول جو سورۃ الانفال میں ہے كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ انہیں قتل اور قید کی سزا دی گئی جیسا کہ آل فرعون کو غرق اور ہلاکت کی سزا دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: بِاٰيٰتِنَا یہ احتمال رکھتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جن کی تلاوت کی گئی ہے (یعنی آیات متلوہ) اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مراد وہ آیات ہوں جو وحدانیت پر بطور دلیل بیان کی گئی ہیں۔ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (پس پکڑ لیا انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

"(اے میرے رسول!) فرما دو ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا کہ عنقریب تم مغلوب کئے جاؤ گے اور ہانکے جاؤ گے جہنم کی طرف اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 405، دار الکتب العلمیہ

كَفَرُوْا سے مراد یہودی ہیں۔ محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے: جب رسول الله ﷺ نے میدان بدر میں قریش کو شکست سے دو چار کیا (اور فتح و کامرانی کے ساتھ) مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے یہودیوں کو جمع کیا اور فرمایا: ''اے گروہ یہود! الله تعالیٰ سے ڈرو اس کی مثل عذاب سے جو اس نے بدر کے دن قریش پر نازل کیا قبل اس کے کہ وہ تم پر بھی وہی نازل کرے جو ان پر نازل کیا۔ تحقیق تم جانتے ہو کہ میں الله تعالیٰ کی جانب سے بھیجا ہوا نبی ہوں تم اسے اپنی کتاب میں بھی پاتے ہو اور الله تعالیٰ نے تم سے عہد بھی لے رکھا ہے۔'' تو انہوں نے کہا: اے محمد! (ﷺ) تجھے یہ بات دھوکہ نہ دے کہ تو نے ان لوگوں کو قتل کیا جو ناتجربہ کار تھے وہ فنون جنگ سے ناواقف تھے، پس تم نے ان میں (قتل و غارت) کا موقع پالیا! قسم بخدا اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ چھیڑی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کتنے (بہادر اور تجربہ کار) لوگ ہیں۔ تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ تا کے ساتھ اور مراد یہود ہیں یعنی تمہیں شکست فاش سے دو چار کر دیا جائے گا۔ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ اور تمہیں آخرت میں جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ یہ عکرمہ اور سعید بن جبیر کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (1)۔ اور آپ ہی سے ابو صالح کی روایت میں ہے کہ یہودی جب خوش ہوئے اس تکلیف اور اذیت سے جس سے مسلمان غزوہ احد کے دن دو چار ہوئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ پس اس بنا پر سَيُغْلَبُوْنَ یا کے ساتھ، مراد قریش ہیں وَيُحْشَرُوْنَ یا کے ساتھ یعنی دونوں لفظ یا کے ساتھ ہیں اور یہ حضرت نافع کی قرأت ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَبِئْسَ الْمِهَادُ مراد جہنم ہے یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مجاہد نے کہا: اس کا معنی ہے برا ہے وہ جو انہوں نے اپنے لئے ٹھکانا بنایا، تو گویا معنی یہ ہوا: ان کا وہ فعل بہت برا ہے جس نے انہیں جہنم تک پہنچا دیا (2)۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

''بے شک تھا تمہارے لئے (عبرت کا) نشان (ان) دو گروہوں میں جو ملے تھے (میدان بدر میں) ایک گروہ لڑتا تھا الله کی راہ میں اور دوسرا کافر تھا دیکھ رہے تھے (مسلمان انہیں) اپنے سے دو چند (اپنی) آنکھوں سے اور الله مدد کرتا ہے اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے یقیناً اس واقعہ (بدر) میں بہت بڑا سبق ہے آنکھ والوں کے لئے۔''

قولہ تعالیٰ: قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ، اٰيَةٌ کا معنی علامت ہے۔ اور یہاں كَانَ فرمایا كانت نہیں فرمایا، کیونکہ اٰيَةٌ کی تانیث غیر حقیقی ہے اور کہا گیا ہے: اسے بیان کی طرف لوٹایا گیا ہے۔ یعنی قد کان لکم بیان (بے شک تمہارے لئے بیان اور وضاحت تھی)

1۔ اسباب النزول للنیشاپوری، جلد 1، صفحہ 62۔ ایضاً، ابی داؤد، باب کان اخراج الیہود من المدینہ، حدیث 2607، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 406، دار الکتب العلمیہ

تو اس میں معنی کو اپنایا گیا ہے اور لفظ کو چھوڑ دیا گیا ہے: جیسا کہ امری القیس کا قول ہے:

بَرَهْرَهَةٌ رُؤْدَةٌ رَخْصَةٌ كَخُرْعُوبَةِ البَانَةِ الْمُنْفَطِرِ

اور اس میں المنفطرۃ نہیں کہا، کیونکہ انہوں نے قضیب کے معنی کو پیش نظر رکھا ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اسے مذکر ذکر کیا ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان صفت سے فاصلہ کیا گیا ہے اور جب اسم اور فعل کے درمیان صفت حائل ہوگئی تو فعل مذکر لایا گیا۔ اور یہ معنی سورۃ البقرہ میں اس قول کے تحت گزر چکا ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ (البقرہ:180) (فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کے موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے) فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا یعنی مسلمانوں اور مشرکوں کے دو گروہ جو بدر کے دن ملے تھے۔ فِئَةٌ جمہور نے فِئَةٌ رفع کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی احدا ھما فِئَةٌ۔

اور حسن اور مجاہد نے فِئَةٍ جر کے ساتھ پڑھا ہے وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٍ کو بدل ہونے کی بنا پر جر کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن ابی عبلہ نے دونوں میں نصب پڑھی ہے(1)۔

احمد بن یحییٰ نے کہا ہے: حال ہونے کی بنا پر نصب پڑھنا جائز ہے، یعنی التقتا مختلفتین مؤمنۃ و کافرۃ۔ زجاج نے کہا ہے: نصب پڑھی گئی ہے بمعنی اعنی۔ اور لوگوں کی جماعت کو فئۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس کی طرف رجوع کیا جاتا ہے شدت اور تکلیف کے وقت۔

اور زجاج نے کہا ہے: الفئۃ کا معنی جدا کرنا اور علیحدہ کرنا ہے اور یہ فَأَوْتُ رَأْسَهُ بالسیف سے ماخوذ ہے۔ (یعنی میں نے تلوار کے ساتھ اس کا سر جدا کر دیا۔) اور کہا جاتا ہے: فأیتہ۔ (یہ تب کہے گا) جب تو اسے پھاڑ دے۔ اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ان دونوں گروہوں سے اشارہ ان کی طرف ہے جو غزوہ بدر کے دن ملے تھے(2)۔ اور اس کے مخاطب کے بارے میں اختلاف ہے۔

پس کہا گیا ہے: اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ مومنوں کو اس کے ساتھ خطاب کیا گیا ہو، یہ احتمال بھی ہے کہ خطاب تمام کفار کو کیا گیا ہو اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے ساتھ مدینہ طیبہ کے یہودیوں کو خطاب کیا گیا ہو۔ اور ان میں سے ہر احتمال کے مطابق قوم نے قول کیا ہے(3)۔ اور مومنین کو خطاب کا فائدہ نفوس کو ثابت قدم رکھنا اور انہیں تشجیع دلانا ہے یہاں تک کہ وہ دو چند اور کئی چند ہو کر آگے بڑھے، جیسا کہ واقع ہوا ہے۔

قولہ تعالیٰ: يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِأُولِي الْأَبْصَارِ ابوعلی نے کہا ہے: اس آیت میں رؤیت سے مراد آنکھ کے ساتھ دیکھنا ہے۔ اسی لئے یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہے(4)۔ مکی اور مہدوی نے کہا ہے: اس پر رَأْيَ الْعَيْنِ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں۔ اور نافع نے تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، صفحہ 407
3۔ ایضاً، صفحہ 406
4۔ ایضاً، صفحہ 407

نے یا کے ساتھ۔ مِّثْلَيْهِمْ کو تَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم سے حال ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے۔ اور جمہور لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ترون کا فاعل مومنین ہیں۔ اور اس کے ساتھ ضمیر متصل کفار کے لئے ہے(1)۔

اور ابو بکر نے اس کا انکار کیا ہے کہ اسے ترونہم تا کے ساتھ پڑھا جائے۔ انہوں نے کہا ہے۔ اور اگر اس طرح ہوتا تو پھر مِثْلَيْكُمْ ہوتا۔ نحاس نے کہا ہے: یہ لازم نہیں آتا، لیکن یہ جائز ہے کہ وہ مثلی اصحابکم ہو۔ مکی نے کہا ہے: تَرَوْنَهُمْ تا کے ساتھ لَكُمْ میں خطاب کی بنا پر واقع ہوا ہے۔ اور اچھا یہ ہے کہ یہ خطاب مسلمانوں کو ہو۔ اور ھا اور میم (ھم) مشرکین کے لئے ہو۔ اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ مثلیکم کاف کے ساتھ پڑھیں اور یہ خط کی مخالفت کی وجہ سے جائز نہیں ہے، لیکن یہ کہ کلام خطاب سے غیب کی طرف نکلنے پر واقع ہو، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ اور یہ ارشاد ہے: وَ مَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ پس پہلے خطاب کیا پھر فرمایا: فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم: 39) اور غیب کی طرف رجوع کیا۔

پس مِّثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم احتمال رکھتے ہیں کہ وہ مشرکین کے لئے ہو، یعنی اے مسلمانو! تم مشرکوں کو دو چند دیکھ رہے تھے اس تعداد سے جس پر وہ تھے اور معنوی طور پر یہ بعید ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی نگاہوں میں مشرکوں کو زیادہ نہیں کیا، بلکہ اس نے ہمیں یہ بتایا کہ اس نے انہیں مومنین کی نگاہوں میں کم کر دیا، پس معنی یہ ہوگا: اے مومنین! تم مشرکوں کو تعداد میں اپنے سے دو چند دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ ان سے تین گنا تھے، پس اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مسلمانوں کی نظروں سے کم کر دیا اور انہیں اپنی تعداد سے دوگنا مشرکین دکھائے تاکہ ان کے دل قوی اور مضبوط ہو جائیں اور ان میں جرأت و دلیری آجائے۔ اور انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ ان میں سے سو افراد دو سو کافروں پر غالب آجائیں گے۔ اور مسلمانوں کو مشرکین کی نظروں میں کم کر دیا تاکہ وہ ان پر حملے کی جرأت کریں اور پھر ان میں اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ نافذ ہو۔

اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ مِّثْلَيْهِمْ میں ضمیر مسلمانوں کے لئے ہو یعنی اے مسلمانو! تم مسلمانوں کو اس تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے جس پر تم تھے۔ یعنی تم اپنے آپ کو اپنی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ایسا اس لئے کیا تاکہ ان کے نفوس مشرکین کے ساتھ مقابلہ کے لئے قوی اور طاقتور ہو جائیں۔ پہلی تاویل اولیٰ اور ارجح ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا (الانفال: 43) (یاد کرو جب دکھایا اللہ نے آپ کو لشکر کفار خواب میں قلیل)

اور یہ ارشاد: وَ اِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِیْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا (الانفال: 44) (اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے دکھایا تمہیں لشکر کفار جب تمہارا مقابلہ ہوا تمہاری نگاہوں میں قلیل) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے اپنے پہلو میں ایک آدمی کو کہا: کیا تو انہیں ستر دیکھ رہا ہے؟ تو اس نے کہا: میں انہیں سو گمان کر رہا ہوں۔ پس جب ہم نے قیدیوں کو پکڑا تو انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہزار تھے(2)۔ اور علامہ طبری نے ایک قول سے بیان کیا ہے کہ انہوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

نے کہا: بلکہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کی نظروں میں مومنین کی تعداد کو زیادہ کر دیا یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیک ان سے دوگنا تھے۔ اور طبری نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اسی طرح کئی جہتوں سے یہ مردود ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کو مومنوں کی نگاہوں میں کم کر دیا تھا جیسا کہ گزر چکا ہے(1)۔ اور اس تاویل کی بنا پر، ہو تو ترون کافروں کے لئے ہو گا یعنی اے کافرو! تم مومنوں کو ان کی اصلی تعداد سے دو چند دیکھ رہے تھے اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ تم انہیں اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فراء نے گمان کیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ تم انہیں دوگنا دیکھ رہے تھے حالانکہ وہ تین گنا تھے۔ اور یہ بعید ہے لغت میں غیر معروف ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ باب الغلط ہے۔ اس میں غلطی تمام قیاسوں میں ہے، کیونکہ ہم کسی شے کی مثل کو اس کا مساوی سمجھتے ہیں اور ہم اس کی دو مثل اسے سمجھتے ہیں جو دو بار اس کے مساوی ہوتی ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: فراء نے اس کا قول بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: جیسا کہ تو کہتا ہے اور تیرے پاس غلام ہو کہ میں اس کی مثل کا محتاج ہوں۔ پس تو اس کا اور اس کی مثل کا محتاج ہو گا۔ اور تو یہ کہے: میں اس کی دو مثل کا محتاج ہوں، تو تو تین گنا کا محتاج ہو گا اور معنی اور لغت اس کے خلاف ہے جو اس نے کہا۔

اور وہ جو فراء نے اس میں بیان کیا ہے کہ مشرکین غزوۂ بدر کے دن مومنین سے تین گناہ تھے۔ پس اسے یہ وہم ہوا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ وہ انہیں دیکھ رہے ہوں مگر ان کی اسی تعداد پر (جس پر وہ تھے) اور یہ بعید ہے اور معنی اس کے مطابق نہیں ہے۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو اعتبار سے ان کی تعداد بدل کر دکھائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے اس میں نفع اور فائدہ دیکھا، کیونکہ مومنین کے دل اس کے ساتھ قوی ہو جائیں گے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علامت و نشانی ہو جائے۔ اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور رہی یا کی قرأت تو ابن کیسان نے کہا ہے: یَرَوْنَهُمْ میں ھا اور میم (یعنی ھم ضمیر) وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اور مِّثْلَيْهِمْ میں ھا اور میم فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ پر عائد ہے اور اضمار میں سے یہ وہ ہے جس پر سیاق کلام دلالت کرتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ۔

پس یہ اس پر دلیل ہے کہ کافر دکھائی دینے میں مسلمانوں کی دو مثل تھے حالانکہ تعداد میں وہ تین مثل تھے، فرمایا یہاں رؤیت یہود کے لئے ہے اور مکی نے کہا ہے: یہاں رؤیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے والے گروہ کے لئے ہے اور جس کو دیکھا گیا وہ کافروں کا گروہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والا گروہ کافروں کے گروہ کو مومنین کے گروہ کا دوگنا دیکھ رہا تھا حالانکہ کافروں کا گروہ مومنین سے تین گناہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی نظروں میں کم کر دیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور تَرَوْنَهُمْ میں خطاب یہودیوں کے لئے ہے۔ اور حضرت ابن عباس اور طلحہ رضی اللہ عنہم نے تُرَوْنَهُمْ تا کو ضمہ کے ساتھ اور سلمی نے تا مضمومہ کے ساتھ فعل مجہول کی بنا پر پڑھا ہے(2)۔ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ اس کا معنی گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 407، دار الکتب العلمیہ	2۔ ایضاً، صفحہ 406

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

''آراستہ کی گئی لوگوں کے لئے ان خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے اور خزانے جمع کیے ہوئے سونے اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے اور چوپائے اور کھیتی یہ سب کچھ سامان ہے دنیوی زندگی کا اور اللہ ہے جس کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔''

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: زُيِّنَ لِلنَّاسِ زُيِّنَ تزیین سے ہے۔ اور آراستہ کرنے والے کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے، ایک گروہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے آراستہ کیا ہے اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قول کا ظاہر معنی یہی ہے، اسے بخاری نے ذکر کیا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا (الکہف: 7) (بے شک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں ان کے لئے باعث زینت)

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے میرے رب! اس وقت تو نے اسے ہمارے لئے آراستہ کیا ہے! پھر یہ آیت نازل ہوئی قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ (آل عمران: 15) (آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز)

اور ایک گروہ نے کہا ہے: آراستہ کرنے والا شیطان ہے اور حضرت حسن کے قول کا ظاہر یہی ہے، کیونکہ انہوں نے کہا: کس نے اسے آراستہ کیا ہے؟ اس کے خالق سے زیادہ شدید اس کی مذمت کرنے والا کوئی نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کی تزیین یہ ہے کہ اس نے اسے ایجاد کیا اور نفع کے لئے اسے تیار کیا اور ان اشیاء کی طرف میلان فطرت میں رکھ دیا۔ اور شیطان کی تزیین یہ ہے کہ اس نے وسوسہ اندازی کی، دھوکے میں مبتلا کیا اور بغیر اسباب کے انہیں لینے کو حسین قرار دیا۔ اور آیت دونوں وجہوں پر مشتمل ہے۔ ابتداءً یہ تمام لوگوں کے لئے وعظ و نصیحت ہے اور اس کے ضمن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمعصر یہود وغیرہ کے لئے زجر و توبیخ ہے (1)۔ جمہور نے مفعول کا فعل ہونے کی بنا پر زُيِّنَ (یعنی مجہول) پڑھا ہے۔ اور حُبُّ کو رفع دیا ہے۔ اور حضرت ضحاک اور مجاہد نے فاعل کا فعل ہونے کی بنا پر زَيَّنَ (یعنی معروف) پڑھا ہے اور حُبَّ کو نصب دی ہے (2)۔ اور شہوات میں اسم اور صفت میں فرق کرنے کے لئے ہا کو حرکت دی گئی ہے۔ اور الشَّهَوٰت شہوۃ کی جمع ہے اور یہ معروف ہے۔ اور آدمی کسی شے کی خواہش رکھنے والا ہوتا ہے، (کہا جاتا ہے رجل شهوان للشئ) اور شے کی خواہش رکھی جاتی ہے (جیسا کہا جاتا ہے شئ شهی ای مشتهی)۔ اور شہوات (خواہشات) کی اتباع و پیروی سرکش بنا دیتی ہے اور ان کی اطاعت اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ''جنت کا احاطہ مصائب و مکروہات سے کیا گیا ہے اور جہنم کا احاطہ خواہشات سے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

کیا گیا ہے'' اسے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے(1)۔ اور اس تمثیل کا فائدہ یہ ہے کہ جنت حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تبھی جب مصائب و مکروہات کے جنگل کو کاٹ دیا جائے اور ان پر صبر کیا جائے اور جہنم سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی مگر تب جب شہوات کو چھوڑ دیا جائے اور نفس کو ان سے چھٹکارا دلا دیا جائے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جنت کا راستہ ٹیلوں کے سبب کٹھن اور دشوار ہے اور جہنم کا راستہ نرم ہموار زمین ہونے کے سبب سہل ہے۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا معنی یہی ہے: حفت الجنۃ بالمکارہ و حفت النار بالشھوات (2) یعنی جنت کا راستہ مشکل ہے کیونکہ اس میں چلنے کے لئے کئی ٹیلوں سے اوپر چڑھنا پڑھتا ہے، اور جہنم کا راستہ آسان ہے اس میں نہ کوئی ناہمواری ہے اور نہ دشوار گزاری۔ اور یہی معنی اس قول کا ہے سھل بسھوۃ اور یہ لفظ سین مہملہ کے ساتھ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ النِّسَآءِ ان کی عادت اور رویہ کی وجہ سے لوگوں کا کثرت سے ان کی طرف میلان اور جھکاؤ ہوتا ہے، کیونکہ وہ شیطان کا جال (پھندا) اور مردوں کے لئے فتنہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے بڑھ کر کوئی شدید فتنہ نہیں چھوڑا (3)'' اسے بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے روایت کیا ہے۔ پس عورتوں کا فتنہ تمام اشیاء سے زیادہ شدید اور سخت ہے۔ اور کہا جاتا ہے: عورتوں میں دو فتنے ہیں اور اولاد میں ایک فتنہ ہے۔ پس وہ دو جو عورتوں میں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قطع رحمی تک پہنچا دیتا ہے، کیونکہ عورت اپنے خاوند کو ماؤں اور بہنوں سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیتی ہے اور دوسرا یہ ہے کہ آدمی کو حلال و حرام مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اور رہے بیٹے! تو ان میں صرف ایک فتنہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی کو ان کے لئے مال جمع کرنے میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لا تسکنوا نسآء کم الغرف ولا تعلموھن الکتاب (4) (تم اپنی عورتوں کو بالا خانوں میں سکونت نہ دو اور تم انہیں لکھنا نہ سکھاؤ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ڈرایا (اور محتاط رہنے کی تلقین فرمائی۔) کیونکہ ان کے لئے بالا خانوں میں سکونت اختیار کرنے میں مردوں کی طرف دیکھنا (آسان) ہے۔ اور اس میں ان کے لئے نہ حفاظت ہے اور نہ پردہ۔ کیونکہ وہ مردوں پر جھانکتی رہیں گی نتیجتاً فتنہ اور آزمائش کھڑی ہو جائے گی اور کیونکہ یہ مرد سے پیدا کی گئی ہیں، لہٰذا ان کی خواہش اور قصد مرد کی جانب ہوتی ہے۔ اور مرد میں شہوت پیدا کر دی گئی ہے اور عورت کو مرد کے لئے باعث راحت و تسکین بنا دیا گیا ہے، پس دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے محفوظ و مامون نہیں اور انہیں لکھنے کی تعلیم دینے میں یہ فتنہ بھی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، جلد 2، صفحہ 378

2۔ ایضاً۔ صحیح بخاری، باب حجبت النار بالشھوات، حدیث نمبر 6006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب مایتقی من شوم المرأۃ، حدیث 4706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 380، حدیث نمبر 44999

اور کتاب الشہاب میں حضور نبی مکرم ﷺ سے حدیث موجود ہے: اَعْرُوا النسآء یَلْزَمْنَ الحجال (1) (تم عورتوں کو چھوڑ دو وہ اپنے خاص کمروں کو لازم پکڑے رکھیں گی) پس آدمی پر لازم ہے جب وہ ان زمانوں میں صبر نہ کر سکے تو وہ کسی دیندار عورت کو تلاش کرے تا کہ وہ اپنے دین کو محفوظ رکھ سکے، حضور ﷺ نے فرمایا علیك بذات الدین تَرِبَتْ یداك (2) (تجھ پر کسی دیندار عورت کو تلاش کرنا لازم ہے تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں) اسے مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لا تزوجوا النسآء لحسنھن فعسی حسنھن ان یُردیھن ولا تزوجوھن لا موالھن فعسی اموالھن ان تطغیھن ولکن تزوجوھن علی الدین ولامة سوداء خرماء ذات دین افضل (3) (تم عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کا حسن انہیں ہلاک کر دے، اور تم ان کے مالوں کی وجہ سے ان سے شادی نہ کرو کیونکہ قریب ہے ان کے مال انہیں سرکش بنا دیں البتہ تم دین کی بنا پر ان سے شادی کرو اور سیاہ رنگ چھیدے ہوئے کانوں (اور کٹی ہوئی ناک) والی دیندار کنیز افضل ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالْبَنِیْنَ اس کا عطف اپنے ماقبل پر ہے اور بنین کا واحد اِبْنٌ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی جانب سے خبر دیتے ہوئے فرمایا: اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ (بے شک میرا بیٹا میری اہل میں سے ہے۔) اور اس کی تصغیر بُنَیٌّ ہے۔ جیسا کہ لقمان نے کہا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ''کیا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے تیری کوئی اولاد ہے''؟ انہوں نے عرض کی: جی ہاں، میرا اس سے ایک بیٹا ہے اور میں یہ پسند کرتا ہوں کہ اس کے لئے میرے پاس طعام کا ایک کنواں ہو اور بنی جبلہ کا جو فرد بھی باقی رہے وہ اسے کھلاتا رہے تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''اگر تو نے ایسا کیا ہے تو بلاشبہ وہ (بیٹے) دلوں کی الفت اور راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بزدل بنا دینے والے، بخیل بنا دینے والے اور غمزدہ کر دینے والے ہیں۔ لئن قلت ذالك انھم لثمر القلوب و قرة الاعین و انھم مع ذالك لمجبنة مبخلة محزنة۔ (4)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَالْقَنَاطِیْرِ، القناطیر قنطار کی جمع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَآتیتم احدھن قنطارا۔ اور اس سے مراد مال کی بہت بڑی گانٹھ ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایک پیمانے کا نام ہے جس کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے، جیسا کہ رطل اور ربع وغیرہ۔ اور جو شی اس خاص وزن تک پہنچ جائے اس کے لئے کہا جاتا ہے: ھذا قنطار یعنی یہ قنطار کے مساوی اور برابر ہے۔ اور عرب کہتے ہیں: قنطر الرجل۔ جب اس کا مال اس حد کو پہنچ جائے کہ قنطار کے ساتھ وہ اس کا وزن کرے۔ اور زجاج نے کہا ہے: القنطار ماخوذ ہے عقد الشیٔ و احکامه (6) سے (یعنی کسی شے کو باندھنا اور اسے

1۔ کنز العمال، جلد 16، صفحہ 374، حدیث نمبر 44962

2۔ صحیح مسلم، کتاب الرضاع، جلد 1، صفحہ 474۔ ایضاً، صحیح بخاری، الاکفاء فی الدین، حدیث 4700، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 135۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث 1848، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 211 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408، دار الکتب العلمیہ 6۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 409

مضبوط کرنا، عرب کہتے ہیں: قنطرت الشئ۔ جب تو اسے خوب پختہ اور مضبوط کر دے اور اسی سے القنطرہ ہے کہ اس کے پختہ ہونے کی وجہ سے اس کا نام قنطرہ رکھا گیا ہے جیسا کہ طرفہ نے کہا ہے:

كَقَنْطَرَةِ الرُّومِيِّ اقسم ربُّها لَتُكْتَنَفَنْ حتّٰى تُشَادُ بِقَرْمَدِ

اور القنطرہ سے مراد وہ شے ہے جس کا عقد کیا جائے تو گویا قنطار مال کا عقد کرتا ہے (1) اور علماء نے اس کی حد بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کتنی ہے، اس کے بارے متعدد اقوال ہیں۔ سو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''ایک قنطار ایک ہزار دو سو اوقیہ کا ہے۔'' اور اسی کے مطابق حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور علماء کی ایک جماعت نے قول کیا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے: لیکن شہروں میں اوقیہ کی مقدار مختلف ہونے کے سبب قنطار بھی مختلف ہوتا ہے (2)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے، اسے البستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک قنطار بارہ ہزار اوقیہ کا ہے اور ایک اوقیہ اس سے بہتر ہے جو کچھ زمین و آسمان کے مابین ہے (3)''۔ اور یہی قول حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی بیان کیا ہے اور مسند ابی محمد الدارمی میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ''جس نے ایک رات میں دس آیات پڑھیں اسے ذاکرین میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے سو آیت پڑھیں اسے قانتین (بندگی پر قائم و دائم رہنے والے) میں لکھ دیا جائے گا اور جس نے پانچ سو سے ہزار آیات تک پڑھیں تو وہ صبح اس حال میں کرے گا کہ اس کے لئے ایک قنطار اجر ہوگا۔'' عرض کی گئی: قنطار کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: مِلْءُ مَسْكِ ثَوْرٍ ذَهَبًا (مشکیزہ سونے سے بھرا ہوا ہو۔)

یہ روایت موقوف ہے اور ابونضرۃ العبدی نے یہی کہا ہے اور ابن سیدہ نے بیان کیا ہے: یہ سریانی زبان میں اسی طرح ہے اور نقاش نے ابن کلبی سے بیان کیا ہے کہ یہ لغت روم کے مطابق بھی اسی طرح ہے (4) اور حضرت ابن عباس، حضرت ضحاک اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: قنطار کی مقدار، بارہ سو مثقال چاندی ہے، اسے حسن نے مرفوع ذکر کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: چاندی کے بارہ ہزار درہم اور سونے میں سے ایک ہزار دینار مسلم آدمی کی دیت ہے۔ اور حسن اور ضحاک سے یہی مروی ہے اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اسی ہزار ہیں۔ حضرت قتادہ نے کہا: سونے کے ایک سو رطل یا چاندی کے اسی ہزار درہم (5) اور ابو حمزہ الثمالی نے بیان کیا ہے: افریقہ اور اندلس میں ایک قنطار سے مراد آٹھ ہزار مثقال سونا یا چاندی ہے۔ سدی نے کہا ہے: چار ہزار مثقال کا ہے۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: ستر ہزار مثقال کا۔ اور یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے (6) اور مکی نے ایک قول بیان کیا ہے کہ ایک قنطار چالیس اوقیہ سونا یا چاندی ہے، اور یہی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408
3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، صفحہ 268۔ ایضاً مسند امام احمد حدیث 8758
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 408-409، دار الکتب العلمیہ 5۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 408 6۔ ایضاً

ابن سیدہ نے المحکم میں بیان کیا ہے اور کہا ہے: لغت بربر کے مطابق ایک قنطار ہزار مثقال کا ہے اور ربیع بن انس نے کہا ہے: قنطار سے مراد مال کثیر ہے جو بعض بعض پر پڑا ہو (1)۔

اور عربوں کے نزدیک یہی معروف ہے۔ اور اسی کے مطابق یہ ارشاد ہے: وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا (النساء:20) یعنی تم نے ان میں سے ایک کو مال کثیر دیا۔ اور اسی معنی میں حدیث طیبہ ہے: ''بے شک صفوان بن امیہ زمانہ جاہلیت میں ایک قنطار کو پہنچ گیا اور اس کا باپ بھی قنطار کو پہنچ گیا۔'' یعنی اس کا مال قنطار ہو گیا۔ اور حکم سے روایت ہے: قنطار وہ ہے جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔ اور المُقَنْطَرَۃِ کے معنی میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس طبری وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے المُضَعَّفَه (دو چند کیا ہوا) گویا قناطیر سے مراد تین قنطار اور مقنطرہ سے مراد نو ہیں (2)۔ اور فراء سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا: قناطیر قنطار کی جمع ہے اور مقنطرہ جمع الجمع ہے۔ پس وہ نو قنطار ہو جائیں گے۔ سدی نے کہا ہے: مقنطرہ سے مراد ڈھالا ہوا سونا یا چاندی ہے یہاں تک کہ دنانیر یا دراہم ہو جائے۔ مکی نے کہا ہے: یہ المقنطرۃ الکملۃ (یعنی جمع کئے ہوئے خزانے (3) ''مکمل قنطار'')۔ اور اسے ہروی نے بیان کیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: بِدَرٌ مُبَدَّرَۃ (دس ہزار کی تھیلی جوان سے بھری ہوئی ہو۔) اور آلاف مؤلفۃ (ہزاروں جو جمع کئے گئے ہوں۔) اور بعض نے کہا ہے: اور اسی لئے بنا (عمارت) کو اس کی بناوٹ ایک دوسرے کے اوپر گھنی اور مضبوط ہونے کی وجہ سے قنطرہ کہا جاتا ہے۔

ابن کیسان اور فراء نے کہا ہے: نو قنطار سے کم مقنطرہ نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: المقنطرہ حضور مال اور اس کے بھاری بھر کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ (4)

اور صحیح البستی میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے دس آیات کے ساتھ قیام کیا وہ غافلین میں سے نہیں لکھا جائے گا اور جس نے سو آیات کے ساتھ قیام کیا اسے قانتین میں لکھا جائے گا اور جس نے ہزار آیتوں کے ساتھ قیام کیا تو اسے مقنطرین (خزانہ جمع کرنے والے) میں لکھا جائے گا (5)۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ الذَّهَب مونث ہے کہا جاتا ہے: ھی الذھب الحسنۃ (یہ حسین سونا ہے) اس کی جمع ذھاب اور ذھوب آتی ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ ذَهَبَةٌ کی جمع ہو۔ اور جمع اذھاب بنائی جائے۔ اور ذھب فلان مذھبا حسنا (فلاں خوب اچھی طرح گزر گیا) اور الذھب اہل یمن کا ایک پیمانہ بھی ہے۔ اور رجل ذھب جب کوئی آدمی سونے کی کان دیکھے اور حیران رہ جائے۔ اور الفضۃُ یہ تو معروف ہے اور اس کی جمع فِضَضٌ ہے۔ پس الذھبُ، الذّھاب سے ماخوذ ہے۔ اور الفضّۃ یہ انفض الشئ (شے کا متفرق ہونا) سے ماخوذ ہے۔ اور اسی سے فَضَضْتُ الْقَوْمَ فَانْفَضُّوْا ہے۔ یعنی میں نے قوم کو تقسیم کیا تو وہ تقسیم ہو گئی اور یہ مادہ اشتقاق ان دونوں کے زوال اور ان کے عدم ثبوت کا احساس دلاتا ہے۔ جیسا وجود میں ~ کہا گیا ہے۔ اور اس معنی میں جو سب سے اچھا کہا گیا ہے وہ بعض کا یہ قول ہے:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ ایضاً 5۔ سنن ابی داؤد، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 198

النَّار آخرُ دینار نطقتَ به والهمّ آخرُ هذا الدِّرْهم الجاری

جس دینار کے بارے تو نے گفتگو کی ہے اس کا آخر آگ ہے اور اس جاری درہم کا آخر غم ہے۔

والمرء بینهما ان کان ذا وَرَعٍ مُعَذَّبُ القلبِ بَیْنَ الْهَمِّ والنَّارِ

اگر آدمی کمزور دل ہو تو وہ ان دونوں کے درمیان اس حال میں ہوتا ہے کہ اس کا دل غم اور آگ کے درمیان عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَالْخَيْلِ الخیل مؤنث ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ابو عبیدہ سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا: خیل کا واحد خائل ہے، جیسا طیر کا واحد طائر اور ضَیْن کا واحد ضائن ہے اور گھوڑے کو یہ نام اسی لئے دیا گیا ہے کیونکہ وہ اپنی چال میں اکڑ اور تکبر کا اظہار کرتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے کہ یہ اسم جمع ہے لفظوں میں اس کا کوئی واحد نہیں، (1) (بلکہ) اس کا واحد فرس ہے، جیسا کہ یہ الفاظ القوم، الرهط، النساء اور الابل وغیرہ۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے گھوڑے کو ہوا سے پیدا کیا ہے اور اسی لئے اسے بغیر پروں کے اڑنے والا بنا دیا'' (مراد اس کی تیز رفتاری ہے۔) اور وہب بن منبہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جنوب کی ہوا سے تخلیق فرمایا ہے۔ حضرت وہب نے کہا ہے: کوئی تسبیح، تکبیر اور تہلیل نہیں ہے جسے پڑھنے والا پڑھتا ہے مگر وہ (گھوڑا) اسے سنتا بھی ہے اور اسے اسی کی مثل کے ساتھ جواب بھی دیتا ہے۔ گھوڑے کا ذکر اور اس کے وصف کا بیان سورۃ الانفال میں آئے گا جو اس میں کافی ہو گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پر تمام جانور پیش فرمائے اور آپ کو کہا گیا: ان میں سے ایک پسند کر لو۔ تو انہوں نے گھوڑا چنا۔ تو آپ کو فرمایا گیا: تم نے اپنی عزت کو اختیار کیا ہے۔ پس اسی وجہ سے اس کا نام الخیر پڑ گیا۔ اور اس کا نام خیل رکھا گیا کیونکہ یہ (گھوڑا) العزّ سے موسوم ہے اور جو اس پر سوار ہو جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے عزت پا لیتا ہے اور وہ اس کے سبب اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر اظہار فخر کرتا ہے۔ اور اس کا نام فرس رکھا گیا ہے کیونکہ یہ شیر کے جھپٹنے کی طرح اچھلتے کودتے فضا کی مسافتوں کو طے کر لیتا ہے اور وہ زور سے روندتے ہوئے انہیں اس طرح کاٹتا ہے جیسا کہ اپنے ہاتھ سے کوئی شے دبوچ لی جائے۔ اور اس کا نام عربی رکھا گیا ہے کیونکہ اسے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کے لئے کعبہ معظمہ کی بنیادیں اٹھانے کی جزا کے طور پر لایا گیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عربی ہیں۔ پس چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کو عطا ہوا اس لئے اس کا نام عربی رکھا گیا۔

اور حدیث طیبہ میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے: ''شیطان اس گھر میں داخل نہیں ہوگا جس میں عتیق گھوڑا ہو (2)'' گھوڑے کو عتیق اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ هجانه سے جدا اور مبرا ہوتا ہے (هجانه سے مراد خراب نسل کا گھوڑا جس میں گھوڑی ترکی ہو اور گھوڑا عربی ہو تو ان سے پیدا ہونے والے گھوڑے کو هجین کہا جاتا ہے۔)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ 2۔ المطالب العالیہ لابن حجر، حدیث نمبر 3630

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بہترین گھوڑا وہ سیاہ رنگ کا گھوڑا ہے جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو اور اس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ بھی سفید ہو۔ (پھر وہ جس کی پیشانی اور چاروں پاؤں سفید ہوں) طلق الیمین ہو (یعنی اس کا دایاں پاؤں سفید نہ ہو) اور اگر سیاہ (ادھم) گھوڑا نہ ہو تو پھر کُمیت (جس کا رنگ سیاہی مائل ہو) گھوڑا جو اسی وضع پر ہو (1)۔“

اسے ترمذی نے حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے اور مسند دارمی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں گھوڑا خریدنے کا ارادہ رکھتا ہوں [میں کون سا گھوڑا خریدوں؟] تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تو سیاہ رنگ کا گھوڑا خرید جس کی ناک اور اوپر والا ہونٹ سفید ہوں اور محجل طلق الیمین ہو۔ (یعنی اس کی پیشانی اور تین پاؤں سفید ہوں) یا پھر اسی صورت پر کمیت گھوڑا خرید لے تو نفع پائے گا اور تو سلامت رہے گا (2)۔“ اور نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک عورتوں کے بعد گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ شے کوئی نہ تھی (3)۔ اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں، ایک آدمی کے لئے باعث اجر ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے باعث ستر (پردہ) ہوتا ہے اور ایک آدمی کے لئے بوجھ ہوتا ہے (4)“۔ یہ حدیث طویل اور مشہور ہونے کے سبب ذکر سے مستغنی ہے۔ گھوڑوں کے احکام کا ذکر سورۃ الانفال اور النحل میں آئے گا جو کافی ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: **الْمُسَوَّمَةِ** مراد چراگاہوں میں چرنے والے، حضرت سعید ابن جبیر رضی اللہ عنہ نے یہ کہا ہے۔ کہا جاتا ہے: سامت الدابۃ والشاۃ جب گھوڑا اور بکری چرنے کے لئے جائے تسوم سوما فھی سائمۃ (5)۔ اور أسمتھا انا جب تو انہیں چرنے کے لئے چھوڑے فھی مسامۃ اور سوّمتھا تسویما فھی مُسوّمۃ۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب سے پہلے جانور چرانے سے اور دودھ والے جانور ذبح کرنے سے منع فرمایا ہے (6)۔ (اس حدیث میں السوم کا لفظ چرنے کے معنی میں ہے) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ** ۝ (النحل) (جس میں تم (مویشی) چراتے ہو) اخطل نے کہا ہے:

مثل ابن بزعۃ أو كآخر مثلہ　　أولى لك ابن مسيمۃ الاجمال

مراد اونٹ کو چرانے والے کا بیٹا ہے اور السوام سے مراد ہر چرنے والا جانور ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں جہاد کے لئے تیار کیا جائے۔ ابن زید نے یہی کہا ہے (7)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً ترمذی، باب کتاب الجہاد، حدیث 1619، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن دارمی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 131، حدیث نمبر 2433　　3۔ سنن نسائی، کتاب الخیل والسبق والرمی، جلد 2، صفحہ 122

4۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السبق والرمی، جلد 10، صفحہ 15

صحیح بخاری، باب شرب الناس والدواب من الانہار، حدیث 2198، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ　　6۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، صفحہ 160

7۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العلمیہ

حضرت مجاہد نے کہا ہے: المُسَوَّمَه وہ ہوتا ہے جو بہت موٹا تازہ اور خوبصورت ہو۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے: سومها الحسن (1) (اس نے اسے خوبصورت نشانات لگائے یا اس نے اسے اچھی طرح چرنے کے لئے چھوڑا۔) اور نحاس نے اسے اختیار کیا ہے، انہی کے قول سے ہے: رجل وسیم خوبصورت چہرے والا آدمی۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: المسومه ایسے گھوڑے جن کے چہروں پر ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن سے ان کی پہچان ہو سکے (2)۔ یہ السیماء سے ہے اور اس کا معنی علامت اور نشانی ہے۔ اور یہی کسائی اور عبیدہ کا مذہب ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: جو کچھ ذکر کیا گیا ہے لفظ ان تمام کا احتمال رکھتا ہے، پس وہ گھوڑا جو چرنے والا ہو، اچھی طرح تیار کیا ہوا ہو اور اسے ایسے نشانات لگائے گئے ہوں جن کے سبب دوسروں سے اس کی پہچان ہو سکے (وہی) مراد ہوگا۔

ابو زید نے کہا ہے: اس کی اصل یہ ہے کہ تو اس پر ایسی اون اور علامت بنادے جو اس کے سارے بدن میں نمایاں ہو تاکہ چراگاہ میں وہ اسے ماسویٰ سے ممتاز اور الگ کر دے۔

ابن فارس اللغوی نے اپنی مجمل میں بیان کیا ہے: المسومة سے مراد وہ گھوڑا ہے جو چھوڑا جائے اور اس پر اس کا سوار بھی ہو۔ اور مورج نے کہا ہے: المسومه کا معنی ہے داغ دیا ہوا۔ مبرد نے کہا ہے: وہ جو شہروں میں معروف ہو۔ ابن کیسان نے کہا ہے: جس میں سیاہ و سفید داغ ہوں۔ یہ تمام معانی سیما کے متقارب ہیں۔ نابغہ نے کہا ہے:

و ضُمْرٍ كالقِداحِ مُسَوَّمَاتٍ   عليها مَعْشَرٌ اشباهُ جِنٍّ (3)

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَالْاَنْعَامِ ابن کیسان نے کہا ہے جب تو کہے نَعَمٌ تو اس کا اطلاق صرف اونٹ پر ہوتا ہے اور جب کہے انعام تو اس میں اونٹ اور تمام چرنے والے جانور آ جاتے ہیں۔

فراء نے کہا ہے: یہ لفظ مذکر ہے اس کی مونث نہیں آتی، وہ کہتے ہیں: هذا نَعَمٌ وَارِدٌ (یہ اونٹ آ رہا ہے) اس کی جمع انعام آتی ہے۔ ہروی نے کہا ہے: نَعَمٌ مذکر و مونث دونوں کے لئے آتا ہے۔ اور الأنعام سے مراد اونٹ، گائے اور بکری وغیرہ جانور ہیں اور جب کہا جائے: النَّعَمُ تو پھر صرف اونٹ مراد ہوتا ہے اور حسان نے کہا ہے:

و كانت لايزال بها انيس   خِلَالَ مُروجِها نَعَم وَ شَاءُ

اس میں نَعَمٌ سے مراد اونٹ ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں عروہ البارقی سے مرفوع روایت ہے انہوں نے بیان کیا: ''اونٹ اپنے مالکوں کے لئے (باعث) عزت ہے اور بکریاں باعث برکت ہیں اور خیر و بھلائی یوم قیامت تک گھوڑے کی پیشانی میں رکھ دی گئی ہے (4)''۔ اور اس میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بکری جنت کے جانوروں میں سے ہے (5)'' اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 409، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً صفحہ 410

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، صفحہ 168۔ ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر 2295، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارت، صفحہ 168۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر 2296، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اغنیاء کو بکریاں رکھنے کا اور فقراء کو مرغیاں رکھنے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: اغنیاء کے مرغیاں رکھنے کے وقت اللہ تعالیٰ شہروں کو ہلاک و برباد کرنے کی اجازت دے دیتا ہے (1)۔ اور اسی میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: تو بکریاں رکھ لے کیونکہ ان میں برکت ہے (2)''۔ انہوں نے اسے ابوبکر بن ابی شیبہ عن وکیع عن ھشام بن عروۃ عن ابیہ عن ام ھانی کی سند سے بیان کیا ہے اور یہ اسناد صحیح ہے۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: وَالْحَرْثِ یہاں حرث ہر اس شے کا نام ہے جسے کاشت کیا جاتا ہے اور یہ مصدر ہے جس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے، تو کہتا ہے: حَرَثَ الرجل حَرْثًا جب وہ کھیتی باڑی کے لئے زمین کو پھاڑے (اس میں ہل چلائے) اور حِراثَہ کا اسم دانے کاشت کرنے، باغات لگانے اور دیگر کاشتکاری کی انواع پر بولا جاتا ہے اور حدیث میں ہے: ''تو اپنی دنیا کے لئے کھیتی باڑی کر گویا کہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔'' کہا جاتا ہے حرثت اور احترثت (میں نے کھیتی باڑی کی) اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: ''تم اس قرآن میں خوب غور و فکر اور تحقیق کرو''۔ ابن عرابی نے کہا ہے: الحرث کا معنی تفتیش کرنا، تحقیق کرنا ہے۔

اور حدیث میں ہے: أصدق الاسماء الحارث (3) ناموں میں سے أصدق نام حارث ہے کیونکہ حارث وہ ہوتا ہے جو کمانے والا ہو اور احتراث المال کا معنی مال کی کمائی ہے اور المحراث: آگ کو بھڑکانے اور ہلانے والی سیخ ہے اور الحَرَاث قوس میں تانت کی جگہ ہے۔ اس کی جمع أحرثہ ہے۔ اور أحرث الرجل ناقتہ آدمی نے ناقہ کو خوب تھکا دیا، کمزور کر دیا۔

اور حضرت معاویہ کی حدیث میں ہے: ما فعلت نواضحکم؟ تمہارے پانی پلانے والے اونٹوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: حرثناھا یوم بدر۔ ہم نے انہیں بدر کے دن خوب کمزور کیا اور تھکایا (اشارہ اس طرف ہے کہ ان کے اشیاخ کو قتل کیا ہے۔ النھایہ) ابو عبید نے کہا ہے: وہ اس سے ھزلناھا (ہم نے انہیں کمزور کیا ہے۔) کہا جاتا ہے: حرثت الدابۃ اور احرثتھا دونوں لغتیں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان فرمایا کہ انہوں نے ہل کا لوہا (جس کے ساتھ زمین پھاڑی جاتی ہے) اور کوئی شے دیکھی تو کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''یہ کسی قوم کے گھر میں داخل نہیں ہوتی مگر ذلت اس کے ساتھ داخل ہوتی ہے (4)''۔ کہا گیا ہے کہ اس ارشاد میں ذُل سے مراد زمین کے ان حقوق کی مشقت ہے جن کی ادائیگی ہل چلانے والوں پر لازم ہوتی ہے اور ائمہ اور سلاطین ان کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اور مہلب نے کہا ہے: اس حدیث طیبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا حقیقی معنی تو واللہ اعلم بہرحال یہ بلند احوال اور باعزت

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب التجارات، حدیث نمبر 2297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ 2۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2294، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ البدایہ والنہایہ، جلد 12، صفحہ 192

4۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2153، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اشراف ترین کاموں سے رزق طلب کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے اور یہ اس لئے ہوا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں ہل چلانے میں مشغول ہونے، گھوڑوں کی سواری اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے کو ضائع کرنے کا خدشہ لاحق ہوا، کیونکہ اگر یہ ہل چلانے میں مشغول ہو گئے تو پھر ان پر وہ امم اور گروہ غالب آجائیں گے جو گھوڑوں کی سواری ان کی کمائی سے اسباب زندگی تلاش کرنے کے لئے کرتے ہیں۔'' پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جہاد سے اسباب زندگی تلاش کرنے پر ابھارا نہ کہ مسلسل زمین کی آبادی اور مشقت کو لازم پکڑنے سے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جوان بنو اور خوب مضبوط اور طاقتور بنو اور اونٹوں کی سواری چھوڑ دو اور گھوڑوں پر کود کر بیٹھو تم پر اونٹ چرانے والے غالب نہیں آئیں گے۔ پس آپ نے انہیں مسلسل گھوڑے رکھنے اور ان پر اچھل کر بیٹھنے کے لئے اپنے ابدان کی ورزش کرنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی مسلمان نے کوئی درخت لگایا یا کوئی فصل کاشت کی اور اس سے کوئی پرندہ یا انسان یا کوئی جانور کھائے تو اس کے لئے وہ صدقہ ہوگا (1)''۔

علماء نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے مال کی چار قسمیں ذکر کی ہیں اور مال کی ہر نوع کے سبب لوگوں کی ایک قسم خوشحال اور تموں ہوتی ہے۔ پس سونے اور چاندی سے تاجر لوگ خوشحال ہوتے ہیں اور نشان زدہ گھوڑوں کے سبب بادشاہ اور امراء خوشحال ہوتے ہیں اور رہے چوپائے تو ان سے شہروں میں بسنے والے خوشحال ہوتے ہیں اور جہاں تک کھیتی باڑی کا تعلق ہے تو اس سے دیہات میں رہنے والے خوشحالی حاصل کرتے ہیں اور ہر قسم کی آزمائش اسی نوع کے لئے ہوتی ہے جو اس سے خوشحال ہوتی ہے اور جہاں تک عورتوں اور اولاد کا تعلق ہے تو یہ تمام کے لئے آزمائش اور فتنہ ہیں۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا یعنی وہ سامان جس سے دنیا میں لطف اندوز ہوا جاتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ باقی نہیں رہتا، اس میں دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور آخرت کے بارے ترغیب ہے۔ ابن ماجہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ دنیا سامان ہے اور سامان دنیا میں سے کوئی شے نیک اور صالحہ عورت سے افضل نہیں (2)''۔

اور ایک حدیث میں ہے: ''تو دنیا میں زہد اختیار کر اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت فرمائے گا (3)'' یعنی دنیوی ساز و سامان میں جاہ وحشمت اور ضرورت سے زائد مال کو چھوڑ دے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''سوائے ان خصال کے ابن آدم (انسان) کا کوئی حق نہیں ہے۔ گھر جو اسے سکونت دیتا ہے، کپڑا جو اس کی شرمگاہ کو چھپاتا ہے اور خشک روٹی اور پانی (4)''۔ ترمذی نے اسے مقدام بن معد یکرب کی حدیث سے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعۃ، جلد 1، صفحہ 312۔ ایضاً، بخاری، حدیث نمبر 2152، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، صفحہ 134۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، صفحہ 311۔ ایضاً، ابن ماجہ، صفحہ 4091، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 57۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2263، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نقل کیا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ سے پوچھا گیا: بندے پر دنیا اور تمام شہوات کو چھوڑنا کیونکر آسان ہو جاتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: آدمی کے ان کاموں میں مشغول ہو جانے کے ساتھ جن کا اسے حکم دیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ یہ مبتدا اور خبر ہے۔ اور الماب کا معنی لوٹنے کی جگہ ہے، آب یؤوب ایابا کہا جاتا ہے جب کوئی لوٹ کر آئے۔ امرؤ القیس نے کہا:

و قد طوفت فی الآفاق حتی رضِیتُ من الغنیمة بالإیابِ (1)

تحقیق میں آفاق میں گھوما پھرا یہاں تک کہ میں غنیمت کی بجائے لوٹ آنے پر راضی ہو گیا۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا:

و کل ذی غیبة یؤوبُ و غائب الموت لایؤوب (2)

ہر غیب ہونے والا لوٹ آتا ہے (لیکن) موت کے سبب غائب ہونے والا لوٹ کر نہیں آتا۔ مآب کی اصل مَاْوَبٌ ہے واؤ کی حرکت نقل کر کے ماقبل ہمزہ کو دی اور واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔ جیسا کہ مَقَالٌ میں کہا گیا ہے اور آیت کا معنی یہ ہے کہ اس میں دنیا کی قلت اور اس کی حقارت کو بیان کرنا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف حسین انداز میں لوٹنے کی ترغیب ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

''(اے میرے رسول!) آپ فرمائیے کیا بتاؤں میں تمہیں اس سے بہتر چیز، ان کے لئے جو متقی بنے ان کے رب کے ہاں باغات ہیں، رواں ہیں ان کے نیچے نہریں، ہمیشہ رہیں گے (متقی) ان میں اور (ان کے لئے) پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور حاصل ہوگی انہیں خوشنودی اللہ کی اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھنے والا ہے اپنے بندوں کو۔''

سوال کی انتہاء مِّنْ ذٰلِكُمْ پر ہے۔ اور لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا خبر مقدم ہے اور جَنّٰتٌ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سوال کی انتہا عِنْدَ رَبِّهِمْ پر ہے اور جَنّٰتٌ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، تقدیر کلام ہے ذالك جنات (3) اور اس تاویل کی بنا پر جَنّٰتٌ کو خَيْرٍ سے بدل کر مجرور پڑھنا بھی جائز ہے۔ لیکن پہلی صورت میں یہ جائز نہیں۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس قول کی مثل ہے: ''عورت سے چار چیزوں کے سبب نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب کی وجہ سے، اس کے حسن و جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے۔ پس تو دین والی کو تلاش کر تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں'' تنکح المراة لاربع لمالها و حسبها و جمالها و دینها فاظفر بذات الدین تربت یداك۔ (4) اسے مسلم وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ اس میں فاظفر بذات الدین اس آیت

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 410، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ ایضاً
4۔ صحیح بخاری، الترغیب فی النکاح، جلد 2، صفحہ 762

کی مثال ہے اور جو اس سے پہلے ہے وہ اس سے پہلی آیت کی مثال ہے۔
پس اللہ تعالیٰ نے دنیا سے تسلی دینے اور اسے چھوڑنے والے نفوس کو تقویت دینے کے لئے یہ ذکر کیا ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں اس آیت کے الفاظ کے معانی گزر چکے ہیں۔ الرضوان رضا سے مصدر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں فرمائے گا ''کیا تم کسی شے کا ارادہ رکھتے ہو کہ میں تمہارے لئے اس کا اضافہ کردوں؟'' تو وہ عرض کریں گے: اے ہمارے رب! اور کون سی شے اس سے افضل ہے؟ تو رب کریم فرمائے گا: ''میری رضا سو اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہ ہوں گا (1)''۔
اسے مسلم نے بیان کیا ہے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۝ میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ۝

''یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب! یقیناً ہم ایمان لائے تو معاف فرما دے ہمارے لئے ہمارے گناہ اور بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ (یہ مصیبتوں میں) صبر کرنے والے ہیں اور (ہر حالت میں) سچ بولنے والے ہیں اور (عبادت میں) عاجزی کرنے والے ہیں اور (اللہ کی راہ میں) خرچ کرنے والے ہیں اور (اپنے گناہوں کی) معافی مانگنے والے ہیں سحری کے وقت۔''

اس میں اَلَّذِيْنَ۔ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا سے بدل ہے۔ اور اگر چاہو تو مرفوع پڑھ لو اور تقدیر کلام ہوگی ھم الذین یا پھر مدح کی بناء پر منصوب پڑھ لو۔ رَبَّنَآ اصل میں یا ربنا ہے۔ اِنَّنَآ اٰمَنَّا کا معنی ہے یقیناً ہم نے تصدیق کی۔ فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا یہ مغفرت کی دعا اور التجاء ہے۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اَلصّٰبِرِيْنَ یعنی یہ گناہوں اور شہوات سے صبر کرنے والے ہیں اور بعض نے کہا کہ وہ طاعات پر صبر کرنے والے ہیں۔ وَالصّٰدِقِيْنَ اور افعال واقوال میں سچ بولنے والے ہیں۔ وَالْقٰنِتِيْنَ اور وہ اطاعت و پیروی کرنے والے ہیں۔ وَالْمُنْفِقِيْنَ اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں۔ اور سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر یہ معانی گزر چکے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان متقی لوگوں کے احوال تفصیل سے بیان کئے ہیں جن کے لئے جنات کا وعدہ کیا گیا ہے۔
اور قول باری تعالیٰ: وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ کے معنی میں اختلاف ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ مغفرت کی دعا اور التجا کرنے والے لوگ ہیں اور قتادہ نے کہا ہے: ان سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں (2)۔
میں (مفسر) کہتا ہوں: اس میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں ہے، کیونکہ وہی نماز پڑھتے ہیں اور وہی استغفار کرتے ہیں۔ ور

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103۔ ایضاً صحیح بخاری، باب صفة الجنة والنار، حدیث نمبر 6067، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ

سحری کا وقت خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اس کے بارے ظن غالب یہ ہے کہ یہ دعا کی قبولیت کا وقت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف سے خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو کہا: سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيٓ (میں تمہارے لئے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا) ''بلاشبہ آپ نے اس دعا کو سحری کے وقت تک موخر کر دیا (1)'' اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام سے دریافت فرمایا: ''رات کے کون سے حصہ میں (دعا) زیادہ سنی جاتی ہے؟'' تو انہوں نے جواب دیا: ''میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سحری کے وقت عرش وجد کناں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے سَحَر اور سَحْر یعنی حا کے فتحہ اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: سحر سے مراد وہ وقت ہے جب رات واپس پلٹ رہی ہوتی ہے یہاں تک کہ فجر ثانی طلوع ہو جائے اور ابن زید نے کہا ہے: سحر سے مراد رات کا آخری چھٹا حصہ ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس بارے میں صحیح ترین روایت وہ ہے جسے ائمہ حدیث نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ (اپنی شان قدرت کے مطابق) ہر رات جب رات کا پہلا تہائی حصہ گزر جاتا ہے آسمان دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں کون ہے وہ جو مجھ سے دعا مانگ رہا ہو کہ میں اس کی دعا قبول کر لوں، کون ہے وہ جو مجھ سے سوال کر رہا ہو کہ میں اسے عطا کروں، کون ہے وہ جو مجھ سے مغفرت طلب کر رہا ہو کہ میں اس کی مغفرت فرما دوں پس وہ اسی طرح ندا دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر طلوع ہو جاتی ہے۔'' اور ایک روایت میں یہ لفظ ہیں حتی ینفجر الصبح یہاں تک کہ صبح پھوٹ پڑتی ہے (2)۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں ... اس کی تاویل میں اختلاف ہے۔ اور اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سے اولیٰ اور ارجح وہ ہے جو نسائی کی کتاب میں بطور مفسر موجود ہے۔

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہما دونوں نے بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ مہلت دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رات کا پہلا نصف حصہ گزر جاتا ہے پھر وہ منادی کو حکم دیتا ہے پس وہ کہتا ہے: کیا کوئی دعا مانگنے والا ہے اس کی دعا قبول کی جائے گی، کیا کوئی مغفرت کا طالب ہے اس کی مغفرت کر دی جائے گی، کیا کوئی سائل اور حاجتمند ہے اسے عطا کیا جائے گا'' اسے ابو محمد عبد الحق نے صحیح قرار دیا ہے (3)، اور یہ ارشاد اشکال کو رفع کر دیتا ہے اور ہر احتمال کو واضح کر دیتا ہے۔ اور بے شک پہلے ارشاد میں مضاف محذوف ہے یعنی عبارت اس طرح ہے ینزل مَلَكُ ربنا فیقول۔ اور یُنْزِلُ یاء کو ضمہ کے ساتھ بھی روایت کیا گیا ہے اور یہ بھی اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ و باللہ توفیقنا۔ اور ہم نے اس کا ذکر کتاب الأسنی فی شرح أسماء اللہ الحسنی و صفاتہ العلی میں کیا ہے۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 196۔ ایضاً، ترمذی، حدیث نمبر 3493، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، باب صلاۃ اللیل، صلاۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 258۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الدعاء فی الصلوٰۃ، حدیث نمبر 1077، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الجواہر الحسان، جلد 1، صفحہ 239، دار الکتب العلمیہ بیروت

مسئلہ: استغفار کرنا مستحب ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مغفرت طلب کرنے والوں کی تعریف بیان فرمائی ہے۔ اور کئی دوسری آیات میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سحری کے وقت ستر مرتبہ استغفار کریں (1)۔ اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے: جب رات کا پہلا حصہ ہوتا ہے تو ایک ندا دینے والا ندا دیتا ہے چاہیے کہ اطاعت و فرمانبرداری کرنے والے اٹھ کھڑے ہوں چنانچہ وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور سحری تک اسی طرح نماز پڑھتے رہتے ہیں اور جب سحری کا وقت ہوتا ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: مغفرت طلب کرنے والے کہاں ہیں کہ وہ مغفرت طلب کریں، پس دوسرا گروہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور وہ نماز پڑھنے لگ جاتے ہیں اور وہ ان کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور جب فجر طلوع ہو جاتی ہے تو ندا دینے والا ندا دیتا ہے: خبردار سنو! چاہیے کہ غافل لوگ اٹھ کھڑے ہوں پس وہ اپنے بستروں سے اسی طرح اٹھتے ہیں جیسا کہ مردوں کو ان کی قبروں سے اٹھایا جائے گا۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اہل زمین کو عذاب دینے کا ارادہ کرتا ہوں پھر جب میں اپنے گھروں کو آباد کرنے والوں کی طرف، میری رضا کی خاطر ایک دوسرے سے محبت کرنے والوں کی طرف اور سحری کے وقت تہجد پڑھنے والوں اور استغفار کرنے والوں کی طرف دیکھتا ہوں تو ان کے سبب ان سے عذاب پھیر دیتا ہوں۔'' ان اللہ یقول انی لاھم بعذاب اھل الارض فاذا نظرت الی عمار بیوتی والی المتحابین فی والی المتھجدین والمستغفرین بالاسحار صرفت عنھم العذاب بھم۔ (2)

حضرت مکحول نے کہا ہے: جب امت میں پندرہ افراد موجود ہوں جو ہر روز پچیس مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے ہوں تو اللہ تعالیٰ عام عذاب کے ساتھ اس امت کا مواخذہ نہیں فرماتا۔ اسے ابو نعیم نے کتاب الحلیہ میں ذکر کیا ہے۔

اور حضرت نافع نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما رات جاگتے رہتے تھے پھر فرماتے: اے نافع! کیا سحری کا وقت ہو چکا ہے؟ میں عرض کرتا: نہیں۔ پھر آپ دوبارہ نماز پڑھنے لگ جاتے، پھر آپ پوچھتے، پس جب میں کہتا: ہاں (سحری کا وقت ہو چکا ہے) تو آپ بیٹھ جاتے اور استغفار کرنے لگتے (3) اور ابراہیم بن حاطب نے اپنے باپ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے سحری کے وقت مسجد کے ایک کونے میں آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکم دیا تو میں نے تیری اطاعت و پیروی کی، یہ سحری کا وقت ہے تو میری مغفرت فرمادے۔ یا رب، امرتنی فاطعتك، و ھذا سحر فاغفرلی پس میں نے دیکھا تو وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تھے (4)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ مراد حضور قلب کے ساتھ زبان سے استغفار کرنا ہے، نہ کہ وہ جو ابن زید نے کہا کہ مستغفرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں (5)۔ واللہ اعلم۔

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کہا تھا: اے میرے بیٹے! مرغ تجھ سے زیادہ دانا اور عقلمند نہ ہونے پائے، کہ وہ تو سحری کے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ
2۔ شعب الایمان، جلد 6، صفحہ 501، حدیث نمبر 9051
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 411، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

وقت ندا دیتا ہے اور تو سویا ہی رہے''۔

استغفار کے الفاظ میں مختار اور پسندیدہ وہ ہیں جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شداد بن اوس سے روایت کیے ہیں اور آپ کی اجامع میں اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سید الاستغفار یہ ہے کہ تو کہے: اللّٰھم انت ربی لا الہ الا انت خلقتنی و انا عبدك وانا علی عھدك و وعدك ما استطعتُ اعوذ بك من شر ما صنعتُ أبوءُ لك بنعمتك علیّ و أبوء بذنبی فاغفرلی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت . . . (اے اللہ! تو میرا رب ہے تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو نے مجھے پیدا فرمایا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ پر ہوں جتنی مجھ میں قدرت اور استطاعت ہے میں تیری پناہ مانگتا ہوں ہر اس عمل کے شر سے جو میں نے کیا تیری جو نعمتیں مجھ پر ہیں میں ان کے سبب تیری طرف ہی رجوع کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، تو میری مغفرت فرمادے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں ہے۔)

فرمایا جس کسی نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ دن کے وقت یہ پڑھا پھر اسی دن شام ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہوگا اور جس کسی نے رات کے وقت یہ پڑھا اور پھر اسی رات صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ فوت ہو گیا تو وہ اہل جنت میں سے ہوگا (1)'' اور ابو محمد عبد الغنی نے سعید بن ابی لبیعہ کی حدیث عن ابی صخر عن ابی معاویہ عن سعید بن جبیر عن ابی الصہباء البکری عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سند سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا پھر ارشاد فرمایا: ''کیا میں تجھے ایسے کلمات نہ سکھادوں (جب) تو انہیں کہے تو اگر تیرے گناہ چیونٹیوں کی گزرگاہ کی طرح بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ تیرے لئے انہیں معاف فرمادے اس بنا پر کہ اس نے تیری مغفرت فرمادی ہے: اللّٰھم لا الہ الا انت سبحانك عملت سوءا و ظلمت نفسی فاغفرلی فانہ لا یغفر الذنوب الا انت (2) (اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک ہے میں نے برائی کے اعمال کیے ہیں اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے سو تو میری مغفرت فرمادے کیونکہ تیرے سوا کوئی گناہوں کو بخش نہیں سکتا۔)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۱۸

''شہادت دی اللہ تعالیٰ نے (اس بات کی کہ) بے شک نہیں کوئی خدا سوائے اس کے۔ اور (یہی گواہی دی) فرشتوں نے اور اہل علم نے (ان سب نے بھی یہی گواہی دی کہ وہ) قائم فرمانے والا ہے عدل و انصاف کو نہیں کوئی معبود سوائے اس کے (جو) عزت والا حکمت والا ہے''۔

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ کعبہ معظمہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ بت نصب تھے جب

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 933۔ ایضاً، بخاری، صفحہ 5831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، جلد 2، صفحہ 677، حدیث نمبر 5052۔ ایضاً، بخاری، باب الدعاء قبل السلام، حدیث نمبر 790، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ آیت نازل ہوئی تو وہ تمام سجدے میں گر گئے (1)۔

اور کلبی نے کہا ہے: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ کے پاس اہل شام کے علماء میں سے دو عالم حاضر ہوئے، جب ان دونوں نے مدینہ طیبہ کو دیکھا تو ان میں سے ایک نے اپنے دوسرے ساتھی کو کہا: یہ شہر اس نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر کے اوصاف کے ساتھ کتنی زیادہ مشابہت رکھتا ہے جو آخر زمانہ میں تشریف لائے گا! چنانچہ جب وہ دونوں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ کی علامات اور صفات کو دیکھ کر آپ کو پہچان لیا، تو انہوں نے آپ سے پوچھا: کیا آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟ آپ نے فرمایا "ہاں" پھر کہا: کیا آپ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ دونوں نے کہا: ہم آپ سے شہادت کے بارے پوچھتے ہیں پس اگر آپ نے ہمیں اس کے بارے بتا دیا تو ہم آپ کے ساتھ ایمان لے آئیں گے اور ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو فرمایا: "تم مجھ سے پوچھو" تو انہوں نے کہا: کتاب اللہ میں سب سے بڑی شہادت کے بارے آپ ہمیں بتائیے؟ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ چنانچہ وہ دونوں اسلام لے آئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر دی (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُولُوا الْعِلْمِ سے مراد حضرات انبیاء علیہم السلام ہیں۔ اور ابن کیسان نے کہا ہے: مہاجرین اور انصار ہیں۔ مقاتل نے کہا ہے: اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے ہیں اور سدی اور کلبی نے کہا ہے: مراد تمام مومنین ہیں اور یہی قول زیادہ واضح اور ظاہر ہے کیونکہ یہ عام ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں علم کی فضیلت اور علماء کے شرف و فضل پر دلیل ہے، کیونکہ اگر کوئی اور علماء سے اشرف و اعلیٰ ہوتا تو بالیقین اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اور ملائکہ کے نام کے ساتھ اسی طرح ملا کر ذکر کرتا جیسا کہ علماء کا ذکر کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے علم کے شرف و عظمت کے سبب ہی اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا پس اگر کوئی اور شے علم کی نسبت زیادہ شرف والی ہوتی تو یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرماتا کہ اس میں زیادتی اور اضافہ کی التجا کریں جیسا کہ علم میں زیادتی اور اضافہ کی طلب کا حکم ارشاد فرمایا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان العلماء ورثة الانبیاء (3) (بلاشبہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں) اور مزید فرمایا: العلماءُ أمناء الله على خلقه (4) (علماء اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مخلوق پر امین ہیں) اور یہ علماء کے لئے عظیم شرف اور بہت بڑا اعزاز ہے۔ اور دین میں ان کے لئے بہت بڑا مقام اور بلند رتبہ ہے۔ ابو محمد عبدالغنی الحافظ نے برکۃ ابن نشیط کی حدیث نقل کی ہے اور یہ عنکل بن حکارک ہیں اور اس کی تفسیر برکۃ بن نشیط ہے ..... اور یہ حافظ ہیں۔

ہمیں عمر ابن مومل، محمد بن ابی الخصیب، عنکل، محمد بن اسحاق، شریک نے ابو اسحاق سے حدیث بیان کی کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: العلماء ورثة الانبياء يحبهم اهل السماء و يستغفر لهم

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294
2۔ اسباب النزول لنیشا بوری، صفحہ 63
3۔ سنن ابی داؤد، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157
4۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 134، حدیث نمبر 28675

الحیتان فی البحر اذا ماتوا الی یوم القیامۃ (1) (علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں جب وہ فوت ہو جائیں گے تو یوم قیامت تک سمندر میں مچھلیاں ان کے لئے مغفرت طلب کرتی رہیں گی۔) اس باب میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے ابو داؤد نے روایت کیا ہے (2)۔

مسئلہ نمبر 3۔ غالب القطان نے بیان کیا ہے: میں تجارت کی غرض سے کوفہ آیا اور میں حضرت اعمش کے قریب اترا۔ اور میں ان سے اختلاف رکھتا تھا۔ پس جب رات ہوئی تو میں نے بصرہ میں نزول کا ارادہ کیا وہ اٹھے اور انہوں نے رات کے وقت نماز تہجد ادا کی اور یہ آیت تلاوت کی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؕ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اعمش نے کہا میں اس بارے شہادت دیتا ہوں جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے شہادت دی ہے اور میں یہ شہادت اللہ تعالیٰ کے پاس امانت رکھتا ہوں اور یہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس ودیعت ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین (فقط) اسلام ہے۔ انہوں نے بار بار یہ کہا ..... پس میں صبح کے وقت ان کی طرف گیا اور میں نے انہیں الوداع کہا پھر کہا: بلاشبہ میں نے تمہیں یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے اس کے بارے میں تمہیں کیا خبر پہنچی ہے؟ میں ایک سال تک تمہارے پاس رہا ہوں تم نے اس بارے میں مجھے کچھ نہیں بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: قسم بخدا! میں ایک سال تک اس بارے میں تمہیں کچھ نہیں بیان کروں گا۔ وہ فرماتے ہیں: پس میں اٹھا اور میں نے ان کے دروازے پر اس دن کے بارے لکھ دیا، پس جب سال گزر چکا تو میں نے کہا: اے ابو محمد! سال گزر چکا ہے۔ تو انہوں نے کہا: مجھے ابو وائل نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یجاء بصاحبھا یوم القیامۃ فیقول اللہ تعالی عبدی عھد الیّ وأنا احق من وفّی أدخلوا عبدی الجنۃ (3) اس آیت پڑھنے والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا میرے بندے نے میرے ساتھ عہد کیا ہے اور میں کسی بھی وفا کرنے والے سے زیادہ حق رکھتا ہوں پس تم میرے بندے کو جنت میں داخل کر دو۔)

ابو الفرج الجوزی نے کہا ہے: غالب القطان سے مراد غالب بن خطاف القطان ہے جو اعمش سے حدیث شَهِدَ اللّٰهُ روایت کرتا ہے اور یہ حدیث معضل ہے۔ ابن عدی نے کہا ہے: اس کی حدیث میں ضعف بین اور واضح ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا غالب بن خطاف القطان ثقہ ہے، ثقہ ہے۔ ابن معین نے کہا: ثقہ ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: یہ صدوق اور صالح ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: تیرے لئے اس کی عدالت اور ثقاہت کے لئے یہی کافی ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما نے اپنی کتابوں میں اس کی حدیث نقل کی ہے اور تیرے لئے یہ کافی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور

1۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 135، حدیث نمبر 28679

2۔ سنن ابی داود، کتاب العلم، جلد 2، صفحہ 157۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 3157، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 440

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنے سونے کے وقت یہ آیت پڑھی شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓىِٕكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر ہزار فرشتے پیدا فرمادے گا اور وہ اس کے لئے یوم قیامت تک استغفار کرتے رہیں گے۔'' اور کہا جاتا ہے: جس نے اس شہادت کے بارے اپنے صحیح قلب سے اقرار کرلیا تحقیق اس نے عدل قائم کرلیا۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کعبہ معظمہ کے اردگرد تین سو ساٹھ بت تھے قبائل عرب میں سے ہر قبیلے کے لئے ایک یا دو بت تھے۔ پس جب یہ آیت نازل ہوئی تو تمام بت اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ ریز ہوگئے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: شَهِدَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا اور آگاہ فرمایا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: شهد فلان عند القاضی (اس کا معنی ہے) فلاں نے قاضی کے سامنے اس کے بارے بیان کیا جس کا حق ہے یا جس پر حق ہے۔ زجاج نے کہا ہے: شاہد وہ ہوتا ہے جو کسی شے کو جانتا ہے اور اس کی وضاحت کرتا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت پر ایک شے کے ساتھ ہماری راہنمائی فرمائی ہے جسے اس نے تخلیق فرمایا اور بیان فرمایا۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: شَهِدَ اللّٰهُ بمعنی قضی اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے (فیصلہ فرمایا) آگاہ فرمایا۔ اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ کئی اعتبار سے مردود ہے (2)۔

امام کسائی نے قول باری تعالیٰ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اور اِنَّ الدِّیْنَ میں اَن کے ہمزہ کو مفتوح پڑھا ہے۔ مبرد نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے: ان الدین عند اللہ الاسلام بانہ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ پھر با کو حذف کردیا گیا ہے جیسا کہ کہا: امرتک الخیر یہ اصل میں بالخیر ہے۔ کسائی نے کہا ہے تو ان دونوں کو اکٹھی نصب دے، اس معنی میں شهد اللہ انہ کذا، وان الدین عند اللہ۔ ابن کیسان نے کہا ہے: دوسرا ان پہلے سے بدل ہے، کیونکہ اسلام ہی معنی توحید کی تفسیر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی قرأت کی ہے جو کسائی نے بیان کیا ہے شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ یعنی اسے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان الدین اس میں انّ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے (3) اور تقدیر کلام یہ ہے شهد اللہ ان الدین الاسلام پھر ابتدا کی اور فرمایا: اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اور ابو المہلب نے شَهِدَ اللّٰهُ حال ہونے کی بنا پر نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور ان سے شُهَدَآءُ اللّٰهِ بھی مروی ہے (4)۔

اور شعبہ نے عاصم بن زرعن ابی کی سند سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ اس طرح پڑھتے تھے ان الدین عند اللہ الحنیفیة لا الیہودیة ولا النصرانیة ولا المجوسیة (5) ابوبکر انباری نے کہا ہے: کسی صاحب تمیز آدمی پر یہ مخفی نہیں ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کلام تفسیر کی حیثیت سے مروی ہے اور ناقلین حدیث میں سے کسی نے اسے قرآن میں داخل کردیا ہے۔ اور قائماً قول باری تعالیٰ شَهِدَ اللّٰهُ میں اسم جلالت سے یا قول باری تعالیٰ اِلَّا هُوَ سے حال مؤکدہ ہونے

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 294 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 412، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 5، صفحہ 132۔ ایضاً ترمذی، باب مناقب اہل بیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 3726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی بنا پر منصوب ہے (1)۔ اور فراء نے کہا ہے: وہ قطع کی بنا پر منصوب ہے، اس کی اصل القائم ہے پس جب الف لام کو کاٹ دیا گیا تو اسے نصب دے دی گئی جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی قرأت میں القائم بالقسط ہے لغت اور صفت ہونے کی بنا پر۔ اور القسط کا معنی عدل ہے (2)۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ اسے دوبارہ لایا گیا ہے کیونکہ پہلا دعویٰ کے محل میں واقع ہے اور دوسرا شہادت حکم کے محل میں واقع ہے اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پہلا وصف اور توحید ہے اور دوسرا رسم (حکم) اور تعلیم ہے۔ یعنی تم کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۗ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

”بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور نہیں جھگڑا کیا جن کو دی گئی تھی کتاب مگر بعد اس کے کہ آگیا تھا ان کے پاس صحیح علم (اور یہ جھگڑا) باہمی حسد کی وجہ سے تھا اور جو انکار کرتا ہے اللہ کی آیتوں کا تو بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔“

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اس آیت میں دین سے مراد طاعت اور ملت ہے اور اسلام بمعنی ایمان اور طاعات ہے، ابو العالیہ نے یہی کہا ہے اور اسی پر جمہور متکلمین ہیں (3) اور حدیث جبریل (4) کے مطابق ایمان اور اسلام کے مسمی میں دراصل تغایر ہے۔ (یعنی دونوں لفظوں کا اطلاق علیحدہ علیحدہ معنی پر ہوتا ہے۔) اور کبھی معنی مرادفہ کے ساتھ بھی استعمال ہوتے ہیں اور دونوں میں سے ہر ایک کو دوسرے کا نام دے دیا جاتا ہے، جیسا کہ وفد عبد القیس کی حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اللہ وحدہ لاشریک کے ساتھ ایمان لانے کا حکم ارشاد فرمایا اور فرمایا: ”کیا تم جانتے ہو ایمان کیا ہے؟“ انہوں نے عرض کی: اللہ و رسولہ اعلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلوة و ایتاء الزکوٰة و صوم رمضان وان تؤدوا خمسا من المغنم الحدیث (5)۔ (یہ شہادت دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم مال غنیمت سے خمس ادا کرو۔) اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ”ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں اور ان میں سے ادنیٰ تکلیف دہ شے کو راستے سے ہٹانا ہے اور اعلیٰ ترین باب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے۔“ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے (6) اور مسلم نے یہ زیادہ کیا ہے والحیاء شعبة من الایمان (7) (حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ　　2۔ ایضاً　　3۔ ایضاً

4۔ صحیح بخاری، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 12۔ ایضاً، حدیث نمبر 48، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 35۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اداء الخمس من الایمان، حدیث 51، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

6۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً صحیح بخاری، باب امور الایمان، حدیث نمبر 8، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

7۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47

اور یہ تداخل کے معنی میں ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک بولا جاتا ہے اور اس سے مراد اس کا اپنا اصل مسمّی اور دوسرے کا مسمّی لیا جاتا ہے، جیسا کہ اس آیت میں ہے کیونکہ اس میں تصدیق اور اعمال دونوں داخل ہیں اور اسی کے مطابق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد ہے۔ الایمان معرفة بالقلب و قول باللسان و عمل بالارکان (ایمان سے مراد دل سے معرفت حاصل کرنا، زبان سے قول کرنا اور ارکان کے مطابق عمل کرنا ہے) اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے (1) اور یہ پہلے گزر چکا ہے اور حقیقی معنی وضعاً اور شرعاً پہلا ہی ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ وسعت کے باب سے ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اختلاف کے بارے خبر دی ہے کہ وہ حقائق کے بارے علم رکھتے تھے اور یہ کہ وہ دنیا کے خواہشمند اور طالب تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے (2) یہی کہا ہے اور کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور معنی یہ ہے: اور نہیں جھگڑا کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی آپس میں حسد کرتے ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس (صحیح) علم آ گیا۔ اخفش نے یہی کہا ہے۔ محمد بن جعفر بن زبیر نے کہا ہے: اس آیت سے مراد نصاریٰ ہیں اور یہ نجران کے عیسائیوں کے لیے جھڑک ہے (3)۔ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: اس سے مراد یہود ہیں اور الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کا لفظ یہود و نصاریٰ تمام کو شامل ہے (4)۔ یعنی وہ لوگ جنہیں کتاب عطا کی گئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں نہیں جھگڑے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس صحیح علم آ گیا تھا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت اور نبوت کا بیان ان کی کتابوں میں آ چکا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: (اس آیت سے مراد یہ ہے) جنہیں انجیل عطا کی گئی انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جھگڑا نہیں کیا اور آپ کے بارے میں انہوں نے متفرق قول نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس یہ علم آ گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ یکتا اور منفرد معبود ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور بَغْيًا مفعول من اجلہ ہونے کی وجہ سے یا الَّذِيْنَ سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے (5)۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

"پھر اگر (اب بھی) جھگڑا کریں آپ سے تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے جھکا دیا ہے اپنا سر اللہ کے سامنے اور جنہوں نے میری پیروی کی اور کہیے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی اور ان پڑھوں سے کہ کیا تم اسلام لائے پس اگر وہ اسلام لے آئیں جب تو ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیر لیں تو اتنا ہی آپ کے ذمہ تھا کہ آپ پیغام پہنچا دیں (جو آپ نے پہنچا دیا) اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے (اپنے) بندوں کو۔"

1۔ سنن ابن ماجہ، مقدمہ، صفحہ 8۔ ایضاً، سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 63، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

قولہ تعالیٰ: فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ یعنی اگر وہ جھوٹے من گھڑت اقوال اور مغالطوں کے ساتھ آپ سے جھگڑا کریں، تو آپ اپنا معاملہ اس کی طرف منسوب کیجئے جس کا ایمان اور تبلیغ میں سے آپ کو مکلف بنایا گیا ہے اور آپ کی مدد کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر ہی ہے (1)۔ اور قول باری تعالیٰ: وَجْهِيَ بمعنی ذات ہے (یعنی میں نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا دیا ہے) اور حدیث طیبہ میں بھی ہے: سجد وجهی للذی خلقه وصوره (2) (میری ذات نے اسے سجدہ کیا جس نے اسے پیدا کیا اور اسے صورت عطا کی۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الوجه بمعنی القصد ہے۔ جیسا کہ آپ کہتے ہیں خرج فلان فی وجه کذا (فلاں اس ارادے اور قصد میں نکلا) یہ معنی سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے، پہلا معنی زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے۔ اور ساری ذات کو وجہ کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہ (چہرہ) آدمی کے تمام اعضاء میں سے زیادہ شرف و عزت والا ہے اور حواس کو جمع کرنے والا ہے۔ اور کسی شاعر نے کہا:

اسلمت وجهی لمن اسلمت له المزن تحمل عذبا زلالا

اس میں وجہ بمعنی ذات ذکر کیا گیا ہے۔

اور ماہر متکلمین نے اس ارشاد گرامی وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ میں کہا ہے کہ اس میں وجہ سے مراد ذات ہے (3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد وہ عمل ہے جس کے ساتھ اس کی ذات کا قصد کیا جاتا ہے اور قولہ: وَمَنِ اتَّبَعَنِ میں مَنْ محل رفع میں ہے اور یہ اَسْلَمْتُ کی تا پر معطوف ہے۔ یعنی جنہوں نے میری پیروی کی انہوں نے بھی (اپنا آپ) جھکا دیا۔ اور ضمیر مرفوع متصل پر بغیر تاکید کے عطف جائز ہوتا ہے جبکہ دونوں کے درمیان فاصلہ آجائے۔

حضرت نافع، ابو عمرو اور یعقوب نے اتبعنِ میں یا کو اپنے اصل پر ثابت رکھا ہے اور دوسروں نے مصحف کی اتباع میں اسے حذف کر دیا ہے کیونکہ یہ اس میں بغیر یاء کے ہے (4)۔

اور شاعر نے کہا ہے:

لیس تُخفی یَسارتی قدرَ یوم ولقد تُخفِ شیمتی اِعساری

میری خوشحالی دن کی قدر کو نہیں چھپاتی بلکہ میری عادت و کردار میری تنگدستی کو چھپا دیتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۠ ۔ لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور اُمِّيّٖنَ سے مراد وہ ہیں جن کی کوئی کتاب نہیں اور وہ مشرکین عرب ہیں۔ ءَاَسْلَمْتُمْ میں استفہام تقریری ہے۔ اور اس کے ضمن میں امر ہے۔ یعنی اسلموا (یعنی تم اسلام لے آؤ) علامہ طبری وغیرہ نے اسی طرح کہا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: ءَاَسْلَمْتُمْ یہ تہدید ہے اور یہی اچھا اور بہتر مفہوم ہے۔ کیونکہ معنی ہے: کیا تم اسلام لائے یا نہیں؟

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 413، دار الکتب العلمیہ
2۔ صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، جلد 1، صفحہ 263
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ

اور ارشاد گرامی فَقَدِ اهْتَدَوْا میں ماضی کا صیغہ ان کے لئے ہدایت کے وقوع اور اس کی تحصیل میں اظہار مبالغہ کے لئے ہے (1)۔ اور الْبَلٰغُ بلغ کا مصدر ہے اس کے فعل میں عین کلمہ مخفف ہے۔ (بَلَغَ) یعنی بلاشبہ آپ پر صرف تبلیغ کرنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ حکم ان میں سے ہے جو جہاد کے ساتھ منسوخ ہو چکا ہے اور ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ قول اس آیت کی تاریخ نزول کی پہچان کا محتاج ہے۔ ظاہر تو یہی ہے کہ یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، کیونکہ معنی یہ ہے کہ بلاشبہ آپ پر یہ لازم ہے کہ آپ کی طرف قتال وغیرہ احکام میں سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ وہ ان تک پہنچا دیں (2)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

''بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کی آیتوں کا اور قتل کرتے ہیں انبیاء کو ناحق اور قتل کرتے ہیں ان لوگوں کو جو حکم کرتے ہیں عدل و انصاف کا لوگوں میں سے تو خوشخبری دو انہیں دردناک عذاب کی۔ یہ ہیں وہ (بدنصیب) اکارت گئے جن کے اعمال دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہے ان کے لئے کوئی مددگار۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ ابوالعباس المبرد نے کہا ہے: بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ تھے ان کے پاس انبیاء علیہم السلام انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے کے لئے آئے تو انہوں نے انہیں قتل کر دیا اور پھر ان کے بعد مومنین میں سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے انہیں بھی قتل کر دیا، پس انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور اسی طرح معقل بن ابی مسکین نے کہا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات بغیر کتاب کے بنی اسرائیل کے پاس آتے رہے اور وہ انہیں قتل کرتے رہے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کے متبعین میں سے ایک گروہ اٹھا اور وہ انہیں عدل و انصاف کا درس دینے لگا، تو وہ بھی قتل کئے جانے لگے (3) اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بری قوم وہ قوم ہے جو ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں اور کتنی بری ہے وہ قوم جو نیکی کا حکم نہیں دیتے اور منکر سے منع نہیں کرتے اور کتنی بری قوم ہے وہ جس میں بندۂ مومن احتیاط اور پرہیز کے ساتھ چلتا ہے (4)''۔

اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بنی اسرائیل نے دن کے اول حصہ کی ایک ساعت میں تینتالیس انبیاء علیہم السلام کو قتل کیا، پھر بنی اسرائیل کے لوگوں میں سے ایک سو بارہ آدمی اٹھے اور انہوں نے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا تو اسی دن کے آخری حصہ میں وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے اور وہ وہی لوگ ہیں جن کا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً
3۔ جامع البیان، جلد 2، صفحہ 253
4۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 23، حدیث نمبر 2145

ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کیا ہے(1)''۔ اسے المہدوی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اور شعبہ نے ابو اسحاق عن ابی عبیدۃ عن عبداللہ کی سند سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ بنی اسرائیل ایک دن میں ستر انبیاء علیہم السلام کو قتل کرتے رہے پھر دن کے آخر میں ان کی سبزیوں کے بازار لگ گئے (2)۔ پس اگر کہنے والا کہے کہ وہ جنہیں یہ نصیحت کی گئی ہے انہوں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان کے فعل کے ساتھ راضی ہیں جنہوں نے قتل کیا ہے پس یہ بھی انہیں کی طرح ہو گئے۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے بھی حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب کے ساتھ قتال کیا اور انہوں نے ان کے قتل کا ارادہ اور قصد کیا، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ (الانفال:30) (اور یاد کرو جب خفیہ تدبیریں کر رہے تھے آپ کے بارے میں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا تاکہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو شہید کر دیں۔)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سابقہ امتوں میں واجب تھا اور یہی رسالت کا فائدہ اور نبوت کی خلافت ہے۔ حسن نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نیکی کا حکم دیا یا برائی سے روکا تو وہ اللہ تعالیٰ کی زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے(3)''۔

اور درہ بنت ابی لہب نے بیان کیا ہے ایک آدمی حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے تو اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! ﷺ لوگوں میں سے بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(وہ) جس نے انہیں نیکی کا حکم دیا اور انہیں برائی سے منع کیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے لئے ڈرایا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب انہیں جمع اور اکٹھا کیا(4)''۔ اور قرآن کریم میں ہے: اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (التوبہ:67) (منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں حکم دیتے ہیں برائی کا اور روکتے ہیں نیکی سے۔)

پس اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مومنین اور منافقین کے درمیان فرق بنا دیا ہے اور یہ اس پر دلیل ہے کہ مومن کے اوصاف میں سے خاص ترین وصف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے اور اس کا سرخیل اسلام کی طرف دعوت دینا اور اس پر قتال کرنا ہے۔ پھر امر بالمعروف ہر ایک کے لائق اور مناسب نہیں ہوتا۔ بلاشبہ اسے سلطان وقت قائم کرتا ہے کیونکہ حدود کا قیام اسی کے سبب ہوتا ہے، تعزیر اس کی رائے کے سپرد ہوتی ہے، قید کرنا اور چھوڑنا اسی کے حوالے ہوتا ہے اور جلاوطنی وغیرہ کے احکام اسی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ پس وہ ہر شہر میں نیک، صالح، طاقتور، عالم اور امانتدار آدمی مقرر کرے گا اور اسے ان احکام کے نفاذ کا حکم دے گا اور اس طرز پر حدود بغیر کسی زیادتی کے جاری رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج:41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور حکم کرتے ہیں (لوگوں کو)

1۔ زاد المسیر، جلد 1، صفحہ 297
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 414، دار الکتب العلمیہ
3۔ کنز العمال، جلد 3، صفحہ 77، حدیث نمبر 5564
4۔ مسند احمد بن حنبل، جلد 6، صفحہ 432

نیکی کا اور روکتے ہیں (انہیں) برائی سے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ اہل السنت کے نزدیک ناہی کے لئے عادل ہونا شرط نہیں ہے بخلاف مبتدعہ کے وہ کہتے ہیں: کسی کو عادل کے سوا کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ نظریہ ساقط الاعتبار ہے، کیونکہ عدالت تو مخلوق میں سے قلیل لوگوں میں محصور ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام لوگوں میں عام ہے اور اگر وہ اس ارشاد باری تعالیٰ سے استدلال کریں، اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (البقرہ: 44) (کیا تم حکم کرتے ہو (دوسرے) لوگوں کو نیکی کا اور بھلا دیتے ہو اپنے آپ کو) اور قول باری تعالیٰ: كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ اور اسی طرح کی دیگر آیات سے۔ (الصف) (بڑی ناراضگی کا باعث ہے اللہ کے نزدیک کہ تم ایسی بات کہو جو تم کرتے نہیں ہو) تو انہیں کہا جائے گا: ان آیات میں وہ عمل کرنے پر مذمت بیان کی گئی ہے جس سے منع کیا گیا ہے نہ کہ یہ مذمت نہی عن المنکر کرنے پر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جس عمل سے منع کیا گیا ہے اسے کرنے والا اس کی نسبت زیادہ قبیح ہے جو اسے نہیں کرتا اور اسی وجہ سے وہ جہنم میں اسی طرح گھومتا رہے گا جس طرح گدھا چکی کے ساتھ گھومتا ہے۔ ہم نے اس کی تفصیل سورۃ البقرہ میں قول باری تعالیٰ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ کے تحت بیان کر دی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ مسلمانوں نے اس بارے میں اجماع کیا ہے جو ابن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ منکر کو تبدیل کرنا ہر اس پر واجب ہے جو اس پر قادر ہو اور جبکہ اس فریضہ (تغییر منکر) کی ادائیگی میں اسے ایسی ملامت اور خوف لاحق ہو جو باعث اذیت نہ ہو پھر بھی اس فریضہ کی ادائیگی اس پر واجب ہے اور اگر وہ قدرت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے روکے اور اگر اس پر بھی قدرت نہ ہو تو پھر اپنے دل سے (برا جانے) اس پر اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور جب وہ اپنے دل سے برا جانے تو پھر وہ اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داری ادا کرے جب وہ اس کے سوا کچھ استطاعت نہ رکھتا ہو۔ بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید میں بہت زیادہ احادیث مروی ہیں لیکن وہ استطاعت اور قدرت کے ساتھ مقید ہیں۔ حسن نے کہا ہے: بلاشبہ مومن کو امید کے لیے اور جاہل کو تعلیم کے لیے کلام کی جاتی ہے۔ پس وہ جس نے اپنی تلوار یا کوڑا رکھ دیا اور پھر کہا: اِتَّقِنِي اِتَّقِنِي (مجھ سے تو بچ اور ڈر) تو اس میں نہ تیرے لئے کچھ (خطرہ) ہے اور نہ اس کے لئے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسے آدمی کے بارے میں جو منکر (برائی) کو دیکھے اور اسے تبدیل کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ اعتراف کرے کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے (1)۔ ابن لہیعہ نے اعرج سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مومن کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اپنے آپ کو ذلیل کرنا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ ایسی بلا اور مصیبت سے تعرض کرتا ہے جس کے لئے وہ استطاعت نہیں رکھتا (2)''۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسے علی بن زید بن جدعان عن الحسن بن جندب عن حذیفہ عن النبی

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 2، صفحہ 28، حدیث نمبر 2178

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وسلم کی سند سے بیان کیا ہے(1)۔ اور ان دونوں میں کلام ہے۔ اور بعض صحابہ کرام سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا: آدمی جب کسی برائی کو دیکھے اور وہ اسے روکنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ تین بار یہ کہے اللّٰھم ان ھذا منکر (اے اللہ! بلاشبہ یہ منکر (برائی) ہے پس جب اس نے یہ کہہ دیا تو اس نے وہ کر دیا جو اس پر (لازم) تھا۔

ابن عربی نے خیال کیا ہے کہ جسے برائی کے زوال کی امید ہو اور اس کی تبدیلی سے اسے اپنی ذات پر ضرب یا قتل کا خوف ہو تو اکثر علماء کے نزدیک اس خطرہ کے وقت اس کا اس مشقت میں پڑنا جائز ہے اور اگر برائی کے زوال کی امید نہ ہو تو پھر ان کے نزدیک کون سا فائدہ ہے۔ فرمایا: قسم بخدا! میرے نزدیک جب نیت خالص ہے تو اسے چاہیے وہ اس مشقت میں پڑ جائے کیفیت جو بھی ہو اور کسی کی پرواہ نہ کرے(2)۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس کے خلاف ہے جو ابو عمر نے اجماع کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت قتل کا خوف ہونے کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ (لقمان: 17) (نیکی کا حکم دیا کرو اور برائی سے روکتے رہو اور صبر کیا کرو ہر مصیبت پر جو تمہیں پہنچے۔) اور یہ اشارہ اذیت پہنچانے کی طرف ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ ائمہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''تم میں سے جو کوئی برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھے تو پھر اپنی زبان سے روک دے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو تو پھر اپنے دل سے (اسے برا سمجھے) اور یہ کمزور ترین ایمان ہے(3)''۔ علماء نے کہا ہے: ہاتھ کے ساتھ امر بالمعروف امراء (حکام وقت) پر لازم ہے اور زبان کے ساتھ امر بالمعروف علماء کے ذمہ ہے اور دل کے ساتھ ضعفاء یعنی عوام الناس پر لازم ہے۔ پس روکنے کے لئے برائی کا ازالہ کرنا جب زبان کے ساتھ ممکن ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اسے روکے۔ اور اگر اس کے لئے سزا یا قتال کے بغیر ازالہ ممکن نہ ہو تو اسے چاہیے کہ وہ یہ بھی کرے۔ اور اگر برائی قتال کے بغیر زائل ہو جائے تو پھر قتال جائز نہیں اور یہ مفہوم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لیا گیا ہے: فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ (الحجرات: 9) (تو پھر سب (مل کر) لڑو اس سے جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف)

اور اسی پر علماء نے اس کی بنیاد رکھی ہے کہ جب کوئی کسی ذات پر یا مال پر حملہ آور کو اپنی ذات سے یا اپنے مال سے یا کسی اور کی ذات سے دور ہٹائے تو اس کا توحق ہے لیکن اس پر کوئی شے (بطور تاوان) لازم نہیں۔ اگر زید نے عمرو کو دیکھا کہ اس نے بکر کا مال (اٹھانے یا ضائع کرنے کا) قصد کیا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس سے اسے روکے جبکہ مال کا مالک اس پر قادر نہ ہو

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4005، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 266

3۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 51۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر، حدیث نمبر 4002، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور نہ اس کے ساتھ راضی ہو۔ حتیٰ کہ علماء نے کہا: اگر ہم [قصاص] بھی فرض کر لیں۔ اور کہا گیا ہے: ہر شہر میں جس میں چار قسم کے لوگ ہوں تو ان کے رہنے والے آزمائش اور بلا سے محفوظ رہتے ہیں۔ امام عادل جو ظلم نہ کرتا ہو اور عالم جو راہ ہدایت پر گامزن ہو اور مشائخ جو نیکی کا حکم دیتے ہوں اور برائی سے روکتے ہوں اور علم کے حصول اور قرآن کریم کی تعلیم پر برانگیختہ کرتے ہوں۔ اور ان کی عورتیں پردے میں رہتی ہوں اور زمانہ جاہلیت کی طرح وہ زیب و آرائش کا اظہار نہ کرتی ہوں۔

مسئلہ نمبر 6۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ عرض کی گئی: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: "جب تم میں وہ ظاہر ہو جائے جو تم سے پہلی امتوں میں ظاہر ہوا" ہم نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پہلی امتوں میں کیا ظاہر ہوا؟ تو آپ نے فرمایا: الملك في صغاركم والفاحشة في كباركم والعلم في رذالتكم (حکمرانی تمہارے چھوٹوں اور گھٹیا لوگوں میں ہو اور تمہارے بڑوں (اعلیٰ قسم کے لوگوں) میں فحش عام ہو جائے اور علم تمہارے رذیل (اور کمینے) لوگوں میں ہو۔) زید نے بیان کیا ہے: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے والعلم في رذالتكم یعنی جب علم فاسق لوگوں میں آ جائے۔ اسے ابن ماجہ نے بیان کیا ہے (1)، اس باب کا مزید بیان سورۃ المائدہ وغیرہا میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور فَبَشِّرْهُمْ اور حَبِطَتْ کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

"کیا نہیں دیکھا آپ نے ان لوگوں کی طرف جنہیں دیا گیا کچھ حصہ کتاب کا (جب) بلائے جاتے ہیں کتاب الٰہی کی طرف تاکہ تصفیہ کر دے ان کے باہمی جھگڑوں کا تو پیٹھ پھیر لیتا ہے ایک گروہ ان میں سے در آنحالیکہ وہ روگردانی کرنے والے ہوتے ہیں۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ آیت اس سبب سے نازل ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت المدراس میں یہودیوں کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا، تو نعیم بن عمرو اور حارث بن زید نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کون سے دین پر ہیں؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ میں ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہوں۔" تو ان دونوں نے کہا: حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہودی تھے۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میرے پاس تورات لے آؤ پس وہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گی۔" تو ان دونوں نے اس کا انکار کر دیا تب یہ آیت نازل ہوئی۔

اور نقاش نے بیان کیا ہے: یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کیونکہ یہودیوں کی ایک جماعت نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، صفحہ 299

نبوت کا انکار کر دیا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: ''تم میرے پاس تورات لے آؤ اس میں میری صفات موجود ہیں۔'' تو انہوں نے انکار کر دیا (1)۔ جمہور نے لِيَحْكُمَ پڑھا ہے اور ابو جعفر یزید بن القعقاع نے لِيُحْكَمَ یا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے (2) اور پہلی قرأت احسن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (الجاثیہ: 29) (یہ ہمارا نوشتہ ہے جو بولتا ہے تمہارے بارے میں سچ)

مسئلہ نمبر 2۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ جس کو دعوت دی جائے اس کا حاکم کے پاس پیش ہونا واجب ہے کیونکہ اسے کتاب اللہ کی طرف دعوت دی گئی ہے، پس اگر وہ اسے قبول نہ کرے تو وہ مخالف ہو گیا اور مخالف کی قدر و منزلت کے مطابق اس پر ادب سکھانے کے لئے زجر و توبیخ کرنا متعین ہو جاتا ہے۔ اور یہی حکم ہمارے پاس اندلس اور بلاد عرب میں جاری ہے، لیکن دیار مصر میں ایسا نہیں ہے۔ اور یہ وہ حکم ہے جسے ہم نے سورۃ النور میں پوری تفصیل کے ساتھ اس ارشاد باری تعالیٰ کے تحت بیان کیا ہے: وَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْۤا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْۤا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (النور) (اور جب وہ بلائے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف تا کہ فیصلہ کرے ان کے درمیان تو اس وقت ایک جماعت ان میں روگردانی کرنے لگتی ہے...... (بلکہ درحقیقت) وہ خود ظالم ہیں)

اور زہری نے حسن سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اس کے خصم نے مسلمان حکام میں سے کسی حاکم کے پاس بلایا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ظالم ہو اور اس کا کوئی حق نہ ہو (3)''۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''یہ حدیث باطل ہے اور رہا آپ کا یہ قول فَهُوَ ظَالِمٌ تو یہ کلام صحیح ہے اور جہاں تک فلاحق لہ کا تعلق ہے تو وہ صحیح نہیں ہے۔ اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہو أنه على غير الحق (کہ وہ غیر حق پر ہو) ابن خویز منداد مالکی نے کہا ہے: ہر وہ آدمی جسے حاکم کی مجلس کی طرف بلایا جائے اس پر واجب ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کرے جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ حاکم فاسق ہے یا اسے مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان عداوت کا علم ہو۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اس آیت میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ سابقہ شرائع ہمارے لئے بھی شریعت ہیں سوائے اس حکم کے جس کے منسوخ ہونے کا ہمیں علم ہو۔ اور یہ کہ سابقہ انبیاء علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق فیصلہ کرنا ہم پر واجب ہوتا ہے، اس کا بیان آگے آ رہا ہے۔ اور یہ کہ تورات نہ ہم پڑھیں گے اور نہ جو کچھ اس میں ہے اس پر ہم عمل کریں گے، کیونکہ وہ جن کے قبضہ میں ہے وہ اس پر امین نہیں ہیں اور انہوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا ہے اور اگر ہم جان لیں کہ اس میں کوئی ایسی شے ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ہمارے لئے اس کی قرأت جائز ہے۔ اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جبکہ انہوں نے حضرت کعب کو فرمایا: ''اگر تو جان لے کہ یہ وہی تورات ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ بن عمران پر

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416-415، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب آداب القاضی، جلد 10، صفحہ 140

نازل فرمایا ہے تو پھر تو اسے پڑھ۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے جانتے تھے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا اسی لئے آپ نے انہیں اس کی طرف اور اسی کے مطابق فیصلہ کرنے کی طرف دعوت دی۔ اس کا بیان عنقریب سورۃ المائدہ میں آئے گا اور ان اخبار کا بیان جو اس کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَّ غَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

''اس (بیباکی) کی وجہ یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ بالکل نہ چھوئے گی ہمیں دوزخ کی آگ مگر چند دن گنے ہوئے اور فریب میں مبتلا رکھا انہیں ان کے دین کے معاملہ میں ان باتوں نے جو وہ خود گھڑا کرتے تھے۔''

یہ (ان کے) پیٹھ پھیرنے اور اعراض کرنے کی طرف اشارہ ہے، اور ان کے اپنے اس قول سے دھوکہ کھانے کی طرف: نحن ابناء اللہ و احباؤہ اور اسی طرح کے ان کے دیگر اقوال۔ اور سورۃ البقرہ کے اس قول کے معنی میں کلام گزر چکی ہے: لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ۔

فَكَیْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ۫ وَ وُفِّیَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

''تو کیا حال ہوگا (ان کا) جب ہم جمع کریں گے انہیں اس روز جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

یہ توقیف اور تعجب کی جہت پر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو خطاب ہے (1)، یعنی کیا حال ہوگا ان کا یا وہ کیا کریں گے جب قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے اور ان سے ان کے وہ حسن مضمحل ہو جائیں گے جن کا وہ دنیا میں دعویٰ کرتے تھے اور جو کچھ انہوں نے اپنے کفر، اپنی جرأت اور اپنے قبیح اعمال میں سے کمایا اس کا انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

قول باری تعالیٰ لِیَوْمٍ میں لام بمعنی فی ہے، کسائی نے یہی کہا ہے۔ اور بصریوں نے کہا ہے: اس کا معنی ہے لحساب یوم۔ (اس دن کے حساب کے لئے) اور طبری نے کہا ہے: لما یحدث فی یوم۔ (2) (اس کے لئے جو اس دن میں ظاہر ہوگا)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۪ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾

''(اے حبیب! یوں) عرض کرو اے اللہ! اے مالک مالکوں کے تو بخش دیتا ہے ملک جسے چاہتا ہے اور چھین

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے اور عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ذلیل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے تیرے ہی ہاتھ میں ہے ساری بھلائی بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ سورہ فاتحہ، آیۃ الکرسی، شہد اللہ اور قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ نازل فرمائے، تو یہ عرش کے ساتھ معلق ہو گئیں (اس طرح کہ) ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب نہ تھا اور انہوں نے عرض کی: اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں دار الذنوب اور ان لوگوں کی طرف اتار رہا ہے جو تیری نافرمانی کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے میری عزت وجلال کی قسم! کوئی بندہ ہر فرض نماز کے بعد تمہیں نہیں پڑھے گا مگر میں اسے حظیرۃ القدس میں اس کے اعلیٰ مقام پر سکونت عطا فرماؤں گا اور یہ کہ میں اس کی طرف ہر روز اپنی مخفی آنکھوں کے ساتھ ستر بار دیکھوں گا اور یہ کہ میں ہر روز اس کی ستر حاجات پوری فرماؤں گا ان میں سے سب سے ادنیٰ مغفرت ہے اور یہ کہ میں اسے ہر دشمن سے پناہ عطا فرماؤں گا اور اس کے خلاف اس کی مدد کروں گا اور جنت میں داخل ہونے سے کوئی شے اس کے لئے مانع اور رکاوٹ نہیں ہوگی مگر یہ کہ وہ فوت ہو جائے۔''

اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: میں ایک دن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک دیا گیا اور میں آپ کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا نہ کر سکا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے معاذ! تجھے نماز جمعہ سے کس شے نے روکا ہے؟'' میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یوحنا بن باریا یہودی کا مجھ پر ایک اوقیہ چاندی قرض تھا اور وہ میرے دروازے پر میری تاک میں تھا، پس مجھے یہ خوف لاحق ہوا کہ وہ مجھے آپ سے روک دے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے معاذ! کیا تو پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تیرا قرض ادا فرما دے؟'' میں نے عرض کی: ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر روز یہ پڑھا کر قل اللھم مالک الملک... تا قولہ... بغیر حساب رحمن الدنیا والآخرۃ رحیمھما تعطی منھما من تشاء و تمنع منھما من تشاء اقض عنی دینی (اے دنیا اور آخرت میں بہت زیادہ رحم فرمانے والے اور مہربان تو جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے تو مجھ سے میرا قرض ادا فرما دے) تو اگر تجھ پر اتنا سونا قرض ہوگا جس سے ساری زمین بھر جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تجھ سے اسے ادا فرمائے گا۔'' اسے ابونعیم الحافظ نے روایت کیا ہے۔ اور حضرت عطا خراسانی سے بھی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے قرآن کریم میں سے چند آیات یا کلمات سکھائے۔ زمین میں کوئی مسلمان نہیں ہے جو ان کے ساتھ دعا مانگے اور وہ غمزدہ ہو یا اس پر تاوان ہو یا وہ مقروض ہو مگر اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری فرما دے گا اور اس کے غم اور پریشانی کو دور فرما دے گا۔ مجھے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روک لیا گیا۔ پھر آگے مذکورہ روایت بیان کی۔ حضرت عطا کی حدیث غریب ہے انہوں نے اسے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے مرسل روایت کیا ہے۔

اور حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ فتح کیا اور اپنی امت کے ساتھ ملک فارس اور روم کا وعدہ فرمایا تو منافقین اور یہودیوں نے کہا: یہ بعید از امکان ہے! ملک فارس اور روم کہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آسکتے ہیں! وہ ان سے کہیں زیادہ عزت والے اور طاقتور ہیں، کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کافی نہیں ہوا کہ یہ ملک فارس اور روم کا طمع کر رہے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (1)۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے اس قول میں باطل نظریہ کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی: ''بے شک عیسیٰ علیہ السلام ہی خدا ہیں'' اور وہ اس طرح کہ یہ اوصاف ہر صحیح الفطرت آدمی کے لئے یہ واضح اور ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کوئی شے نہیں ہیں (2)۔ ابن اسحاق نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے عناد اور ان کے کفر کے بارے آگاہ کیا ہے اور یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی آیات اور معجزات عطا فرمائے ہیں جو ان کی نبوت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ لیکن اللہ تعالیٰ ان اشیاء میں منفرد اور یکتا ہے۔ ارشاد گرامی ہے: **تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ** مزید فرمایا: **تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝** پس اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام الہٰ ہوتے تو یہ اختیار ان کے پاس بھی ہوتا۔ پس اس میں یہی قیاس ہے اور یہی واضح نشانی ہے۔

قولہ تعالیٰ: **قُلِ اللّٰهُمَّ** علمائے نحو نے لفظ **اللّٰهُمَّ** کی ترکیب میں اختلاف کیا ہے۔ لیکن ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں ھا مضموم ہے اور میم مفتوح مشدد ہے اور یہ منادیٰ ہے (3) اور اعشیٰ کے قول میں میم مخفف بھی مذکور ہے۔

کدعوة من أبی رَباح یسمعها اللّٰهُمَ الکُبار

جیسا کہ ابو رباح کی دعا سے انتہائی عظمت وشان والا معبود حقیقی سن رہا ہے۔

خلیل، سیبویہ اور تمام بصریوں نے کہا ہے: اللّٰھم کی اصل یا اللہ ہے، پس جب کلمہ کو حرف نداء یا کے بغیر استعمال کیا گیا تو انہوں نے اس کا بدل میم مشدد کو بنا دیا پس وہ دو حروف لائے اور وہ دو میمیں ہیں دو حرفوں کے عوض اور وہ دونوں یا اور الف ہیں۔ اور ھا پر ضمہ یہ اسم منادیٰ مفرد کا ضمہ ہے۔ اور امام فراء اور علمائے کوفہ نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اللّٰھم میں اصل یا اللہ اُمَّنا بخیر۔ پھر اسے حذف کر دیا گیا اور دو کلموں کو ملا دیا گیا اور ھا پر ضمہ یہ وہی ضمہ ہے جو اُمَّنا میں تھا۔ جب ہمزہ کو حذف کر دیا گیا تو حرکت منتقل ہو گئی (4)۔

نحاس نے کہا ہے: بصریوں کے نزدیک یہ بہت بڑی خطا ہے اور اس میں قول وہی ہے جو امام خلیل اور سیبویہ نے کیا ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ محال ہے کہ وہ ضمہ چھوڑ دیا جائے جو ندا مفرد پر دلیل ہے اور یہ کہ لفظ اللہ میں اُمّ کا ضمہ رکھا جائے یہ تو اللہ تعالیٰ کے اسم میں الحاد ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ زجاج کی طرف سے انتہائی غلو اور زیادتی ہے (5)۔ اور انہوں نے

1۔ اسباب النزول الواحدی، صفحہ 63
2۔ المحرر الوجیز، جلد 1 صفحہ 416، دار الکتب العلمیہ
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1 صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً

یہ خیال کیا ہے کہ انہوں نے کبھی بھی یَا اللهُ اُمّہ نہیں سنا۔ اور نہ ہی عرب یہ کہتے ہیں: یا اَللّٰھُمَّ۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ کبھی کبھی حرف ندا اَللّٰھُمَّ پر داخل ہو جاتا ہے اور اس پر انہوں نے راجز کا یہ قول بیان کیا ہے۔ غفرت او عذبت یا اللّٰھما (اے اللہ! تو بخش دے یا تو عذاب دے)

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وَ مَا علیكِ أن تقولِی کلّما　　سبَّحتِ أو هلّلتِ یا اللّٰھُمَّ ما

تجھ پر لازم نہیں کہ جب بھی تو سبحان اللہ یا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کہے تو کہے یا اللّٰھُمَّ ما (اے اللہ!)

اُردُد علینا شیخنا مسلّما　　فإننا من خیرہ لن نُعْدَما (1)

تو ہم پر ہمارے شیخ کو صحیح سالم لوٹا دے پس ہمیں ان کی خیر و برکت سے ہرگز محروم نہ کیا جائے۔

کسی اور نے کہا:

انی اذا ما حَدَث أَلَمَّا　　اقول یا اللّٰھم یا اللّٰھُمّا

بلاشبہ جب کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آتا ہے تو میں کہتا ہوں اے اللہ! اے اللہ!

انہوں نے کہا ہے: اگر میم حرف ندا کا عوض ہوتی تو یہ دونوں جمع نہ ہوتے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ شاذ ہے اور اس کا قائل معروف نہیں اور اسے چھوڑا نہیں جا سکتا ہے جو کتاب اللہ میں ہے (2) اور یہ تمام دیوان العرب میں ہے اور اسی کی مثل اس قول میں بھی وارد ہے۔

ھما نَفَثَا فِی فِیَّ من فَمَوَیھِما　　علی النابح العاوی أشدَّ رِجَامِ

کوفیوں نے کہا ہے: بلاشبہ فم اور ابنم میں میم مخفف کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن میم مشدد کا اضافہ نہیں کیا جاتا (3)۔ اور بعض نحویوں نے کہا ہے جو کچھ کوفیوں نے کہا ہے وہ خطا اور غلطی ہے۔ کیونکہ اگر اس طرح ہوتا جیسے انہوں نے کہا ہے تو پھر یہ کہا جانا واجب اور ضروری ہے: اللّٰھم اور اسی پر اقتصار کیا جائے کیونکہ اس کے ساتھ دعا ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ کہتے ہیں: انت اللّٰھم الرزّاق۔ پس اگر اس طرح ہو جیسے انہوں نے دعویٰ کیا ہے تو تو نے مبتدا اور خبر کے درمیان دو جملوں کے ساتھ فاصلہ کر دیا۔ نضر بن شمیل نے کہا ہے: جس نے اللّٰھم کہا تحقیق اس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے جمیع اسماء کے ساتھ پکارا۔ اور حسن نے کہا ہے: اللّٰھم دعا کو جامع ہوتا ہے (4)۔

قولہ تعالیٰ: مٰلِكَ الْمُلْكِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل سے عرض کی کہ وہ آپ کی امت کو ملک فارس عطا فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی (5)۔ اور مقاتل نے کہا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ملک فارس اور روم آپ کی امت کو عطا فرما دے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً　3۔ ایضاً

4۔ ایضاً　5۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 445

تعلیم دی کہ وہ ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگیں۔ اس کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ اور مٰلِكَ سیبویہ کے نزدیک منصوب ہے اس بنا پر کہ یہ ندا ثانی ہے، اور اسی کی مثل یہ ارشاد گرامی ہے: قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور ان کے نزدیک یہ جائز نہیں کہ اسے اللّٰهُمَّ کی صفت بنایا جائے کیونکہ اس کے ساتھ میم ملی ہوئی ہے، اور محمد بن یزید اور ابراہیم بن سری الزجاج نے ان سے اختلاف کیا ہے اور دونوں نے کہا ہے: مالك ترکیب میں اسم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اسی طرح فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ہے۔ ابو علی نے کہا ہے: یہی ابو العباس المبرد کا مذہب ہے اور جو سیبویہ نے کہا ہے وہ زیادہ صحیح اور زیادہ واضح ہے۔ اور وہ اس لئے کہ اسماء موصوفہ میں اللّٰهم کی طرز پر کوئی شے نہیں ہے کیونکہ یہ اسم مفرد ہے اور اس کے ساتھ (اسم) صوت کو ملایا گیا ہے اور اصوات کی صفت نہیں لگائی جاتی جیسا غَاق اور اس کے مشابہ الفاظ۔ اور اسم مفرد کا حکم یہ ہے کہ اس کی صفت نہ لگائی جائے اگرچہ علمائے (نحو) نے کئی مقامات پر اس کی صفت لگائی ہے۔ اور جب یہاں وہ اسم ملا دیا گیا جس کی صفت نہیں لگائی جاتی تو پھر قیاس یہی ہے کہ صفت نہ لگائی جائے کیونکہ یہ صوت کے ساتھ ملنے کے سبب صوت کی طرح ہو گیا ہے۔ جیسا کہ حَيَّهَل پس اس کی صفت نہیں لگائی گئی (1)۔ اور الْمُلْكِ یہاں مراد نبوت ہے (2)۔ یہ حضرت مجاہد کا قول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد غلبہ ہے اور یہ بھی ہے کہ مراد مال اور غلام وغیرہ ہیں (3)۔" زجاج نے کہا ہے: معنی ہے (اے) بندوں کے مالک اور اس (شے) کے مالک جس کے وہ مالک ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی ہے اے دنیا اور آخرت کے مالک (4)۔ اور تُؤْتِي الْمُلْكَ کا معنی ہے: تو ایمان اور اسلام عطا کرتا ہے۔ مَنْ تَشَآءُ یعنی جسے تو چاہتا ہے کہ تو اسے وہ عطا فرمائے۔ اور اسی طرح اس کا مابعد بھی ہے۔ اور اس میں محذوف (کلام) مقدر ماننا ضروری ہے۔ یعنی وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ آن تنزعه منه، پھر اسے حذف کر دیا گیا۔

اور سیبویہ نے شعر کہا ہے:

أَلاهل لهذا الدَّهر من مُتَعَلَّلِ علی الناس مهما شاء بالناس يَفْعَلِ

زجاج نے کہا ہے: (اس میں اصل عبارت اس طرح ہے۔) مهما شاء ان يفعل بالناس يفعل (جب وہ لوگوں کے ساتھ کچھ کرنا چاہے تو وہ کر دیتا ہے۔) اور قول باری تعالیٰ: وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ کہا جاتا ہے: عزّ کا معنی ہے جب وہ بلند ہو اور غالب ہو۔ اور اسی سے ہے وعَزَّنِي فِي الخِطَابِ (وہ خطاب میں مجھ پر غالب آگیا۔) وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ذل يذل ذُلًّا (جب وہ غالب آئے اور مسلط ہو جائے۔)

طرفہ نے کہا ہے:

بطيئ عن الجُلَّى سريعٍ إلى الخَنَا ذليلٍ بأجماع الرجال مُلَهَّدِ

بِيَدِكَ الْخَيْرُ یعنی تیرے ہی قبضے میں ہے خیر اور شر اور اسے (یعنی شر کو) حذف کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ 2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 8 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اور یہ بھی کہا گیا ہے: خیر کو اس لئے خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ دعا اور اس کے فضل میں رغبت رکھنے کا محل ہے۔ نقاش نے کہا ہے: بِيَدِكَ الْخَيْرُ کا مفہوم ہے مدد و نصرت اور غنیمت تیرے قبضہ میں ہے (1)۔ اور اہل الاشارات نے کہا ہے: ابوجہل بہت زیادہ مال پر ملکیت رکھتا تھا اور وہ غزوۂ بدر کے دن کنوئیں میں گر گیا۔ اور حضرت صہیب، حضرت بلال اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم فقراء تھے ان کے پاس کوئی مال نہ تھا اور ان کی ملکیت ایمان تھا قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ تو ابوطالب کے یتیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کرتا ہے کنوئیں کے کنارے پر، یہاں تک کہ وہ ان ابدان کو ندا دیتا ہے جو کنوئیں میں پھینک دیئے گئے ہیں: اے عتبہ، اے شیبہ۔ تو جسے چاہتا ہے عزت اور غلبہ عطا فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ اے صہیب، اے بلال تم یہ اعتقاد نہ رکھو کہ ہم نے تمہیں تمہارے بغض کے سبب دنیا سے روک دیا ہے۔ بيدك الخير۔ عجز میں سے کوئی شے تمہارے لئے رکاوٹ نہیں۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ حق کا انعام عام ہے وہ جسے چاہتا ہے والی بنا دیتا ہے۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

''تو داخل کرتا ہے رات (کا حصہ) دن میں اور داخل کرتا ہے تو دن (کا حصہ) رات میں اور نکالتا ہے تو زندہ کو مردہ سے اور نکالتا ہے مردہ کو زندہ سے اور رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔''

حضرت ابن عباس، مجاہد، حسن، قتادہ اور سدی نے ارشاد باری تعالیٰ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ کے معنی میں بیان کیا ہے کہ تو دونوں (رات اور دن) میں سے ایک کی کمی کو دوسرے میں داخل کر دیتا ہے (2)، یہاں تک کہ دن پندرہ ساعت کا ہو جاتا ہے اور وہ طویل ترین دن ہوتا ہے اور رات نو ساعت کی ہو جاتی ہے اور وہ چھوٹی ترین رات ہوتی ہے۔ اور اسی طرح تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ کا معنی بھی ہے۔ اور یہ کلبی کا قول ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور آیت کے الفاظ یہ احتمال بھی رکھتے ہیں کہ اس میں رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا داخل ہو۔ اور ان میں سے ایک کا زوال دوسرے میں داخل ہونا ہو (3)۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ کے معنی میں مفسرین نے اختلاف کیا ہے۔ پس حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے تو مومن کو کافر سے اور کافر کو مومن سے نکالتا ہے۔ اسی طرح حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور معمر نے حضرت زہری سے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عورتوں کے پاس تشریف لے گئے تو وہاں ایک حسین و جمیل عورت موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' تو انہوں نے عرض کی: یہ آپ کی خالاؤں میں سے ایک ہے۔ آپ نے پھر ارشاد فرمایا: ''یہ کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: یہ خالدہ بنت اسود بن عبد یغوث ہے۔ تب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سبحان الذی یخرج الحی من المیت (پاک ہے وہ ذات جو زندہ کو مردہ سے نکالتی ہے) وہ عورت نیک اور صالحہ تھی اور اس کا باپ کافر تھا۔ تو اس قول کی بنا پر مراد یہ ہے کہ کافر کا دل مردہ ہے اور مومن کا دل زندہ ہے، پس موت اور حیات دونوں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 417، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

مستعار ہیں۔ اور اکثر علماء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ آیت میں حیات اور موت دونوں حقیقت ہیں۔ اور حضرت عکرمہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مرغی کو انڈے سے نکالنا ہے اس میں مرغی زندہ ہے اور انڈا مردہ ہے اور انڈا جو کہ مردہ ہے اسے مرغی سے نکالتا ہے جو کہ زندہ ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد نطفہ ہے جو آدمی سے خارج ہوتا ہے اور اس میں نطفہ مردہ ہے اور آدمی زندہ ہے اور آدمی نطفہ سے زندہ نکلتا ہے حالانکہ نطفہ مردہ ہے۔

اور حضرت عکرمہ اور سدی نے کہا ہے: مراد دانہ ہے جو بالی سے نکلتا ہے اور بالی دانے سے نکلتی ہے اور گٹھلی کھجور سے نکلتی ہے اور کھجور گٹھلی سے نکلتی ہے اور کھجور اور بالی میں حیات تشبیہا موجود ہے (1)۔ پھر فرمایا: وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ گویا کہ وہ جو کچھ عطا کرتا ہے اس کا حساب نہیں لے گا۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۲۸

"نہ بنائیں مومن کافروں کو اپنا دوست مومنوں کو چھوڑ کر اور جس نے کیا یہ کام، پس نہ رہا (اس کا) اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ تم کرنا چاہو ان سے اپنا بچاؤ۔ اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے (یعنی غضب سے) اور اللہ ہی کی طرف (سب نے) لوٹ کر جانا ہے۔"

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مومنین کو منع فرمایا ہے کہ وہ کفار کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں اور انہیں دوست بنائیں۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد ہے لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (2) اور وہاں اس معنی کا بیان آ رہا ہے۔ اور فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ کا معنی ہے پس وہ اللہ کے گروہ میں سے نہیں ہے اور نہ ہی اس کے دوستوں میں سے ہے۔ (یعنی فلیس من حزب اللہ ولا من اولیائہ فی شیئ) اور یہ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ کی مثل ہے۔ سیبویہ نے بیان کیا ہے ہوفی فرسخین یعنی وہ میرے اور میرے ساتھیوں سے دو فرسخ پر ہے۔ (ای من اصحابی و معی) پھر استثناء کی اور وہ یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور فرمایا: اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً حضرت معاذ بن جبل اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تقیہ (بچاؤ) ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے قوی اور طاقتور ہونے سے پہلے پہلے تھا۔ پس آج اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ اور قوت عطا فرمائی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے بچیں اور احتیاط برتیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ (تقیہ) یہ ہے کہ آدمی زبان سے قول کرے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، تو نہ وہ قتل کیا جائے گا اور نہ وہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ اور حسن نے کہا ہے: تقیہ (اپنا بچاؤ کرنا) قیامت کے دن تک آدمی کے لئے جائز ہے اور قتل میں کوئی تقیہ نہیں ہے۔

حضرت جابر بن زید، مجاہد اور ضحاک نے کہا ہے: اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 418 2۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 9

اور یہ بھی کہا گیا ہے: مومن جب کفار کے درمیان موجود ہو تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ انہیں زبان کے ساتھ دھوکہ دیتا رہے جب اسے اپنی ذات پر خوف ہے اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو۔ اور تقیہ حلال نہیں ہوتا مگر تب جب قتل کا خوف ہو یا اعضائے بدن کٹنے کا خوف ہو یا انتہائی شدید اذیت پہنچنے کا خطرہ ہو۔ اور جسے کفر پر مجبور کیا گیا تو اس کے لئے صحیح یہ ہے کہ وہ سولی چڑھ جائے اور کفریہ کلمات زبان پر نہ لائے۔ (یعنی اس پر کلمہ کفر کہنا واجب نہیں ہے) بلکہ اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ النحل میں آئے گی ان شاء اللہ۔ حمزہ اور کسائی نے تقاۃ میں امالہ کیا ہے (1) اور باقیوں نے اسے پر پڑھا ہے۔ اور تُقَاۃً اصل میں وُقَيَةٌ بروزن فُعَلَةٌ ہے جیسا کہ تُوَدَۃٌ اور تهمة ہیں پھر واؤ کو تا سے اور یا کو الف سے بدل دیا گیا ہے۔

حضرت ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت حضرت عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، وہ بدری اور متقی صحابی تھے اور ان کا یہود کے ساتھ معاہدہ تھا۔ پس جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ احزاب کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یا نبی اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، بلاشبہ میرے ساتھ یہود کے پانچ سو آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ساتھ نکلیں، تو ہم ان کے سبب دشمن پر غالب آ سکیں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ الآیہ۔ (2)

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ آیت حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی جبکہ انہوں نے وہ بعض گفتگو کی جس کا مشرکین نے ان سے ارادہ کیا، اس کا بیان سورۃ النحل میں آئے گا۔

قولہ تعالیٰ: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ زجاج نے کہا ہے: ای ويحذركم الله اياه اور اللہ تعالیٰ ہی تمہیں ڈراتا ہے پھر تم اس سے (یعنی ایاہ سے) اس کے سبب (یعنی نفسہ کے سبب) مستغنی ہو گئے اور وہ مستعمل ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسك پس اس کا معنی ہے تو جانتا ہے جو کچھ میرے پاس ہے اور جو میری حقیقت ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے پاس ہے اور نہ وہ جو تیری حقیقت ہے۔ کسی دوسرے نے کہا: معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی سزا سے ڈراتا ہے (3) (لہٰذا) یہ وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ کی مثل ہے اور فرمایا: تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ تو میری غیب اور چھپی ہوئی شی کو جانتا ہے۔ اور النفس کو ضمیر کی جگہ پر رکھا گیا ہے کیونکہ اضمار نفس میں ہی ہوتا ہے۔ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ای والی جزاء اللہ، الْمَصِيْرُ اور اللہ تعالیٰ کی جزا کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔ اس میں دوبارہ زندہ کئے جانے کا اقرار ہے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

"فرما دیجئے اگر تم چھپاؤ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے یا ظاہر کر دو اسے، جانتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اور جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 419، دارالکتب العلمیہ
2۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66
3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 420، دارالکتب العلمیہ

پس وہ سینوں میں مخفی اور چھپی چیزوں کو اور ان تمام کو جن پر وہ مشتمل ہیں جاننے والا ہے اور ان تمام کے بارے جاننے والا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور انہیں جاننے والا ہے جنہیں یہ گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ علام الغیوب ہے اس سے ذرہ برابر کوئی شے پوشیدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی شے غائب ہے اس کی ذات پاک ہے لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

”جس دن موجود پائے گا ہر نفس جو کی تھی اس نے نیکی اپنے سامنے اور جو کچھ کی تھی اس نے برائی۔ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان (حائل ہوتی) مدت دراز اور ڈراتا ہے تمہیں اللہ اپنے (عذاب) سے اور اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔“

يَوْمَ منصوب ہے اور اس ارشاد کے ساتھ متصل ہے: وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ اس قول کے ساتھ متصل ہے: وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۔ يَوْمَ تَجِدُ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ منقطع ہو (یعنی مذکورہ ارشادات میں سے کسی کے ساتھ یہ متصل نہ ہو۔) اس بنا پر کہ اس سے پہلے اُذکُر فعل مضمر ہو۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: ان اللہ عزیز ذو انتقام۔ یوم تبدل الارض۔

اور مُحْضَرًا ما کے صلہ میں ضمیر محذوف سے حال ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے یوم تجد کل نفس ما عملتہ من خیر محضرا اور یہ اس بنا پر ہے کہ تَجِدُ، وجدان الضالۃ (گمشدہ کو پانا) سے ماخوذ ہو۔ اور وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ میں ما پہلے ما پر معطوف ہو۔ اور تَوَدُّ دوسرے ما سے حال ہونے کے محل میں ہے۔ اور اگر تَجِدُ کو بمعنی تعلم بنایا جائے تو پھر مُّحْضَرًا مفعول ثانی ہے۔ اور اسی طرح تَوَدُّ بھی دوسرے مفعول کے محل میں ہوگا۔ تقدیر عبارت یہ ہوگی یوم تجد کل نفس جزاء ما عملت محضرا اور یہ بھی جائز ہے کہ دوسرا ما مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہو۔ اور تَوَدُّ بھی مبتدا کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہو۔ اور یہ صحیح نہیں ہے کہ ما بمعنی جزا ہو۔ کیونکہ تَوَدُّ مرفوع ہے۔ اور اگر یہ ماضی ہوتا تو اس کا جزا ہونا جائز ہوتا اور کلام کا معنی اس طرح ہوتا: وما عملت من سوء ودت لو انّ بینھا و بینہ امدا بعیدا (اور جو کچھ برائی اس نے کی تھی وہ تمنا کرتا ہے کاش اس کے درمیان اور اس دن کے درمیان مدت دراز حائل ہو جاتی) یعنی جیسا کہ مشرق و مغرب کے درمیان بعد ہے۔ اور جب ما کو شرطیہ بنایا جائے تو فعل مضارع مجزوم ہوتا ہے، مگر یہ کہ تو اسے حذف فا پر محمول کرے۔ اور تقدیر کلام یہ ہو: وما عملت من سوء فھی تود۔ ابو علی نے کہا ہے: میرے نزدیک فراء کے قول کا یہی قیاس ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ میں کہا ہے کہ یہ حذف فا کی بنا پر ہے۔ اور الْاَمَدُ کا معنی غایت (انتہا) ہے اور اس کی جمع آماد ہے۔ اور کہا جاتا ہے استولی علی الأمد۔ ای غالب سابقا۔ وہ سبقت لیتے ہوئے غالب آ گیا۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے:

إلَّا لمثلك أو من انت سابقه سبق الجواد اذا استولى على الامد (1)

اور الامد کا معنی غضب بھی ہے۔ کہاجاتا ہے أمِدَ أمَدًا۔ اذا غضب غضباً۔ یعنی جب وہ شدید غصے ہو جائے تو یہ جملہ کہا جاتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

''(اے محبوب!) آپ فرمائیے (انہیں کہ) اگر تم (واقعی) محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ اور بخش دے گا تمہارے لئے گناہ اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

الحُبُّ کا معنی ہے محبت اور اسی طرح الحِبُّ بالکسر بھی ہے۔ اور الحِبُّ بمعنی الحبیب بھی ہے جیسا کہ الخِدن اور الخدین (دوست) ہے۔ کہاجاتا ہے أحبّه فهو مُحِبٌّ اور حبه يَحِبّه (بالکسر) فهو مَحْبُوبٌ (یعنی پہلا محبت کرنے والا اور دوسرا جس سے محبت کی جائے) جوہری نے کہا ہے: یہ شاذ ہے، کیونکہ مضاعف میں یفعل بالکسر نہیں آتا۔

ابوالفتح نے کہا ہے: اس میں اصل حَبُبَ ہے جیسا کہ ظَرُفَ پھر با کو ساکن کیا گیا اور اسے دوسری با میں مدغم کر دیا گیا۔ ابن اسدہان سعید نے کہا ہے: حَبَّ میں دو لغتیں ہیں: حَبَّ اور أحَبَّ اور اس بنا میں حَبَّ اصل میں حَبُبَ تھا جیسا کہ ظَرُفَ اس پر ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: حَبُبْتَ۔ اور فَعُلَ سے صفت کا صیغہ اکثر فَعِيلٌ کے وزن پر آتا ہے۔ ابوالفتح نے کہا ہے: اور أحَبَّ پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ یہ یا کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اور حُبَّ فَعُلَ کے وزن پر آتا ہے کیونکہ ان کا قول ہے حبیب۔ اور فعل کے وزن پر آتا ہے جیسا کہ ان کا قول محبوب ہے: اور حب متعدی سے اسم فاعل نہیں آتا، پس یہ نہیں کہاجاتا: أنا حَابٌّ۔ اور افعل سے اسم مفعول بہت کم آتا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے: مِنّي بمنزلة المُحَبّ المُكْرَمِ (میرے نزدیک معزز محبوب کے قائم مقام ہے) اور ابوزید نے بیان کیا ہے: حَبَبْتُه أحِبُّه۔

اور شعر بیان کیا:

فواللهِ لو لا تَمْرَة ما حببتُهُ ولا كان أدنىٰ من عُوَيف و هاشم

لعمرك انني و طِلابَ مِصْرٍ لَكَالمُزْدادِ مِمّا حَبَّ بُعْدَا

اصمعی نے بیان کیا ہے: حرف مضارع کو فتحہ دیا گیا ہے درآنحالیکہ یا اکیلی ہے۔ اور الحَبُّ الحابیه فارسی سے عربی بنایا گیا ہے۔ اور اس کی جمع حِبَاب اور حِبَبَةٌ آتی ہے۔ اسے جوہری نے بیان کیا ہے۔ اور یہ آیت وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے یہ گمان کیا کہ انہوں نے جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دعویٰ کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہے، محمد بن جعفر بن زبیر نے یہی کہا ہے (2)۔

اور حسن اور ابن جریج نے بیان کیا ہے: یہ آیت اہل کتاب کی ایک جماعت کے بارے نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا:

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 421، دارالکتب العلمیہ

2۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66

نحن الذین نحبُّ ربنا(1) ہم وہ ہیں جو اپنے رب سے محبت کرتے ہیں۔

اور روایت ہے کہ مسلمانوں نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم واللہ انا لنحب ربنا قسم بخدا! ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (2) ابن عرفہ نے کہا ہے: عربوں کے نزدیک محبة کا معنی ہے ارادة الشیٔ علی قصد له کسی شے کا قصد کرتے ہوئے اس کا ارادہ کرنا۔ اور ازہری نے کہا ہے: بندے کی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کا معنی اس کا ان دونوں کی اطاعت کرنا اور ان کے حکم کی اتباع کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ محبت کا معنی اس کا ان پر غفران اور بخشش کے ساتھ انعام فرمانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ان اللہ لا یحب الکافرین یعنی وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

اور سہل بن عبد اللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت قرآن کی محبت ہے اور قرآن کریم کی محبت کی علامت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی علامت سنت کی محبت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور قرآن کی محبت اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور سنت کی محبت کی علامت آخرت کی محبت ہے اور آخرت کی محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ سے محبت کرے اور اپنے نفس سے محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ دنیا سے بغض رکھے اور دنیا کے بغض کی علامت یہ ہے کہ وہ اس سے صرف زادراہ اور گزارے کی مقدار حاصل کرے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قول باری تعالیٰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ کے بارے میں روایت کیا ہے فرمایا: ''(کہ تم میری اتباع کرو) نیکی، تقویٰ، تواضع اور ذلة النفس میں'' اسے ابوعبد اللہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے(3)۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: مَن اراد ان یحبه الله فعلیه بصدق الحدیث و اداء الامانة و ألا یؤذی جاره۔

جو یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے تو اس پر لازم ہے کہ وہ سچ بولے، امانت ادا کرے اور یہ کہ وہ اپنے پڑوسی کو اذیت نہ پہنچائے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرمانے لگتا ہے تو وہ جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر (4)۔ پس حضرت جبریل امین بھی اس سے محبت فرمانے لگتا ہے: پھر وہ آسمان میں ندا دیتا ہے اور کہتا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں سے محبت کرتا ہے سو تم بھی اس سے محبت کرو تو پھر اہل آسمان بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں فرمایا

پھر اسے زمین میں قبول عام عطا فرما دیا جاتا ہے اور جب وہ کسی بندے کو مبغوض جانے تو جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے: بلاشبہ میں فلاں کو ناپسند کرتا ہوں پس تو بھی اسے ناپسند کر پھر جبریل امین علیہ السلام بھی اسے ناپسند کرتے ہیں پھر

1۔ اسباب النزول للواحدی، جلد 1، صفحہ 66　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 4، صفحہ 272

3۔ نوادر الاصول فی معرفۃ احادیث الرسول، قل ان کنتم تحبون، صفحہ 199

4۔ صحیح بخاری، باب ذکر الملائکۃ، حدیث نمبر 2970، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

آسمان کے باسیوں میں اعلان کر دیتے ہیں: بے شک اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتا ہے تو تم بھی اسے مبغوض جانو ... فرمایا۔ پس وہ بھی اسے مبغوض جانتے ہیں پھر زمین میں اس کے لئے نفرت رکھ دی جاتی ہے(1)"۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ مریم کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابورجا العطاردی نے فَاتَّبِعُوْنِیْ یا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور وَیَغْفِرْ لَکُمْ کا عطف یُحْبِبْكُمُ پر کیا ہے۔ اور محبوب نے ابو عمرو بن علاء سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یغفر کی را کو لَکُمْ کی لام میں مدغم کر دیا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: امام خلیل اور سیبویہ را کو لام میں ادغام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور ابو عمرو نے اس طرح کی غلطی کرنے سے صرف نظر کیا ہے شاید وہ حرکت کو مخفی کر دیتے ہیں جیسا کہ وہ کثیر اشیاء میں ایسا کرتے ہیں۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ۝۳۲

"آپ فرمائیے اطاعت کرو اللہ کی اور (اس کے) رسول کی پھر اگر وہ منہ پھیریں تو یقیناً اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا کفر کرنے والوں کو۔"

قولہ تعالیٰ: قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا یہ شرط ہے، مگر چونکہ یہ ماضی ہے اسے اعراب نہیں دیا جا سکتا (یعنی یہ معرب نہیں ہے) اور تقدیر کلام یہ ہے فان تولوا علی کفرھم و اعرضوا عن طاعۃ اللہ و رسولہ۔ (اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول معظم ﷺ کی اطاعت سے اعراض کر لیں) فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے فعل کو پسند نہیں کرتا اور وہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اور فرمایا: فَاِنَّ اللّٰهَ یہ نہیں کہا: فانہ کیونکہ عرب جب کسی شے کی عظمت بیان کرتے ہیں تو اس کے ذکر کا اعادہ کرتے ہیں۔

جیسا کہ سیبویہ کے اس شعر میں ہے:

لا أری الموتَ یسبِقُ الموتَ شیٌ نَغَّصَ الموتُ ذَا الغِنَی وَالفقیرا

میں موت کو نہیں پاتا کہ کوئی شے موت سے سبقت لے جا سکتی ہے موت نے خوشحال اور فقیر آدمی کی زندگی کو مکدر اور بدمزہ کر دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝۳۳ لا

"بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا آدم اور نوح اور ابراہیم علیہم السلام کے گھرانے کو اور عمران کے گھرانے کو سارے جہان والوں پر۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا۔ اصْطَفٰۤى بمعنی اختار ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا۔ سورۃ البقرہ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح آدم کا مادہ اشتقاق اور آپ کی کنیت کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ان اللہ اصطفی

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 331

دینھم بے شک اللہ تعالیٰ نے ان کا دین چن لیا اور وہ دین، دین اسلام ہے، سو مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور زجاج نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے زمانے کے رہنے والوں پر نبوت کے لئے چن لیا اور وَنُوۡحًا کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ نام ینوح سے مشتق ہے اور یہ عجمی اسم ہے مگر یہ منصرف ہے کیونکہ یہ سہ حرفی ہے (اور اس کا درمیان والا حرف ساکن ہے۔) اور آپ مرسلین کے شیخ ہیں اور آپ ہی پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے بعد اہل زمین کی طرف مبعوث فرمایا اور ساتھ ہی بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں اور تمام قرابت رکھنے والی عورتیں حرام قرار دیں۔ اور جس کسی نے یہ کہا ہے کہ بعض مؤرخین کے نزدیک حضرت ادریس علیہ السلام آپ سے پہلے تھے، اسے وہم ہی ہے اس کا بیان سورۃ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ اٰلَ کا معنی اور جس پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں ہو چکا ہے۔ اور بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: آل ابراہیم اور آل عمران سے مراد وہ مومنین ہیں جو آل ابراہیم، آل عمران، آل یاسین اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے مومنین ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَـلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ (1) (آل عمران) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل ابراہیم سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے اور یہ کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم بھی آل ابراہیم میں سے ہیں (2)۔ اور یہ قول بھی ہے کہ آل ابراہیم سے مراد ان کی اپنی ذات ہے۔ اور اسی طرح آل عمران ہے، اس کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ هٰرُوۡنَ (البقرہ: 248) (اور (اس میں) بچی ہوئی چیزیں ہوں گی جنہیں چھوڑ گئی ہے اولاد موسیٰ اور اولاد ہارون (3))

اور حدیث میں ہے: ''مجھے آل داؤد کی دعاؤں میں سے ایک دعا عطا کی گئی'' (4)

اور شاعر نے کہا ہے:

ولا تبك مَيِّتا بعد ميت أَحبّه عليّ و عبّاس وآلُ ابی بكر (5)

اور تو نہ رو کسی میت پر اپنے سب سے زیادہ محبت کرنے والوں کے مرنے کے بعد یعنی حضرت علی، حضرت عباس اور آل ابی بکر۔ اس میں آل ابی بکر سے مراد ان کی ذات ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

يُلاقى من تذكُّرِ آلِ لَيْلٰى كما يَلقَى التَسلِيمُ من العِدَادِ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، جلد 1، صفحہ 488 2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 452
3۔ صحیح بخاری، فضائل القرآن، جلد 2، صفحہ 755 4۔ صحیح بخاری، باب حسن الصوت بالقراءۃ للقرآن، حدیث 4660، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 423، دار الکتب العلمیہ

اس میں تذکر آل لیلیٰ سے مراد اس کی ذات ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آل عمران ہی آل ابراہیم ہے۔
جیسا کہ فرمایا: ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ اور یہ قول بھی ہے کہ مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ آپ کی والدہ عمران کی بیٹی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: ان کی اپنی ذات مراد ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے۔ مقاتل نے کہا ہے: وہ عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے باپ ہیں اور وہ عمران بن یصہر بن فاہاث بن لاوی بن یعقوب ہیں (1)۔
اور کلبی نے کہا ہے: وہ مریم کے باپ عمران ہیں اور وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ اور سہیلی نے بیان کیا ہے: وہ عمران ابن ماتان ہیں اور ان کی بیوی حنہ (بالنون) ہے۔ انبیاء علیہم السلام میں سے خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے کیونکہ تمام کے تمام انبیاء ورسل علیہم السلام انہیں کی نسل میں سے ہیں۔ اور عمران غیر منصرف ہے کیونکہ اس کے آخر میں الف نون زائدتان ہے۔ اور قولہ تعالیٰ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ کا معنی ہے علی عالمی زمانہم۔ (یعنی انہیں اپنے زمانے کے باسیوں پر چن لیا)، یہ اہل تفسیر کے قول کے مطابق ہے اور ترمذی حکیم ابو عبداللہ محمد بن علی نے کہا ہے: جمیع الخلق کلھم یعنی تمام مخلوق پر۔ اور کہا گیا ہے: عَلَى الْعٰلَمِيْنَ صور پھونکنے کے دن تک تمام مخلوق پر (انہیں چن لیا) اور یہ اس لئے کہ یہ رسل اور انبیاء علیہم السلام تھے اور یہی مخلوق میں چنے ہوئے تھے۔
اور رہے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم! تو آپ کا مرتبہ (مقام) اصطفاء سے کہیں بلند ہے کیونکہ آپ تو اللہ تعالیٰ کے حبیب اور رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (الانبیاء) پس اور رسل علیہم السلام رحمت کے لئے پیدا کئے گئے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو سراپا رحمت تخلیق فرمایا گیا۔ اسی لئے آپ مخلوق کے لئے امان بن گئے، جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا تو مخلوق یوم قیامت تک عذاب سے محفوظ و مامون ہوگئی۔ اور بقیہ تمام انبیاء علیہم السلام اس مقام پر فائز نہ ہوئے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أنا رحمة مهداة (2) آپ خبر دے رہے ہیں کہ آپ کی ذات اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے رحمت ہے۔ اور آپ کا قول مهداة کا معنی ہے: آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کے لئے ہدیہ اور تحفہ ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے ساتھ چنا، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دست قدرت کے ساتھ انتہائی حسین صورت میں تخلیق فرمایا، دوسری یہ ہے کہ انہیں تمام چیزوں کے اسماء سکھا دیئے، تیسری یہ ہے کہ ملائکہ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ انہیں سجدہ کریں، چوتھی یہ ہے کہ انہیں جنت میں سکونت عطا فرمائی اور پانچویں یہ ہے کہ انہیں ابو البشر بنایا اور پانچ چیزوں کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کو منتخب فرمایا: پہلی یہ کہ آپ کو ابو البشر بنایا کیونکہ پہلے تمام کے تمام لوگ غرق کر دیئے گئے اور صرف آپ کی ذریت اور اولاد ہی باقی رہی۔ اور دوسری یہ کہ آپ کو طویل عمر عطا فرمائی اور کہا جاتا ہے: مبارک اور بشارت ہے اس کے لئے جس کی عمر طویل ہو اور اس کا عمل حسین اور اچھا ہو (3)۔ اور تیسری یہ کہ کفار اور مومنین کے بارے میں آپ کی دعا کو قبول فرمایا اور چوتھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 453　2۔ شعب الایمان، کتاب حب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، جلد 2، صفحہ 164، حدیث نمبر 1446
3۔ جامع ترمذی، باب ماجاء فی طول العمر للمومن، حدیث نمبر 2251، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یہ ہے کہ آپ کو کشتی پر اٹھایا اور پانچویں یہ کہ آپ پہلے آدمی تھے جنہوں نے احکام شرعیہ کو منسوخ کیا۔ آپ سے پہلے خالاؤں اور پھوپھیوں سے شادی کرنا حرام نہ تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پانچ چیزوں کے ساتھ چنا: پہلی یہ کہ آپ کو ابو الانبیاء بنایا، کیونکہ یہ روایت ہے کہ آپ کے زمانہ سے لے کر حضور نبی مکرم ﷺ کے زمانہ تک آپ کی صلب سے ایک ہزار نبی تشریف لائے اور دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا خلیل بنایا، تیسری یہ کہ آپ کو نار نمرود سے نجات عطا فرمائی (اور آگ آپ کے لئے گلزار بنا دیا) اور چوتھی یہ کہ آپ کو لوگوں کا امام بنایا اور پانچویں یہ کہ آپ کو کچھ کلمات کے ساتھ آزمایا اور آپ کو توفیق عطا فرمائی یہاں تک کہ آپ نے انہیں مکمل فرمالیا۔ (یعنی آپ تمام آزمائشوں میں کامیاب و کامران ہوئے) پھر فرمایا وَاٰلَ عِمْرٰنَ اگر عمران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے والد ہیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو زمین پر چن لیا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی قوم پر من وسلویٰ نازل فرمایا اور عالم میں انبیاء علیہم السلام میں سے کسی ایک کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا۔ اور اگر عمران حضرت مریم علیہا السلام کے باپ ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مریم کو چن لیا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے جنم دیا اور عالم میں کسی کے لئے بھی ایسا نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"یہ ایک نسل ہے بعض ان میں سے بعض کی اولاد ہیں اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔"

ذُرِّيَّةً کا معنی اور اس کا مادہ اشتقاق سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہاں یہ حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ ای فی حال کون بعضھم من بعض یعنی اس حال میں کہ وہ بعض بعض سے ہیں، ای ذریۃ بعضھا من ولد بعض یعنی ایک نسل ہے درآنحالیکہ ان میں سے بعض بعض کی اولاد میں سے ہیں۔ کوفیوں نے کہا ہے: بالقطع یہی ہے۔
زجاج نے کہا ہے: یہ بدل ہے ای اصطفی ذریۃ بعضھا من بعض (یعنی اللہ تعالیٰ نے چن لیا ایک نسل کو جن میں سے بعض بعض کی اولاد ہیں) اور بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ کا معنی ہے یعنی دین میں ایک دوسرے کی مدد کرنے میں (باہم معاون ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض یعنی ضلالت و گمراہی میں (وہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں)، حسن اور قتادہ نے یہی کہا ہے (1) اور بعض نے کہا ہے: وہ اجتباء، اصطفاء اور نبوت میں ایک دوسرے کا بعض ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے اور یہ (معنی) سب سے کمزور ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۗ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 2، صفحہ 10

''جب عرض کی عمران کی بیوی نے اے میرے رب! میں نذر مانتی ہوں تیرے لئے جو میرے شکم میں ہے (سب کاموں سے) آزاد کر کے، سو قبول فرمالے (یہ نذرانہ) مجھ سے بے شک تو ہی (دعائیں) سننے والا، (نیتوں کو) جاننے والا ہے۔ پھر جب اس نے جنا اسے (تو حیرت وحسرت سے) بولی اے رب! میں نے تو جنم دیا ایک لڑکی کو اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا۔ اور نہیں تھا لڑکا (جس کا وہ سوال کرتی تھی) مانند اس لڑکی کے۔ اور (ماں نے کہا) میں نے نام رکھا ہے اس کا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ ابو عبیدہ نے کہا ہے: اِذْ زائدہ ہے اور محمد بن یزید نے کہا ہے: تقدیر کلام ہے اذکر اذ۔ اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اصطفی آل عمران اذ قالت امرأة عمران۔ اللہ تعالیٰ نے آل عمران کو چن لیا جب عمران کی بیوی نے عرض کی۔ اور یہ حنہ بنت فاقود بن قنبل حضرت مریم علیہا السلام کی ماں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دادی تھی۔ یہ عربی نام نہیں ہے اور نہ ہی عربی میں کسی عورت کا نام حنہ معروف ہے۔ عربی میں ابو حنہ البدری ہے۔ اور اس میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ ابو حبہ ہے اور یہی اصح ہے اور اس کا نام عامر ہے۔ اور حنہ کی خانقاہ شام میں ہے اور ایک دوسری بھی ہے اسے بھی دیر حنہ ہی کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ ابو نواس نے کہا ہے:

يا دَيْرَ حَنَّةَ من ذات الأكَيْرَاحِ   مَن يَصْحُ عنك فانى لستُ بالصاحِي

اس میں یا دَیْرَ حَنَّہ سے استشہاد کیا گیا ہے۔

اور عرب میں حبہ تو کثیر ہیں، ان میں سے ایک ابو حبہ انصاری ہیں اور ابو السنابل بن بعکک جو کہ حدیث سبیعہ میں مذکور ہیں (1)۔ وہ بھی حبہ ہیں اور خنہ خا معجمہ کے ساتھ تو کوئی معروف نہیں سوائے بنت یحییٰ بن اکثم القاضی کے اور یہ محمد بن نصر کی ماں ہے اور جنہ تو کوئی معروف نہیں سوائے ابو جنہ کے اور یہ ذی الرمہ شاعر کا ماموں ہے یہ سب ابن ماکولا کی کتاب سے لیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا، نذر کا معنی پہلے گزر چکا ہے اور یہ (نذر) بندے پر لازم نہیں ہوتی مگر اس طرح کہ بندہ خود اسے اپنے اوپر لازم کرتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ جب حاملہ ہوئیں تو انہوں نے کہا: اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے نجات عطا فرمائی اور میں نے اسے جنا جو میرے پیٹ میں ہے تو میں اسے (سب کاموں سے) آزاد کردوں گی۔ اور لَكَ کا معنی ہے لعبادتک یعنی تیری عبادت کے لئے اور مُحَرَّرًا حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ مفعول محذوف کی صفت ہے یعنی انی نذرت لك ما فی بطنی غلاما محررا تفسیر، سیاق کلام اور اعراب (ترکیب) کے اعتبار سے پہلا مفہوم زیادہ اولی اور بہتر ہے، کیونکہ جہاں تک ترکیب کا تعلق ہے تو نعت کو منعوت کے قائم

1۔ صحیح بخاری، باب فضل من شهد بدرا، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مقام رکھنا کئی مقامات پر جائز نہیں ہوتا اور کئی دوسرے مقامات پر مجازی طور پر جائز ہوتا ہے اور رہی تفسیر، تو کہا گیا ہے کہ عمران کی بیوی کے اس قول کا سبب یہ ہے کہ وہ عمر رسیدہ تھی بچے کو جنم نہ دے سکتی تھی۔

اور یہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں رہ رہے تھے اور وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے ایک پرندے کو دیکھا وہ اپنے بچے کو چوگ دے رہا تھا تو اس وجہ سے اس کے دل میں بھی اضطراب اور حرکت پیدا ہوئی اور اس نے اپنے رب سے دعا مانگی کہ وہ اسے بچہ عطا فرمائے اور نذر مانی کہ اگر اس نے (بچہ) جنا تو وہ اسے (ہر کام سے) آزاد کر دے گی۔ یعنی وہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کے لئے آزاد ہوگا۔ عبادت گاہ کا خادم ہوگا اور اسی کے لئے وقف ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ ہوگا۔ اور ایسا کرنا ان کی شریعت میں جائز تھا اور ان کی اولاد پر لازم تھا کہ وہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ پس جب اس نے حضرت مریم علیہا السلام کو جنم دیا تو کہا: رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى اے رب! میں نے ایک لڑکی کو جنم دیا ہے۔ یعنی لڑکی تو کنیسہ کی خدمت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کہا گیا ہے یا اس وجہ سے کہ اسے حیض اور دیگر تکلیفیں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: (یا اس وجہ سے) کہ وہ مردوں کے ساتھ اختلاط اور میل جول کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اور وہ امید کر رہی تھی کہ وہ بچہ ہوگا پس اسی وجہ سے اس نے اسے آزاد کر دیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عمران کی بیوی کے حمل تک نذر کوئی راستہ نہیں پا سکتی کیونکہ وہ آزاد تھی۔ اور اگر اس کی بیوی کنیز ہوتی تو بھی کوئی اختلاف نہیں کہ آدمی کے لئے اپنے بچے کے بارے میں نذر ماننا صحیح نہیں ہوتا تو کیونکر اس نے اس کی حالت میں تصرف کر لیا، کیونکہ اگر نذر ماننے والا غلام ہو تو اس بارے میں اس کا کوئی قول مضبوط اور پختہ نہیں۔ اور اگر آزاد ہو تو یہ صحیح نہیں کہ وہ اس کا مملوک ہو۔ اور عورت بھی اسی طرح ہے تو پھر اس بارے میں نذر کی وجہ کیا ہے؟ بلاشبہ اس کا حقیقی معنی تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے شک آدمی اپنے بچے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ وہ اس سے انس حاصل کرے، اس سے مدد لے اور اس کے ساتھ اطمینان اور تسلی پائے۔ پس اس عورت نے بھی بچے سے انس حاصل کرنے اور سکون اور راحت پانے کے لئے بچے کی خواہش اور طلب کی تو جب اللہ تعالیٰ نے اس پر احسان فرما دیا تو اس نے نذر مانی کہ وہ اس سے انس حاصل کرنے کے اپنے حصہ سے دستبردار ہوتی ہے اور وہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے وقف ہوگا۔ اور یہ نیکوکار آزاد لوگوں کی نذر ہے۔ اور اس نے اس سے ارادہ یہ کیا ہے کہ وہ میری جانب سے آزاد ہوگا اور دنیا کی غلامی اور اس کی مشغولیت سے آزاد ہوگا۔ صوفیاء میں سے ایک آدمی نے اپنی ماں کو کہا: اے ماں! تو مجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دے میں اس کی عبادت کروں گا اور علم حاصل کروں گا تو ماں نے کہا: ہاں (میں نے تجھے چھوڑ دیا) پس وہ چلا گیا یہاں تک کہ اس نے غور و فکر کیا تو پھر ماں کی طرف واپس لوٹ کر آیا اور دروازے پر دستک دی تو ماں نے پوچھا: کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میں تیرا فلاں بیٹا ہوں۔ تو ماں نے کہا: ہم نے تجھے اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ دیا ہے اور ہم تجھے واپس نہیں لوٹائیں گے (1)۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مُحَرَّرًا یہ ماخوذ ہے اس حریۃ (آزادی) سے جو عبودیۃ (غلامی) کی ضد ہے۔ اسی

1۔ احکام القرآن للجصاص، جلد 1، صفحہ 270

سے تحریر الکتاب ہے اور وہ اسے اضطراب اور فساد سے خالص (خالی) کرنا ہے۔ اور خصیف نے حضرت عکرمہ اور حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ محرر وہ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو اور امور دنیا میں سے کسی شے کی اس میں آمیزش نہ ہو۔ اور لغت میں یہ معروف ہے کہ ہر شے جو خالص ہو اسے حر (آزاد) کہا جاتا ہے۔ اور محرر اسی معنی میں ہے۔

جیسا کہ ذوالرمہ نے بھی کہا ہے:

والقُرطُ فی حرّۃ الذِّفرَی مُعَلَّقُهٗ		تباعد الحبلُ منه فهو یَضطرب

اور طین حرّ وہ مٹی جس میں ریت نہ ہو، باتت فلانة بلیلة حُرّۃٍ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب پہلی رات خاوند عورت کے پاس نہ آئے اور اگر وہ اس پر قدرت پالے تو پھر اس کی رات لیلۃ شیباء کہلائے گی۔

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: اس نے یہ کہا ہے کیونکہ نذر میں صرف مذکر قبول کیا جاتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو قبول فرمالیا۔ اور ترکیب کلام میں اُنْثٰی حال ہے اور اگر چاہے تو اسے بدل بنالے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس نے ان کی تربیت اور پرورش کی یہاں تک کہ وہ جوان ہوگئی تو اس وقت انہیں (آزاد) چھوڑ دیا، اشہب نے اسے مالک سے روایت کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نے اسے ایک کپڑے میں لپیٹا اور مسجد چھوڑ آئی اور اپنی نذر کو پورا کردیا اور اس سے برأت اختیار کرلی۔ شاید ان میں حجاب (پردہ) نہیں تھا جیسا کہ ابتدائے اسلام میں تھا اور بخاری اور مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک سیاہ رنگ کی عورت مسجد میں جھاڑو دیتی تھی اور وہ فوت ہوگئی۔ الحدیث۔ (1)

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ یہ اس کی قرأت کے مطابق ہے جس نے وَضَعْتُ تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ من جملہ اس کا کلام ہے، کیونکہ کلام متصل ہے اور یہ ابوبکر اور ابن عامر کی قرأت ہے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا اور اس کے لئے خضوع اور پاکی بیان کرنے کا معنی ہے۔ (اس سے کہ اس پر کوئی شے مخفی ہے۔) اور اس نے یہ بطریق اخبار نہیں کہا کیونکہ مومن کے دل میں یہ پختہ اور ثابت شدہ امر ہے کہ ہر شے کے بارے میں اللہ تعالیٰ جانتا ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور تنزیہ بیان کرنے کے طریقہ پر کہا ہے۔ اور جمہور کی قرأت کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہے جو پہلے لایا گیا ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے کہ یہ وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ سے موخر ہو وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ، مہدوی نے یہی کہا ہے۔ اور مکی نے کہا ہے: یہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تثبیت کے طریقہ پر اطلاع ہے پس فرمایا: اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے اس کے بارے جو مریم کی ماں نے جنا وہ اس کے بارے کچھ کہے یا نہ کہے۔ اور اسے اس سے بھی قوت حاصل ہوتی ہے کہ اگر یہ حضرت مریم کی ماں کے کلام سے ہوتا تو کلام کا انداز یہ ہوتا: وانت اعلم بما وضعت، (اور تو بہتر جانتا ہے اس کے بارے جو میں نے جنا) کیونکہ اس نے اپنے قول میں پہلے کلام اس طرح پکارا ہے: رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بِمَا وَضَعْتِ تا کے کسرہ کے ساتھ مروی ہے۔ یعنی اسے یہ کہا گیا۔

1۔ صحیح بخاری، باب کنس المسجد والتقاط الخرق والقذی والعیدان، حدیث نمبر 438، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ بعض شافعیہ نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ رمضان المبارک میں دن کے وقت وطی کے سلسلہ میں عورت اپنے خاوند کی پیروی اور مطاوعت اختیار کرے تو وجوب کفارہ میں مرد عورت کے مساوی نہیں ہوگا۔

ابن عربی نے کہا ہے: اور یہ ان کی طرف سے غفلت ہے، کیونکہ یہ خبر ہم سے پہلے والوں کی شریعت میں سے ہے اور وہ اس طرح کا قول نہیں کرتے تھے۔ اور اس صالحہ عورت نے اپنے کلام کے ساتھ اس کا قصد کیا ہے جس کے بارے اس کی ظاہر حالت اور اس کے کلام کا مقطع شہادت دیتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے بچے کے لئے مسجد کی خدمت کرنے کی نذر مانی تھی۔ پس جب اس نے اسے بچی دیکھا جو اس کی صلاحیت نہیں رکھتی تو چونکہ وہ عورت ہے تو اس نے اپنے مقصود کے خلاف پانے جانے کی وجہ سے اپنے رب کی بارگاہ میں معذرت پیش کی اور ''مریم'' غیر منصرف ہے کیونکہ یہ مونث معرفہ ہے اور یہ عجمی بھی ہے۔ نحاس نے اسی طرح کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ان کی لغت میں مریم کا معنی خادم الرب ہے۔ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ اس میں ھا ضمیر سے مراد مریم ہے۔ وَذُرِّيَّتَهَا مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کبھی ذریت کا اطلاق صرف بیٹے پر ہوتا ہے (1)۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے شیطان اسے کچوکا لگاتا ہے اور وہ شیطان کے کچوکا لگانے سے چیخ کر روتا ہے سوائے ابن مریم اور ان کی ماں کے۔'' پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو۔ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ہمارے علماء نے کہا ہے: پس اس حدیث نے یہ فائدہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی دعا کو قبول فرمایا ہے۔ کیونکہ شیطان سوائے مریم اور ان کے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کے تمام اولاد آدم کو حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء کو بھی کچوکے لگاتا ہے۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: ہر بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پہلو میں کچوکا لگاتا ہے سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں کے، ان دونوں کے درمیان حجاب ڈال دیا گیا پس اس کا کچوکا حجاب پر لگا اور دونوں کے لئے اس سے کوئی شے پار نہ ہوئی (2)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر اس طرح نہ ہو تو پھر ان دونوں کی خصوصیت باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ شیطان کے کچوکا لگانے سے جس کو مس کیا گیا ہے اس کو گمراہ کرنا اور بھٹکانا اس سے لازم آتا ہے، کیونکہ یہ ظن فاسد ہے۔ پس کتنے انبیاء اور اولیاء ہیں کہ شیطان نے فساد اور بھٹکانے کے طرح طرح کے طریقوں سے ان سے تعرض کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے محفوظ و مامون رکھا جو شیطان کا ارادہ تھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ (الحجر:42) (بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی بس نہیں چلتا۔) یہ اس کے باوجود ہے کہ بنی آدم میں سے ہر ایک کو شیاطین میں سے اس کے ساتھی کے حوالے کیا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (3)

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب صفۃ ابلیس وجنودہ، حدیث نمبر 3044، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2323

پس حضرت مریم اور ان کا بیٹا اگرچہ دونوں شیطان کے کچوکے سے بچا لیے گئے ہیں لیکن ان دونوں کو اس کی ملازمت اور مقارنت سے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ واللہ اعلم۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

''پھر قبول فرمایا اسے اس کے رب نے بڑی ہی اچھی قبولیت کے ساتھ اور پروان چڑھایا اسے اچھا پروان چڑھانا اور نگران بنا دیا اس کا زکریا کو جب بھی جاتے مریم کے پاس زکریا (اس کی) عبادت گاہ میں (تو) موجود پاتے اس کے پاس کھانے کی چیزیں (ایک بار) بولے اے مریم! کہاں سے تمہارے لئے آتا ہے یہ (رزق) مریم بولیں یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے بے حساب۔ وہیں دعا مانگی زکریا نے اپنے رب سے عرض کی اے میرے رب! عطا فرما مجھ کو اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد بے شک تو ہی سننے والا ہے دعا کا۔''

قولہ تعالیٰ: فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ اس کا معنی ہے: اسے سعداء کے راستے پر چلایا۔ یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: تقبل کا معنی ہے تربیت میں کفیل بننا اور اس کے معاملات کو ادا کرنا۔ اور حسن نے کہا ہے تُقَبُّل کا معنی ہے کہ اس کے رب نے اسے رات، دن میں سے کبھی ایک ساعت بھی اذیت اور تکلیف نہیں دی۔ اور وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا سے مراد ہے اس کی خلقت کو بغیر کسی کمی و بیشی کے صحیح بنایا، پس وہ ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا عام بچہ سال میں نشوونما پاتا ہے۔ قبول اور نبات دونوں مصدر ہیں لیکن اپنے فعل کے ہم وزن مصدر نہیں۔ فی الحقیقت مصدر تَقَبُّلًا اور اِنْبَاتًا ہیں۔

شاعر نے کہا:

اَكُفْرًا بعد ردّ الموت عنّی و بعدَ عطائكَ المائةَ الرّتاعا

شاعر کی مراد بعدِ اعطائِك ہے۔ لیکن جب کہا اَنْۢبَتَهَا تو یہ نَبَتَ پر دلیل ہے (انبات بنت کو مستلزم ہے)

اسی طرح امرؤ القیس نے کہا ہے۔

فصِرنا الی الحسنٰی ورق کلامُنا و رُضتُ فذلّت صعبةً ای اِذلالِ

باشبہ ذَلَّتْ کا مصدر ذُلٌّ ہے۔ لیکن اس نے اسے اَذْلَلْتُ کے معنی پر لوٹا دیا ہے اور اسی طرح ہر اس کا حال ہے جو اس باب میں آتا ہے۔ پس تَقَبَّلَ اور قَبِلَ کا معنی ایک ہے۔ پس معنی ہوا فقبلها رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ کہ اس کے رب نے اسے اچھی

طرح قبول کرلیا۔

اور اسی کی مثل روبہ کا قول ہے۔

وقد تَطَوَّيْتُ انطواءَ الحِضْب

اس میں تَطَوَّيْتُ اور انطویت کا معنی ایک ہے۔

اور اسی کی مثل القطامی کا قول ہے:

و خیر الامر ما استقبلت منه　و لیس بأن تَتَبَعَهُ اتباعا

کیونکہ تَتَبَّعْتُ اور اتبعت دونوں ہم معنی ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے وَاَنْزَلَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَنْزِيْلًا کیونکہ نزّل اور اَنْزَلَ کا معنی ایک ہے۔ اور مفضل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے۔ وانبتها فنَبَتَتْ نباتًا حسنًا۔ (اس کے رب نے اسے پروان چڑھایا اور وہ خوب اچھی طرح پروان چڑھی۔) اور معنی کی رعایت کرنا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اور قبول میں اصل ضمہ ہے کیونکہ یہ مصدر ہے جیسا کہ دُخول اور خُروج۔ اور فتحہ قلیل حروف میں آیا ہے جیسا کہ وَلوع اور وَزوع۔ یہ تین ہیں ان کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ابو عمرو، کسائی اور ائمہ نے یہی کہا ہے۔ اور زجاج نے ''قبول'' کو اصل کی بنا پر قاف کے ضمہ کے ساتھ جائز قرار دیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا یعنی مریم کو حضرت زکریا علیہ السلام کے ساتھ ملا دیا (سپرد کر دیا)۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: وہ اس کی دیکھ بھال کے ضامن بن گئے۔ کوفیوں نے وَكَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے: وکفلها ربّها زکریا، یعنی اس کی کفالت ان کے ذمہ لازم کر دی۔ اور اس پر انہیں مقرر کر دیا اور اسے ان کے لئے آسان بنا دیا۔

اور مصحف ابی میں ہے واکفلها متعدی میں ہمزہ تشدید کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہ اس سے پہلے فَتَقَبَّلَهَا اور اَنْۢبَتَهَا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں خبر دی اس کے بارے جو اس کے ساتھ کیا، پس اسی وجہ سے كَفَّلَهَا تشدید کے ساتھ ذکر کیا۔ اور باقیوں نے فعل کی نسبت حضرت زکریا علیہ السلام کی طرف کرنے کی بنا پر اسے مخفف پڑھا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ وہ اس کی کفالت اور اس کے معاملات کے والی اور نگران بن گئے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ (ان میں سے کون مریم کی نگرانی کرے گا؟) مکی نے کہا ہے: یہی پسندیدہ ہے، کیونکہ تشدید بھی تخفیف کی طرف ہی لوٹتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب اسے زکریا علیہ السلام کی نگرانی میں دیا تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے ضامن اور نگران بنے۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے کفیل بنے تو وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی قدرت کے ساتھ ہی بنے۔ پس اس بناء پر دونوں قرأتیں باہم متداخل ہیں۔

عمرو بن موسیٰ نے عبداللہ بن کثیر اور ابی عبداللہ المزنی سے وَكَفِلَهَا فا کے کسرہ کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: کہا جاتا ہے كَفَلَ يَكْفُلُ اور كَفِلَ يَكْفَلُ (یعنی یہ دونوں باب ہیں) اور میں نے كَفُلَ نہیں سنا، حالانکہ یہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

اور مجاہد نے فَتَقَبَّلْهَا سوال اور طلب کی بنا پر لام کو سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور رَبَّهَا کو نصب کے ساتھ اس لئے کہ اس کی نسبت (حرف) ندا کی طرف ہے۔ اور وَاَنْبِتْهَا میں تا کو سکون کے ساتھ وَكَفِّلْهَا میں لام کو سکون کے ساتھ، اور ''زکریا'' کو مد اور نصب کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص، حمزہ اور کسائی نے ''زکریا'' کو بغیر مد اور ہمزہ کے پڑھا ہے اور باقیوں نے اسے مد کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور فراء نے کہا ہے: اہل حجاز ''زکریا'' کو مد کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس میں قصر کرتے ہیں۔ اور اہل نجد اس سے الف کو حذف کر دیتے ہیں اور اسے منصرف پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں: زکرئ۔

اخفش نے کہا ہے: اس میں چار لغات ہیں: مد اور قصر اور زکرِیّ یا کی تشدید اور منصرف اور زکرِی اور رأیت زکرِیا۔ ابو حاتم نے کہا ہے: زکری غیر منصرف ہے کیونکہ یہ عجمہ ہے اور یہ غلط ہے، کیونکہ جو اس میں ''یا'' ہے اس طرح کے الفاظ منصرف ہوتے ہیں مثلاً کرسی اور یحییٰ اور زکریا مد اور قصر کی صورت میں منصرف نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث، عجمہ اور تعریف ہے۔

قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝

اس میں چار مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ لغت میں محراب سے مراد مجلس میں قابل تکریم جگہ ہے۔ اس کا مزید بیان سورۂ مریم میں آئے گا۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ ''(حضرت مریم) ایک کمرہ میں رہتی تھیں اور حضرت زکریا علیہ السلام ان کے پاس سیڑھی سے چڑھ کر آتے تھے۔

جیسا کہ وضاح الیمن نے کہا ہے:

رَبَّةُ مِحرابٍ اذا جئتُها　　لم أَلقَها حتى ارتقِي سُلَّما

محراب (مکان) میں رہنے والی، جب بھی میں اس کے پاس آتا ہوں تو میں اس سے ملاقات نہیں کر سکتا یہاں تک کہ میں سیڑھی چڑھتا ہوں۔

اس سے مراد رَبَّةُ غُرْفَةٍ ہے۔ ابو صالح نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: عمران کی بیوی عمر رسیدہ ہونے کے بعد حاملہ ہوئی تو اس نے نذر مانی کہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے، تو عمران نے اسے کہا: تیری ہلاکت ہو! تو نے کیا کیا ہے؟ تیرا کیا خیال ہے اگر وہ بچی ہوئی؟ تو اس وجہ سے دونوں ہی مغموم ہو گئے۔ پھر عمران فوت ہو گئے اور حنہ حاملہ تھی اس نے بچی کو جنم دیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے خوب اچھی طرح قبول کر لیا اور وہ صرف بچوں کو آزاد چھوڑتے تھے، تو علماء نے ان قلموں کے ساتھ اس کے بارے قرعہ اندازی کی جن کے ساتھ وہ وحی لکھتے تھے۔ جیسا کہ آگے آئے گا۔ پس زکریا علیہ السلام کو اس پر نگران مقرر کر دیا اور انہوں نے اس کے لئے ایک جگہ بنائی اور جب وہ تھوڑی بڑی عمر کی ہو گئی تو آپ نے اس کے لئے محراب بنا دیا اور اس جگہ کی طرف آپ سیڑھی کے ساتھ اوپر چڑھتے تھے اور آپ نے اس کے لئے ایک دایہ (دودھ

پلانے والی) اجرت پر رکھی اور آپ اس پر دروازہ بند کر جاتے تھے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کے سوا کوئی اس کے پاس داخل نہ ہو سکتا تھا یہاں تک کہ وہ بڑی ہو گئی۔ پس جب وہ حائضہ ہوئی تو آپ اسے اپنے گھر کی طرف نکال کر لے گئے اور وہ اپنی خالہ کے پاس رہنے لگی اور کلبی کے قول کے مطابق اس کی خالہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی تھی۔ مقاتل نے کہا ہے: اس کی بہن حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ تھی۔ اور جب وہ حیض سے پاک ہو گئی اور اس نے غسل کر لیا تو آپ اسے محراب کی طرف لوٹا لائے۔ اور بعض نے کہا ہے: اسے حیض نہ آتا تھا اور وہ اس سے پاک رہتی تھی۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام جب اس کے پاس آتے تو آپ اس کے پاس موسم سرما کے پھل گرمی میں اور گرمی کے پھل موسم سرما میں پاتے تھے، تو آپ نے فرمایا: اے مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آتے ہیں؟ تو اس نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتے ہیں تو اس وقت حضرت زکریا علیہ السلام نے بچے کی خواہش کی اور کہا: بے شک وہ جو اس کے پاس پھل لاتا ہے وہ مجھے بچہ عطا کرنے پر بھی قادر ہے اور أنّیٰ کا معنی ہے من أین۔ کہاں سے۔ ابو عبیدہ نے یہی کہا ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اس میں تساہل ہے، کیونکہ أین جگہ اور مکان کے بارے سوال کے لئے آتا ہے اور أنّیٰ مذاہب اور جہات کے بارے سوال کے لئے آتا ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ کون سے مذاہب اور کون سی جہات سے تیرے لئے یہ ہیں۔ کمیت نے ان دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ اور کہا ہے:

أنّی و من أین آبك الطّرب   من حیث لا صبوۃ ولا رِیَب

اس میں أنّی جہات اور أین مکان کے لئے ذکر کئے گئے ہیں۔

اور کلما، وَجَدَ کے سبب منصوب ہے ای کل دخلۃ (ہر بار داخل ہوتے وقت) اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝ کہا گیا ہے: یہ مریم کے قول میں سے ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور یہی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا اور بچے کی التجا کا سبب بن گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ۔ هُنَالِكَ محل نصب میں واقع ہے، کیونکہ یہ ظرف ہے اور اسے زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ظرف مکان ہے۔ مفضل بن سلمہ نے کہا ہے: هُنَالِكَ ظرف زمان کے لئے ہے اور هنا ظرف مکان کے لئے آتا ہے اور کبھی اسے اس کی جگہ بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ اور هَبْ لِيْ کا معنی ہے مجھے عطا فرما مِنْ لَّدُنْكَ اپنی بارگاہ سے ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً صالح اور نیک نسل (بچہ) ذُرِّيَّةً واحد اور جمع اور مذکر اور مونث تمام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں واحد کے لئے ہے۔ اور اس پر قول باری تعالیٰ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا دلالت کرتا ہے کیونکہ یہاں اولیاء نہیں فرمایا۔ اور طَيِّبَةً کو مونث لایا گیا ہے کیونکہ لفظ ذُرِّيَّةً مونث ہے۔

جیسا کہ شاعر کا قول:

ابوك خلیفة ولدته أخری   وانت خلیفة ذاك الكمال

اس میں لفظ خلیفہ کے مونث ہونے کی وجہ سے ولدته کو مونث لایا گیا ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ای رجل مات و ترك ذرية طيبة أجری

اللہ لہ مثل أجر عملهم ولم ینقص من اجورھم شیئًا (جو کوئی آدمی فوت ہوا اور اس نے نیک اور صالح اولاد پیچھے چھوڑی تو اللہ تعالیٰ اسے ان کے اعمال کے اجر کی مثل اجر عطا فرمائے گا اور ان کے اجر میں سے کوئی شی کم نہ ہوگی۔) سورۃ البقرۃ میں لفظ ذُرِّیَّۃً کا مادہ اشتقاق گزر چکا ہے۔ اور طَیِّبَۃً کا معنی ہے صالح، نیک اور بابرکت اِنَّکَ سَمِیۡعُ الدُّعَآءِ بلاشبہ تو ہی دعا کو قبول فرمانے والا ہے اور اسی سے سمع اللہ لمن حمدہ بھی ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ یہ آیت بچے کی طلب اور خواہش کرنے پر دلیل ہے اور یہ مرسلین اور صدیقین کی سنت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِکَ وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ اَزۡوَاجًا وَّذُرِّیَّۃً (الرعد: 38) (اور بے شک ہم نے بھیجے کئی رسول آپ سے پہلے اور بنائیں ان کے لئے بیویاں اور اولاد۔)

اور صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تجرد اختیار کرنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں منع فرمادیا اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اس کی اجازت عطا فرمادیتے تو ہم خصی ہو جاتے اور ابن ماجہ نے حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نکاح میری سنت ہے پس جس نے میری سنت کے مطابق عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں ہے اور تم شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا اور جو کوئی قدرت رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نکاح کرلے اور جو (قدرت) نہ پائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ روزے رکھے کیونکہ یہی اس کے لئے وجاء (شہوت نکاح کو کاٹنے کا ذریعہ) ہے۔(1)

اور اس میں ان بعض جاہل متصوفہ کا رد ہے جنہوں نے کہا ہے: جو بچے کی خواہش اور طلب رکھتا ہے وہ احمق ہے اور اسے نہیں معلوم کہ وہ کند ذہن اور بے وقوف ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے بارے خبر دیتے ہوئے فرمایا: وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ ﴿۸۴﴾ (الشعراء) (اور بنادے میرے لئے سچی ناموری آئندہ آنے والوں میں)

اور مزید فرمایا: وَالَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ اَزۡوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعۡیُنٍ (الفرقان: 74) (اور وہ جو عرض کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! مرحمت فرما ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک)

اور امام بخاری نے تو اس عنوان سے باب باندھا ہے باب طلب الولد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اس دن فرمایا جس وقت ان کا بیٹا فوت ہوا۔ ''کیا تم نے آج رات مباشرت کی ہے'' انہوں نے عرض کی۔ جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: بارک اللہ لکما فی غابر لیلتکما (اللہ تعالیٰ تمہاری گزشتہ رات کے بارے میں تم دونوں کو برکت عطا فرمائے) فرمایا پس وہ حاملہ ہوگئی (2)۔ اور بخاری میں ہے: سفیان نے بیان کیا ہے انصار میں سے ایک آدمی نے کہا ہے: میں نے نو بچے پائے ہیں ان تمام نے قرآن کریم پڑھا ہے (3) اور یہ بھی عنوان ہے باب الدعاء بکثرۃ الولد مع البرکۃ (برکت کے ساتھ اولاد کی کثرت کی دعا کا بیان) اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ام سلیم نے کہا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ کا خادم انس

1۔ ابن ماجہ، کتاب النکاح، حدیث نمبر 1835، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ صحیح بخاری، کتاب العقیقہ، حدیث 5048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من لم یظهر حزنه عند المصیبة، حدیث 1218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللهم اكثر ماله وولده وبارك له فيما اعطيته (اے اللہ! اس کے مال اور اس کی اولاد میں کثرت عطا فرما اور جو تو اسے عطا فرمائے اس میں اس کے لئے برکت عطا فرما)۔ (1)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! ابوسلمہ کی مغفرت فرما اور ہدایت یافتہ لوگوں میں اس کا درجہ بلند فرما اور باقی رہنے والے لوگوں میں سے اسے اچھا خلیفہ (نائب) عطا فرما۔'' اسے بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم بچے جننے والی اور محبت کرنے والی (عورت) سے شادی کرو کیونکہ میں تمہارے سبب دیگر امتوں پر اظہار کثرت کروں گا (2)''۔ اسے ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔ اس معنی میں بہت سی روایات ہیں جو بچے کی طلب پر ابھارتی ہیں اور اس طرف متوجہ کرتی ہیں، کیونکہ انسان اپنی زندگی میں اور اپنی موت کے بعد اس کے نفع اور فوائد کا امیدوار ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اذا مات أحدكم انقطع عمله الامن ثلاث جب تم میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین کے۔ اس میں ذکر فرمایا أو ولد صالح يدعوله یا نیک بچہ جو اس کے لئے دعا کرتا ہو۔ گر اس حدیث کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو تو اس میں یہی کافی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا تو انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنے بچے اور اپنی بیوی کی ہدایت کے لئے تضرع اور التجا کرتا رہے کہ وہ دونوں کو ہدایت، نیکی، پاکدامنی اور رعایت کی توفیق عطا فرمائے اور یہ کہ وہ دونوں دین اور دنیا میں اس کے معاون و مددگار ہوں یہاں تک کہ دونوں کے سبب اس کی منفعت اور فوائد دنیا اور آخرت میں عظیم ہو جائیں۔ کیا آپ حضرت زکریا علیہ السلام کے قول میں غور نہیں کرتے وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (مریم) اور عرض کی ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اور کہا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے دعا فرمائی اور کہا: اللهم اكثر ماله وولده وبارك له فيه اسے بخاری (3) اور مسلم نے نقل کیا ہے اور یہ تیرے لئے کافی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۳۹

''پھر آواز دی ان کو فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے (اپنی) عبادت گاہ میں کہ بے شک اللہ تعالیٰ خوشخبری دیتا ہے آپ کو یحییٰ کی جو تصدیق کرنے والا ہوگا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرمان کی اور سردار ہوگا اور ہمیشہ عورتوں سے بچنے والا ہوگا اور نبی ہوگا صالحین سے۔''

قولہ تعالیٰ: فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ حمزہ اور کسائی نے فَنَادَاهُ مذکر ہونے کی بنا پر الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں اس میں امالہ کرتے ہیں کیونکہ یہ (الف) اصل میں یا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ چوتھی جگہ ہے اور حضرت ابن عباس اور حضرت ابن مسعود

1۔ صحیح بخاری، باب دعوة النبی لخادمه بطول العمر و بكثرة ماله، حدیث نمبر 5868، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، حدیث نمبر 1754، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، باب من زار قوما ولم يفطر عندهم، حدیث نمبر 1846، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رضی اللہ عنہم کی قرأت الف کے ساتھ ہی ہے اور یہی ابو عبید کی پسند ہے۔

اور جریر نے مغیرہ کے واسطہ سے ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ پورے قرآن میں ملائکہ کو مذکر قرار دیتے ہیں۔ ابو عبید نے کہا ہے: ہم انہیں جانتے ہیں کہ انہوں نے اسے مشرکین کے خلاف اختیار کیا ہے کیونکہ مشرکین نے کہا: ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔

نحاس نے کہا ہے: یہ ایسا استدلال ہے جس سے کوئی شے حاصل نہیں کی جاسکتی کیونکہ عرب کہتے ہیں: قالت الرجال اور قال الرجال اور اسی طرح النساء کے ساتھ بھی کرتے ہیں (یعنی مذکر و مونث دونوں طرح استعمال کر لیتے ہیں۔) اور ان پر قرآن کریم سے استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ جائز ہے کہ ان کے خلاف قرآن کریم سے اس طرح حجت لائی جائے تو پھر یہ بھی جائز ہے کہ وہ اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کریں: وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ البتہ ان کے خلاف اس ارشاد میں حجت ہے: أَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ یعنی انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا۔ پس وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ مونث ہیں۔ تحقیق یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ظن اور محض خواہش ہے۔ اور رہا فَنَادَاهُ تو یہ جمع کے مذکر ہونے کی بنا پر جائز ہے اور نَادَتْهُ جماعت کے مونث ہونے کی بنا پر جائز ہے۔

مکی نے کہا ہے: الملائکۃ ذوی العقول میں سے جمع مکسر ہے اور یہ تانیث میں قائم مقام غیر ذوی العقول کے ہے۔ آپ کہتے ہیں: ھی الرجال و ھی الجذوع و ھی الجمال و قالت الاعراب۔ اور اسے یہ ارشاد اور تقویت دیتا ہے۔ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ اور دوسری جگہ مذکور ہے: وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اور اسی پر اجماع ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ پس اس جمع کو مذکر و مونث دونوں طرح لانا اچھا ہے اور سدی نے کہا ہے: اکیلے حضرت جبرائیل امین نے انہیں ندا دی۔ (ناداہ جبرائیل وحدہ) اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے اور قرآن کریم میں ہے: يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ اور روح سے مراد وحی ہے۔ اور عربی میں یہ جائز ہے کہ واحد کے بارے جمع کے لفظ کے ساتھ خبر دی جائے اور قرآن کریم میں آیا ہے: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ الناس سے مراد نعیم بن مسعود ہے، جیسا کہ آگے آئے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہیں تمام ملائکہ نے ندا دی اور یہی زیادہ ظاہر ہے۔ یعنی ندا ان کی جانب سے آئی۔

قولہ تعالیٰ: وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ اس میں وَهُوَ قَآئِمٌ مبتدا اور خبر ہے۔ اور يُّصَلِّيْ محل رفع میں ہے اور اگر چاہے تو ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں رکھ لے۔ اَنَّ اللّٰهَ اصل میں بان اللہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے اِنَّ پڑھا ہے یعنی قالت ان اللہ۔ پس ندا بمعنی قول ہے۔ يُبَشِّرُكَ تشدید کے ساتھ اہل مدینہ کی قرأت ہے۔ اور حمزہ نے يَبْشُرُكَ مخفف پڑھا ہے۔ اسی طرح حمید بن قیس مکی نے کہا ہے مگر یہ کہ انہوں نے شین کو کسرہ یا ضمہ اور با کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اخفش نے کہا ہے: یہ تینوں لغات ایک معنی میں ہیں۔

پہلی کی دلیل اور یہ ایک جماعت کی قرأت ہے کہ اس مادہ سے جو بھی فعل ماضی یا امر کا صیغہ قرآن کریم میں ہے وہ بتثقیل

کے ساتھ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَشِّرْ عِبَادِ۔ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ۔ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ۔ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ اور رہی دوسری تو وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے اور وہ بَشَرَ يَبْشُرُ سے ہے اور وہ اہل تہامہ کی لغت ہے۔ اور اسی سے شاعر کا قول بھی ہے:

بشرتُ عيالى اذْ رأيتُ صحيفةً أتتك من الحجاج يُتلى كتابُها

اس میں محل استشہاد بشرت ہے۔

اور دوسرے نے کہا:

واذا رأيت الباهشين الى النَّدى غُبْرًا أكُفُّهُمْ بقاعٍ مُمْحِلِ
فأعِنْهُم وأبشَر ما بَشِروا به واذا هم نزلوا بضَنْكٍ فانْزِلِ

اس میں محل استشہاد بما بَشِروا بِہ ہے۔

اور جہاں تک تیسری قرأت کا تعلق ہے تو وہ أَبْشَرَ يُبْشِرُ إِبْشَارًا سے ہے۔

شاعر نے کہا:

يا أُمَّ عمرو أَبْشِرى بالبُشْرىٰ موتٌ ذريعٌ وجرادٌ عظلىٰ

اس میں محل استشہاد أَبْشِرى ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِيَحْيٰى، پہلی کتاب میں ان کا نام حیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ سارہ کا نام یسارہ تھا۔ اور عربی میں اس کی تفسیر لاتلد (وہ بچہ نہ جنے گی) ہے۔ پس جب انہیں اسحاق کی بشارت دی گئی تو انہیں کہا گیا: سارہ اور انہیں یہ نام حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دیا، تو انہوں نے کہا: اے ابراہیم! علیہ السلام میرے نام سے ایک حرف کیوں کم کر دیا گیا ہے؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی جبرائیل علیہ السلام سے کہا تو انہوں نے کہا: ''بلاشبہ یہ حرف ان کے اس بیٹے کے نام میں زائد کر دیا گیا ہے جو افضل انبیاء میں سے ہے اس کا نام حیی ہے اور اس کا نام یحییٰ رکھ دیا گیا ہے۔'' نقاش نے اسے ذکر کیا ہے اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: ان کا نام یحییٰ رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان اور نبوت کے ساتھ پیدا فرمایا (اور زندہ رکھا) اور بعض نے کہا ہے: ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سبب لوگوں کو ہدایت کے ساتھ احیا عطا فرمایا اور مقاتل نے کہا ہے: ان کا اسم اللہ تعالیٰ کے اسم حیّ سے مشتق ہے پس یحییٰ نام رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کیونکہ ان کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کی ماں کی رحم کو زندہ کر دیا۔

مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ اکثر مفسرین کے قول کے مطابق کلمۃ من اللہ سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمہ اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ وہ اللہ کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئے۔ پس وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ ابو السمال العدوی نے بِكَلِمَةٍ تمام قرآن میں کاف کو مکسور اور لام کو ساکن پڑھا ہے۔ اور یہ فصیح لغت ہے جیسا کہ كِتْف اور فِخْذٌ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا نام کلمہ اس لئے ہے کیونکہ لوگ ان سے اسی طرح ہدایت پاتے تھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے کلام سے ہدایت اور راہنمائی پاتے تھے۔

اور ابو عبید نے کہا ہے: بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ کا معنی ہے بکتاب من اللہ (یعنی جو تصدیق کرنے والا ہو گا اللہ تعالیٰ کی کتاب کی۔) فرمایا: اور عرب کہتے ہیں انشدنی کلمۃ ای قصیدۃ اس نے میرے سامنے قصیدہ پڑھا۔ جیسا کہ روایت ہے کہ الحویدرہ کا حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے پاس ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا: لعن اللہ کلمتہ یعنی قصیدتہ۔ (اللہ تعالیٰ اس کے قصیدہ پر لعنت کرے) اور اس کے علاوہ بھی کئی اقوال کہے گئے ہیں۔ پہلا قول زیادہ مشہور ہے اور اکثر علماء اسی پر ہیں اور یحییٰ علیہ السلام وہ پہلے فرد ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی۔ اور حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تین سال بڑے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چھ مہینے بڑے تھے۔ اور دونوں خالہ زاد بھائی تھے۔

پس جب حضرت زکریا علیہ السلام نے ان کی شہادت سنی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اٹھے اور انہیں اپنے ساتھ ملا لیا اور وہ ایک کپڑے میں (لپٹے) پڑے تھے اور علامہ طبری نے ذکر کیا ہے کہ حضرت مریم جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں تو اسی وقت ان کی بہن حضرت یحییٰ علیہ السلام سے حاملہ تھی، تو وہ اپنی بہن کی ملاقات کے لئے آئی اور کہا: اے مریم! کیا تجھے معلوم ہوا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو حضرت مریم علیہا السلام نے اسے کہا: کیا تو نے محسوس کیا ہے کہ میں حاملہ ہوں؟ تو اس نے آپ کو کہا: جو میرے پیٹ میں ہے میں اسے پا رہی ہوں کہ وہ اسے سجدہ کر رہا ہے جو تیرے پیٹ میں ہے۔ اسی وجہ سے یہ روایت کیا گیا کہ انہوں نے اپنے جنین کو محسوس کیا کہ وہ اپنا سر حضرت مریم کے پیٹ کی طرف جھکا رہا ہے۔ سدی نے کہا ہے: پس اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ اور مُصَدِّقًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ وَ سَيِّدًا اس کا معنی السید (سردار) وہ جو اپنی قوم کا سردار ہوتا ہے۔ اور اس کے قول پر (کسی کام کی) انتہا ہو جاتی ہے اور اس کی اصل سَيْوِدٌ ہے کہا جاتا ہے: فلان اسود من فلان۔ یہ افعل کے وزن پر صیغہ اسم تفضیل ہے اور السیادۃ سے بنایا گیا ہے اور اسی میں اس پر دلیل موجود ہے کہ انسان کا نام سید رکھنا جائز ہے جیسا کہ یہ جائز ہوتا ہے کہ اس کا نام عزیز یا کریم رکھا جائے۔ (1)

اور اسی طرح حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے بنی قریظہ (☆) کو فرمایا: ۔ (اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو۔) اور بخاری و مسلم میں ہے (2) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: ان ابنی ھذا سید و لعل اللہ یصلح بہ بین فئتین عظیمتین من المسلمین (بلاشبہ میرا یہ بیٹا سید (سردار) ہے اللہ تعالیٰ اس کے سبب مسلمانوں کے دو بہت بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔) اور پھر اسی طرح ہوا۔ کیونکہ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو چالیس ہزار سے زائد لوگوں نے آپ کی بیعت کی اور بہت سے ان میں سے تھے جو ان کے باپ سے پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں سے تھے جنہوں نے ان کی بیعت توڑ دی تھی، آپ تقریباً سات ماہ تک عراق اور اس کے بعد خراسان میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3812، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، کتاب الصلح، حدیث 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

☆ تفسیر میں الفاظ یہی ہیں جبکہ اصل میں یہ ارشاد حضرت سعد بن معاذ کے حق میں انصار کو ہے۔

خلیفہ رہے، پھر آپ اہل حجاز اور اہل عراق کا لشکر ساتھ لے کر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف چلے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اہل شام کو لے کر آپ کی طرف چلے۔ پس جب دونوں لشکر ایک جگہ آمنے سامنے ہوئے وہ انبار کی اطراف میں عراق کی زمین میں سے مَسْکِن کہلاتی ہے، تو امام حسن رضی اللہ عنہ نے جنگ کو ناپسند کیا کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ دونوں گروہوں میں سے کوئی ایک غالب نہیں آسکتا یہاں تک کہ دوسرے کا اکثر حصہ ہلاک ہو جائے۔ پس مسلمان ہلاک ہوں گے، تو آپ نے ان شرائط پر معاملہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیا جو شرائط آپ نے ان پر عائد کی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے بعد امارت (حکمرانی) آپ کی ہوگی۔ پس امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان تمام کا التزام کیا۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سچ ثابت ہوا اِنّ ابنی ھذا سید بلاشبہ میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور اس سے بڑا سردار کوئی نہیں ہو سکتا جسے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول سردار بنائے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے کہ وَسَیِّدًا کا مفہوم ہے کہ وہ علم و عبادت میں سردار ہیں۔ ابن جبیر اور ضحاک نے کہا ہے: علم اور تقویٰ میں سردار ہیں۔

مجاہد نے کہا ہے: السید سے مراد کریم سخی ہے۔ ابن زید نے کہا ہے: وہ جس پر غصہ غالب نہ آتا ہو۔ اور زجاج نے کہا ہے: سید وہ ہے جو اپنے ساتھیوں پر خیر اور نیکی کے کام میں فوقیت رکھتا ہو۔ اور یہ لفظ (تمام) کو جامع ہے۔ اور کسائی نے کہا ہے: السید کا معنی دو سال کی بھیڑ بھی ہے۔ اور حدیث میں ہے: ثنی من الضان خیر من السید المعز بھیڑوں میں دو ندی دو برس کی بھیڑ سے بہتر اور افضل ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

سواءٌ علیه شاۃٌ عامٍ دَنَت له ... لیذبحها للضیف أم شاۃ سیّد

وَحَصُوْرًا یہ اصل ہے الحصر سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی ہے روکنا، قید کرنا، حَصَرَنِی الشیئ وأحْصَرَنِی جب کوئی شے مجھے روک لے۔

جیسا کہ ابن میادہ نے کہا ہے:

وما هجرُ لیلی ان تکون تباعدت ... علیكَ ولا أن احصَرتك شُغولَ

اور ناقة حصور: ضیقة الاحلیل یعنی جس اونٹنی کے تھنوں (یا پیشاب) کا سوراخ تنگ ہو۔ اور حَصُور وہ ہوتا ہے جو عورتوں کے پاس نہ آسکتا ہو (یعنی جماع کے قابل نہ ہو) گویا کہ اسے ان سے روک دیا گیا ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: رجل حصور وحصیر جب کہ وہ اپنی بخشش اور عطا کو روک لے اور وہ کچھ نہ نکالے جو کچھ اس کے ہم نشین نکال رہے ہیں کہا جاتا ہے: شرِب القوم فحصِر علیهم فلاں ای بخل۔ (قوم نے شراب پی تو ان پر فلاں نے پابندی لگادی، یعنی اس نے ان کے ساتھ بخل کیا۔) یہ ابو عمرو سے منقول ہے۔

اخطل نے کہا ہے:

وشارِبٍ مُرْبِحٍ بالکأس نادمنِی ... لا بالحَصور ولا فیها بِسوّارِ

اور قرآن کریم میں ہے وَ جَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا یعنی جہنم کو ہم نے کافروں کے لئے قید خانہ بنایا ہے اور الحصیر سے مراد مِلک ہے کیونکہ اسے روک لیا جاتا ہے۔

اور لبید نے کہا ہے:

وَ قُمَامِمُ غُلْبِ الرِّقَابِ کانهم جِنٌّ لدی باب الحصیر قیام

اس میں باب الحصیر سے مراد مِلک ہے۔

پس حضرت یحییٰ علیہ السلام حصور تھے یہ بروزن فعول بمعنی مفعول ہے یعنی آپ عورتوں کے ساتھ مباشرت نہ کر سکتے تھے۔ گویا کہ انہیں اس سے روک لیا گیا جو کچھ مردوں میں ہوتا ہے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے مروی ہے۔ اور فعول بمعنی مفعول لغت میں کثیر الاستعمال ہے۔ اسی سے حلوب بمعنی محلوبۃ ہے۔

شاعر نے کہا:

فیها اثنتان واربعون حَلُوبَةً سُودًا کخافیة الغراب الأسْحَم

اس میں حلوبۃ سے استدلال کیا گیا ہے۔

حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابن جبیر، قتادہ، عطا، ابو الشعثاء، حسن، سدی اور ابن زید رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے: (حصور) اس سے مراد وہ ہے جو عورتوں سے باز رہتا ہے اور قدرت کے باوجود وہ ان کے قریب نہیں جاتا۔ اور دو اعتبار سے یہی اصح قول ہے۔ ایک یہ ہے کہ یہ ان کی مدح اور تعریف ہے اور بلاشبہ تعریف اکثر فعل کسبی کے سبب ہوتی ہے نہ کہ فطری اور طبعی فعل پر اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فعول لغت میں فاعل کے صیغوں میں سے ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

ضَروبٌ بنصل السیف سُوقَ سِمانها اذا عَدِموا ازاداً فانك عاقِرٌ

اس میں محل استشہاد لفظ ضروبٌ ہے۔

پس معنی یہ ہے کہ اپنے نفس کو شہوات سے روکنے والا ہے۔ اور شاید یہ ان کی شریعت میں تھا اور رہی ہماری شریعت تو اس میں نکاح ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حصور سے مراد وہ عنین ہے جس کا ذکر نہ ہو کہ وہ اس کے سبب وطی کر سکتا ہو اور نہ اسے انزال ہوتا ہو یہ حضرت ابن عباس سے بھی، حضرت سعید ابن مسیب اور ضحاک نے کہا ہے۔ اور ابو صالح نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”ہر انسان اللہ تعالیٰ سے گناہ کے ساتھ ملاقات کرے گا، درآنحالیکہ اس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا ہوگا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ اس کے سبب اسے عذاب دے گا یا پھر رحم فرمائے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے، کیونکہ وہ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ تھے۔ پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک زمین کے ایک تنکے کی طرف نیچے کیا اور اسے اٹھا لیا اور فرمایا: ”ان کا ذکر اس تنکے کی مثل تھا۔“ اور قول

بھی ہے کہ اس کا معنی ہے: وہ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچانے اور روکنے والا ہے۔ وَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ زجاج نے کہا ہے: الصالح الذی یؤدی للہ ما افترض علیہ والی الناس حقوقھم۔ (کہ صالح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض ادا کرتا ہے اور لوگوں کو ان کے حقوق عطا کرتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ ۝

”زکریا کہنے لگے اے رب! کیونکر ہوگا میرے ہاں لڑکا حالانکہ آ لیا ہے مجھے بڑھاپے نے اور میری بیوی بانجھ ہے فرمایا بات اسی طرح ہے (جیسی تم نے کہی) لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔“

کہا گیا ہے: یہاں رب سے مراد جبریل امین علیہ السلام ہیں یعنی انہوں نے حضرت جبریل امین علیہ السلام کو کہا: رب، اے میرے سردار　کیونکر میرے ہاں لڑکا ہوگا؟ یہ کلبی کا قول ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: رب سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اَنّٰی بمعنی کیف ہے اور یہ ظرف ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے اور اس استفہام کے معنی میں دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا اس کے ہاں بچہ ہوگا حالانکہ وہ اور اس کی بیوی اپنے اس حال پر ہیں یا انہیں اس حال پر لوٹا دیا جائے گا جس سے بچہ ہو سکتا ہے؟ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے سوال کیا کیا انہیں اپنی اسی بانجھ بیوی سے بچہ عطا کیا جائے گا یا کسی اور سے؟ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے کہ کون سے درجہ کے سبب اس کا حقدار سمجھا گیا ہے حالانکہ میں اور میری بیوی اس حال پر ہیں۔ آپ نے یہ علی وجہ التواضع کہا۔

اور روایت ہے کہ آپ کی دعا اور جس وقت آپ کو اس کی بشارت دی گئی ان کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ تھا۔ اور جس دن آپ کو بشارت دی گئی تھی اس وقت آپ کی عمر نوے برس تھی اور آپ کی اہلیہ کی عمر بھی اس کے قریب تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ضحاک نے کہا: جب آپ کو خوشخبری دی گئی اس وقت آپ کی عمر ایک سو بیس برس تھی اور آپ کی بیوی کی عمر اٹھانوے برس تھی۔

پس اسی لئے یہ قول ہے و امراتی عاقر یعنی میری بیوی بانجھ ہے وہ بچہ نہیں جن سکتی۔ کہا جاتا ہے: رجل عاقر و امراۃ عاقر جس میں بانجھ پن واضح اور ظاہر ہو۔ اور (کہا جاتا ہے) عقُرت و عقِر (دونوں میں قاف مضموم ہے) تعقُر عُقْرًا وہ بانجھ ہو گئی، مثلاً حسنت تحسن حسنا، یہ ابو زید سے منقول ہے اور عقارۃ بھی ہے اور دونوں میں اسم فاعل فعُل سے فعیلۃ کے وزن پر ہے۔ کہا جاتا ہے: عظمت فھی عظیمۃ اور ظرفت فھی ظریفۃ اور عاقر کہا گیا ہے کیونکہ اس سے مراد نسب کی بنا پر بانجھ پن والا ہے اور اگر یہ فعل کی بنا پر ہوتا تو کہتا: عقرت فھی عقیرۃ گویا کہ وہ اس کے سبب بانجھ ہے، یعنی عمر کے اعتبار سے بڑھاپا بچہ جننے سے اس کے لئے مانع ہے۔ اور عاقر سے مراد ریت کی وہ کثیر مقدار ہے جو کوئی شے اگنے نہ دے۔ اور عُقْر عورت کے مہر کو بھی کہتے ہیں جب شبہ کے ساتھ اس سے وطی کی جائے۔ اور بیضۃ العقر، اس سے مراد مرغ کا انڈا ہے، کیونکہ یہ اس کی عمر میں طویل مدت تک ایک خاص سفیدی سی لے آتا ہے اور عُقر النار بھی ہے، یعنی آگ کا وسط اور اس کا بڑا حصہ۔

اور عقر الحوض حوض کا پچھلا حصہ جہاں اونٹ کھڑے ہوتے ہیں جب وہ اس پر آئیں، کہا جاتا ہے: عُقْر اور عُقُر مثلاً عُسْر اور عُسُر۔ اور اس کی جمع الاعقار ہے اور یہ لفظ مشترک ہے۔ اور كَذٰلِكَ میں کاف محل نصب میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس کی مثل جو چاہتا ہے کرتا ہے اور الغلام، الغُلْمه سے مشتق ہے اور اس کا معنی نکاح کی طلب کا شدید ہونا ہے اور اغتلم الفعل غلمة وہ شہوۃ ضِراب سے بھڑک اٹھا۔

لیلی الاخیلیہ نے کہا ہے:

شفاها من الداء العُضال الذی بها علام اذا هَزَّ القناة سقاها

اور الغلام سے مراد ایسا نوجوان جس کی لبیں نکل رہی ہوں اور وہ جس میں غُلُومة اور غلومية (جوانی) واضح ہو۔ اور اس کی جمع الغِلمة اور الغِلمان ہے۔ اور کہا جاتا ہے: ان الغيلم الشاب و الجارية ايضا (یعنی جوان آدمی اور جوان لڑکی) اور الغَيلم کچھوے کو بھی کہتے ہیں اور الغيلم جگہ بھی ہے۔ اور اغتلم البحر کا معنی ہے: سمندر نے جوش مارا اور اس کی امواج تلاطم خیز ہوئیں۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝

''عرض کی اے میرے رب! مقرر فرمادے میرے لئے کوئی نشانی۔ فرمایا تیری نشانی یہ ہے کہ نہ بات کر سکو گے لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے اور یاد کرو اپنے پروردگار کو بہت اور پاکی بیان کرو (اس کی) شام اور صبح۔''

اس میں تین، مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً یہاں جَعَلَ بمعنی صیّر ہے کیونکہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ اور لِی مفعول ثانی کے محل میں واقع ہے۔ جب انہیں بچے کی بشارت دی گئی اور ان کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں تو انہوں نے علامت کا مطالبہ کیا جس کے ساتھ وہ اس امر کی صحت اور اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کو پہچان لیں، تو اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ چونکہ انہوں نے علامت اور نشانی کا مطالبہ کیا ہے لہٰذا ملائکہ کے ان کے آمنے سامنے ہونے کے بعد لوگوں کے ساتھ کلام کرنے سے سکوت اور خاموشی انہیں آ پہنچے گی۔ (یعنی وہ کلام نہ کر سکیں گے)

اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ انہوں نے کہا: اور اسی طرح اگر مرض کے سبب گونگا پن یا اس طرح کی کوئی شے نہ ہو تو اس میں ہر حال پر کچھ نہ کچھ سزا ہے۔

ابن زید نے کہا ہے: بے شک حضرت زکریا علیہ السلام کی زوجہ جب ان کے سبب یحییٰ سے حاملہ ہوئی تو انہوں نے صبح اس حال میں کی کہ وہ کسی کے ساتھ کلام کرنے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اور وہ اس کے باوجود تورات پڑھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے اور جب وہ کسی اور سے گفتگو کرنے کا ارادہ کرتے تو نہ بول سکتے تھے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: اِلَّا رَمْزًا لغت میں الرمز سے مراد ہونٹوں کے ساتھ اشارہ کرنا ہے اور کبھی کبھی یہ بھنوؤں،

آنکھوں اور دونوں ہاتھوں کے ساتھ اشارہ کرنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اس کا اصل معنی حرکت ہے۔ اور کہا گیا ہے: آپ نے اس علامت کا مطالبہ طمانیت وراحت میں زیادتی اور اضافہ کے لئے کیا تھا۔ معنی یہ ہے: تو نعمت مکمل اور تمام فرما دے اس طرح کہ تو میرے لئے کوئی علامت اور نشانی بنا دے۔ اور وہ علامت مزید نعمت اور کرامت ہو جائے گی، تو آپ کو کہا گیا: اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ یعنی تم تین رات تک کلام نہ کر سکو گے۔ اس قول کی دلیل اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد ہے جو ملائکہ کے آپ کو بشارت دینے کے بعد ہے۔

وَ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَیْـًٔا یعنی میں نے اپنی قدرت کے ساتھ تجھے پیدا کیا ہے تو اسی طرح تیرے لئے بچہ بھی پیدا فرمادیں گے۔ نحاس نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے۔ قتادہ کا قول ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو ترک کلام کے ساتھ سزا دی گئی۔ یہ قول قابل التفات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی خبر نہیں دی کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے منع فرمایا ہے۔ اور اس میں کلام یہ ہے کہ اس کا معنی ہے: تو میرے لئے ایسی علامت اور نشانی بنا دے جو بچہ ہونے پر دلالت کرتی ہو، جبکہ وہ مجھ سے غائب ہے اور رَمْزًا استثنا منقطع کی بنا پر منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے اور کسائی نے کہا ہے: رمزیرمُز، رَمَزیرمِز۔ اور اِلَّا رَمْزًا کو میم کے فتحہ اور رُمُزًا میم اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اس کی واحد رمزۃ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اشارہ کلام کے قائم مقام ہوتا ہے اور یہ کثیر احادیث میں موجود ہے اور اشارات کو اس امر نے موکد اور پختہ کر دیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوداء کے بارے میں اس کے ساتھ ہی فیصلہ فرمایا جبکہ آپ نے اسے کہا این اللہ۔ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ تو اس نے اپنے سر سے آسمان کی طرف اشارہ کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعتقها فانها مؤمنة تو اسے آزاد کر دے کیونکہ یہ مومنہ ہے۔ تو آپ نے اشارہ کے ساتھ اس اسلام کی اجازت دے دی جو اس دین کی اصل ہے جو جان اور مال کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے ساتھ جنت کا مستحق بنا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آتش جہنم سے نجات پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ایمان کا اسی طرح فیصلہ فرمایا جس طرح اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے جو زبان سے بول کر اقرار کرتا ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ اشارہ تمام دین میں قابل عمل ہے۔ اور یہی عام فقہاء کا قول ہے۔

ابن قاسم نے مالک سے روایت کیا ہے کہ گونگا آدمی جب طلاق کے لئے اشارہ کرے تو وہ لازم ہو جاتی ہے۔ اور امام شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جو بیمار ہوتا ہے اور اس کی زبان تحلل ہو جاتی ہے تو وہ رجعت اور طلاق کے مسائل میں گونگے کی طرح ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ جائز ہے جبکہ اس کا اشارہ معروف ہو (یعنی اسے سمجھنے میں کوئی شبہ نہ ہو) اور اگر اس میں شک ہو تو پھر وہ باطل ہے، یہ قیاس نہیں ہے البتہ یہ استحسان ہے۔ ان تمام میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ باطل ہو کیونکہ وہ کلام نہیں کر سکتا اور اس کا اشارہ سمجھا نہیں جا سکتا۔

ابوالحسن بن بطال نے کہا ہے: اور انہوں نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے اس قول پر محمول کیا ہے کہ انہیں ان احادیث کا علم نہیں ہوا جو دین کے مختلف احکام کے بارے میں اشارات کے جواز کے بارے وارد ہوئی ہیں۔ اور شاید امام بخاری

نے باب الاشارۃ فی الطلاق والامور کے عنوان سے ان کے رد کا قصد کیا ہے۔(1)

اور حضرت عطا نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ سے تین دن کے روزے کا قصد کیا ہے اور وہ جب روزہ رکھتے تھے تو وہ صرف اشارے کے ساتھ ہی گفتگو کرتے تھے۔ اور یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ بعض ان افراد نے کہا ہے جو سنت کے ساتھ قرآن کریم کا نسخ جائز قرار دیتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کلام کرنے سے روک دیا گیا حالانکہ وہ اس پر قادر تھے اور یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے منسوخ ہے: لا صَمتَ یوما الی اللیل (کسی دن رات تک خاموش رہنا جائز نہیں) اور اکثر علماء کا نظریہ یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں (2)۔ کیونکہ حضرت زکریا علیہ السلام کو کسی آفت کے سبب کلام سے روک دیا گیا جو انہیں لاحق ہوئی اور اس نے انہیں کلام سے روک دیا اور وہ آفت صحت کے باوجود کلام پر قادر نہ ہونا ہے، اسی طرح مفسرین نے کہا ہے۔ اور بہت سے علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث طیبہ لا صمت یوماً الی اللیل کا معنی یہ ہے کہ پورا دن رات تک اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموشی (جائز) نہیں ہے اور رہی فضول اور بے فائدہ گفتگو! تو اس سے تو خاموشی اچھی اور بہتر ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم ارشاد فرمایا کہ وہ اپنی زبان بند ہونے کے باوجود اپنے دل میں ذکر کبھی نہ چھوڑے، یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ذکر کا معنی گزر چکا ہے۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: اگر کسی کو ذکر ترک کرنے کی رخصت دی جاتی تو وہ یقیناً حضرت زکریا علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے سبب دی جاتی اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا اور اس آدمی کو دی جاتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جہاد میں ہوتا ہے: اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا اسے علامہ طبری نے بیان کیا ہے۔

وَسَبِّحْ بمعنی صل ہے یعنی تو نماز پڑھ۔ اس میں صلاۃ (نماز) کو سُبْحَة کا نام دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر قسم کی برائی اور نقص سے اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تنزیہ بیان کرتا ہے اور العشی، عشیۃ کی جمع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واحد ہے اور اس سے مراد سورج کے زوال پذیر ہونے کے وقت سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت ہے، یہ حضرت مجاہد سے منقول ہے۔ اور موطا میں قاسم بن محمد سے منقول ہے میں نے لوگوں کو نہیں پایا مگر یہ کہ وہ ظہر کی نماز عشی کے وقت ادا کرتے ہیں اور الْاِبْكَارِ سے مراد طلوع فجر سے چاشت تک کا وقت ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"اور جب کہا فرشتوں نے اے مریم! بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے تمہیں اور خوب پاک کر دیا ہے تمہیں اور پسند کیا ہے تجھے سارے جہان کی عورتوں سے۔"

1۔ صحیح بخاری، باب الاشارۃ فی الطلاق والانوار، تحت الحدیث 4883، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داود، باب ما جاء متی ینقطع الیتم۔ حدیث نمبر 2489، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں اختیار کرلیا ہے (چن لیا ہے) اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔
وَ طَهَّرَكِ اور تجھے خوب پاک کردیا ہے کفر سے۔

حضرت مجاہد اور حسن سے یہی مروی ہے اور زجاج نے کہا ہے: اور تمہیں پاک کردیا ہے تمام الائشوں سے مثلاً حیض، نفاس وغیرہما۔ اور تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دینے کے لئے پسند کرلیا ہے۔ **عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ** یعنی اپنے زمانے کی تمام عورتوں پر، حسن اور ابن جریج وغیرہما نے یہی بیان کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ **عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ** قیامت قائم ہونے کے دن تک تمام جہان والی عورتوں کو شامل ہے اور یہی صحیح ہے ہم اسے بیان کریں گے اور یہی زجاج وغیرہ کا قول ہے۔

اصطفاء کا ذکر دوبارہ کیا گیا ہے کیونکہ پہلے کا معنی ہے کہ تمہیں چن لیا ہے اپنی عبادت کے لئے اور دوسرے کا معنی ہے کہ تمہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے لئے چن لیا ہے۔ امام مسلم نے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا(1) ''مردوں میں سے کامل بہت سے ہیں اور عورتوں میں سے سوائے مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ کے سوا کوئی کامل نہیں اور بلا شبہ عائشہ کی فضیلت دوسری عورتوں پر اسی طرح ہے جیسے ثرید کی فضیلت تمام کھانوں پر۔'' ہمارے علماء رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: کمال سے مراد انتہا کو پہنچنا اور مکمل ہونا ہے۔ اور اس کا فعل ماضی کمل میم کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے۔ اور مضارع یکمُل میم کے ضمہ کے ساتھ آتا ہے اور ہر شے کا کمال اس کی اپنی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے اور کمال مطلق تو فقط اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نوع انسان میں سے کامل ترین حضرات انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں اور پھر ان کے بعد اولیاء مثلاً صدیقین، شہداء اور صالحین۔ اور جب یہ ثابت ہو چکا تو پھر کہا گیا: بے شک وہ کمال جس کا ذکر حدیث طیبہ میں کیا گیا ہے اس سے مراد تو نبوت ہے تو اس پر یہ لازم آتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام اور آسیہ دونوں نبیہ ہوں اور اس طرح کہا گیا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبیہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف فرشتہ کے واسطہ سے وحی فرمائی ہے جیسا کہ اس نے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی فرمائی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اس کا بیان سورۂ مریم میں بھی آئے گا اور رہی آسیہ تو کوئی ایسی شے بیان نہیں ہوئی جو واضح طور پر اس کی نبوت پر دلالت کرتی ہو بلکہ اس کے صدیقہ ہونے پر اور اس کی فضیلت پر دلالت کرتی ہو۔ اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

صحیح اسناد سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اور آپ سے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: ''سارے جہان کی عورتوں سے بہتر چار عورتیں ہیں مریم بنت عمران، آسیہ بنت مزاحم جو فرعون کی بیوی ہے، حضرت خدیجہ بنت خویلد اور حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے: ''اہل جنت کی عورتوں میں سے افضل خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مریم بنت عمران اور فرعون کی بیوی آسیہ بنت مزاحم ہیں (2)''۔ اور آپ ہی سے ایک دوسری سند سے مروی ہے: ''مریم کے بعد اہل جنت کی عورتوں کی سردار

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث نمبر 3159 ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ مسند امام احمد، حدیث 2668

حضرت فاطمہ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہما ہیں"۔

پس قرآن واحادیث کا ظاہر یہ تقاضا کرتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام سارے جہان کی عورتوں سے افضل ہے حضرت مائی حواء علیہا السلام سے لے کر اس آخری عورت تک جس پر قیامت قائم ہوگی (سب سے افضل ہے) کیونکہ ملائکہ نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے تکلیف اخبار، اور بشارت کے بارے میں وحی ان تک اسی طرح پہنچائی ہے جس طرح تمام انبیاء علیہم السلام تک پہنچائی، پس اس طرح یہ نبیہ ہیں اور نبی ولی سے افضل ہوتا ہے پس یہ تمام عورتوں سے افضل ہیں مطلقاً اولین و آخرین سب شامل ہیں۔ پھر ان کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا افضل ہیں پھر ان کے بعد حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور پھر ان کے بعد آسیہ رضی اللہ عنہا۔ اور اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے کریب کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سارے جہان کی عورتوں کی سردار مریم ہیں پھر فاطمہ، پھر خدیجہ اور پھر آسیہ ہے" یہ حدیث حسن ہے اشکال کو دور کر دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہا السلام کو اس کے ساتھ خاص کیا ہے جو عورتوں میں سے کسی کو عطا نہیں فرمایا اور وہ یہ کہ روح القدس ان سے ہمکلام ہوئے، ان کے قریب ہوئے اور عورتوں میں سے کسی کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہوا اور انہوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔ اور جب انہیں بشارت دی گئی تو کسی نشانی کا مطالبہ نہیں کیا جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے نشانی کا مطالبہ کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآن مقدس میں صدیقہ کا نام دیا ہے اور فرمایا: وَ اُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ اور فرمایا: وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صدیقہ ہونے کی شہادت دی اور ان کے لئے کلمات بشارت کی تصدیق کرنے کی شہادت دی اور ان کے لئے عجز وانکساری اور اطاعت شعاری کی شہادت دی۔ اور بلاشبہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو بچے کی بشارت دی گئی تو انہوں نے اپنے بڑھاپے اور اپنی بیوی کے بانجھ پن کی طرف دیکھا اور کہا: کیونکر میرے لئے بچہ ہوسکتا ہے حالانکہ میری بیوی بانجھ ہوچکی ہے، سونشانی طلب کی اور حضرت مریم کو بچے کی بشارت دی گئی تو اس نے یہ دیکھا کہ وہ باکرہ ہے اور اسے کسی بشر (انسان) نے مس نہیں کیا تو اسے کہا گیا: كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اسی طرح تیرے رب نے کہا ہے۔

پس انہوں نے اسی پر اقتصار کیا اور اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کر دی اور کوئی ایسی علامت اور نشانی طلب نہ کی جس سے اس امر کی حقیقت کو جانا جاسکتا ہو۔ بنات آدم میں سے سارے جہان کی عورتوں میں کسی عورت کے لئے اس قسم کے مناقب نہیں ہیں، اسی لئے یہ روایت ہے کہ وہ جنت کی طرف رسل علیہم السلام کے ساتھ پہلے جانے والوں میں جائیں گی۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے: "اگر میں قسم کھاؤں کہ میری امت کے سابقین سے پہلے کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا سوائے دس سے کچھ زائد افراد کے ان میں سے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت مریم بنت عمران علیہا السلام کے تو میں یقیناً اپنی قسم میں سچا ہوں۔"

تحقیق اس پر یہ فرض اور لازم ہو جاتا ہے جس پر ظاہری علم کھلا اور اس نے اشیاء ظاہرہ سے اشیاء باطنہ پر استدلال کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو جان لے(1): انا سید ولد آدم ولا فخر (میں اولاد آدم کا سردار ہوں اور مجھے کوئی فخر نہیں۔) لواء الحمد یوم القیامۃ بیدی و مفاتیح الکرم بیدی و أنا اول خطیب و اول شفیع و اول مبشر و اول و اول (قیامت کے دن لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہوگا اور کرم کی چابیاں میرے ہاتھ میں ہوں گی اور میں پہلا خطیب ہوں گا اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں گا اور میں سب سے پہلے بشارت دینے والا ہوں گا اور میں (فلاں میں) اول ہوں گا اور (فلاں میں) اول ہوں گا)(2) اور رسل علیہم السلام کو دنیا میں یہ سرداری حاصل نہیں ہوئی مگر باطن میں کسی امر عظیم کے سبب (انہیں یہ مقام ملا) اور اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کی شان ہے کہ انہیں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے صدیقہ اور کلمات کی تصدیق کرنے کی شہادت نصیب نہیں ہوئی مگر ایسے مرتبہ کے سبب جو انتہائی قرب عطا کرنے والا ہے۔

اور جنہوں نے یہ کہا کہ وہ نبیہ نہیں انہوں نے کہا ہے: ان کا فرشتے کو دیکھنا اسی طرح ہے جس طرح حضرت جبریل علیہ السلام کو دحیہ کلبی کی صورت میں دیکھا گیا جس وقت انہوں نے اسلام اور ایمان کے بارے سوال کئے تھے اور اس رؤیت کے باوجود صحابہ کرام انبیاء نہیں ہوئے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر اور واضح ہے اور اکثر اسی موقف پر ہیں۔ واللہ اعلم۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

"اے مریم! خلوص سے عبادت کرتی رہ اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔"

مراد یہ ہے کہ اے مریم! نماز میں قیام طویل کر۔ یہ مجاہد سے منقول ہے۔ حضرت قتادہ نے کہا ہے: تو اطاعت و عبادت پر دوام اختیار کر، قنوت کے بارے تفصیلی گفتگو پہلے گزر چکی ہے۔ امام اوزاعی نے کہا ہے: جب ملائکہ نے انہیں یہ کہا تو وہ نماز میں کھڑی ہوئیں یہاں تک کہ ان کے قدم ورم آلود ہو گئے۔ اور ان سے خون اور پیپ بہنے لگی۔ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ یہاں رکوع پر سجود کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور اس بارے میں اختلاف سورۃ البقرہ میں اس ارشاد کے تحت گزر چکا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ پس جب تو کہے: قام زید و عمرو تو یہ مراد لینا جائز ہے کہ عمرو زید سے پہلے کھڑا ہوا ہو۔ پس اس بنا پر معنی یہ ہوگا وار کعی واسجدی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی شریعت میں سجدہ رکوع سے پہلے تھا۔ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ کہا گیا ہے اس کا معنی ہے افعلی کفعلهم تو ان کی طرح کا فعل کر اگرچہ تو ان کے ساتھ نماز نہ پڑھے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد نماز با جماعت ہے۔ یہ بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

"یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم وحی کرتے ہیں ان کی آپ کی طرف اور نہ تھے آپ ان کے

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر الشفاعہ، حدیث نمبر 4297، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، باب فی فضل النبی، حدیث نمبر 3543، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پاس جب پھینک رہے تھے وہ (مجاور) اپنی قلمیں (یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ) کون ان میں سے سرپرستی
کرے مریم کی اور نہ تھے آپ ان کے پاس جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ یعنی یہ جو حضرت زکریا، حضرت یحییٰ اور حضرت مریم علیہم السلام کے واقعات ہم نے ذکر کئے ہیں یہ اخبار غیب میں سے ہیں۔ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلیل ہے اس حیثیت سے کہ آپ نے حضرت زکریا اور حضرت مریم علیہما السلام کے واقعہ کی خبر دی حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابوں میں نہیں پڑھا تھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بیان فرمایا اور اہل کتاب نے اس بارے آپ کی تصدیق کی۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ میں ضمیر کو ذالك کی طرف لوٹایا گیا ہے اور اسی کی یاد دلائی گئی ہے اور الایحاء یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کچھ بھیجنے کے معنی میں ہے۔ اور وحی الہام، اشارہ اور کئی دوسرے طریقوں سے ہوتی ہے۔ اور لغت میں اس کی اصل خفیۃ کسی شے سے آگاہ کرنا ہے۔ اسی وجہ سے الہام کو بھی وحی کا نام دیا جاتا ہے اور اسی سے ہے وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اور قول باری تعالیٰ: وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اور کہا گیا ہے: اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ کا معنی ہے "میں نے انہیں حکم دیا، کہا جاتا ہے: وحی اور اوحی، رمی اور ارمی یہ ہم معنی ہیں۔ عجاج نے کہا ہے: اوحی لھا القرار فاستقرت یعنی اس نے زمین کو قرار پکڑنے کا حکم دیا پس وہ قرار پذیر ہوگئی۔

اور حدیث میں ہے: الوحی الوحی مراد انتہائی سرعت اور تیزی ہے اور اس سے فعل توحیت توحیا ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: الوحی کا معنی اشارہ، کتابت اور رسالۃ (بھیجنا) ہے۔ اور ہر وہ شے جسے تو کسی غیر کی طرف القاء کرے یہاں تک کہ وہ اسے جان لے وہی وحی ہے وہ جیسے بھی ہو۔ اور الوحیٰ کا معنی السریع ہے۔ اور الوَحَیٰ کا معنی الصوت آواز ہے۔ اور کہا جاتا ہے: استوحیناھم یعنی ہم نے ان کی مدد طلب کی۔

کسی نے کہا:

ادحیت میمونا لھا والأزراق

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کے پاس موجود نہ تھے۔ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ۔ اقلام قَلَم کی جمع ہے۔ یہ قَلَمَہ سے ہے اس کا معنی ہے: فلاں نے اسے کاٹ دیا۔ کہا گیا ہے: قداحھم و سھامھم یعنی مراد ان کے تیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کی وہ قلمیں مراد ہیں جن سے وہ تورات لکھتے تھے اور یہی عمدہ معنی ہے، کیونکہ ازلام (جوئے کے تیر) سے تو اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور کہا ہے ذٰلِكُمْ فِسْقٌ۔

مگر وہ ان کی اجازت دیتا ہے اس طور پر کہ وہ انہیں اس طرز پر استعمال نہ کریں جس طرح دور جاہلیت میں کرتے تھے۔ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ یعنی کون مریم کی پرورش اور تربیت کرے گا؟ تو حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے گھر ہے۔ اور ان کے نکاح میں اشیع بنت فاقود تھی جو کہ مریم کی ماں حنہ بنت فاقود کی بہن

تھی۔ بنی اسرائیل نے کہا: ہم اس کا زیادہ حق رکھتے ہیں کیونکہ یہ ہمارے عالم کی بیٹی ہے۔ پس انہوں نے اس پر قرعہ اندازی کی اور ہر ایک اپنا قلم لے کر آیا۔ اور انہوں نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ قلم جاری پانی میں ڈالیں گے پس جس کا قلم ٹھہر گیا اور پانی اسے بہا کر نہ لے گیا تو وہ اس کی پرورش اور تربیت کرے گا۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پس قلم بہہ گئے اور حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم اوپر بلند ہو گیا۔" اور یہ آپ کی نشانی اور معجزہ تھا، کیونکہ آپ نبی تھے اور معجزات اور علامات آپ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔

اور اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ یہ مبتدا اور خبر اس فعل مضمر کے سبب محل نصب میں واقع ہیں جس پر کلام دلالت کرتی ہے۔ تقدیر کلام ہے: ینظرون أیهم یکفل مریم اور فعل لفظا اس میں کوئی عمل نہیں کرتا کیونکہ وہ برائے استفہام ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے بعض علماء نے اس آیت سے قرعہ اندازی کے اثبات پر استدلال کیا ہے اور ہماری شریعت میں یہی اصل اور بنیاد ہے ہر اس کے لئے جو تقسیم میں عدل و انصاف کرنا چاہے اور جمہور فقہاء کے نزدیک دو مساوی حجتوں میں یہی سنت ہے، تاکہ ان کے درمیان عدل ہو سکے اور ان کے دل مطمئن ہو جائیں اور اس آدمی کے بارے میں وہم و گمان اٹھ جائے جو ان کی تقسیم کا والی بنتا ہے۔ اور ان میں سے کسی کو اس کے ساتھی پر فضیلت نہ دی جائے گی جبکہ مقسوم ایک جنس سے ہو یہی کتاب و سنت کی اتباع ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے اصحاب نے قرعہ اندازی پر عمل کرنے کو رد کر دیا ہے اور انہوں نے اس بارے میں وارد ہونے والی احادیث کو بھی رد کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ ان کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں اور یہ جوئے کے ان تیروں کے مشابہ ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ اور ابن منذر نے امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ آپ نے اسے (قرعہ اندازی کو) جائز قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے: قیاس کے مطابق قرعہ صحیح نہیں ہوتا لیکن ہم نے اس مسئلہ میں قیاس کو چھوڑ دیا ہے۔ اور ہم نے آثار اور سنت کو پکڑ لیا ہے۔

ابوعبید نے کہا ہے: قرعہ اندازی کے مطابق تین انبیاء نے عمل کیا ہے: مراد حضرت یونس علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام اور ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں...... ابن منذر نے کہا ہے: جو شے شرکاء کے مابین تقسیم کی جاتی ہے اس میں قرعہ اندازی پر عمل کرنا ایسا ہے گویا اس پر اہل علم کا اجماع ہے اور جس نے اس کا رد کیا ہے اس کے قول کا کوئی معنی اور حقیقت نہیں۔ امام بخاری نے کتاب الشہادات کے آخر میں یہ عنوان ذکر کیا ہے باب القرعة فی المشكلات و قول الله عزوجل، اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے: "حدود اللہ پر قائم رہنے والے اور ان میں واقع ہونے والے کی مثال اس قوم کی مثل ہے جنہوں نے کشتی پر قرعہ اندازی کی (1) ...الحدیث" عنقریب اس کا بیان سورۃ الانفال اور سورۃ الزخرف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور ام العلاء کی حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون کا حصہ رہائش میں ان کے لئے تقسیم ہو گیا جب انصار نے مہاجرین کی رہائش کے لئے قرعہ اندازی کی (2)، الحدیث۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تھے اپنی ازواج مطہرات کے درمیان قرعہ

1۔ صحیح بخاری، باب القرعة فی المشکلات، حدیث 2489، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2490

اندازی کرتے اور جس کسی کے نام پر قرعہ نکلتا اسے ساتھ لے جاتے، آگے حدیث ذکر کی۔(1)

اس بارے میں حضرت امام مالک سے مختلف روایات ہیں۔ آپ نے ایک بار کہا حدیث کی وجہ سے وہ قرعہ اندازی کرے گا اور ایک بار کہا: ازواج میں سے جو سفر میں اس کے موافق ہوگی اسے وہ سفر پر لے جائے گا۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر اذان دینے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کے اجر و ثواب کو لوگ جانتے ہوتے پھر وہ قرعہ اندازی کے بغیر اس کا موقعہ نہ پاتے تو یقیناً وہ قرعہ اندازی کرتے(2)''۔ اس بارے میں احادیث کثیر ہیں۔ قرعہ اندازی کی کیفیت اور اختلاف کتب فقہ میں مذکور ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام اور ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں قرعہ اندازی ان میں سے ہے کہ اگر تم اس پر بغیر قرعہ اندازی کے راضی ہو جاؤ تو وہ جائز ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''یہ ضعیف ہے، کیونکہ قرعہ اندازی کا فائدہ ہی یہ ہے کہ باہم اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں کسی مخفی حکم کو نکالنا اور ظاہر کرنا اور رہا وہ حکم جو اس میں رضامندی کے ساتھ نکالا جاتا ہے وہ ایک دوسرا باب ہے۔ اور کسی کے لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قرعہ باہم رضامندی کے محل میں ڈالا جاتا ہے، کیونکہ یہ کبھی بھی باہم رضامندی کے ساتھ نہیں ہوتا۔'' یہ ہوتا ہی ان چیزوں میں ہے جن میں لوگوں کے مابین اختلاف اور جھگڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ بخل کیا جاتا ہے۔

امام شافعی اور جنہوں نے اس کے بارے کہا ہے ان کے نزدیک قرعہ اندازی کا طریقہ یہ ہے کہ کاغذ کے مساوی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں اور ہر ٹکڑے پر حصہ دار کا نام لکھ دیا جائے پھر انہیں مٹی کی ایسی گولیوں میں رکھ دیا جائے جو مساوی ہوں ان میں کوئی تفاوت نہ ہو۔ پھر وہ تھوڑی تھوڑی خشک کر لی جائیں پھر وہ کسی آدمی کے کپڑے میں ڈال دی جائیں جو وہاں حاضر نہ ہو۔ اور انہیں کپڑے سے ڈھانپ دیا جائے پھر وہ اپنا ہاتھ اس میں داخل کرے اور ایک نکال لے اور جس آدمی کا نام لے اسے وہ جز اور حصہ دے دے جس پر قرعہ اندازی کی گئی۔

مسئلہ نمبر 4۔ یہ آیت اس پر بھی دال ہے کہ سوائے دادی کے تمام قرابتداروں کی نسبت خالہ کے لئے حق پرورش زیادہ ہے۔ اور تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے لئے فرمایا تھا اور ان کے نکاح میں ان کی خالہ تھی۔ اور فرمایا: ''بلاشبہ خالہ ماں کے قائم مقام ہے(3)''۔ یہ مسئلہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ابو داؤد نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے(4)۔ انہوں نے بیان فرمایا: حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ گئے اور حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو لے آئے تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: اسے میں لوں گا، میں اپنے چچا کی بیٹی کا زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ اس کی خالہ میرے پاس ہے اور بلاشبہ خالہ ماں ہی ہوتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اپنے چچا کی بیٹی کا

1۔ صحیح بخاری، باب القرعۃ فی المشکلات، حدیث 2491، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ایضاً، حدیث نمبر 2492
3۔ ایضاً، کتاب الصلح، حدیث نمبر 2501، ایضاً
4۔ ابی داؤد، باب من احق بالولد، حدیث نمبر 1940، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

زیادہ حق رکھتا ہوں کیونکہ میرے عقد میں رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی ہے اور وہ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اس کا زیادہ حق رکھتا ہوں، کیونکہ میں اس کی طرف گیا، میں نے سفر کیا اور اسے ساتھ لے کر آیا۔ پس حضور نبی مکرم ﷺ تشریف لائے اور حدیث ذکر کی فرمایا: ''جہاں تک بچی کا ذکر ہے تو میں حضرت جعفر کے حق میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں یہ اپنی خالہ کے پاس رہے گی بلاشبہ خالہ ماں ہوتی ہے۔'' ابن ابی خیثمہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے وصی تھے۔ پس اس بنا پر خالہ وصی کی نسبت بھی زیادہ حق رکھتی ہے۔ اور چچا کا بیٹا جب خاوند ہو تو وہ خالہ کے حق حضانت کو ختم نہیں کرتا اگرچہ وہ اس کا محرم نہ ہو۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

''جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تعالیٰ بشارت دیتا ہے تجھے ایک حکم کی اپنے پاس سے اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا معزز ہوگا دنیا اور آخرت میں اور (اللہ کے) مقربین سے ہوگا۔ اور گفتگو کرے گا لوگوں کے ساتھ گہوارے میں بھی اور پکی عمر میں بھی اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔''

یہ حضرت مریم علیہا السلام کی نبوت کی دلیل ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ کے متعلق ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ کے متعلق ہو۔ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ابو السمال نے اسے بِكِلْمَةٍ منه پڑھا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ اس میں اِسْمُهَا نہیں فرمایا کیونکہ کلمۃ بمعنی ولد ہے۔ اور المسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور اس کا معنی صدیق ہے، حضرت ابراہیم نخعی نے یہی کہا ہے اور یہ معرب الفاظ میں سے ہے۔ اور اس میں اصل شین ہے اور وہ مشترک ہے۔ ابن فارس نے کہا ہے: مسیح کا معنی پسینہ ہے اور المسیح کا معنی الصدیق ہے اور مسیح کا معنی ایسا درہم بھی ہے جس پر نقش مٹا ہوا ہو۔ اور المسح کا معنی جماع ہے۔ کہا جاتا ہے مَسَحها اور الامسح سے مراد نرم و ملائم جگہ بھی ہے۔ اور المسحاء وہ عورت جس کے کولہو اور ران کمزور ہوں۔ وبفلان مَسْحة من جمال (فلاں کے پاس انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ ہے) اور المسائح انتہائی مضبوط عمدہ اونٹ اس کی واحد مَسِيحة ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

لها مسائحُ زُوْرٌ فی مراكِضها لِينٌ و ليس بها وَهْن ولا رَفَق

اس میں لفظ مسائح اسی معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور مسیح ابن مریم کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ کون سے مادہ سے لیا گیا ہے؟ پس کہا گیا ہے: کیونکہ آپ نے زمین میں خوب سیاحت کی اور آپ نے حفاظت کے لئے کوئی گھر نہیں بنایا۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ جب کسی کوڑھ زدہ کو پھونک مارتے تھے تو وہ صحت یاب ہو جاتا تھا، تو اسی وجہ سے آپ کا نام مسیح پڑ گیا۔ اس بنا پر یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ آپ کو برکت کا تیل لگایا گیا تھا، انبیاء علیہم السلام کو جو تیل لگایا جاتا ہے وہ انتہائی خوشبودار ہوتا ہے، پس جب وہ لگایا جاتا ہے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نبی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے چونکہ ان کے دونوں (پاؤں کے) تلووں کو مس کیا گیا تھا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: ''کیونکہ حسن و جمال نے ان کا احاطہ کیا ہوا تھا اور وہ ان پر ظاہر اور عیاں تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان کا یہ نام اس لئے رکھا گیا کیونکہ انہیں گناہوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔ اور ابوالہیثم نے کہا ہے: مسیح، مسیخ کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے مسحه الله یعنی اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی حسین اور مبارک پیدا فرمایا اور مسخه کا معنی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے انتہائی ملعون اور قبیح پیدا کیا۔ اور ابن اعرابی نے کہا ہے: المسیح الصدیق یعنی مسیح کا معنی صدیق ہے۔ اور مسیخ کا معنی اعور (کانا) ہے۔ اور دجال کو یہی نام دیا گیا ہے۔ اور ابو عبید نے کہا ہے: مسیح دراصل عبرانی زبان کا لفظ ہے اور اصل میں مشیخ یعنی شین کے ساتھ ہے اور پھر اسے عربی کی طرف منتقل کیا گیا ہے جیسا کہ موشی کو عربی میں موسیٰ بنا دیا گیا ہے اور رہا دجال تو اس کا نام مسیح اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس کی ایک آنکھ مسخ کر دی گئی ہے اور دجال کے لئے مِسّیح میم کے کسرہ اور سین کی شد کے ساتھ کہا گیا ہے اور بعض اسی طرح خانقطے والی کے ساتھ کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں مَسِیخ یعنی میم مفتوح ہے خانقطے والی ہے اور سین مخفف ہے۔ پہلا زیادہ مشہور ہے اور اکثر کا قول اسی کے مطابق ہے۔ اور اس کا وہ نام اس لئے ہے کیونکہ وہ زمین میں گھومتا پھرتا رہے گا اور سوائے مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور بیت المقدس کے تمام شہروں میں داخل ہوگا اور یہ فعیل بمعنی فاعل ہے۔ پس دجال زمین میں فساد برپا کرنے کے لئے چکر لگائے گا، گھومے گا اور ابن مریم علیہ السلام بخشش و عطا کے لئے سیاحت کریں گے۔ اور اس بنا پر کہ اس کی ایک آنکھ بند کر دی گئی ہے فعیل بمعنی مفعول ہوگا۔

اور شاعر نے کہا:

اِنَّ المسیح یقتل المسیخا

بے شک مسیح علیہ السلام مسیخ (دجال) کو قتل کر دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے سوا کوئی شہر نہیں ہے مگر دجال اس میں داخل ہوگا (1)''۔ الحدیث۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے ''سوائے کعبہ اور بیت المقدس کے'' اسے ابو جعفر طبری نے ذکر کیا ہے اور ابو جعفر طحاوی نے ''مسجد طور'' کا اضافہ ذکر کیا ہے اور اسے انہوں نے جنادہ بن ابی امیہ عن بعض اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے روایت کیا ہے۔

اور ابو بکر بن ابی شیبہ نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے ''کہ وہ ساری زمین پر غالب آ جائے گا سوائے حرم پاک اور بیت المقدس کے اور وہ مومنین کو بیت المقدس میں محصور کر دے

1۔ صحیح بخاری، باب لا یدخل الدجال المدینہ، حدیث نمبر 1748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گا۔‘‘ اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔ اور صحیح مسلم میں ہے: ’’پس ہمارے درمیان وہ اسی طرح ہوگا کہ اچانک اللہ تعالیٰ حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کو مبعوث فرمائے گا۔ وہ دمشق کے مشرق سے سفید منارہ کے پاس نزول فرمائیں گے اس حال میں کہ وہ ورس اور زعفران سے رنگا ہوا لباس پہنے ہوئے ہوں گے اور اپنے ہاتھ دو فرشتوں کے پروں پر رکھے ہوئے ہوں گے جب وہ اپنا سر جھکائیں گے تو اس سے قطرے گریں گے اور جب اسے اٹھائیں گے تو اس سے چاندی کے جے گریں گے جو اپنی ہیئت و شکل میں موتیوں کی مثل ہوں گے۔ پس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہوگا کہ وہ آپ کی سانس کی ہوا کو پائے مگر وہ مر جائے گا۔ اور آپ کی سانس کی انتہا وہاں تک ہوگی جہاں تک آپ کی نظر پہنچے گی پس آپ اسے تلاش کریں گے یہاں تک کہ اسے باب لد (لد فلسطین میں بیت المقدس کے قریب ایک گاؤں ہے) کے پاس پالیں گے اور اسے قتل کر دیں گے، الحدیث۔ یہ ایک طویل حدیث ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسیح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام ہے کسی سے مشتق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کا یہ نام رکھا ہے، اس بنا پر عیسیٰ المسیح سے بدل کل ہوگا۔ اور عیسیٰ عجمی اسم ہے اسی وجہ سے وہ غیر منصرف ہے۔ اور اگر آپ اسے عربی قرار دیں تو پھر اس کے غیر منصرف ہونے کے لئے معرفہ یا نکرہ ہونے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ اس میں الف تانیث موجود ہے (اور یہ قائم مقام دو سببوں کے ہے) اور یہ مشتق ہوگا عاسہ یعوسہ سے یعنی جب کوئی کسی کے لئے تدبیر اور انتظام کرے اور اس پر ڈٹ جائے اور قائم رہے۔

وَجِیْھًا کا معنی ہے شریف، صاحب قدر و منزلت اور یہ لفظ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ وَّ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقربین میں سے ہوگا۔ یہ وَجِیْھًا پر معطوف ہے یعنی بمعنی مقربا اخفش نے یہی کہا ہے۔ اور وجیہ کی جمع وُجہاء اور وجہاء ہے۔ وَ یُكَلِّمُ النَّاسَ اس کا عطف بھی وجیھا پر کیا گیا ہے۔ اخفش نے بھی یہی کہا ہے۔ اور الْمَهْدِ سے مراد بچے کی شیر خوار گی کا بچھونا ہے۔ اور مهدت الأمر کہا جاتا ہے جب تو اسے تیار کرے اور پھر اسے روندے...... اور قرآن کریم میں ہے: فَلِاَنْفُسِهِمْ یَمْهَدُوْنَ ﴿﴾ (الروم) (تو وہ اپنے لئے ہی راہ ہموار کر رہے ہیں) اور امتهد الشئ کا معنی ہے کسی شے کا اس طرح بلند ہونا جس طرح اونٹ کی کوہان بلند ہوتی ہے۔ وَ كَهْلًا، الکھل سے مراد عمر کا وہ حصہ ہے جو بچپن اور شیخوخت کے درمیان ہوتا ہے (یعنی پکی عمر) اور امرأة كهلة پکی عمر کی عورت۔ اور اكتهلت الروضة جب باغ میں کلیاں عام ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ آپ گہوارے میں لوگوں سے بطور معجزہ اور علامت کے گفتگو کرتے تھے اور پکی عمر میں وحی اور رسالت کے سبب گفتگو کرتے تھے۔

ابو العباس نے کہا ہے: آپ نے گہوارے میں لوگوں سے اس وقت گفتگو کی جب آپ نے اپنی ماں کی برأت کا اظہار فرمایا اور کہا: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ الآیہ۔ اور رہی حالت کہولت کی گفتگو! تو جب اللہ تعالیٰ آپ کو آسمان سے نازل فرمائے گا تو اس وقت آپ کو تینتیس برس کی عمر والی حالت پر نازل فرمائے گا اور یہی کہل کی حالت ہے تو آپ انہیں فرمائیں گے: اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ جیسا کہ آپ نے گہوارے میں کہا تھا۔ پس یہ دونوں معجزے اور دلائل ہیں۔

مہدوی نے کہا ہے: آیت کا فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آگاہ فرمادیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں ان سے گفتگو کریں گے اور کہولت کی حالت میں ان سے گفتگو کرنے تک وہ زندہ رہیں گے، جبکہ عادت یہ ہے کہ جس کسی نے گہوارے میں گفتگو کی وہ زندہ نہیں رہا۔

زجاج نے کہا ہے: وَ كَهْلًا بمعنی ویکلم الناس كَهْلًا ہے۔ اور فراء اور اخفش نے کہا ہے: یہ وَجِيْهًا پر معطوف ہے۔ اور کہا گیا ہے اس کا معنی ہے اور وہ لوگوں سے صغرسنی اور کہولت کی عمر میں گفتگو کریں گے۔ ابن جریج نے حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ الکہل کا معنی حلیم اور بردبار ہے۔ (1)

نحاس نے کہا ہے: لغت میں یہ معنی معروف نہیں۔ اہل لغت کے نزدیک الکہل سے مراد چالیس سال کے قریب کی عمر ہوتی ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: سولہ برس تک کی عمر کو حَدَث (لڑکپن) کہا جاتا ہے۔ پھر بتیس سال تک جوانی ہوتی ہے۔ اور پھر تینتیسویں سال میں کہولت شروع ہو جاتی ہے، اخفش نے یہی کہا ہے۔ وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ اس کا عطف وَجِيْهًا پر کیا گیا ہے یعنی و ھو من العباد الصالحین۔ (اور وہ نیکوکار بندوں میں سے ہوگا۔) ابوبکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن ادریس نے حصین سے اور انہوں نے ہلال بن یساف سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا: گہوارے میں تین کے سوا کسی نے گفتگو نہیں کی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، صاحب یوسف اور صاحب جریج۔ اسی طرح کہا او صاحب یوسف۔

اور یہی صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''گہوارے میں سوائے تین کے کسی نے کلام نہیں کی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اور صاحب جریج اور صاحب الجبار اور یہ اس دوران ہوا جب بچہ اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔'' اور انہوں نے طویل حدیث بیان کی۔ اور حضرت صہیب کی حدیث میں اصحاب اخدود کے واقعہ میں یہ بھی آیا ہے ''کہ ایک عورت کو لایا گیا تاکہ اسے ایمان لانے کی وجہ سے آگ میں ڈال دیا جائے اور اس کے ساتھ ایک (شیر خوار) بچہ بھی تھا۔'' اور مسلم کے علاوہ میں ہے ''وہ شیر خوار تھا تو عورت آگ میں کودنے سے ذرا خوفزدہ ہوئی تو اس بچے نے کہا یا امہ اصبری فانت علی الحق اے میری ماں! تو صبر کر (یعنی آگ میں ڈالے جانے سے خوفزدہ نہ ہو) کیونکہ تو ہی حق پر ہے۔

اور ضحاک نے کہا ہے: گہوارے میں چھ نے کلام کی ہے۔ شاہد یوسف، فرعون کی بیوی کی ماشطہ کا بچہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، یحییٰ، صاحب جریج اور صاحب جبار اور انہوں نے اخدود کا ذکر نہیں کیا اور انہوں نے صاحب الاخدود کو ساقط کر دیا ہے اور اس سمیت کلام کرنے والے سات ہو جائیں گے۔ اس کے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے درمیان کوئی معارضت نہیں ہے ''کہ گہوارے میں تین کے سوا کسی نے کلام نہیں کی'' آپ نے کلام حصر کے ساتھ فرمایا۔ کیونکہ آپ نے ان کے بارے خبر دی جن کا علم آپ کو اس وقت بذریعہ وحی عطا فرمایا گیا پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس کے بارے چاہا آپ کو آگاہ فرمایا اور آپ نے اس کے بارے خبر دی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا صاحب یوسف تو اس کے بارے کلام آگے آئے گا۔ اور صاحب جریج، صاحب الجبار اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، قبل الحدیث 3179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صاحب الاخدود کا ذکر صحیح مسلم میں ہے۔ اور عنقریب اصحاب اخدود کا قصہ ''سورۃ البروج'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور جہاں تک فرعون کی بیوی کی ماشطہ کے بچے کا ذکر ہے تو اسے علامہ بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب مجھے سفر معراج پر لے جایا گیا تو میں نے انتہائی طیب اور اچھی خوشبو میں سیر کی، تو میں نے کہا یہ خوشبو کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا: فرعون کی بیٹی کی ماشطہ اور اس کی اولاد کی اس کی کنگھی اس کے ہاتھ سے گر پڑی تو اس نے کہا: بسم اللہ (اللہ تعالیٰ کے نام سے) تو اس پر فرعون کی بیٹی نے کہا: کیا وہ میرا باپ ہے؟ اس نے جواب دیا: رَبِّی و ربك و رب ابیك (اس کے نام سے جو) میرا رب ہے اور تیرا رب ہے اور تیرے باپ کا بھی رب ہے۔ اس نے کہا: کیا میرے باپ کے سوا بھی تیرا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں میرا، تیرا اور تیرے باپ کا رب اللہ ہے اس نے کہا نہیں فرعون نے اسے بلایا اور کہا: کیا تیرا میرے سوا کوئی رب ہے؟ اس نے جواب دیا۔ ہاں میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔ اس نے کہا...... پھر اس نے تانبے کے ٹکڑے پگھلانے کا حکم دیا پس اسے گرم کیا گیا پھر اس نے اسے اس میں پھینک دینے کا حکم دیا تو ماشطہ نے کہا: مجھے تجھ سے ایک کام ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: یہ میری اور میرے بچے کی ہڈیوں کو ایک ہی جگہ میں جمع کر دے گا۔ اس نے کہا: یہ تیرے لئے اس حق کے عوض میں ہے جو تیرے لئے ہم پر لازم ہے۔ پس اس نے ان کے بارے حکم دیا تو انہیں ایک ایک کر کے اس میں پھینک دیا یہاں تک کہ وہ ان میں شیر خوار بچے تک جا پہنچے، تو اس نے کہا: اے ماں! تو کود جا اور اس میں تاخیر نہ کر کیونکہ ہم حق پر ہیں۔ راوی نے کہا۔ چار بچوں نے صغر سنی میں گفتگو کی۔ ایک یہ بچہ ہے، دوسرا شاہد یوسف، تیسرا صاحب جریج اور چوتھا حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

''مریم بولیں اے میرے پروردگار! کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ؟ حالانکہ ہاتھ تک نہیں لگایا مجھے کسی انسان نے۔ فرمایا بات یونہی ہے (جیسے تم کہتی ہو لیکن) اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے جب فیصلہ فرماتا ہے کسی کام (کے کرنے) کا تو بس اتنا ہی کہتا ہے اسے کہ ہو جا تو وہ فوراً ہو جاتا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: قَالَتْ رَبِّ مریم بولیں اے میرے سردار۔ آپ حضرت جبریل علیہ السلام کو خطاب کر رہی ہیں، کیونکہ جب وہ اس کے پاس انسانی شکل میں آئے اور اسے کہا: بلاشبہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ وہ تجھے ایک پاکیزہ خوبرو بچہ عطا فرمائے تو جب مریم نے ان کا یہ قول سنا تو آپ نے ان سے بچہ کے طریقے کے بارے پوچھا اور کہا: میرے ہاں بچہ کیوں کر ہو سکتا ہے حالانکہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا؟ یعنی نکاح کے ساتھ (سورۃ مریم میں ہے) وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ (مریم) (اور نہ میں بدچلن ہوں)

انہوں نے یہ بطور تاکید ذکر کیا ہے، کیونکہ ان کا یہ قول لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ (مجھے کسی انسان نے ہاتھ نہیں لگایا) حرام اور حلال دونوں طریقوں کو شامل ہے۔ آپ کہتی ہیں: وہ عادت جاریہ جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں جاری کر رکھی ہے وہ یہ ہے

کہ بچہ پیدا ہوتا ہے نکاح سے یا زنا سے۔ اور کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بھی بعید نہیں سمجھا لیکن ارادہ یہ کیا کہ یہ بچہ کیسے ہوگا۔ کیا مستقبل میں خاوند کی جانب سے یا ابتداءً ہی اللہ تعالیٰ اسے پیدا فرمائے گا؟ اور روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جس وقت مریم کو کہا: كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ (بات یونہی ہے اللہ پیدا فرماتا ہے جو چاہتا ہے) قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ (اس نے کہا اسی طرح ہے تیرے رب نے فرمایا ہے وہ مجھ پر آسان ہے)

انہوں نے مریم کی قمیص کے گریبان اور ان کی آستین میں پھونک ماری۔ ابن جریج نے یہی کہا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: حضرت جبریل امین علیہ السلام نے اپنی انگلی کے ساتھ ان کی قمیص کی آستین کو پکڑا اور وہ اسی ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوگئیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اس کا بیان سورۂ مریم میں آگے آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور بعض نے کہا ہے: جبریل امین کی پھونک مریم کے رحم پر پڑی پس وہ اس کے سبب حاملہ ہوگئی۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ تخلیق حضرت جبریل امین علیہ السلام کی پھونک سے ہو کیونکہ اس طرح جزوی طور پر بچہ ملائکہ میں سے ہو جائے گا اور اس کا بعض انسانوں میں سے ہوگا لیکن اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو تخلیق فرمایا اور ان کی اولاد سے عہد و پیمان لیا تو کچھ پانی باپوں کی صلبوں میں رکھ دیا اور کچھ ماؤں کی رحموں میں، پس جب یہ دونوں پانی جمع ہوں تو بچہ بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے دونوں پانی اکٹھے مریم میں رکھ دیئے کچھ ان کی رحم میں اور کچھ ان کی صلب میں، پس جبریل امین نے اس میں پھونک ماری تا کہ ان کی شہوت بھڑک جائے، کیونکہ عورت کی شہوت میں جب تک ہیجان پیدا نہ ہو وہ حاملہ نہیں ہوتی، پس جب حضرت جبریل امین کی پھونک سے ان کی شہوت میں انگیخت پیدا ہوئی تو وہ پانی جو ان کی صلب میں تھا وہ رحم میں آ گرا اور اس طرح دونوں پانی آپس میں مل گئے تو اس طرح استقرار حمل ہوگیا۔ پس اسی کے بارے ارشاد باری تعالیٰ: اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا یعنی جب وہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے کہتا ہے کُنْ تو ہو جا...... تو وہ شے ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں مکمل گفتگو سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝٤٨ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٤٩

''اور اللہ تعالیٰ سکھائے گا اسے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل۔ اور (بھیجے گا اسے) رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف (وہ انہیں آکر کہے گا کہ) میں آ گیا ہوں تمہارے پاس ایک معجزہ لے کر تمہارے رب کی طرف سے (وہ معجزہ یہ ہے کہ) میں بنا دیتا ہوں تمہارے لئے کیچڑ سے پرندے کی سی صورت پھر پھونکتا ہوں اس (بے جان

صورت) میں تو وہ فوراً ہو جاتی ہے پرندہ اللہ کے حکم سے اور میں تندرست کر دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو اور (لاعلاج) کوڑھی کو اور میں زندہ کرتا ہوں مردے کو اللہ کے حکم سے اور بتلاتا ہوں تمہیں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم جمع کر کے رکھتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان معجزوں میں (میری صداقت کی) بڑی نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایماندار ہو''

قولہ تعالیٰ: وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ابن جریج نے کہا ہے: الکتاب سے مراد کتابت کرنا اور لکھنا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد تورات اور انجیل کے علاوہ کوئی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھائی۔

وَرَسُوْلًا (یعنی) اور ہم اسے رسول بنائیں گے یا وہ ان سے رسول کی حیثیت سے ہمکلام ہوگا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ وَجِيْهًا پر معطوف ہے اور اخفش نے کہا ہے: اگر چاہے تو وَرَسُوْلًا میں واؤ کو مقحم بنادے اور رسولاً کو ہ ضمیر سے حال بنا لے تقدیر کلام ہوگی ويعلمه الكتاب رسولاً (اور اللہ تعالیٰ اسے کتاب سکھائے گا اس حال میں کہ وہ رسول ہوگا) اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے ''انبیاء بنی اسرائیل میں سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور آخری حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں'' اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ یعنی میں تمہارے لئے تصویر اور شکل سی بنادیتا ہوں۔ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ اعرج اور ابو جعفر نے کھیۃ شد کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے ہمزہ کے ساتھ۔

اور الطیر مذکر و مونث دونوں ہو سکتا ہے۔ فَاَنْفُخُ فِيْهِ اور ان میں سے ایک میں پھونک مارتا ہوں یا کیچڑ میں پھونکتا ہوں تو وہ پرندہ اڑنے والا ہو جائے گا۔ اور طائر اور طیر یہ تاجر اور تجر کی مثل ہیں۔

وہب نے کہا ہے: وہ اڑتا رہا جب تک لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے اور جب وہ ان کی آنکھوں سے غائب ہو گیا تو مردہ ہو کر گر پڑا تاکہ مخلوق کا فعل اللہ تعالیٰ کے فعل سے ممتاز ہو جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے چمگادڑ کے سوا کوئی نہیں بنایا کیونکہ خلقت کے اعتبار سے وہ کامل ترین پرندہ ہے تاکہ وہ قدرت میں انتہا کو پہنچ جائے، کیونکہ اس کے پستان بھی ہیں، دانت بھی اور کان بھی ہیں اور اسے حیض بھی آتا ہے، وہ پاک بھی ہوتا ہے اور بچے بھی جنتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: انہوں نے چمگادڑ بنانے کا مطالبہ کیا کیونکہ وہ خلقت میں تمام سے عجیب تر ہے اور اس کے عجائب میں سے یہ ہے کہ اس میں گوشت بھی ہے اور خون بھی، وہ بغیر پروں کے اڑتا ہے اور حیوانوں کی طرح بچوں کو جنم دیتا ہے اور وہ اس طرح انڈے نہیں دیتا جس طرح باقی تمام پرندے انڈے دیتے ہیں، اس کی کھیری ہوتی ہے اور اس سے دودھ نکلتا ہے، وہ نہ دن کی روشنی میں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی رات کی تاریکی میں، بلکہ وہ صرف دو ساعتوں میں دیکھ سکتا ہے، ایک ساعت سورج غروب ہونے کے بعد اور ایک ساعت طلوع فجر کے بعد اس سے پہلے کہ وہ خوب روشن ہو۔ اور وہ اس طرح ہنستا ہے جس طرح آدمی ہنستا ہے اور اسے اسی طرح حیض آتا ہے جس طرح عورت کو حیض آتا ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بے شک ان کا آپ سے اس بارے میں سوال کرنا تعنت اور سرکشی کی بنا پر تھا تو انہوں نے کہا: ہمارے لئے

چمگادڑ بناؤ اور اس میں روح ڈال دو اگر آپ اپنے قول میں سچے ہیں، پس آپ نے مٹی لی اور اس سے چمگادڑ بنایا پھر اس میں پھونک ماری تو وہ زمین و آسمان کے درمیان اڑنے لگا، اس میں مٹی اور پھونک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے، جس طرح کہ پھونک جبریل امین علیہ السلام کی جانب سے تھی اور تخلیق اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔

قولہ تعالیٰ: وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ الاکمہ وہ جو اندھا اور نابینا پیدا ہوتا ہے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور اسی طرح ابوعبیدہ نے کہا ہے: وہ جو اندھا پیدا کیا جاتا ہے اور رؤبہ کے بارے کسی نے کہا:

فَارْتَدَّ ارتداد الاكمه

ابن فارس نے کہا ہے: الکمہ کا معنی نابینا (یعنی) انسان پیدا ہوتا ہے اس حال میں کہ اسے یہ عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ سوید نے کہا ہے: کَمِهت عيناه حتى ابيضتا (اس کی آنکھیں اندھی ہیں یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئیں)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: وہ جو دن کے وقت تو دیکھتا ہے لیکن رات کے وقت نہیں دیکھ سکتا۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اعمش ہیں، البتہ لغت میں اس کا معنی عمی اندھا پن ہے، کہا جاتا ہے کَمِهَ يَكْمَه كَمَهًا اور كَمَّهتها۔ أنا کا معنی ہے جب تو اسے اندھا کر دے۔ اور برص تو معروف بیماری ہے یعنی وہ سفید داغ جو ساری جلد پر چھا جاتے ہیں (اور اسے سفید کر دیتے ہیں) اور الأبرص کا معنی قمر (چاند) بھی ہے اور سام أبرص (چھپکلی) تو معروف ہے اور اس کی جمع اباریص آتی ہے ان دونوں بیماریوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ دونوں عاجز کر دینے والی ہیں (یعنی ان کا علاج انتہائی مشقت آمیز اور مشکل ہے گویا لاعلاج بیماریاں ہیں) اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب کا غلبہ اور دور دورہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے اسی کی جنس سے انہیں معجزہ دکھا دیا۔

وَاُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے چار آدمیوں کو زندہ کیا: عاذر کو وہ آپ کا دوست تھا، بڑھیا کے بیٹے کو، ابنۃ العاشر کو اور سام بن نوح کو۔ فاللہ اعلم، پس عاذر نے تو چند دن قبل وفات پائی تھی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی پس وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کی چربی ٹپکنے کے قریب ہو گئی پس وہ زندہ رہا اور اس کی اولاد بھی ہوئی۔ اور رہا ابن العجوز! تو آپ اس کے پاس سے گزرے اسے چارپائی پر اٹھایا جا رہا تھا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے پہن لئے اور چارپائی اپنی گردن پر اٹھالی اور اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گیا اور جہاں تک بنت العاشر کا تعلق ہے تو آپ ایک رات اس کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اس کے بعد زندہ ہو گئی اور اس کی اولاد بھی ہوئی، پس جب بنی اسرائیل نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: بلاشبہ آپ انہیں زندہ کرتے ہیں جن کی موت قریب قریب واقع ہوئی ہے تو شاید وہ ابھی نہ مرے ہوں بلکہ ان پر سکتہ طاری ہوا ہو، تو آپ ہمارے لئے سام بن نوح کو زندہ کریں۔ تو آپ نے انہیں فرمایا: تم اس کی قبر کے بارے میری راہنمائی کرو۔ چنانچہ آپ نکلے اور آپ کے ساتھ قوم بھی نکلی یہاں تک کہ اس کی قبر کے پاس پہنچ گئے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تو وہ اپنی قبر سے اس حال میں نکلا کہ اس کے سر کے بال سفید تھے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا: تیرا سر کیسے سفید ہو گیا ہے حالانکہ تمہارے زمانے میں بڑھاپا نہیں تھا؟ تو اس نے جواب دیا: اے روح اللہ! بلاشبہ تو نے مجھے بلایا ہے اور میں نے یہ آواز سنی کوئی کہہ رہا ہے: روح اللہ کو جواب دو، تو میں نے یہ گمان کیا کہ

قیامت قائم ہو چکی ہے، پس اسی خوف کی وجہ سے میرا سر سفید ہو گیا ہے۔ پھر آپ نے اس سے نزع کے بارے پوچھا، تو اس نے کہا: اے روح اللہ! بلاشبہ نزع کی تلخی میری سانس کی نالی سے (نرخرہ سے) ابھی ختم نہیں ہوئی حالانکہ میری موت کے وقت سے (اب تک) چار ہزار برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، پھر اس نے قوم کو کہا: تم ان کی تصدیق کر لو کیونکہ یہ نبی ہیں، تو ان میں سے بعض آپ کے ساتھ ایمان لے آئے اور بعض نے آپ کو جھٹلا دیا۔ اور کہا: یہ سحر ہے۔ اسماعیل بن عیاش کی حدیث سے مروی ہے کہ انہوں نے ذکر کیا مجھے محمد بن طلحہ نے ایک آدمی سے حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام جب کسی مردے کو زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو آپ دو رکعت نماز ادا فرماتے پہلی رکعت میں تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ اور دوسری میں تنزیل السجدہ کی قرأت فرماتے اور جب فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتے پھر ان سات اسماء کے وسیلہ سے دعا مانگتے: یا قدیمُ، یا خفِیُ، یا دائم، یا فردُ، یا وترُ، یا احَدُ، یا صَمَدُ، اسے علامہ بیہقی نے ذکر کیا ہے اور کہا ہے۔ اس کی اسناد قوی نہیں ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی میں تمہیں اس کے بارے بتلاتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو تم جمع کر کے رکھتے ہو۔ اور یہ اس لئے ہوا کہ جب آپ نے ان کے لئے مردے زندہ کئے تو انہوں نے آپ سے ایک دوسرے معجزے کا مطالبہ کر دیا اور انہوں نے کہا: آپ ہمیں اس کے بارے بتائیے جو ہم اپنے گھروں میں کھاتے ہیں اور جو آنے والے کل کے لئے جمع کر کے رکھتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے انہیں آگاہ کیا اور فرمایا: اے فلاں! تو نے فلاں فلاں چیز کھائی اور تو نے فلاں فلاں چیز کھائی اور فلاں فلاں چیز جمع کر کے رکھی۔ اسی کے بارے قولہ وَاُنَبِّئُكُمْ الآیہ ہے۔

مجاہد، زہری اور سختیانی نے ذال معجمہ کے ساتھ وماتذخرون مخفف پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے: آپ تعلیم گاہ میں بچوں کو ان چیزوں کے بارے بتلاتے تھے جو وہ جمع کر کے رکھ آتے تھے یہاں تک کہ ان کے والدین نے انہیں آپ کے پاس بیٹھنے سے روک دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا: آپ نے انہیں اس کے بارے بتایا جو وہ دستر خوان سے کھا کر آتے اور جو وہ خفیۃً (چھپ کر) اس سے جمع کر آتے تھے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

"اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اس سے پہلے آئی ہوئی کتاب تورات کی اور تاکہ میں حلال کر دوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو (پہلے) حرام کی گئی تھیں تم پر اور لایا ہوں تمہارے پاس ایک نشانی تمہارے رب کی طرف سے سو، ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے مجھے اور مرتبہ کمال تک پہنچانے والا ہے تمہیں، سو اس کی عبادت کرو یہی سیدھا راستہ ہے"۔

وَ مُصَدِّقًا اس کا عطف وَ رَسُوْلًا پر ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ میں تمہارے پاس تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں۔ لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ اس کی جو مجھ سے پہلے آئی۔ وَ لِأُحِلَّ لَكُمْ اس میں حذف ہے، ای وَلأحل لکم جئتکم (اور تا کہ میں تمہارے لئے حلال کر دوں میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں) بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ یعنی کھانے کی اشیاء میں سے بعض جو تم پر پہلے حرام کی گئی تھیں۔

کہا گیا ہے: حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جو ان پر ان کے گناہوں کی وجہ سے حرام کی گئی تھیں اور وہ تورات میں نہ تھیں، مثلاً تھوم کھانا اور ہر ناخن والا جانور۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کر دیا جنہیں ان پر علماء نے حرام کر دیا تھا اور وہ تورات میں ان پر حرام نہ کی گئی تھیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ بعض بمعنی کل ہو۔

اور لبید نے کہا ہے:

تَرَّاكُ أَمْكِنَةٍ اذا لم ارضها أو يَرْتَبِطْ بعضَ النفوس حِمامُها

اس میں بعض بمعنی کل استعمال ہوا ہے۔

یہ قول اہل لغت میں سے اہل نظر و فکر کے نزدیک غلط ہے، کیونکہ بعض اور جز اس جگہ پر بمعنی کل نہیں ہو سکتے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام نے ان کے لئے ان چیزوں کو حلال کیا جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حرام کیا تھا مثلاً تھوم کھانا وغیرہ۔ اور آپ نے ان کے لئے قتل، چوری اور فحاشی وغیرہ کو حلال نہیں کیا۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام انتہائی نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان کے پاس تشریف لائے ان چیزوں کے بارے میں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس لے کر آئے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اونٹوں کی تحریم اور تھوم وغیرہ اشیاء کی تحریم کا حکم لے کر ان کے پاس آئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے بعض کی حلت کا حکم لے کر آئے۔

نخعی نے بَعْضَ الَّذِي حَرُمَ عَلَيْكُمْ پڑھا ہے۔ یعنی یہ کَرُمَ کی مثل ہے بمعنی صَارَ حَرَامًا۔ یعنی وہ حرام ہو گیا کے معنی میں ہے۔ اور کبھی بعض کو بمعنی کل بھی رکھا جاتا ہے جبکہ وہاں ایسا قرینہ متصل ہو جو اس پر دلالت کرے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا:

أبا منذرٍ افنيتَ فاستبقِ بعضَنا حَنَانَيْكَ بعضُ الشرِّ اهون من بعض

اس میں بعض الشر اهون سے مراد کل ہے۔ وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اس میں آیہ کو واحد ذکر کیا گیا ہے حالانکہ یہ آیات ہیں، اس وجہ سے کہ یہ آپ کی رسالت پر دلالت کرنے کے اعتبار سے جنس واحد ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

''پھر جب محسوس کیا عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان سے کفر (و انکار) (تو) آپ نے کہا: کون ہیں میرے مددگار

اللہ کی راہ میں؟ (یہ سن کر) کہا حواریوں نے کہ ہم مدد کرنے والے ہیں اللہ (کے دین) کی، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور (اے نبی!) آپ گواہ ہو جائیو کہ ہم (حکم الٰہی کے سامنے) سر جھکائے ہوئے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کفر محسوس کیا۔ آیت میں اَحَسَّ بمعنی عَلِمَ اور وَجَدَ کے ہے (یعنی جانا اور پایا) زجاج نے یہی کہا ہے۔ اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: اَحس، عَرَفَ (آپ نے پہچانا) کے معنی میں ہے۔ اور اس کا اصل معنی کسی شے کو حاسہ کے ساتھ پانا ہے (وجود الشئ بالحاسة) اور احساس کا معنی کسی شے کو جاننا ہے (العلم بالشئ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ (مریم:98) (کیا آپ ان میں سے کسی کو جانتے ہیں؟ اور الحس بمعنی قتل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (آل عمران:152) (جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے) اور اسی معنی میں جراد (مکڑی) کے بارے میں حدیث بھی ہے اِذَا حَسَّهُ البرد (جب سردی نے اسے ہلاک کر دیا) مِنْهُمُ الْكُفْرَ یعنی ان کا اللہ کے ساتھ کفر و انکار کرنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ نے ان سے کلمہ کفر سنا اور فراء نے کہا ہے: انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔

قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَى اللّٰهِ۔ فرمایا: کون ہے وہ جس سے میں ان کے خلاف مدد طلب کروں؟ سدی اور ثوری وغیرہما نے کہا: یہاں اِلَى اللّٰهِ بمعنی مع اللہ ہے یعنی الی بمعنی مع ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: وَ لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ یعنی مع اموالکم۔ (یعنی تم اپنے مالوں کے ساتھ ان کے مال نہ کھاؤ۔) واللہ اعلم۔

اور حسن نے کہا ہے: اس کا معنی ہے مَن انصاری فی السبیل الی اللہ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں کون میرے مددگار ہیں؟) کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا معنی ہے کون ہے جو اپنی نصرت اور مدد کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کے ساتھ ملائے گا؟ ان دونوں قولوں کے مطابق اِلی اپنے اصل معنی پر ہے اور یہی جید اور عمدہ ہے۔ اور آپ نے نصرت اور مدد طلب کی تا کہ اس کے سبب آپ اپنی قوم سے حفاظت میں رہیں اور اعلانیہ دعوت دے سکیں، حسن اور مجاہد سے یہ معنی منقول ہے۔ اور انبیاء و اولیاء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریقہ یہی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا: لَوْ اَنَّ لِیْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِیْدٍ (ہود) (اے کاش! میرے پاس بھی تمہارے مقابلے کی قوت ہوتی یا میں پناہ ہی لے سکتا کسی مضبوط سہارے کی) یعنی خاندان اور اصحاب میری مدد کرتے۔ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ حواریوں نے کہا: ہم اللہ تعالیٰ کے نبی اور اس کے دین کے مددگار ہیں۔ اور حواریوں سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب ہیں اور وہ بارہ آدمی تھے، کلبی اور ابو روق نے یہی کہا ہے۔

ان کا یہ نام رکھنے میں اختلاف ہے، سو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ان کے سفید کپڑوں کی وجہ سے انہیں یہ نام دیا گیا، وہ صیادین (شکاری) تھے۔ ابن ابی نجیح اور ابن ارطاۃ نے کہا ہے: وہ دھوبی تھے۔ تو انہیں یہ نام کپڑے خوب صاف کرنے کی وجہ سے دیا گیا۔ حضرت عطا نے کہا ہے: حضرت مریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو متفرق عمال کے سپرد کیا اور سب سے آخر میں آپ نے انہیں حواریوں کے حوالے کر دیا اور وہ دھوبی اور رنگساز تھے، پس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معلم نے

سفر کا ارادہ کیا، تو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا: میرے پاس مختلف رنگوں کے بہت سے کپڑے ہیں اور میں نے تمہیں رنگ کرنا سکھا دیا ہے پس تم انہیں رنگ دینا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مٹکا رنگ پکایا اور اس میں تمام کپڑے ڈال دیئے اور کہا: تو اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسی طرح ہو جا جو میں تجھ سے ارادہ رکھتا ہوں۔ پس حواری آیا اور سارے کپڑے مٹکے میں پڑے ہوئے تھے۔ جب اس نے انہیں دیکھا تو کہا: تو نے انہیں خراب کر دیا ہے، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سرخ، زرد اور سبز اور دیگر ان رنگوں میں کپڑے نکالے جو رنگ ان میں سے ہر کپڑے پر لکھا ہوا تھا، یہ دیکھ کر حواری بہت متعجب ہوا اور اس نے جان لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ اس نے لوگوں کو آپ کی طرف بلایا پس وہ آپ کے ساتھ ایمان لائے اور وہی حواری تھے۔ حضرت قتادہ اور ضحاک نے کہا ہے: انہیں یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ وہ انبیاء علیہ السلام کے ساتھ خاص تھے اور وہ اس سے اپنے دلوں کی صفائی اور طہارت کا ارادہ رکھتے تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ بادشاہ تھے، اس طرح کہ بادشاہ نے کھانے کی دعوت کی اور لوگوں کو اس پر بلایا، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے جو پیالہ تھا وہ ذرا کم نہ ہوا تو بادشاہ نے آپ کو کہا: آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، تو اس نے کہا میں اپنی یہ سلطنت چھوڑتا ہوں اور تمہاری اتباع کرتا ہوں۔ پس وہ اپنے متبعین کو ساتھ لے کر آپ کے ساتھ چل پڑا، تو وہی حواری ہیں، یہ ابن عون نے کہا ہے۔ لغت میں الحَوَر کا اصل معنی سفیدی ہے اور حوّرت الثیاب کا معنی ہے میں نے کپڑے کو خوب صاف کیا، سفید کیا اور الحُوّاری من الطعام ماحوّر یعنی جو کھانا خوب اچھی طرح پکایا جائے۔ اور احوَرّ کا معنی ابیض (سفید ہونا) ہے۔ اور الجفنة المحوّرة: سفید چمڑے سے بنی ہوئی نیام اور الحواری کا معنی مددگار بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لِکل نبیّ حواریّ وحواریّ الزبیر(1) (ہر نبی کا حواری (مددگار) ہے اور میرا حواری زبیر ہے) اور الحواریات سفید عورتیں۔

اور کسی نے کہا:

فقل للحواریات یبکین غیرنا ولا تبکنا الّا الکلابُ النوابحُ

پس تو ان سفید عورتوں سے کہہ دے وہ ہمارے سوا اوروں پر روئیں اور ہم پر نہ روئیں گے مگر بھونکنے والے کتے۔

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنۡزَلۡتَ وَ اتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۵۳﴾

"اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے نازل فرمایا اور ہم نے تابعداری کی رسول کی، تو لکھ لے ہمیں (حق پر) گواہی دینے والوں کے ساتھ۔"

قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنۡزَلۡتَ یعنی وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے بِمَآ اَنۡزَلۡتَ یعنی اس کے ساتھ جو تو نے اپنی کتاب میں نازل فرمایا اور اس پر جو تو نے اپنے حکم میں سے ظاہر اور بیان کیا۔ وَ اتَّبَعۡنَا الرَّسُوۡلَ رسول سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ فَاكۡتُبۡنَا مَعَ الشّٰهِدِيۡنَ شاہدین سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے، یہ

1۔ صحیح بخاری، باب فضل الطلیعة، حدیث نمبر 2634، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور معنی یہ ہے ہمارے اسماء ان کے اسماء کے ساتھ لکھ لے اور ہمیں من جملہ ان میں سے بنا دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: معنی یہ ہے ہمیں ان کے ساتھ لکھ لے جنہوں نے تیرے انبیاء علیہم السلام کی صدق و سچائی کے ساتھ شہادت دی۔

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۠ ﴿۵۴﴾

''اور یہودیوں نے بھی (مسیح کو قتل کرنے کی) خفیہ تدبیر کی اور (مسیح کو بچانے کے لئے) اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر (اور مؤثر) خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَكَرُوْا مراد بنی اسرائیل کے وہ کفار ہیں جن سے آپ نے کفر محسوس کیا یعنی آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ اور وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب ان کی قوم اور ان کی ماں نے اپنے درمیان سے نکال دیا تو آپ حواریوں کے ساتھ ان کی طرف لوٹ کر آئے اور ان میں اعلانیہ دعوت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا، تو انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ بنایا اور انہوں نے آپ کے قتل پر اتفاق کیا، پس یہی ان کا مکر اور خفیہ تدبیر ہے۔ اور مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے لئے ایسی خفیہ تدبیر کرنا ہے جسے وہ نہ جانتے ہوں، فراء وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جب بھی انہوں نے کوئی گناہ اور غلطی کی تو ہم نے انہیں ایک تازہ اور اچھی نعمت عطا کر دی۔

اور زجاج نے کہا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ سے مراد انہیں ان کی خفیہ تدبیر پر جزا اور بدلہ دینا ہے، پس جزا اور بدلے کو ابتدا کا نام دیا گیا ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ اور وَ هُوَ خَادِعُهُمْ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لغت میں مکر کا اصل معنی حیلہ کرنا اور دھوکہ دینا ہے۔ اور مکر کا معنی خدالۃ الساق (پنڈلی کا بھر جانا) ہے اور امرأۃ ممکورۃ الساقین (ایسی عورت جس کی دونوں پنڈلیاں گول اور بھری ہوئی ہوں) اور مکر کپڑوں کی ایک قسم بھی ہے۔

اور کہا جاتا ہے: بلکہ اس سے مراد گیرو اور سرخ مٹی ہے، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: مَكَرَ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ کو دوسروں کے سامنے کر دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف سے اٹھا لیا اور وہ اس طرح ہوا کہ یہودی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے تو آپ ان سے بھاگ کر گھر میں داخل ہوئے تو حضرت جبرائیل امین نے آپ کو روشندان سے آسمان کی طرف اٹھا لیا، تو ان کے بادشاہ نے ان میں سے ایک خبیث آدمی کو کہا اسے یہودا کہا جاتا تھا: تو ان پر داخل ہو اور انہیں قتل کر دے، پس وہ روشندان سے اندر داخل ہوا لیکن وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہ پایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو عیسیٰ علیہ السلام کی شبیہ مشابہ بنا دیا، پس جب وہ نکلا تو انہوں نے اسے عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ دیکھا چنانچہ انہوں نے اسے پکڑ لیا اور قتل کر دیا اور پھر اسے سولی دے دی۔ بعد ازاں انہوں نے کہا: اس کا چہرہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چہرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور اس کا بدن ہمارے اپنے ساتھی کے بدن سے مشابہ ہے، پس اگر یہ ہمارا ساتھی ہے تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں! اور اگر یہ عیسیٰ ہیں تو پھر ہمارا ساتھی کہاں ہے؟ پھر ان کے درمیان جنگ

شروع ہوگئی اور انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو قتل کیا۔ پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ اس کے علاوہ بھی (بہت کچھ) کہا گیا ہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ۔ مَاكِرِيْن مَكَرَ يَمْكُرُ مَكْرًا سے اسم فاعل ہے اور بعض علماء نے اسے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں شمار کیا ہے اور جب وہ اس کے ساتھ پکاریں تو اس طرح کہتے ہیں: یا خیر الماکرین امکرلی۔ (اے بہترین تدبیر کرنے والے میرے لئے تدبیر فرما) اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی دعا میں کہتے تھے(1)۔ اللھم امکرلی ولا تمکر علی (اے اللہ! میرے حق میں تدبیر فرما اور میرے خلاف تدبیر نہ فرما) ہم نے اسے "الکتاب الاسنی فی شرح اسماء الحسنیٰ" میں ذکر کیا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

"یاد کرو جب فرمایا اللہ نے اے عیسیٰ! یقیناً میں پوری عمر تک پہنچاؤں گا تمہیں اور اٹھانے والا ہوں تمہیں اپنی طرف اور پاک کرنے والا ہوں تمہیں ان لوگوں (کی تہمتوں سے) جنہوں نے (تیرا) انکار کیا اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے تیری پیروی کی غالب کفر کرنے والوں پر قیامت تک، پھر میری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے تم نے پس (اس وقت) میں فیصلہ کروں گا تمہارے درمیان (ان امور کا) جن میں تم اختلاف کرتے رہتے تھے۔"

قولہ تعالیٰ: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ، اِذْ میں عامل یا تو مَكَرُوْا ہے یا فعل مضمر ہے۔ اہل معانی کی ایک جماعت جن میں ضحاک اور فراء بھی ہیں انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ کے بارے کہا ہے کہ اس میں تقدیم و تاخیر ہے، کیونکہ واؤ ترتیب کو ثابت نہیں کرتی۔ اور معنی یہ ہے: انی رافعک الی و مطھرک من الذین کفروا و متوفیک بعد ان تنزل من السماء (میں تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں ان لوگوں کی تہمتوں سے پاک کرنے والا ہوں جنہوں نے تیرا انکار کیا اور تمہیں آسمان سے اتارے جانے کے بعد تمہیں موت دوں گا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ (طٰہٰ) (اور اگر ان کے (انجام کے) متعلق آپ کے رب کا فیصلہ پہلے نہ ہو چکا ہوتا اور ان کے لئے ایک وقت مقرر نہ کر دیا گیا ہوتا تو ابھی ان پر عذاب نازل ہو جاتا۔) اس میں تقدیر عبارت یہ ہے ولولا کلمۃ سبقت من ربک واجل مسمی لکان لزاما۔

شاعر نے کہا ہے:

الا یا نخلۃ من ذات عرق　　علیک و رحمۃ اللہ السلام

اس میں تقدیر عبارت، علیک السلام و رحمۃ اللہ۔ یعنی اس میں بھی تقدیم و تاخیر ہے۔

حسن اور ابن جریج نے کہا ہے: متوفیک کا معنی ہے: میں تمہیں قبضہ میں لینے والا ہوں اور بغیر موت کے آسمان کی طرف

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر 3474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اٹھانے والا ہوں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: توفیت مالی من فلان یعنی میں نے فلاں سے اپنا مال قبضے میں لے لیا۔
اور وہب بن منبہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دن کی تین ساعتوں کے لئے موت دی اور پھر انہیں آسمان کی طرف اٹھالیا۔ لیکن یہ قول بعید از حقیقت ہے۔ کیونکہ آپ کے آسمان سے اترنے اور دجال کو قتل کرنے کے بارے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح احادیث مروی ہیں، جیسا کہ ہم نے اسے ''کتاب التذکرہ'' میں بیان کیا ہے اور اس کتاب میں بھی کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔
اور ابن زید نے کہا ہے: متوفیك بمعنی قابضك (میں تجھے قبضہ میں لینے والا ہوں) ہے اور متوفیك اور رافعك ایک ہی ہے اور اس کے بعد موت نہیں ہے۔
ابن طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ متوفیك کا معنی ممیتك ہے (یعنی میں تجھے موت دینے والا ہوں) حضرت ربیع بن انس نے کہا ہے کہ اس سے مراد نیند کی موت ہے، (جیسا کہ) اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وھو الذی یتو فاکم باللیل یعنی تمہیں رات کے وقت سلا دیتا ہے کیونکہ نیند اخو الموت ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب آپ سے پوچھا گیا کیا جنت میں نیند ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، نیند اخو الموت ہے اور جنت میں کوئی موت نہیں'' اسے دار قطنی نے بیان کیا ہے۔
اور صحیح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بغیر وفات اور بغیر نیند کے آسمان کی طرف اٹھالیا، جیسا کہ حسن اور ابن زید نے کہا ہے اور اسے ہی طبری نے اختیار کیا ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت ہے۔ اور ضحاک نے بھی یہی کہا ہے۔
ضحاک نے کہا ہے: واقعہ یہ ہے کہ جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، حواری ایک کمرے میں جمع ہوئے اور وہ بارہ آدمی تھے تو حضرت مسیح علیہ السلام کمرے کے طاق سے ان پر داخل ہوئے تو ابلیس نے یہود کی جماعت کو اس سے آگاہ کر دیا، چنانچہ ان میں سے چار ہزار آدمی سوار ہو کر آئے اور انہوں نے کمرے کے دروازہ کو گھیر لیا، تو حضرت مسیح نے حواریوں کو کہا: تم میں سے کون ہے جو نکلے گا اور اسے قتل کر دیا جائے گا اور وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا؟ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے نبی! میں، پس آپ نے اون سے بنا ہوا ایک جبہ اور ایک عمامہ اس کی طرف پھینکا اور اسے اپنا نیزہ (مراد ایسا ڈنڈا جس کے نیچے پھل لگا ہوا ہو) بھی عطا فرمایا اور اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا، وہ یہود کی طرف نکلا تو انہوں نے اسے قتل کر دیا اور اسے سولی دے دی اور رہے حضرت مسیح علیہ السلام! تو اللہ تعالیٰ نے انہیں پر عطا فرمائے اور انہیں نور کا لباس پہنا دیا اور ان سے کھانے پینے کی لذت منقطع کر دی تو وہ ملائکہ کے ساتھ اڑ گئے۔
ابو بکر بن ابی شیبہ نے ذکر کیا ہے کہ ابو معاویہ اعمش نے منہال سے، انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھانے کا ارادہ فرمایا تو وہ اپنے اصحاب کی طرف نکلے وہ بارہ آدمی تھے، ایک معین کمرے میں جمع تھے اور آپ کے سر سے پانی کے قطرے گر رہے تھے تو آپ نے انہیں کہا: خبردار! بلاشبہ تم میں سے وہ ہے جو عنقریب میرے بارے میں بارہ

مرتبہ انکار کرے گا اس کے بعد کہ وہ میرے ساتھ ایمان لا چکا ہے، پھر آپ نے فرمایا: تم میں سے کون ہے جس پر میری شبیہ ڈال دی جائے پھر وہ میری جگہ قتل کر دیا جائے تو وہ میرے درجہ میں میرے ساتھ ہوگا؟ تو ان کے جوانوں میں سے ایک جوان اٹھا اور اس نے کہا میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا، پھر آپ نے دوبارہ بات کی تو وہی جوان اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تو بیٹھ جا۔ آپ نے پھر اپنی بات کی تو وہی جوان پھر اٹھا اور اس نے کہا: میں، تو اب کی بار آپ نے فرمایا: ہاں تو ہی وہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پرتو ڈال دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس سوراخ سے اوپر اٹھا لیا جو گھر میں آسمان کی طرف تھا۔ راوی نے بیان کیا: اور پھر تلاش کرنے والے یہودی آئے اور انہوں نے اس مشابہ شخص کو پکڑ لیا اور اسے قتل کر دیا اور پھر اسے سولی پر لٹکا دیا اور ان میں سے بعض نے آپ کا بارہ مرتبہ انکار کیا بعد اس کے کہ وہ آپ کے ساتھ ایمان لا چکے تھے، پس اس طرح وہ تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ رہا جب تک اس نے چاہا پھر وہ آسمان کی طرف بلند ہو گیا اور وہ یعقوبیہ ہیں۔ اور ایک گروہ نے کہا: ہم میں ابن اللہ رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور یہ نسطوریہ ہیں۔ اور ایک فرقے نے کہا: ہم میں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا اور پھر اسے اپنی طرف اٹھا لیا اور یہ مسلمان ہیں۔ پھر دونوں کافر گروہ مسلمان گروہ پر غالب آ گئے اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ پھر اسلام مسلسل مٹتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو وہ قتل کر دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَاٰمَنَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآىِٕفَةٌ ۚ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الصف: 14) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان کے آباء ایمان لائے عَلٰى عَدُوِّهِمْ یعنی ہم نے اہل ایمان کے دین کو کفار کے دین پر غلبہ دینے میں ان کی تائید کی فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِیْنَ پس وہ غالب ہو گئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے(1) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم بخدا! ابن مریم عادل حکمران کی حیثیت سے ضرور نازل ہوں گے وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور خنزیر کو ضرور قتل کریں گے اور جزیہ ختم کر دیں گے اور جوان اونٹنیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور ان پر کوئی کام نہ کیا جائے گا اور کینہ، باہم ایک دوسرے سے بغض رکھنا اور باہمی حسد سب ختم ہو جائے گا اور آپ مال کی طرف دعوت دیں گے اور کوئی اسے قبول نہ کرے گا''۔

اور آپ ہی سے یہ بھی روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے! ابن مریم کو (مکہ اور مدینہ کے درمیان) روحاء کے راستہ پر ڈالا جائے گا حج کے لئے یا عمرہ کرنے کے لئے یا اس لئے تاکہ وہ دونوں کو ایک ساتھ کریں''۔

وہ کسی نئی شریعت کے ساتھ نزول نہیں فرمائیں گے کہ اس سے ہماری شریعت منسوخ ہو جائے بلکہ وہ ان امور کی تجدید کے لئے نازل ہوں گے جو اس شریعت کے متبعین نے اس سے بوسیدہ کر دیئے ہیں اور مٹا ڈالے ہیں۔ اسی طرح صحیح مسلم میں

1۔ صحیح بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام، حدیث نمبر 3192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم کیسی (شان سے) ہو گے جب ابن مریم تم میں نزول فرمائیں گے اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا'' اور ایک روایت میں الفاظ فامکم منکم ہیں۔ ابن ابی ذئب نے کہا: تم جانتے ہو تم میں سے امکم کیا ہے؟ میں نے کہا: آپ ہی مجھے بتائیے۔ تو انہوں نے کہا: پس تمہاری اصل (فامکم) تمہارے رب تبارک وتعالیٰ کی کتاب ہے اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے(1)۔ ہم نے ''کتاب التذکرہ'' میں اس بارے قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ والحمدللہ۔

اور مُتَوَفِّيْكَ اصل میں مُتَوَفِّيُكَ ہے اور ضمہ کو ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا اور یہ ان کی خبر ہے اور وَرَافِعُكَ اس پر معطوف ہے، اور اسی طرح مُطَهِّرُكَ اور وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ بھی ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اصل ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا پر وقف تام ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول حسن ہے۔ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ اور بنانے والا ہوں ان کو جنہوں نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی اتباع کی۔ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حجت اور قیام دلیل کے ساتھ غالب ان پر جنہوں نے کفر کیا اور یہ بھی کہا گیا ہے: بالعزۃ والغلبۃ۔ یعنی عزت اور غلبے کے ساتھ کفر کرنے والوں پر غالب۔ اور ضحاک اور محمد ابن ابان نے کہا ہے: مراد حواری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝

''تو وہ جنہوں نے کفر کیا میں عذاب دوں گا انہیں سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں اور نہیں ہوگا ان کے لئے کوئی مددگار۔ اور وہ جو ایمان لائے اور کئے نیک کام تو اللہ پورے پورے دے گا انہیں ان کے اجر اور اللہ تعالیٰ نہیں محبت کرتا ظلم کرنے والوں سے۔ یہ جو ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو آیتیں ہیں اور نصیحت حکمت والی۔''

قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ یعنی میں انہیں دنیا میں قتل، سولی، قید اور جزیہ کے ساتھ اور آخرت میں آگ کے ساتھ سخت عذاب دوں گا۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ، ذٰلِكَ مبتدا ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ اور اس کی خبر نَتْلُوْهُ ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ الامر ذالک ہو یعنی مبتدا مضمر ہو۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

''بے شک مثال عیسیٰ (علیہ السلام) کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) کی مانند ہے بنایا اسے مٹی سے،

1۔ صحیح بخاری، باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام، حدیث نمبر 3193، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پھر فرمایا اسے ہو جا تو وہ ہو گیا۔ (اے سننے والے) یہ حقیقت (کہ عیسیٰ انسان ہیں) تیرے رب کی طرف سے (بیان کی گئی) ہے پس تو نہ ہو جا شک کرنے والوں سے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ یہ آیت قیاس کے صحیح ہونے پر دلیل ہے۔ اور تشبیہ اس بناء پر واقع ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آدم علیہ السلام کی طرح بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہے، اس بنا پر نہیں ہے کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور ایک شے دوسری شے کے مشابہ ہوتی ہے جب وہ دونوں ایک وصف میں جمع ہوں اگرچہ فی الحقیقت دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہو، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق فرمایا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو مٹی سے پیدا نہیں کیا گیا پس اس جہت سے دونوں کے درمیان فرق ہے لیکن جس شے میں دونوں کو تشبیہ دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا ہے اور اس لئے بھی کہ دونوں کی خلقت کی اصل مٹی سے ہے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام بھی نفس مٹی سے پیدا نہیں کیے گئے، بلکہ مٹی کو کیچڑ بنایا پھر اسے صلصال (سوکھی ہوئی بجنے والی مٹی) بنایا پھر اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا، تو اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرا، پھر آپ کو بغیر باپ کے بشر بنایا۔

اور یہ آیت وفد نجران کے سبب نازل ہوئی جبکہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کی وجہ سے انکار کیا: ان عیسی عبد اللہ و کلمتہ کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کا کلمہ ہیں۔ انہوں نے کہا: آپ ہمیں کوئی بندہ دکھائیں جو بغیر باپ کے پیدا کیا گیا ہو، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "آدم علیہ السلام جو ان کے باپ تھے وہ عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ تمہارے لئے تعجب خیز ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا صرف باپ نہیں لیکن آدم علیہ السلام کا نہ باپ ہے اور نہ ہی ماں" اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں (وہ آپ کے پاس کوئی مثال نہیں لائیں گے) اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ (مگر ہم آدم علیہ السلام کے بارے میں آپ کے پاس حق لے کر آئے)۔ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (اور کتنی اچھی تفسیر بیان کی) اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ہم تم سے پہلے مسلمان تھے، تو آپ نے فرمایا: "تم نے جھوٹ بولا ہے تین چیزیں تمہیں اسلام سے روک رہی ہیں۔ ایک تمہارا یہ قول کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنایا ہے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) اور دوسرا تمہارا خنزیر کھانا اور تیسرا تمہارا صلیب کو سجدہ کرنا۔" تو انہوں نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون ہے؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝٥٩ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝٦٠ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝٦١ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں بلایا، تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: اگر تم نے ایسا کیا تو تم پر وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی۔ تب انہوں نے کہا: کیا اس کے سوا بھی کوئی شے آپ ہم پر پیش فرمائیں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسلام یا جزیہ یا جنگ تو انہوں نے ان میں سے جزیہ کا اقرار کیا اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور قول باری تعالیٰ اٰدَمَ پر کلام مکمل ہو گیا۔

پھر فرمایا: خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یہ بمعنی فکان ہے۔ جب معنی معلوم اور معروف ہوتو مستقبل ماضی کے محل میں واقع ہوسکتا ہے۔

فراء نے کہا: اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ مرفوع ہے اور اس سے پہلے ھو مبتدا مضمر ہے۔

اور ابوعبیدہ نے کہا ہے: یہ جملہ مستانفہ ہے اور اس کی خبر مِنْ رَّبِّكَ کے قول میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الحق فاعل ہے یعنی جاءت الحقُّ۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ یہ خطاب حضور نبی مکرم ﷺ کو ہے اور مراد آپ کی امت ہے، کیونکہ آپ ﷺ تو حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے قطعاً شک کرنے والے نہیں۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝

''پھر جو شخص جھگڑا کرے آپ سے اس بارے میں اس کے بعد کہ آ گیا آپ کے پاس (یقینی) علم تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بلائیں اپنے بیٹوں کو بھی اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اپنے آپ کو بھی اور تم کو بھی، پھر بڑی عاجزی سے (اللہ کے حضور) التجا کریں پھر بھیجیں اللہ تعالیٰ کی لعنت جھوٹوں پر۔''

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ یعنی اے محمد! ﷺ جو شخص آپ سے جھگڑا کرے فِيْهِ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اس کے بعد کہ آپ کے پاس اس بارے میں یقینی علم آ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فَقُلْ تَعَالَوْا یعنی تَعَالَوْا بمعنی أقبلوا ہے، تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ۔ یہ لفظ وضع تو اس کے لئے کیا گیا ہے جس کی کوئی قدر و منزلت اور رفعت و شان ہو اور پھر ہر آنے اور متوجہ ہونے کی دعوت دینے والے کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کا مزید بیان سورۃ الانعام میں آئے گا۔ نَدْعُ یہ محل جزم میں ہے اَبْنَآءَنَا یہ اس پر دلیل ہے کہ بیٹیوں کے بیٹوں کو ابناء کا نام دیا جا سکتا ہے، اس لئے کہ حضور نبی مکرم ﷺ امام حسن، امام حسین رضی اللہ عنہما کو ساتھ لے کر آئے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے پیچھے چل رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پیچھے تھے اور آپ ﷺ انہیں فرما رہے تھے: ''اگر میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔'' اور یہی اس ارشاد کا معنی ہے ثُمَّ نَبْتَهِلْ یعنی ہم دعا میں انتہائی عجز و انکساری اختیار کریں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی مروی ہے۔ ابوعبیدہ اور کسائی نے کہا ہے کہ نبتھل بمعنی نلتعن ہے اور ابتہال کا اصل معنی یہی ہے کہ دعا میں لعن وغیرہ کے ساتھ انتہائی کوشش کرنا۔

لبید نے کہا ہے:

فی کھولٍ سادۃ من قومہ نظر الدھرُ الیھم فابتھل

یعنی زمانے نے انہیں ہلاک کرنے میں پوری کوشش کی۔

کہا جاتا ہے: بھلہ اللہ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ اور البھل کا معنی لعن ہے۔ اور البھل کا معنی ماء قلیل (تھوڑا پانی) بھی ہے اور ابھلتہ تب کہا جاتا ہے جب تو اسے اور اس کے ارادہ کو چھوڑ دے۔ اور بھلتہ کا بھی یہی معنی ہے۔ اور ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے: بھلہ اللہ یبھلہ بھلۃ یعنی اللہ نے اس پر لعنت کی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ اہل نجران تھے: ان کے رؤساء میں قابل ذکر، عاقب اور ابن حارث تھے۔ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰذِبِيۡنَ (پھر ہم جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت بھیجیں)

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامت میں سے ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مباہلہ کی دعوت دی اور انہوں نے اس سے انکار کیا اور جزیہ دینے پر راضی ہو گئے اس کے بعد کہ ان کے بڑے سردار عاقب نے انہیں بتایا کہ اگر انہوں نے آپ سے مباہلہ کیا تو پھر ان پر یہ وادی آگ سے بھڑک اٹھے گی، کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں، اور تحقیق تم جانتے ہو کہ وہ تمہارے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل لے کر آئے ہیں، تو انہوں نے مباہلہ ترک کر دیا اور اپنے شہروں کی طرف واپس چلے گئے اس شرط پر کہ وہ ہر سال ایک ہزار حلہ صفر کے مہینہ میں اور ایک ہزار حلہ رجب کے مہینہ میں ادا کریں گے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے بدلے اسی پر ان سے صلح کر لی۔

مسئلہ نمبر 3۔ بہت سے علماء نے کہا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مباہلہ کے وقت امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے بارے یہ قول نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَكُمۡ اور امام حسن رضی اللہ عنہ کے بارے آپ کا یہ ارشاد اِنَّ ابۡنِیۡ ھٰذَا سَیِّدٌ (1) امام حسن و حسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ مخصوص ہے کہ ان دونوں کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا ہونے کا نام دیا گیا، ان کے سوا کسی کے لئے یہ حکم نہیں ہے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: ''قیامت کے دن ہر سبب و نسب کٹ جائے گا سوائے میرے نسب و سبب کے'' اسی لئے بعض اصحاب شافعی نے ایسے آدمی کے بارے میں کہا ہے جس نے فلاں کے بیٹے کے لئے وصیت کی اور اس کا صلبی بیٹا نہ تھا اور اس کے بیٹے کا بیٹا اور بیٹی کا بیٹا تھا، بلاشبہ وہ وصیت بیٹے کے بیٹے کے لئے ہوگی نہ بیٹی کے بیٹے کے لئے اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ اس کے بارے مزید بیان سورۃ الانعام اور زخرف میں آئے گا ان شاء اللہ۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ ۚ وَمَا مِنۡ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ۝ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِالۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝

''بے شک یہی ہے واقعہ سچا اور نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور بے شک اللہ ہی غالب ہے (اور) حکمت والا ہے۔ پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ خوب جاننے والا ہے فساد برپا کرنے والوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡقَصَصُ الۡحَقُّ قول باری تعالیٰ اِنَّ هٰذَا میں اشارہ قرآن اور اس میں موجود قصص کی طرف ہے، انہیں قصص کا نام دیا گیا ہے کیونکہ ان میں معانی تسلسل کے ساتھ ہوتے ہیں اور یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے:

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلح، حدیث نمبر 2505، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فلان یقص أثر فلان یعنی فلاں فلاں کی اتباع میں آ رہا ہے۔

وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ اس میں مِنْ زائدہ تاکید کے لئے ہے اور معنی ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں (وما اله الا اللہ) الْعَزِیْزُ یعنی وہ جو مغلوب نہیں ہوتا۔ الْحَکِیْمُ اس کا معنی ہے صاحب حکمت اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے۔ والحمد للہ۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَ بَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

”(میرے نبی!) آپ کہئے اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو یکساں ہے ہمارے اور تمہارے درمیان (وہ یہ کہ) ہم نہ عبادت کریں (کسی کی) سوائے اللہ کے اور نہ شریک ٹھہرائیں اس کے ساتھ کسی چیز کو اور نہ بنا لے کوئی ہم میں سے کسی کو رب اللہ کے سوا پھر اگر وہ روگردانی کریں (اس سے) تو تم کہہ دو گواہ رہنا (اے اہل کتاب) کہ ہم مسلمان ہیں۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ حسن، ابن زید اور سدی کے قول کے مطابق یہ خطاب اہل نجران کو ہے اور قتادہ اور ابن جریج وغیرہما کے قول کے مطابق خطاب مدینہ کے یہودیوں کو ہے، انہیں اس لئے خطاب کیا گیا کیونکہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی اطاعت و پیروی کرنے میں رب کی طرح بنا رکھا تھا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ تمام کے لئے ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرقل کی طرف جو گرامی نامہ تحریر فرمایا اس میں ہے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ... من محمد رسول الله الی هرقل عظیم الروم سلام علی من اتبع الهدی [أما بعد فانی ادعوك بدعایة الاسلام] أسلم تسلم [و أسلم] یؤتك الله أجرك مرتین و ان تولیت فان علیك اثم الاریسیین، و یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا الله ... الی قوله: فقولوا اشهدوا بانا مسلمون۔ (1)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (یہ خط) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شاہ روم ہرقل کی طرف ہے اس پر سلام ہو جس نے ہدایت کی اتباع اور پیروی کی [اما بعد میں تجھے دعوت اسلام دیتا ہوں] تو اسلام قبول کر لے محفوظ ہو جائے گا [اور تو اسلام لے آ] اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اعراض کیا تو تجھ پر اپنے جملہ لواحقین و متبعین کا گناہ ہو گا اور اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں تا قولہ ”تو تم کہہ دو گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں) یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔

السواء کا معنی عدل اور نصف و نصف ہے، قتادہ نے یہی کہا ہے۔

اور زہیر نے کہا ہے:

1۔ مسند امام احمد، حدیث نمبر 2370

أرونی خُطّة لا ضَیم فیھا یُسَوّی بیننا فیھا السَّوَاء

مجھے کوئی ایسا کام دکھاؤ جس میں ظلم نہ ہو اور اس میں ہمارے درمیان عدل کیا جاتا ہو۔

فراء نے کہا ہے: عدل کے معنی ادا کرنے کے لئے سِویٰ اور سُویٰ کہا جاتا ہے، پس جب تو سین کو فتحہ دے گا تو اسے مد کے ساتھ پڑھے گا اور جب تو سین پر کسرہ یا ضمہ پڑھے گا تو اسے قصر کے ساتھ پڑھے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَكَانًا سُوًى فرمایا: اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں ہے الی کلمة عدل بیننا و بینکم اور قعنب (ابوالسمال العدوی) نے كِلْمَة لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے لام کی حرکت کاف کو دے دی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: كِبْد پس معنی یہ ہے تم اسے قبول کرو جس کی طرف تمہیں دعوت دی گئی ہے اور وہی وہ کلمہ عادلہ مستقیمہ ہے جس میں حق سے کہیں اور ذرا میلان اور جھکاؤ نہیں اور اس کی تفسیر اس قول باری تعالیٰ کے ساتھ کی ہے۔ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ اس میں انْ، کلمة سے بدل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے یا مبتدا مضمر ہونے کی بنا پر یہ محل رفع میں ہے، تقدیر کلام یہ ہے ھی أن لا نعبد الا اللہ۔ یا پھر یہ انْ مفسرہ ہے اور اس کا کوئی محل نہیں، اور اس کے ساتھ نَعْبُدُ اور جو اس پر معطوف ہے اس پر رفع اور جزم دونوں جائز ہیں: پس جزم اس بنا پر کہ انْ مفسرہ بمعنی ای ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: أَنِ امْشُوْا اور لا جازمہ ہو۔ یہ سیبویہ کا مذہب ہے۔ اور اس بنا پر یہ بھی جائز ہے کہ نَعْبُدُ کو رفع دیا جائے اور یہ اور اس کا مابعد خبر ہو۔ اور بمعنی أنه لا نعبدُ رفع دینا جائز ہے اور اس کی مثل یہ ارشاد ہے اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ (طہ) (کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا)

اور کسائی اور فراء نے کہا ہے: وَّ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّ لَا یَتَّخِذَ یعنی یہ جزم کے ساتھ ہیں اس وہم کی بنا پر کہ اول کلام میں انْ نہیں ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی ہم کسی شے کو حلال کرنے یا اسے حرام کرنے میں اس کی اتباع اور پیروی نہ کریں گے مگر اسی میں جسے اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنے علماء کو ان کی حرام کردہ اور حلال کردہ چیزوں کو قبول کرنے میں اپنے رب کے رتبہ اور درجہ میں رکھا ان چیزوں کے بارے میں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نہ حرام کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلال کیا۔

اور یہ ایسے استحسان کے بارے قول کے باطل ہونے پر دلالت کرتا ہے جس کا انحصار کسی دلیل شرعی پر نہ ہو، الکیا الطبری نے کہا ہے: مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ کے وہ استحسانات جو ان اندازوں اور تقدیرات کے بارے ہیں جو انہوں نے بذات خود بغیر واضح دلائل کے مقرر کئے۔ اور اس میں ان روافض کا بھی رد ہے جو یہ کہتے ہیں: دلیل شرعی کا سہارا لئے بغیر بھی امام کا قول قبول کرنا واجب ہے اور یہ کہ وہ اسے حلال کر سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہو بغیر اس کے کہ وہ کوئی مستند دلیل شرعی بیان کرے۔ ارباب رب کی جمع ہے اور یہاں دُوْنِ بمعنی غیر ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاِنۡ تَوَلَّوۡا یعنی اگر وہ اس سے اعراض کرلیں جس کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے۔ فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ تو تم کہہ دو گواہ رہنا ہم دین اسلام کے ساتھ متصف ہیں، اس کے احکام کی پیروی کرنے والے ہیں اور ہم ان احسانات اور انعامات کا اعتراف کرتے ہیں جو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہم پر ہیں ہم کسی کو رب بنانے والے نہیں ہیں نہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ عزیر علیہ السلام کو اور نہ ہی ملائکہ کو، کیونکہ وہ ہماری مثل بشر ہیں وہ ہمارے حدوث کی طرح حادث ہیں۔ اور راہبوں سے کسی ایسی شے کو قبول نہیں کریں گے جسے انہوں نے ہم پر حرام کیا ہو جب تک اللہ تعالیٰ نے اسے ہم پر حرام نہ کیا ہو، کہ ہم انہیں رب بنالیں۔ اور عکرمہ نے کہا ہے: یَتَّخِذَ بمعنی یسجد ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک سجدہ (تعظیمی) جائز تھا پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو منع فرمادیا جب انہوں نے سجدہ کرنے کا ارادہ کیا، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارے بعض بعض کے لئے جھک سکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا "نہیں" پھر ہم نے عرض کی: کیا ہم آپس میں ایک دوسرے سے معانقہ کرسکتے ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں البتہ تم ایک دوسرے سے مصافحہ کرو' اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے (1)۔ اس بارے میں مزید بیان سورۂ یوسف میں آئے گا اور سورۂ واقعہ میں کہ قرآن یا اس کے جز کو بغیر طہارت کے چھونا کیسا ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝۶۵

"اے اہل کتاب! کیوں جھگڑتے ہو تم ابراہیم کے بارے میں حالانکہ نہیں اتاری گئی تورات اور انجیل مگر ان کے بعد کیا (اتنا بھی) تم نہیں سمجھ سکتے۔"

قولہ تعالیٰ: یٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ، لِمَ اصل میں لِمَا ہے، استفہام اور خبر کے درمیان فرق بیان کرنے کے لئے الف کو حذف کردیا گیا ہے۔ اور یہ آیت یہود و نصاریٰ میں سے ہر فریق کے اس دعویٰ کے سبب نازل ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے دین پر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی بایں طور کہ یہودی اور نصرانی دونوں ہی آپ کے بعد ہوئے ہیں، سو اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ الآیہ۔

زجاج نے کہا ہے: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے خلاف واضح حجت ہے، کیونکہ تورات وانجیل دونوں ان کے بعد نازل کی گئیں اور ان دونوں میں ادیان میں سے کسی ایک کا نام نہیں ہے اور اسلام کا نام ہر کتاب میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ہزار برس کا عرصہ تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان بھی ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ کیا تم اپنی دلیل اور قول کے بطلان کو نہیں جانتے۔ واللہ اعلم۔

1۔ ابن ماجہ، باب المصافحہ، حدیث نمبر 3691، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۞

"سنتے ہو! تم وہ لوگ ہو جو جھگڑتے رہے ہو (اب تک) ان باتوں میں جن کا تمہیں کچھ نہ کچھ علم تھا پس (اب) کیوں جھگڑنے لگے ہو ان باتوں میں نہیں ہے تمہیں جن کا کچھ علم اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ یعنی تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جھگڑتے ہو، کیونکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات کو جانتے تھے جو وہ اپنی کتاب میں پاتے تھے پس آپ کے بارے میں انہوں نے باطل اور غلط جھگڑا کیا۔ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس دعویٰ پر کہ وہ یہودی تھے یا عیسائی (کیوں جھگڑنے لگے ہو جبکہ تمہیں اس بارے کچھ علم ہی نہیں)

هٰٓاَنۡتُمۡ دراصل أأنتم تھا اس میں پہلے ہمزہ کو ھا سے بدل دیا گیا کیونکہ یہ اس کی اُخت ہے، ابو عمرو بن العلاء اور اخفش سے یہی منقول ہے۔

نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا اور حسین قول ہے۔ اور قنبل نے ابن کثیر سے هأنتم، هعنتم کی مثل نقل کیا ہے اور اس سے احسن یہ ہے کہ ھا ہمزہ سے بدل کر آئی ہو اور اس کی اصل أأنتم ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ھا تنبیہ کے لئے ہو اور یہ انتم پر داخل ہوئی ہو اور الف کو کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کر دیا گیا ہو۔ اور هؤلاء میں دو لغتیں ہیں یعنی مد اور قصر اور عربوں میں سے بعض اسے قصر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

ابو حاتم نے کہا ہے:

لعمرك انا والأحاليف هاؤلا　　لفی محنة أظفارها لم تُقَلَّم

اس میں هاؤلا کو قصر کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

اور یہاں هؤلاء محل ندا میں واقع ہے یعنی یا هؤلاء۔ اور هولاء کو انتم کی خبر بنانا بھی جائز ہے، اس بنا پر کہ أولاء بمعنی الذین ہو اور اس کا مابعد اس کا صلہ ہو۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ انتم کی خبر حاججتم ہو۔ اور یہ سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 2۔ آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ اس کے بارے جھگڑنا منع ہے جس کے بارے علم نہ ہو اور اس سے روکنے اور منع کرنے کے ممنوع ہونے پر دلیل موجود ہے جو اس کے نزدیک محقق اور ثابت نہ ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: هٰٓاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ۔

اور اس کے بارے جھگڑنے کا حکم موجود ہے جس کے بارے علم اور یقین ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ (النحل: 125) (اور ان سے بحث (ومناظرہ) اس انداز سے کیجیے جو بڑا پسندیدہ اور (شائستہ ہو) اور حضور نبی

مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ایک آدمی آپ کے پاس حاضر ہوا، اس نے اپنے بچے کا انکار کیا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری بیوی نے ایک سیاہ رنگ کے بچے کو جنم دیا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تیرے پاس اونٹ ہیں؟'' اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''ان کی رنگت کیسی ہے؟'' اس نے عرض کی: وہ سرخ رنگ کے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا ان میں کوئی خاکستری رنگ کا بھی ہے؟ اس نے عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''وہ کہاں سے آیا؟'' اس نے عرض کی: شاید اصل اس کے مشابہ ہو، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اور یہ بچہ شاید اصل اس کے مشابہ ہو (1)''۔ یہی جھگڑے کی حقیقت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے استدلال کو واضح اور ظاہر کرنے کی انتہا ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

''نہ تھے ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی بلکہ وہ ہر گمراہی سے الگ رہنے والے مسلمان تھے اور نہ ہی وہ شرک کرنے والوں میں سے تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے ان کے جھوٹے دعاوی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پاکی اور برأت بیان فرمائی اور یہ بیان فرمایا کہ وہ حنیفیہ اسلامیہ (خالص اسلامی دین) پر تھے اور وہ مشرک نہ تھے۔ اور حنیف وہ ہوتا ہے جو توحید کا اقرار کرتا ہے، حج ادا کرتا ہے، قربانی دیتا ہے، مختون ہوتا ہے اور قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے مادہ اشتقاق کے بارے سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور لغت میں مسلم وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہو اور اس کی اطاعت و پیروی کرنے والا ہو۔ اور اسلام کا معنی سورۃ البقرہ میں باتفصیل گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

''بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم) اور جو (اس نبی پر) ایمان لائے اللہ تعالیٰ مددگار ہے مومنوں کا۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے کہ سرداران یہود نے کہا: قسم بخدا! اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ یقیناً جانتے ہیں کہ ہم آپ اور آپ کے سوا کسی اور کی نسبت دین ابراہیمی کے نزدیک تر لوگ ہیں، کیونکہ وہ یہودی تھے اور آپ کو سوائے حسد کے اور کچھ نہیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اَوْلٰى بمعنی اَحَق ہے (یعنی زیادہ حق رکھنا) یہ کہا گیا ہے: معونت (مدد) اور نصرت میں (یعنی مدد اور نصرت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حجت کے اعتبار سے قریب تر وہ تھے۔ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وہ جو آپ کی ملت اور سنت پر تھے۔ وَهٰذَا النَّبِيُّ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم (اور توقیر) کے

1۔ صحیح بخاری، باب اذا عرض بنفی الولد، حدیث نمبر 4893، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لئے آپ کا ذکر علیحدہ کیا گیا، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے فِیۡهِمَا فَاکِهَةٌ وَّ نَخۡلٌ وَّ رُمَّانٌ اور مکمل طور پر اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور لفظ هٰذَا محل رفع میں ہے اور الذین پر معطوف ہے، اور النبی۔ هٰذَا کی صفت ہے یا عطف بیان ہے اور اگر اسے محل نصب میں رکھا جائے تو بھی کلام میں جائز ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اتبعوہ کی ھا ضمیر پر ہوگا۔ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ یعنی اللہ تعالیٰ مومنین کا مددگار ہے۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان لکل نبیّ ولیاً من النبیین وان ولیّ منھم أبی وخلیل ربی۔ بے شک ہر نبی کا انبیاء علیہم السلام میں سے کوئی (نہ کوئی) مددگار ہے اور ان میں سے میرے مددگار میرے باپ (جد اعلیٰ حضرت ابراہیم) اور میرے رب کے خلیل ہیں (1)۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی..... اِنَّ اَوۡلَی النَّاسِ بِاِبۡرٰهِیۡمَ لَلَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ (آل عمران:68) (بے شک نزدیک تر لوگ ابراہیم (علیہ السلام) سے وہ تھے جنہوں نے ان کی پیروی کی نیز یہ نبی (کریم)۔

وَدَّتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ یُضِلُّوۡنَكُمۡ ؕ وَمَا یُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۶۹﴾

”دل سے چاہتا ہے ایک گروہ اہل کتاب سے کہ کسی طرح گمراہ کر دیں تمہیں اور نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور وہ (اس حقیقت کو) نہیں سمجھتے“۔

یہ آیت حضرات معاذ بن جبل، حذیفہ بن یمان، اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی جس وقت بنی نضیر، قریظہ اور بنی قینقاع کے یہودیوں نے انہیں اپنے دین کی طرف دعوت دی۔ اور یہ آیت اس قول باری تعالیٰ کی مثل ہے: وَدَّ كَثِیۡرٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَوۡ یَرُدُّوۡنَكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ اِیۡمَانِكُمۡ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا (البقرہ:109) (دل سے چاہتے ہیں بہت سے اہل کتاب کہ کسی طرح پھر بنا دیں تمہیں ایمان لانے کے بعد کافر (ان کی یہ آرزو) بوجہ اس حسد کے ہے۔) اس قول کی بنا پر مِنۡ تبعیض کے لئے ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مراد جمیع اہل کتاب ہیں، تو پھر مِنۡ بیان جنس کے لئے ہوگا۔

اور لَوۡ یُضِلُّوۡنَكُمۡ کا معنی ہے وہ تمہیں دین اسلام سے رجوع اور اس کی مخالفت کے سبب معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دیں۔ اور ابن جریج نے کہا ہے: یُضِلُّوۡنکم کا معنی ہے یُھۡلِکُوۡنکم یعنی وہ تمہیں ہلاک کر دیں۔

اور اسی میں اخطل کا قول ہے:

کُنۡتَ القَذَی فی موج اَکۡدَرَ مُزۡبِدٍ　　قذف الاَتِیّ به فضلّ ضلالا

اس میں ضل ضلالا بمعنی ھلك ھلاکا ہے۔

وَمَا یُضِلُّوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ اس میں نفی اور اثبات ہے (یعنی اوروں سے ضلالت و گمراہی کی نفی ہے اور ان کی اپنی ذاتوں کے لئے اس کا اثبات ہے۔ یعنی وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو) وَمَا یَشۡعُرُوۡنَ یعنی وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ وہ مومنین کو گمراہ کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 2921، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمَا یَشْعُرُوْنَ کا معنی ہے: وہ اسلام کی صحت کو نہیں جانتے حالانکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اسے جانیں اور سمجھیں، کیونکہ اس کی براہین ظاہر اور دلائل واضح ہیں۔ واللہ اعلم۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝

''اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا حالانکہ تم خود گواہ ہو۔''

یعنی ان آیات کے صحیح ہونے کے تم خود گواہ ہو جو تمہارے پاس تمہاری کتابوں میں ہیں، یہ حضرت قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: اور تم ان کی مثل انبیاء علیہم السلام کی ان آیات وعلامات کے گواہ ہو جن کے بارے تم خود اقرار کرتے ہو۔

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝

''اے اہل کتاب! کیوں ملاتے ہو حق کو باطل کے ساتھ اور (کیوں) چھپاتے ہو حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔''

اللبس کا معنی ہے الخلط یعنی ملا دینا (گڈمڈ کر دینا) سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور اس آیت کا معنی اور جو آیت اس سے پہلے ہے دونوں کا معنی ایک ہے۔ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ اسے جواب استفہام ہونے کی وجہ سے تَكْتُمُوْا پڑھنا بھی جائز ہے۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یہ جملہ حالیہ ہے یعنی حالانکہ تم جانتے ہو۔

وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ۝

''کہا ایک گروہ نے اہل کتاب سے کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو اتاری گئی ایمان والوں پر صبح کے وقت اور انکار کر دو اس کا سرشام شاید (اس طرح) وہ (اسلام سے) برگشتہ ہو جائیں۔''

یہ آیت کعب بن اشرف اور مالک بن صیف وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے اپنی قوم کے سفلہ اور احمق لوگوں کو کہا کہ ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو ایمان والوں پر اتاری گئی صبح کے وقت، وَجْهَ النَّهَارِ سے مراد دن کا پہلا اور اول حصہ ہے۔ اور اس کے بہت حسین ہونے کی وجہ سے اسے وَجْهًا کا نام دیا گیا ہے اور اس کا اول وہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے (مراد صبح ہے۔)

شاعر نے کہا ہے:

وتُضِيءُ في وجه النهارِ منيرةً كجمانة البحري سُلّ نظامُها

دن کی صبح کو روشنی اس طرح منور کرتی ہے جیسا کہ موتیوں کو لڑی میں پرو دیا گیا ہو۔

اور ایک دوسرے نے کہا:

من كان مسروراً بمقتل مالك فليأت نسوتنا بوجه نهارِ

جو مالک کے قتل سے مسرور ہے اسے چاہیے کہ وہ ہماری عورتوں کو صبح سویرے لے آئے اور وَجْهَ النَّهَارِ اور اسی طرح اٰخِرَهٗ ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہیں۔

اور حضرت قتادہ کا موقف یہ ہے کہ انہوں نے اس لئے ایسا کیا تاکہ وہ مسلمانوں کو شک میں مبتلا کر دیں۔ اور الطائفه کا معنی الجماعة ہے، یہ طاف یطوف سے ہے اور کبھی نفس طائفة کے معنی پر واحد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

اور آیت کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں میں سے بعض نے بعض کو کہا: دن کے اول حصہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان کا اظہار کرو اور پھر دن کے آخر میں اس کا انکار کر دو، کیونکہ جب تم اس طرح کرو گے تو جو ان کی اتباع اور پیروی کر رہے ہیں ان کے لئے اپنے دین میں شک پیدا ہو جائے گا پس وہ ان کے دین سے تمہارے دین کی طرف لوٹ آئیں گے اور یہ کہنے لگیں گے: بے شک اہل کتاب اس بارے میں ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم صبح کے وقت آپ کی نماز کے ساتھ ایمان لے آؤ جس میں منہ بیت المقدس کی طرف ہے کیونکہ وہ حق ہے اور سر شام آپ کی نماز کا انکار کر دو جس میں منہ کعبہ کی طرف ہے، شاید وہ تمہارے قبلہ کی طرف رجوع کر لیں۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے منقول ہے۔

اور مقاتل نے کہا ہے: اس کا معنی ہے کہ وہ صبح کے وقت حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کے پاس سے لوٹ کر گئے تو انہوں نے سفلہ لوگوں کو کہا: وہ حق ہے تم اس کی اتباع اور پیروی کرو، بعد ازاں انہوں نے کہا: یہاں تک کہ ہم تورات دیکھ لیں، پھر وہ سر شام لوٹ کر آئے تو انہوں نے کہا: تحقیق ہم نے تورات میں دیکھا ہے وہ پسندیدہ نہیں ہے، وہ کہنے لگے: بلاشبہ وہ حق نہیں ہے اور اس سے انہوں نے ارادہ یہ کیا کہ وہ سفلہ لوگوں پر معاملہ مشتبہ کر دیں اور یہ کہ وہ اس بارے میں انہیں شک میں مبتلا کر دیں۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

''(ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں) کہ مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو پیروی کرتے ہیں تمہارے دین کی۔ فرمایئے ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) دیا جا سکتا ہے کسی کو جیسے تمہیں دیا گیا یا کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس۔ (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!) فرما دیجئے کہ فضل (و کرم) تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ یہ نہی ہے اور یہ یہود کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ کلام میں سے ہے، یعنی ان کے روساء نے سفلہ اور گھٹیا لوگوں کو کہا۔ اور سدی نے بیان کیا ہے: یہ خیبر کے یہودیوں کی مدینہ طیبہ کے یہودیوں کے ساتھ گفتگو میں سے ہے۔ اور یہ آیت اس سورۃ میں مشکل ترین آیت ہے۔

اور حسن اور مجاہد سے مروی ہے کہ آیت کا معنی ہے: تم کسی کی بات نہ مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور تم یہ نہ مانو کہ وہ تم پر تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتے ہیں، کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت ہے ہی نہیں، پس دین کے اعتبار سے تم ان سے زیادہ صحیح ہو۔ أنْ اور یُحَآجُّوْ کُمْ دونوں محل جر میں ہیں ای بأن یحاجو کم ای باحتجاجھم یعنی تم اس بارے میں ان کی تصدیق نہ کرو کیونکہ ان کے پاس کوئی حجت نہیں ہے۔

اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ (اور یہ بھی نہ ماننا کہ) کسی کو اتنا دیا جا سکتا ہے جیسے تمہیں دیا گیا ہے مثلاً تورات، من و سلوی اور سمندر کا پھٹنا اور علاوہ ازیں دیگر علامات وفضائل۔

پس اَنْ یُّؤْتٰۤى۔ اَوْ یُحَآجُّوْ کُمْ کے بعد مؤخر ہوگا۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔

اور اخفش نے کہا ہے: معنی یہ ہے اور تم مت مانو کسی کی بات سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور مت مانو یہ کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے اور نہ اس کی تصدیق کرو کہ وہ تم پر کوئی حجت لا سکتے ہیں، یہ اس طرف گئے ہیں کہ یہ کلام معطوف ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: اور تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔ پس استفہام پر مد بھی اس انکار کی تاکید کے لئے ہے جو انہوں نے کہا ہے: ''بے شک کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا انہیں دیا گیا ہے، کیونکہ علمائے یہود نے انہیں کہا ہے: تم مت مانو سوائے ان کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں کہ کسی کو اس کی مثل دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے، پس کلام اپنی ترتیب پر ہے اور أنْ محل رفع میں ہے ان کے قول کے مطابق جنہوں نے تیرے اس قول میں رفع دیا ہے۔ أزید ضربته، اور خبر محذوف ہے، تقدیر عبارت یہ ہے: أن یؤتی احد مثل ما أوتیتم تصدّقون أو تقرّون، ای ایتاء موجود مصدَّقٌ أو مُقَرٌّ به، ای لا تصدّقون بذالك۔

اور یہ بھی جائز ہے کہ فعل مضمر کی بنا پر أنْ محل نصب میں ہو، جیسا کہ تیرے اس قول میں جائز ہے أزیدا ضربته اور عربی میں یہ زیادہ قوی ہے کیونکہ استفہام بالفعل اولیٰ ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی: أتقرّون أن یؤتی او أتشیعون ذالك أو أتذكرون ذالك نحوه۔

اور ابن کثیر، ابن محیصن اور حمید نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اور ابو حاتم نے کہا ہے: آن بمعنی أَلِأَنْ ہے پھر لام جر کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا اور اسے مد کے ساتھ بدل دیا گیا، جیسا کہ اس کی قراءت جس نے اس طرح پڑھا اٰنْ كَانَ ذَا مَالٍ یہ اصل میں أَلِأَنْ ہے۔ اور اس قراءت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَوْ یُحَآجُّوْ کُمْ مومنین کو خطاب کرنے کی طرف رجوع ہے، یا پھر أوْ بمعنی أنْ ہوگا، کیونکہ یہ دونوں حرف شک اور جزا ہیں اور ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ رکھا جا سکتا ہے۔ اور آیت کی تقدیر اس طرح ہے: وأن یحاجو کم عند ربکم یا معشر المؤمنین،

پس تم فرما دیجئے! اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بے شک ہدایت اور فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور ہم اسی پر ہیں۔

اور جس نے بغیر مد کے پڑھا ہے اس نے کہا ہے: بے شک پہلی نفی ان کے قول وَلَا تُؤْمِنُوٓا میں ان کے انکار پر دلالت کرتی ہے۔ پس معنی یہ ہے کہ یہودی علماء نے ان سے کہا: تم اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے، یعنی نہ ان کے پاس ایمان ہے اور نہ ہی کوئی حجت، پس علم و حکمت، کتاب و حجت، من و سلویٰ اور سمندر کا پھٹنا وغیرہ فضائل و کرامات کا معنی پر عطف کیا گیا ہے، یعنی بلاشبہ یہ سب صرف تم ہی میں موجود ہیں پس تم یہ بات مت مانو کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں۔ پس اس قراءت کے مطابق کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور لام زائدہ ہے اور من استثنیٰ اول میں سے نہیں ہے، ورنہ کلام جائز نہیں ہوگا۔ اور اَحَدٌ داخل کیا گیا ہے کیونکہ اول کلام نفی ہے، پس اسے أَنْ کے صلہ میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ وہ فعل منفی کا مفعول ہے، اور جر دینے والا عامل نہ ہونے کی وجہ سے أَنْ محل نصب میں ہے اور خلیل نے کہا ہے: أَنْ محل جر میں ہے کیونکہ اس سے پہلے جر دینے والا لفظ محذوف ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام زائدہ نہیں ہے اور تُؤْمِنُوٓا یہ تُقِرُّوا پر محمول ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: معنی یہ ہے کہ تم مت مانو سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اس کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کسی کو اس کی مثل دیا جاسکتا ہے جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے: تم اس کے بارے مت خبر دو جو تمہاری کتاب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف موجود ہیں سوائے ان لوگوں کے جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں تاکہ بتوں کی عبادت اور ان کی تصدیق کی طرف کوئی راہ نہ ہو۔

اور فراء نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہودیوں کا کلام اس ارشاد پر ختم ہو چکا ہو اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ اور پھر حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا ہو: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ یعنی بلاشبہ بیان حق ہی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے۔ اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ یہ (اس معنی میں) بالکل بین اور ظاہر ہے کہ کسی کو اس کی مثل نہیں دیا جاسکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے۔ اور لَا، أَنْ کے بعد مقدرہ ہے۔ یعنی لئلا یؤتی، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا یعنی لئلا تضلوا، تاکہ تم گمراہ نہ ہو۔ پس اسی لئے کلام میں اَحَدٌ کا داخل ہونا صحیح ہے۔ اور اَوْ بمعنی حتّٰی اور الّا اَنْ ہے۔

جیسا کہ امرء القیس نے کہا ہے:

فقلتُ له لا تَبْكِ عينُكَ انما نحاول مُلْكًا او نموتَ فنُعذَرا

اس میں اَوْ نَمُوْتَ اِلَّا اَنْ نَمُوْتَ کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

وكنت اِذَا غَمَزْتُ قناةَ قَوْمٍ كَسَرْتُ كُعُوبَهَا او تستقيما

اس میں اَوْ تَسْتَقِیْمَا حَتّٰی اَنْ تستقیما کے معنی میں ہے اور اس کی مثل ان کا یہ قول ہے: لا نلتقی أو تقوم الساعة،

اس میں اَوْ بمعنی حتّٰی یا اِلٰی اَنْ کے ہے اور اسی طرح کسائی کا مذہب ہے۔
اور اخفش کے نزدیک یہ اَوْ عاطفہ ہے اور یہ عطف وَلَا تُؤْمِنُوْٓا پر ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔ یعنی لا ایمان لھم ولا حجۃ (نہ ان کا ایمان ہے اور نہ ان کی کوئی دلیل) اور یہ عطف معنی پر کیا گیا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ پوری آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کو خطاب ہو ان کے دلوں کو ثابت قدم رکھنے کے لئے اور ان کی نگاہوں میں تیزی پیدا کرنے کے لئے، تاکہ وہ یہودیوں کی تلبیس اور ان کے اپنے دین کو آراستہ اور مزین کر کے پیش کرنے کے وقت کسی شک میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور معنی یہ ہو: اے گروہ مومنین! تم بات نہ مانو مگر ان لوگوں کی جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور اس بات کی تصدیق نہ کرو کہ اس کی مثل فضل و کرم اور دین میں سے کسی کو نہیں دیا جا سکتا جیسا تمہیں دیا گیا ہے اور نہ یہ مانو کہ تمہارا کوئی مخالف تمہارے دین کے بارے میں تمہارے رب کے پاس کوئی حجت لا سکتا ہے یا وہ اس پر قدرت رکھتا ہے، کیونکہ ہدایت وہی ہے جو اللہ تعالیٰ عطا فرمائے اور بلاشبہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔

ضحاک نے کہا ہے: بے شک یہودیوں نے کہا ہم اپنے رب کے پاس اس پر حجت لائیں گے جس نے ہمارے دین میں ہماری مخالفت کی، پس اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ بے شک وہ پھسلائے گئے ہیں اور عذاب دیئے گئے ہیں اور مومنین غالب آنے والے ہیں۔ اور ان کی حجت ان کا قیامت کے دن جھگڑنا ہے۔ اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک یہود و نصاریٰ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت لائیں گے اور وہ کہیں گے تو نے ہمیں ایک اجر دیا ہے اور انہیں تو نے دو اجر دیئے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا میں نے تمہارے ساتھ تمہارے حقوق کے بارے کسی قسم کی زیادتی کی ہے؟ وہ عرض کریں گے نہیں، تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ میرا فضل ہے جسے میں چاہتا ہوں اسے عطا کرتا ہوں۔'' (1)

ہمارے علماء نے کہا ہے: اگر وہ جانتے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل میں سے ہے تو وہ ہمارے بارے میں ہمارے رب کے پاس حجت نہ لاتے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرما دیا کہ وہ قیامت کے دن تمہارے بارے میں تمہارے رب کے پاس حجت لائیں گے، پھر فرمایا! تم اب ان سے کہہ دو اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ بے شک فضل و کرم تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔ ابن کثیر نے اَنْ يُّؤْتٰى کو استفہام کی بنا پر مد کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ اعشی نے بھی کہا ہے:

أَأَنْ رَأَتْ رَجُلًا أَعْشَى أَضَرَّ بِهِ   رَيْبُ الْمَنُونِ وَدَهْرٌ مُتْبِلٌ خَبِلُ

اور باقیوں نے خبر کی بنا پر بغیر مد کے پڑھا ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر نے اِنْ يُّؤْتٰى ہمزہ کو مکسور پڑھا ہے اس بنا پر کہ اس میں معنی نفی کا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں سے ہو گا جیسا کہ فراء نے کہا ہے۔ اور معنی ہو گا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے: ''بے شک ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہو کسی کو اس کی مثل عطا نہیں کیا جائے گا جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے یا نہ کوئی حجت لا سکتا ہے تم پر تمہارے رب کے پاس'' یعنی یہودی باطل پر ہیں کہ وہ کہتے ہیں ہم تم سے افضل ہیں۔ اور اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ کو اَنْ

1۔ صحیح بخاری، باب الاجارۃ الی صلوٰۃ العصر، حدیث نمبر 2108، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مضمرہ اور أو کے ساتھ نصب دی گئی ہے اور أو کے بعد أن کو مضمر کیا جاتا ہے جب وہ حتی اور إلا أن کے معنی میں ہو۔

اور حسن نے أن یؤتی یعنی تا کو کسرہ کے ساتھ اور یا کو مفتوح پڑھا ہے معنی یہ ہوگا أن یوتی احدٌ احدًا مثل ما اوتیتم (کہ کوئی کسی کو اتنا دے گا جتنا تمہیں دیا گیا ہے۔) اس میں سے مفعول کو حذف کر دیا گیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اس میں دو قول ہیں:

ایک یہ کہ خیر اور نیکی کی طرف ہدایت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی کرنا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ اسے اپنے انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات کو عطا فرماتا ہے، سو تم انکار نہ کرو کہ تمہارے سوا کسی کو اس کی مثل عطا کیا جائے جیسا تمہیں عطا کیا گیا ہے، پس اگر وہ اس کا انکار کریں تو ان سے فرما دیجئے اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ کہ فضل و کرم اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اور دوسرا قول یہ ہے: آپ فرما دیجئے ہدایت تو وہی ہے جو اس اللہ کی ہدایت ہو جس نے جو مومنین کو حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے کے بارے عطا فرمائی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

اور بعض اہل اشارات نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے: تم (حسن) معاشرت نہ رکھو سوائے ان کے جو تمہارے احوال اور تمہارے طریقہ میں تم سے موافقت کرتے ہیں، کیونکہ جو تم سے موافقت نہیں کرتا وہ تمہارا دوست نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

''خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔''

یعنی وہ اپنی نبوت اور ہدایت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے جسے چاہتا ہے، یہ قول حسن اور مجاہد وغیرہما کا ہے۔ ابن جریج نے کہا ہے: وہ خاص کر لیتا ہے اسلام اور قرآن کے ساتھ جسے چاہتا ہے۔ ابو عثمان نے کہا ہے: یہ حسین تر قول ہے جس کے ساتھ امیدوار کی امید اور خوفزدہ ہونے والے کا خوف باقی رہتا ہے۔ ''اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔''

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝

''اور اہل کتاب سے بعض ایسے (دیانتدار) ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک ڈھیر (سونے چاندی کا) تو ادا کر دے اسے تمہاری طرف اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں کہ اگر تو امانت رکھے اس کے پاس ایک اشرفی تو واپس نہ کرے گا اسے بھی تیری طرف مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے، اس (بددیانتی) کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت اور یہ لوگ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ حالانکہ وہ جانتے ہیں''۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام (ان اہل کتاب میں سے تھے) وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖۤ اِلَیْكَ اس سے مراد فنحاص بن عازوراء یہودی ہے، ایک آدمی نے اس کے پاس کچھ دینار امانت رکھے تو اس نے اس میں خیانت کی۔

اور یہ بھی قول ہے کہ ان سے مراد کعب بن اشرف اور اس کے ساتھی ہیں۔ ابن وثاب اور اشہب عقیلی نے مَنْ اِنْ تِیْمَنْهُ قرأت کی ہے اور یہ ان کی لغت پر ہے جو نِستعین پڑھتے ہیں اور یہ بنی بکر اور بنی تمیم کی لغت ہے۔ اور حضرت عبداللہ کی قرأت میں مالك تِیْمَنَّا علی یوسف کے الفاظ ہیں، جبکہ باقیوں نے الف کے ساتھ پڑھا ہے۔

نافع اور کسائی نے یؤدّھی ادراج میں یا کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عبید نے کہا ہے: ابو عمرو، اعمش، عاصم اور حمزہ نے ابوبکر کی روایت میں ھا پر وقف کر کے پڑھا ہے یعنی یؤدّہ الیك۔ نحاس نے کہا ہے: بعض نحویوں کے نزدیک ھا کو ساکن کرنا بغیر شعر کے جائز نہیں ہے اور بعض نے اسے مطلقاً جائز قرار نہیں دیا ہے اور ان کا خیال ہے کہ جنہوں نے سکون کے ساتھ اسے پڑھا ہے انہوں نے غلطی کی ہے اور یہ کہ انہیں وہم ہوا ہے کہ جزم ھا پر واقع ہوئی ہے اور ابو عمرو نے اس سے پاک قرار دیا کہ اس کی مثل اس پر جائز ہو اور ان سے صحیح روایت یہ ہے کہ وہ ھا کو کسرہ دیتے ہیں اور یہی یزید بن قعقاع کی قرأت ہے۔ اور فراء نے کہا ہے کہ بعض عربوں کا مذہب یہ ہے کہ وہ ھا کو جزم دیتے ہیں جب اس کا ماقبل متحرک ہو، وہ کہتے ہیں: ضربته ضرب شدیدا، جیسا کہ وہ انتم اور قمتم کی میم کو سکون دیتے ہیں اور اس کی اصل رفع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

لما رأی ألاّ دَعَه ولا شِبَعْ مال الی ارطَاۃ حِقْفٍ فاضطَجَعْ

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس مقام پر ھا کو ساکن کرنا جائز ہے کیونکہ وہ جزم کے محل میں واقع ہے اور یہ یا ختم ہو جانے والی ہے۔ ابو المنذر سلام اور زہری نے یؤدّہُ بغیر واؤ کے ہا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قتادہ، حمید اور مجاہد نے یؤدّھُو کو واؤ کے ساتھ پڑھا ہے، اس کے لئے واؤ کو اختیار کیا گیا ہے کیونکہ واؤ شفتہ سے ادا ہوتی ہے اور ھا بعیدۃ المخرج ہے۔ (یعنی اس کی ادائیگی کا محل بعید ہے)

سیبویہ نے کہا ہے: مذکر میں واؤ مؤنث میں الف کے قائم مقام ہے اور اسے یا سے بدل دیا جاتا ہے کیونکہ یا زیادہ خفیف ہے، جبکہ اس کا ماقبل کسرہ پایا ہو اور یا حذف ہو جاتی ہے اور کسرہ باقی رہتا ہے، کیونکہ یا کبھی حذف ہو جاتی ہے اور فعل مرفوع ہو تو اسے اپنے حال پر ثابت رکھا جاتا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اہل کتاب میں کچھ خائن ہیں اور کچھ امین ہیں اور مومنین ان میں تمیز نہیں کر سکتے، پس چاہیے کہ وہ ان تمام سے اجتناب کریں اور اہل کتاب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اگرچہ مومنین بھی اسی طرح ہیں، اس لئے کہ ان میں خیانت زیادہ پائی جاتی ہے، پس کلام غالب کے بارے میں کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور قنطار کی تفسیر پہلے گزر

چکی ہے اور رہا دینار تو وہ چوبیس قیراط کا ہوتا ہے اور ایک قیراط درمیانے جو کے تین حبوں کے برابر ہوتا ہے اور اس کا مجموعہ بہتر حبے ہیں اور اس پر اجماع کیا گیا ہے۔ جس نے کثیر کی حفاظت کی اور اسے ادا کر دیا تو (حفاظت اور ادائیگی) قلیل میں بدرجہ اولیٰ ہوگی اور جس نے تھوڑے میں خیانت کی یا اسے روک کر رکھا تو وہ کثیر میں اور زیادہ ہوگی۔ اور یہ مفہوم خطاب کے ساتھ قول پر انتہائی واضح دلیل ہے۔ اور اس میں علماء کے مابین بہت زیادہ اختلاف ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں جو ادا کرتا ہے اور وہ جو ادا نہیں کرتا مگر وہی جو اس پر لازم ہوتا ہے اور کبھی لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو ادا نہیں کرتا اگرچہ تو اس کے پاس ہمیشہ کھڑا رہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے دو قسمیں ذکر کی ہیں کیونکہ یہ غالب اور معتاد ہیں اور تیسری نادر ہے، لہٰذا کلام غالب کے بارے ہے اور طلحہ بن مصرف اور ابو عبد الرحمن السلمی وغیرہما نے دِمت دال کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں اور کسرہ ازدالسراۃ کی لغت ہے، یہ دِمت تدامر سے ماخوذ ہے جیسا خفت تخاف ہے۔

اور اخفش نے دِمت تدوم بیان کیا ہے، اور یہ شاذ ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس ارشاد سے اپنے اس موقف پر استدلال کیا ہے کہ غریم (مقروض) کے ساتھ ساتھ رہنا چاہیے اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا اور تمام علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور سورۃ البقرہ میں یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور ہمارے علماء میں سے بعض بغداد کے رہنے والوں نے بہت زیادہ قرض لینے والے کو حبس میں رکھنے پر اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا تو جب اسے لازم پکڑنا اور تصرف سے اسے روکنا جائز ہے تو اسے حبس میں رکھنا بھی جائز ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک اِلَّا مَادُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا کا معنی ہے پس وہ تیری وجہ سے تجھ سے ڈرتا ہے اور تجھ سے حیاء محسوس کرتا ہے، کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے، کیا آپ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول جانتے نہیں ہیں: لا تطلبوا من الاعمی حاجة فان الحیاء فی العینین تم اندھے سے حاجت کا مطالبہ نہ کرو کیونکہ حیاء آنکھوں میں ہوتا ہے۔ اور جب تو اپنے بھائی سے حاجت کا مطالبہ کرے تو تو اپنے چہرے (کو متوجہ کر کے) اس کی طرف دیکھ یہاں تک کہ وہ حیاء محسوس کرنے لگے تو وہ اسے (حاجت کو) پورا کر دے گا۔ اور کہا جاتا ہے: قَآئِمًا بمعنی ملازما له ہے (یعنی اسے لازم پکڑتے ہوئے) پس اگر تو نے اسے مہلت دی تو وہ تیرا انکار کر دے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: قیام سے مراد مسلسل مطالبہ کرنا ہے نہ کہ عین قیام مراد ہے۔ اور دینار اصل میں دِنَّارٌ ہے کثرت استعمال کی وجہ سے تخفیف کے لئے دونوں میں سے ایک کو یا سے بدل دیا گیا ہے۔ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کی جمع دنانیر آتی ہے اور تصغیر دُنَيْنِير بنائی جاتی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ دین میں امانت انتہائی عظیم الرتبت ہے اور اس کی عظمت و قدر میں سے یہ ہے کہ یہ اور رَحم (صلہ رحمی) پل صراط کی دونوں جانبوں پر کھڑے ہوں گے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے اور اسے عبور کرنے پر کوئی قادر نہ ہوگا مگر وہی جو ان دونوں کی حفاظت اور پاسداری کرے گا۔

اور مسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: ہمیں رفع امانت کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے بیان فرمایا: ''آدمی نیند کی حالت میں سو جائے گا اور اس کے دل سے امانت قبض کر لی جائے گی'' الحدیث۔ یہ روایت سورۃ البقرہ کے اول میں مکمل طور پر گزر چکی ہے۔ اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ محمد بن مصطفیٰ، محمد بن حرب نے سعید بن سنان عن ابی الزاھریہ عن ابی شجرۃ کثیر ابن مرۃ عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس سے حیاء چھین لیتا ہے اور جب وہ اس سے حیاء چھین لیتا ہے تو اسے نفرت اور ناپسندیدگی کے سوا کچھ نہیں ملتا اور جب اسے نفرت اور ناپسندیدگی آملتی ہے تو اس سے امانت چھین لی جاتی ہیں اور جب اس سے امانت چھین لی جاتی ہے تو پھر وہ خود خیانت کا ارتکاب کرتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے اور جب وہ خود خیانت کرنے لگتا ہے اور اس سے خیانت کی جاتی ہے تو اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے اور جب اس سے رحمت چھین لی جاتی ہے تو پھر اسے صرف دھتکار اور لعنت آ پہنچتی ہے اور اسے دھتکار اور لعنت پڑنے لگتی ہے تو اس سے اسلام کا قلادہ اتار لیا جاتا ہے (1)''۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ ادّ الامانۃ الی من ائتمنک ولا تخن من خانک اس کی امانت ادا کر جس نے تجھے امین بنایا اور اس کے ساتھ خیانت نہ کر جس نے تجھ سے خیانت کی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس آیت میں تمام اہل کتاب کے لئے اور نہ ہی ان میں سے بعض کے لئے کوئی تبدیلی ہے، بخلاف ان کے جو اس طرف گئے ہیں، کیونکہ فاسق مسلمانوں میں بھی ایسے پائے جاتے ہیں جو امانت ادا کرتے ہیں اور مال کثیر پر امین بنائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عادل نہیں ہوتے۔ پس عدالت و شہادت کے طریق میں امانت فی الحال کی ادائیگی کو معاملہ اور ودیعت کی جہت سے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا، کیا آپ ان کا قول جانتے نہیں لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ (آل عمران: 75) (کہ نہیں ہے ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت) پس وہ کیسے عدل کر سکتا ہے جو کوئی بغیر حرج کے اپنے اوپر ہمارے اموال اور ہماری عزتیں مباح سمجھنے کا اعتقاد رکھتا ہے اور اگر ان کی تعدیل میں اتنا کافی ہوتا تو یقیناً ان کی شہادت مسلمانوں پر سنی جاتی۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا یعنی یہودیوں نے کہا: لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ کہا گیا ہے کہ یہودی جب مسلمانوں سے خرید و فروخت کرتے تھے تو کہتے تھے: ہم پر ان پڑھوں کے معاملہ میں کوئی گرفت نہیں ہے ..... یعنی ان کے ساتھ ظلم میں کوئی حرج نہیں ہے ..... اس لئے کہ انہوں نے ہماری مخالفت کی ہے۔ اور انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ان کی کتاب میں موجود ہے، پس اللہ عزوجل نے انہیں جھٹلایا اور ان کا رد کر دیا۔ اور فرمایا: بَلٰی یعنی کیوں نہیں ان پر ان کے جھوٹ کی وجہ سے اور ان کے عربوں کے مال حلال سمجھنے کی وجہ سے عذاب کی راہ ہے۔

ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: کلام مکمل ہو گیا ہے، پھر فرمایا مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى اور کہا جاتا ہے: بے شک یہودی اعرابیوں سے اموال قرض لیتے تھے پس جب حقوق کے مالک اسلام لائے تو یہودیوں نے کہا: تمہارے لئے ہم پر کوئی شے واجب الادا نہیں، کیونکہ تم نے اپنا دین چھوڑ دیا ہے لہٰذا ہم سے تمہارا قرض ساقط ہو چکا ہے۔

1۔ ابن ماجہ، باب ذہاب الامانۃ، حدیث نمبر 4043، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ تورات کا حکم ہے سو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا بَلٰی یہ ان کے اس قول کا رد ہے لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ یعنی اس طرح نہیں ہے جس طرح تم کہتے ہوں، پھر نئے سرے سے ارشاد فرمایا: مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی یعنی جس نے وعدہ پورا کیا اور شرک سے بچتا رہا تو وہ جھٹلانے والوں میں سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے محبت فرماتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 7۔ کسی آدمی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: بے شک ہم ارادۃً اہل ذمہ کے اموال میں سے مرغیاں اور بکریاں پکڑ لیتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں ہم پر اس میں کوئی حرج نہیں ہے؟ تو آپ نے اسے فرمایا: یہ تو اسی طرح ہے جیسے اہل کتاب نے کہا لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْلٌ بلاشبہ جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو تمہارے لئے ان کے اموال ان کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہیں، عبدالرزاق نے اسے معمر عن ابی اسحاق الھمدانی عن صعصعۃ ان رجلا قال ابن عباس رضی اللہ عنہما کی سند سے ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کافر کو قبولیت شہادت کا اہل قرار نہیں دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے فرمایا ہے کہ یہ کذاب ہے اور اس میں ان کافروں پر رد ہے جو اللہ تعالیٰ کی تحریم کے بغیر (چیزوں کو) حرام قرار دیتے ہیں اور اس کی تحلیل کے بغیر (چیزوں کو) حلال قرار دیتے ہیں۔ اور پھر اسے شریعت میں سے قرار دیتے ہیں۔ ابن عربی نے کہا ہے: اور اس سے ان کا رد نکلتا ہے جو بغیر دلیل کے استحسان کے ساتھ فیصلہ کرتے ہیں اور میں اہل قبلہ میں سے کسی کو نہیں جانتا کہ اس نے یہ کہا ہو۔ اور حدیث میں ہے: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جاہلیت کی کوئی شے نہیں ہے مگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہے سوائے امانت کے کیونکہ اسے نیکوکار اور فاجر تک پہنچایا گیا ہے (1)۔''

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝

''ہاں کیوں نہیں جس نے پورا کیا اپنا وعدہ اور پرہیزگار بنا تو بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پرہیزگاروں سے۔''

مَنْ مبتدا ہونے کے سبب مرفوع ہے اور یہ شرط ہے اور اَوْفٰی محل جزم میں ہے اور اتَّقٰی معطوف علیہ ہے، یعنی اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا اور وہ جھوٹ نہیں بولا اور نہ ہی اس نے اس شے کو حلال سمجھا جو اس پر حرام کی گئی۔ فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ یعنی اللہ ان سے محبت فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اپنے اولیاء سے محبت کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے اور قول باری تعالیٰ بِعَهْدِهٖ میں ھا ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ اور اس کا ذکر اس ارشاد میں بھی ہے وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْکَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ وعدہ پورا کرنے والے اور کفر و خیانت اور نقض عہد سے پرہیز کرنے والے کی طرف لوٹ رہی ہو۔ عہد مصدر ہے جسے فاعل اور مفعول (دونوں) کی طرف مضاف کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ

1۔ تفسیر رازی، جلد 8، صفحہ 108 تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 511

وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

''بے شک جو لوگ خریدتے ہیں الله کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑی سی قیمت، یہ وہ (بدنصیب) ہیں کہ کچھ حصہ نہیں ان کے لئے آخرت میں اور بات تک نہ کرے گا ان سے الله تعالیٰ اور دیکھے گا بھی نہیں ان کی طرف قیامت کے روز اور نہ پاک کرے گا انہیں اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ائمہ نے اشعث بن قیس سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ میرے اور ایک یہودی آدمی کے درمیان زمین کا تنازعہ ہوا تو اس نے میرے (حق کا) انکار کر دیا سو میں اسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آیا، تو رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا: ''کیا تیرے پاس گواہ ہیں؟'' میں نے عرض کی: نہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو فرمایا: ''تو حلف دے دے۔'' میں نے عرض کی: ''تب یہ تو حلف دے دے گا اور میرا مال لے جائے گا، پس الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا الی آخر الآیۃ۔ (1)

اور ائمہ نے یہ بھی حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم کے ساتھ کاٹ دیا تحقیق الله تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا'' تو ایک آدمی نے آپ سے عرض کی، یارسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ وہ تھوڑی سی شے بھی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ وہ درخت کی ایک ٹہنی ہی ہو۔'' اور لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ کا معنی ومفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت اور احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حاکم کا حکم قضاء ظاہر کے ساتھ باطن میں مال کو حلال نہیں کرتا جبکہ محکوم لہ اس کے بطلان کو جانتا ہو اور ائمہ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تم میرے پاس آکر جھگڑتے ہو اور بلاشبہ میں تو بشر ہوں شاید تمہارے بعض اپنی دلیل اور حجت بیان کرنے میں بعض کی نسبت خطا کریں میں تمہارے درمیان اس کے بارے فیصلہ کرتا ہوں جو میں تم سے سنتا ہوں پس جس کے لئے اس کے بھائی کے حق میں سے کسی شے کا میں فیصلہ کروں تو وہ اسے نہ لے کیونکہ گویا میں اس کے لئے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ رہا ہوں جس کے ساتھ وہ قیامت کے دن آئے گا۔'' (2)

اس میں ائمہ کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس میں امام ابوحنیفہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: بلاشبہ حاکم کا وہ فیصلہ جس کا دارومدار شہادت باطلہ پر ہو اور وہ اس کے لئے اس شرمگاہ کو حلال کر دیتا ہے جسے اس پر حرام کیا گیا تھا، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور یہ گمان کیا ہے کہ اگر دو جھوٹے گواہوں نے ایک آدمی پر اپنی بیوی طلاق دینے کے بارے شہادت دی اور حاکم نے ان کی شہادت کے مطابق فیصلہ کر دیا تو بلاشبہ اس کی شرمگاہ اس کے ساتھ اس شادی کرنے والے کے لئے حلال ہوگی

1۔ صحیح بخاری، باب کلام الخصوم بعضهم فی بعض، حدیث نمبر 2239، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب الحیل، حدیث نمبر 6452، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جو یہ جانتا ہے کہ فیصلہ باطل ہے۔ اور آپ پر اس صحیح اور صریح حدیث سے اعراض کرنے کا عیب لگایا گیا ہے۔ اور اس طرح کہ آپ نے اموال کو بچالیا اور آپ نے احکام فاسدہ کے سبب انہیں مباح سمجھنے کی طرف غور نہیں فرمایا۔ اور اس سے آپ نے شرمگاہوں کی حفاظت نہیں کی حالانکہ شرمگاہیں زیادہ حق رکھتی ہیں کہ ان کے بارے احتیاط برتی جائے اور ان کی حفاظت کی جائے۔ ان کے قول کا بطلان آیت لعان میں آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ (☆)۔

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝

"اور بے شک ان میں ایک فریق وہ ہے جو مروڑتے ہیں اپنی زبان کو کتاب کے ساتھ تاکہ تم خیال کرنے لگو (ان کی) اس (الٹ پھیر) کو بھی اصل کتاب سے حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں یہ بھی اللہ کی طرف سے (اترا) ہے حالانکہ وہ نہیں ہے اللہ کے پاس سے اور وہ کہتے ہیں اللہ پر جھوٹ جان بوجھ کر۔"

فریقاً سے مراد یہود کی ایک جماعت اور گروہ ہے۔ يَلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ ابوجعفر اور شیبہ نے (معنی) تکثیر کی بنا پر یُلَوُّوْنَ پڑھا ہے۔ جب وہ اسے جھکالے، مروڑ لے اور اسی سے یہ معنی ہے وہ کلام میں تحریف کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ اسے مقصد سے پھیر دیتے ہیں، اللیّ کا اصل معنی المیل (ایک طرف جھکنا) ہے۔ لَوی بیدہ (اس نے اپنا ہاتھ پھیر دیا) اور لوی برأسہ اور اس نے اپنا سر پھیر دیا۔ قولہ تعالیٰ: لَیًّا بِاَلۡسِنَتِهِمۡ یعنی حق سے عناد رکھتے ہوئے اور اس سے غیر کی طرف پھیرتے ہوئے (اپنی زبانوں کو مروڑتے ہیں) اور وَلَا تَلۡوٗنَ علی احد کا معنی ہے لا تعرجون علیہ (اس پر نہیں چڑھو گے)، کہا جاتا ہے لَوَیٰ علیہ جب وہ اس پر چڑھے اور مقیم ہو جائے۔ اور اللی کا معنی ہے المطل مروڑنا (لوہے کو بڑھانے کے لئے کاٹنا) ٹال مٹول کرنا۔ لواہ بدینہ یلویہ لیًّا و لِیَانا مطلہ یعنی اس نے اسے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کی۔

شاعر نے کہا:

قد کنت داینت بها حسّانا مخافة الإفلاس واللّیانا

یحسن بیع الأصل والعیانا

ذوالرمہ نے کہا ہے:

تریدین لیّانی وانتِ ملیّةٌ و أحسن یا ذات الوشاح التقاضیا

اور حدیث میں ہے لَیُّ الواجدِ یُحِل عِرضه و عقوبته (پانے والے کا ٹال مٹول کرنا اپنی عزت اور اپنی سزا کو حلال کر دیتا ہے۔)

☆۔ امام اعظم ابوحنیفہ کے بارے میں یہ رائے محل نظر ہے کیونکہ یہ امام اعظم کے نقطہ نظر میں عدم تدبر کی بنا پر ہے اس کی تفصیل ہدایہ کتاب النکاح میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اور السنة، لِسَانٌ کی جمع ہے لغت میں جس نے مذکر قرار دیا ہے اور جس نے مونث قرار دیا ہے اس نے ألسن کہا ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿٧٩﴾

''نہیں ہے مناسب کسی انسان کے لئے کہ (جب) عطا فرمادے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکومت اور نبوت تو پھر وہ کہنے لگے لوگوں سے کہ بن جاؤ میرے بندے اللہ کو چھوڑ کر (وہ تو یہ کہے گا کہ) بن جاؤ اللہ والے اس لئے کہ تم دوسروں کو تعلیم دیتے رہتے تھے کتاب کی اور بوجہ اس کے کہ تم خود بھی اسے پڑھتے تھے''۔

مَا كَانَ اس کا معنی ہے ما ینبغی یعنی نہیں چاہیے، جیسا کہ فرمایا: وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا اور مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ اور مَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا تمام میں مراد یہی ہے کہ نہیں چاہیے (مناسب نہیں) اور لفظ بشر واحد اور جمع دونوں کے لئے آتا ہے کیونکہ یہ قائم مقام مصدر کے ہے اور ضحاک اور سدی کے قول کے مطابق یہاں مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ کتاب سے مراد قرآن کریم ہے اور حکم سے مراد علم اور فہم ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکم سے مراد احکام ہیں۔ یعنی بلاشبہ اللہ تعالیٰ اپنی نبوت کے لئے جھوٹوں کو نہیں چنتا۔ اور اگر کوئی انسان ایسا کرتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ نبوت کی آیات وعلامات اس سے سلب کر لیتا۔ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اور يَقُوْلَ کے درمیان اشتراک کی بنا پر ثُمَّ يَقُوْلَ کو نصب دی گئی ہے یعنی کسی نبی کے لئے نبوت کا ہونا اور اس کا یہ قول: كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ جمع نہیں ہو سکتے۔ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ یعنی البتہ یہ جائز ہے کہ وہ نبی ان سے کہے كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ تم اللہ والے ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے کہ یہ آیت نجران کے نصاریٰ کے بارے نازل ہوئی ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ پوری سورۃ قول باری تعالیٰ وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تک کا سبب نزول نجران کے نصاریٰ تھے، لیکن یہود کو ان کے ساتھ ملا دیا گیا، کیونکہ انہوں نے بھی انکار اور عناد انہیں کی طرح کیا۔

رَبّٰنِيّٖنَ اس کا واحد رَبَّانِیٌّ ہے یہ الرَّبّ کی طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہوتا ہے جو لوگوں کی صغار علم کے ساتھ اپنے بڑا ہونے سے پہلے تربیت کرتا ہے، گویا کہ وہ امور کو آسان بنانے میں رب سبحانہ کی اقتدا کرتا ہے، یہ معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

بعض نے کہا ہے یہ اصل میں رَبِّی تھا پھر مبالغہ کے لئے اس میں الف اور نون داخل کر دیئے گئے، جیسا کہ عظیم اللحیہ کے لئے کہا جاتا ہے: لِحْيَانِ اور عظیم الجُمّہ (بہت ہی زیادہ) کے لئے جُمَّانی اور غلیظ الرقبہ (موٹی گردن والا) کے لئے رَقَبَانِ کہا جاتا ہے۔ اور مبرد نے کہا ہے: الربانیون سے مراد ارباب علم ہیں، ان کا واحد ربان ہے، یہ ان کے اس قول سے ماخوذ ہے رَبَّهُ يَرُبُّهُ فهو ربان جب وہ اسے مدبر بنائے اور اسی کی اصلاح کرے، اس بنا پر اس کا معنی ہے یدبرون امور الناس ویصلحونہا وہ لوگوں کے امور کی تدبیر کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کرتے ہیں۔ اور اس میں الف اور نون مبالغہ کے لئے ہیں جیسا کہ ان کا قول ریّان اور عطشان ہے پھر اس کے ساتھ یائے نسبت ملا دی گئی ہے جیسا کہ کہا گیا ہے: لحیانی،

رَقَبانی اور جبّانی۔

شاعر نے کہا ہے:

لوکنت مرتَہنًا فی الجو انزلنی	منه الحدیث و رَبانیُّ أحباری

پس ربانی کا معنی رب العالمین کے دین کا ایسا عالم ہے جو اپنے علم کے ساتھ ساتھ عمل کرتا ہے، کیونکہ جب وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرے تو پھر عالم نہیں۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے اور ابورزین نے کہا ہے: ربانی سے مراد ایسا عالم ہے جو حکیم اور دانا بھی ہو۔

حضرت شعبہ نے حضرت عاصم سے، انہوں نے حضرت زر سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ فرمایا مراد ایسے حکماء ہیں جو علماء ہوں۔ ابن جبیر نے کہا ہے: مراد ایسے حکماء ہیں جو انتہائی متقی اور پرہیزگار ہوں۔

اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ حفظ قرآن کے لئے بہت محنت اور جدوجہد کو چھوڑ دے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ اور ابن زید نے کہا ہے: ربّانیون سے مراد ولی اور جید علماء ہیں۔

اور حضرت مجاہد نے فرمایا ہے: ربّانیون احبار (علماء) سے فائق اور اعلیٰ ہوتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: اور یہ قول اچھا ہے، کیونکہ احبار تو علماء ہی ہیں اور ربانی وہ ہوتا ہے جو علم بصیرت کو سیاست و دانائی کے ساتھ جمع کرتا ہے، یہ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: رَبَّ أمرَ الناسِ يَرُبُّهُ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ لوگوں کے معاملہ کی اصلاح کر دے اور اس سے منتظم قائم ہو جائے، فهو رابٌّ اور ربّانیٌّ تکثیر پر دلالت کرتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا: میں نے کسی عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ربانی سے مراد حلال و حرام اور امر و نہی کے بارے جاننے والا عالم ہے اور وہ جو امت کی اخبار اور جو کچھ ہو چکا اور جو کچھ ہوگا کے بارے جاننے والا ہو۔

جس دن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وصال ہوا اس دن محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اليوم مات ربانی هذه الامة۔ (1) آج اس امت کے عالم ربانی کا وصال ہو گیا۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: کوئی مومن و مرد و عورت اور آزاد و غلام نہیں مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ قرآن کا علم حاصل کرے اور اس کے دین میں تفقہ حاصل کرے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ الآیہ اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔

قولہ تعالیٰ: بِمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ابوعمرو اور اہل مدینہ نے اسے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ علم سے ماخوذ ہے۔ اور ابوحاتم نے اسی قرأت کو پسند کیا ہے۔ ابوعمرو نے کہا ہے: اور اس کی تصدیق تَدْرُسُوْنَ کرتا ہے (کیونکہ) التدریس سے تشدید کے ساتھ تُدَرِّسُوْنَ نہیں کہا گیا۔ ابن عامر اور اہل کوفہ نے تعلیم سے تشدید کے ساتھ تُعَلِّمُوْنَ پڑھا ہے اور ابوعبید نے اسے اختیار کیا ہے (اور) کہا ہے: کیونکہ یہ دونوں معنوں (یعنی) تعلمون اور تدرسون کو جامع ہے۔

1۔ الکشاف زمخشری، جلد 1، صفحہ 440

مکی نے کہا ہے: تشدید ابلغ ہے، کیونکہ ہر معلم عالم بمعنی یَعْلَمُ ہوتا ہے لیکن ہر وہ جو کسی شے کا علم رکھتا ہو وہ معلِّم نہیں ہوتا، پس تشدید علم اور تعلیم دونوں پر دلالت کرتی ہے اور تخفیف صرف علم پر دلالت کرتی ہے، پس تعلیم ابلغ اور زیادہ قابل تعریف ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ ذم میں ابلغ ہے۔ جنہوں نے تخفیف کی قرأت کو ترجیح دی ہے، انہوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول سے استدلال کیا ہے کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ فرمایا: تم حکماء، علماء ہو جاؤ، پس یوں کہا جانا بعید ہے کونوا فقھاء حکماء علماء بتعلیمکم یعنی تم اپنی تعلیم کے ساتھ فقہاء حکماء علماء ہو جاؤ۔ حسن نے کہا ہے: تم اپنے علم کے ساتھ حکماء علماء ہو جاؤ۔ اور ابو حیوہ نے تُدْرِسُوْنَ۔ اَدْرَسَ یُدْرِس (یعنی باب افعال) سے پڑھا ہے۔ اور حضرت مجاہد سے تَعَلَّمُون تا کے فتحہ اور لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے یعنی اصل میں تتعلمون تھا۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ۗ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۟

”اور وہ (مقبول بندہ) نہیں حکم دے گا تمہیں اس بات کا کہ بنالو فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا (تم خود سوچو) کیا وہ حکم دے سکتا ہے تمہیں کفر کرنے کا بعد اس کے کہ تم مسلمان بن چکے ہو۔“

ابن عامر، عاصم اور حمزہ نے اَنْ یُّؤْتِیَهُ پر عطف کرتے ہوئے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے یہ قول تقویت دیتا ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: کیا آپ یہ چاہتے ہیں اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کہ ہم آپ کو رب بنالیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۟ وَلَا یَاْمُرَكُمْ اور اس میں ضمیر بشر کی طرف راجع ہے۔ یعنی تمہیں وہ انسان حکم نہیں دے گا بشر سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔

اور باقیوں نے اسے پہلے کلام سے جدا ہونے اور استیناف کی بنا پر رفع کے ساتھ پڑھا ہے اور اس میں ضمیر کا مرجع اللہ عزوجل کا اسم گرامی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم نہیں دے گا کہ تم بنالو اور اس قرأت کو یہ تقویت دیتا ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے مصحف میں وَلَنْ یَّاْمُرَكُمْ ہے پس یہ استیناف پر دلالت کرتا ہے اور ضمیر بھی اللہ عزوجل کے لئے ہے، اسے مکی نے ذکر کیا ہے اور سیبویہ اور زجاج نے بھی یہی کہا ہے اور ابن جریج اور ایک جماعت نے کہا ہے: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں حکم نہیں دیں گے۔ یہی قرأت ابو عمرو، کسائی اور اہل حرمین کی ہے۔

اَنْ تَتَّخِذُوْا کہ تم ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کو خدا بنالو، یہ نصاریٰ میں موجود تھا وہ انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کی تعظیم کرتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں خدا بنالیا۔ اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ یہ انکار اور تعجب کے طریقہ پر ہے، پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر حرام قرار دیا کہ وہ لوگوں کو ایسے بندے بنادیں کہ وہ ان کے خدا بن جائیں البتہ مخلوق پر ان کی حرمت کو لازم کر دیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی یہ نہ کہے عبدی و اَمَتی (اے میرے بندے اور اے میری بندی) بلکہ یہ کہنا چاہیے فتایَ و فتاتِی (اے میرے جوان اور اے میری

دوشیزہ) اور تم میں سے کوئی کسی کو یہ نہ کہے ربی۔ (اے میرے رب) بلکہ یہ کہنا چاہئے سیدی (اے میرے آقا)(1) اور قرآن کریم میں ہے اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ اس کے معنی کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ①

''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے پختہ وعدہ کہ قسم ہے تمہیں اس کی جو دوں میں تم کو کتاب اور حکمت سے پھر تشریف لائے تمہارے پاس وہ رسول جو تصدیق کرنے والا ہو ان (کتابوں) کی جو تمہارے پاس ہیں تو تم ضرور ضرور ایمان لانا اس پر اور ضرور ضرور مدد کرنا اس کی (اس کے بعد) فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اٹھا لیا تم نے اس پر میرا بھاری ذمہ؟ سب نے عرض کی: ہم نے اقرار کیا (اللہ نے) فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔''

کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ بعض بعض کی تصدیق کریں اور بعض بعض کو ایمان کا حکم دیں (یعنی وہ ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور ایک دوسرے پر ایمان لائیں۔) سو تصدیق کے ساتھ مدد و نصرت کرنے کا یہی معنی ہے۔ یہ قول سعید بن جبیر، قتادہ، طاؤس، سدی اور حسن رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور یہی آیت کا ظاہر مفہوم ہے۔ طاؤس نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء علیہم السلام سے یہ وعدہ لیا کہ وہ بعد میں آنے والوں کے ساتھ ایمان لائیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قرأت کی ہے وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ کسائی نے کہا ہے: یہ جائز ہے کہ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ بمعنی و اذ اخذ اللہ میثاق الذین مع النبیین ہو۔

اور بصریوں نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا تو تحقیق یہ وعدہ انہیں سے لیا جو ان کے ساتھ تھے، کیونکہ انہوں نے ہی ان کی اتباع و پیروی کی اور انہوں نے ہی ان کی تصدیق کی۔ اور قول باری تعالیٰ لَمَآ میں ما بمعنی الذی ہے۔ سیبویہ نے کہا ہے میں نے خلیل ابن احمد سے قول باری تعالیٰ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ کے بارے پوچھا۔ تو انہوں نے کہا: لَمَآ بمعنی الذی ہے۔

نحاس نے کہا ہے۔ خلیل کے قول کے مطابق تقدیر عبارت یہ ہے للذی آتیتکموہ، پھر اسم کے طویل ہونے کی وجہ سے ھا کو حذف کر دیا گیا۔ اور الذی مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ہے اور مِنْ بیان جنس کے لئے ہے اور یہ کہنے والے کے اس قول کی طرح ہے: لزید افضل منك اور یہی اخفش کا قول ہے کہ یہ لام ابتدا ہے۔

المہدوی نے بیان کیا ہے: قولہ: ثُمَّ جَآءَكُمْ اور اس کا مابعد جملہ صلہ پر معطوف ہے اور اس سے موصول کی طرف لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے اور تقدیر کلام یہ ہے ثم جآءکم رسول مصدق بہ۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب العتق، حدیث نمبر 2366، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اس آیت میں رسول سے مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لفظ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ معین فرد کی طرف ہے، جیسا کہ یہ ارشادگرامی ہے: ضَرَبَ اللّٰهُ مثلا قرية كانت آمنة مطمئنة ... تا قولہ: ولقد جاءهم رسول منكم فكذبوه۔ پس اللہ تعالیٰ نے تمام کے تمام انبیاء علیہم الصلوٰت والتسلیمات سے پختہ وعدہ لیا کہ وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائیں اور آپ کی مدد کریں اگر وہ آپ کو پالیں اور انہیں یہ بھی حکم ارشاد فرمایا کہ وہ یہی وعدہ اپنی اپنی امتوں سے لیں۔ اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ میں لام اس قسم کا جواب ہے جو وعدہ لینے کی صورت میں ہے کیونکہ یہ استحلاف (قسم لینے) کے قائم مقام ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ کلام میں کہتے ہیں اخذت میثاقك لتفعلن كذا تو اس صورت میں گویا تو نے یہ کہا: میں تجھ سے حلف لیتا ہوں اور قسم اور جواب قسم کے درمیان فاصلہ اس حرف جار کے سبب ہے جو ابن کثیرہ کی قرأت میں لِمَا ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ اور جنہوں نے اسے فتحہ دیا ہے انہوں نے اسے اس قسم کے ساتھ ملا کر بیان کیا ہے جو اخذ میثاق ہے اور لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ میں محذوف قسم کا جواب ہے یعنی اصل عبارت ہے۔ واللہ لتؤمنن بہ۔

مبرد۔ کسائی اور زجاج نے کہا ہے: ما شرط ہے اس پر لام تحقیق داخل ہوا ہے جیسا کہ یہ اِنْ پر داخل ہوتا ہے، اور اس کا معنی ہے [لمھما] آتیتکم، پس ما کا محل نصب ہے اور اٰتَيْتُكُمْ کا محل جزم ہے اور ثُمَّ جَآءَكُمْ معطوف علیہ ہے، لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ اس میں لام جواب و جزا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ (اسراء: 86) (اس میں لنذ هبَنَّ جواب اور جزا ہے۔)

اور کسائی کا بیان ہے کہ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ قسم کا معتمد ہے اور یہ کلام اول کے ساتھ متصل ہے اور جواب و جزا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ اور اس بنا پر ضمیر عائد مقدر ماننے کی ضرورت نہیں۔

اور اہل کوفہ نے لِمَا آتیتکم لام مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ بھی بمعنی الذی ہے اور یہ اَخَذَ کے متعلق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے پختہ وعدہ لیا اس لئے کہ اس نے انہیں کتاب وحکمت عطا فرمائی پھر اگر تمہارے پاس رسول آجائے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو اس وعدہ کے بعد تم ضرور ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا۔ کیونکہ اخذ المیثاق، استحلاف کے معنی میں ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ نحاس نے بیان کیا ہے: اس بارے میں ابو عبیدہ کا قول اچھا ہے۔ انہوں نے کہا: اس کا معنی یہ ہے واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب لتؤمنن بہ لما آتیتکم من ذکر التوراۃ۔

اور جب اللہ نے ان سے وعدہ لیا جنہیں کتاب عطا کی گئی تو تم ضرور اس کے ساتھ ایمان لانا کیونکہ میں نے تمہیں تورات کا ذکر عطا فرمایا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور معنی یہ ہے: اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے پختہ وعدہ لیا کہ تم ضرور ضرور لوگوں کو اس کے بارے آگاہ کرو گے جو تمہارے پاس کتاب وحکمت لے کر آئے اور ضرور ضرور لوگوں پر یہ لازم کرو گے کہ وہ (اس کے ساتھ) ایمان لائیں۔ (واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لتعلمن الناس لما جاء کم من کتاب وحکمۃ، ولتاخذن علی الناس ان یومنوا) اور اس حذف پر یہ ارشاد دال ہے وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ اور یہ بھی

کہا گیا ہے کہ جنہوں نے لِمَا میں لام کو کسرہ دیا ہے وہ لام بمعنی بعد ہے، یعنی بعد ما اتیتکم من کتاب وحکمۃ، (بعد اس کے کہ میں تمہیں کتاب وحکمت عطا کردوں۔)

جیسا نابغہ نے کہا ہے:

توھمت آیات لھا فعرفتھا لستۃ أعوام وَ ذالعامُ سابع

مجھے اس کی نشانیوں کا وہم ہوا تو میں نے اسے چھ سال بعد پہچان لیا اور یہ ساتواں سال ہے۔ اس میں لستۃ اعوام بمعنی بعد ستۃ اعوام ہے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے لِمَا کو مشدد پڑھا ہے اور اس کا معنی ہے حین اتیتکم یعنی جب میں تمہیں عطا کردوں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس میں اصل تخفیف ہو۔ پھر مِن زائد کردیا گیا ہو ان کے مذہب کے مطابق جو اس کی زیادتی کو واجب قرار دیتے ہیں تو یہ لِمن ما ہو گیا اور پھر ادغام کے لئے نون کو میم سے بدل دیا گیا، پس تین میم جمع ہو گئے تو ان میں پہلے میم کو تخفیف کے لئے حذف کر دیا گیا۔ اور اہل مدینہ نے تعظیم کی بنا پر آتَیْنَاکُمْ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے آتَیْتُکُمْ صیغہ واحد پڑھا ہے۔

پھر تمام انبیاء علیہم السلام کو کتاب نہیں دی گئی بلکہ بعض کو عطا کی گئی ہے، لیکن غلبہ انہیں دیا گیا ہے جنہیں کتاب عطا کی گئی ہے۔ اور مراد تمام انبیاء علیہم السلام سے وعدہ لینا ہے پس جنہیں کتاب عطا نہیں کی گئی تو وہ بھی ان کے حکم میں ہیں جنہیں کتاب دی گئی ہے کیونکہ انہیں حکم اور نبوت عطا فرمائے گئے ہیں اور یہ بھی ہے کہ جنہیں کتاب نہیں دی گئی تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے سے پہلے والی کتاب لے لیں (اور اس کے احکام پر عمل کریں۔) نتیجتاً یہ بھی ان کی صفت کے تحت داخل ہو گئے جنہیں کتاب دی گئی۔

قولہ تعالیٰ: ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ،

اَقْرَرْتُمْ یہ اقرار سے ماخوذ ہے۔ اور الاصر اور الأصر دو لغتیں ہیں اور اس سے مراد عہد ہے۔ لغت میں الاصر کا معنی ثقل (بوجھ) ہے۔ اور عہد کو اِصر کا نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہ بہت بڑی رکاوٹ اور سختی ہے۔ قَالَ فَاشْهَدُوْا بمعنی اعلموا۔ فرمایا پس تم جان لو، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ زجاج نے کہا ہے: تم بیان کرو کیونکہ شاہد وہ ہوتا ہے جو مدعی کے دعویٰ کی تصحیح کرتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے تم گواہ بنالو اپنے آپ پر اور اپنے تبعین پر۔ وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ اور میں بھی تم پر اور ان پر گواہوں میں سے ہوں۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ارشاد فرمایا ''پس تم ان پر گواہ رہنا'' تو یہ غیر مذکور سے کنایہ ہوگا۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۸۲

''پھر جو کوئی پھرے اس (پختہ عہد) کے بعد تو وہی لوگ فاسق ہیں۔''

مَن شرطیہ ہے پس انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں سے جس نے وعدہ لئے جانے کے بعد ایمان سے منہ پھیرا فَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ پس وہ ایمان سے خارج ہیں اور فاسق بمعنی خارج۔ یہ پہلے گزر چکا ہے۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا
وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿۸۳﴾ قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ
وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ
رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۸۴﴾

''کیا اللہ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) تلاش کرتے ہیں حالانکہ اسی کے حضور سر جھکا دیا ہے ہر چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے خوشی سے یا مجبوری سے اور اسی کی طرف وہ (سب) لوٹائے جائیں گے۔ آپ فرمایئے ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہم پر اور جو اتارا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کے بیٹوں پر اور جو کچھ دیا گیا موسیٰ، عیسیٰ اور (دوسرے) انبیاء کو ان کے رب کی طرف سے نہیں فرق کرتے ہم کسی کے درمیان ان میں سے اور ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ کلبی نے کہا ہے: کعب بن اشرف اور اس کے ساتھیوں نے نصاریٰ کے ساتھ اپنا جھگڑا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کیا اور عرض کی: ہم میں سے کون زیادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہے؟ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دونوں فریق آپ کے دین سے بری ہیں'' (یعنی دونوں اس پر نہیں ہیں) تو انہوں نے کہا: نہ ہم آپ کے فیصلے پر راضی ہیں اور نہ ہی ہم آپ کا دین قبول کرتے ہیں، تب یہ آیت نازل ہوئی أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ کیا اللہ تعالیٰ کے دین کے سوا (کوئی اور دین) وہ تلاش کرتے ہیں۔ آیت میں غَيْرَ کو يَبْغُونَ فعل کے سبب نصب دی گئی ہے یعنی يبغون غيرَ دين الله۔ اور صرف عمرو نے يبغون کو خبر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھا ہے اور وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ کو خطاب کی بنا پر تا سے (پڑھا ہے) فرمایا: چونکہ پہلا خاص ہے اور دوسرا عام ہے لہٰذا معنی میں افتراق کے لئے ان کے درمیان فرق کیا گیا ہے اور حفص وغیرہ نے يبغون اور يرجعون دونوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ اور باقیوں نے دونوں کو خطاب کی بنا پر تا سے پڑھا ہے، اس ارشاد کی وجہ سے لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ، واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَلَهُ أَسْلَمَ یعنی سر جھکا دیا، سر تسلیم ختم کر دیا اور تمام مخلوق اطاعت و پیروی کرنے والی اور سر جھکانے والی ہے، کیونکہ وہ ایسی فطرت پر ہے جس سے نکلنے کی وہ قدرت نہیں رکھتی۔ حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے کہ مومن نے خوشی اور رضامندی سے سر تسلیم خم کر لیا ہے اور کافر نے اپنی موت کے وقت مجبوری سے (سر جھکایا) اور وہ اسے کوئی نفع نہ دے گا، کیونکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا (المومن: 85) (پس کوئی فائدہ نہ دیا انہیں ان کے ایمان نے جب دیکھ لیا انہوں نے ہمارا عذاب)

حضرت مجاہد نے کہا ہے: کافر کا اسلام مجبوراً ہے کیونکہ اس کا سجدہ غیر اللہ کے لئے ہے اور اس کے سائے کا سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے) أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ يَتَفَيَّأُ ظِلَالُهُ عَنِ الْيَمِينِ وَالشَّمَائِلِ سُجَّدًا لِلَّهِ وَهُمْ دَاخِرُونَ ﴿۴۸﴾ (النحل) (کیا انہوں نے نہیں دیکھا ان اشیاء کی طرف جنہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا

ہے کہ بدلتے رہتے ہیں ان کے سائے دائیں سے (بائیں طرف) اور بائیں سے (دائیں طرف) سجدہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو اس حال میں کہ وہ اظہار عجز کر رہے ہیں۔) وَ لِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ ظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَ الْاٰصَالِ ۝ (الرعد) (اور اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کر رہی ہے ہر چیز جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے بعض خوشی سے اور بعض مجبوراً اور ان کے سائے بھی (سجدہ ریز ہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس صورت پر پیدا فرمایا جس کا ان سے ارادہ فرمایا، پس ان میں سے کچھ حسین ہے اور کچھ قبیح، کچھ طویل ہے اور چھوٹے قد کی، کچھ صحت مند ہے اور کچھ بیمار اور تمام کے تمام مجبوراً جھکے ہوئے ہیں۔ پس صحیح رضامندی اور خوشی سے اطاعت کرنے والے ہیں اور اسے پسند کرنے والے ہیں اور مریض جھکتے ہیں، اطاعت اختیار کرتے ہیں اگرچہ وہ مجبور ہوں۔ اور الطوع کا معنی ہے سہولت کے ساتھ جھکنا اور اتباع کرنا۔ اور الکرہ وہ ہوتا ہے جو مشقت کے ساتھ ہو، مجبوراً ہو اور دل سے اس کا انکار ہو۔ اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں اور حال کے محل میں واقع ہیں، یعنی یہ طائعین اور مکرہین کے معنی میں ہیں۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد باری تعالیٰ کے بارے فرمایا: وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: ''ملائکہ نے آسمان میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور انصار اور عبدالقیس نے زمین میں'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تم میرے اصحاب کو گالی گلوچ نہ دو کیونکہ میرے اصحاب اللہ تعالیٰ کے خوف سے اسلام لائے اور لوگ تلوار کے خوف سے اسلام لائے''۔(1)

اور عکرمہ نے کہا ہے: طَوْعًا سے مراد وہ ہے جس نے بغیر کسی بحث مباحثہ کے اسلام قبول کیا اور كَرْهًا سے مراد وہ ہے جسے حجت اور دلیل نے توحید کی جانب مجبور کر دیا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: 87) (اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو یقیناً کہیں گے اللہ نے) وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: 61) (اور اے حبیب!) اگر آپ پوچھیں ان (مشرکوں) سے کہ کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے فرمانبردار بنایا ہے سورج اور چاند کو تو وہ ضرور کہیں گے اللہ تعالیٰ نے)

حسن نے کہا ہے: یہ (لفظ) عام ہے مگر اس کا معنی خاص ہے۔ اور آپ سے مروی ہے اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ اور کلام مکمل ہوئی۔ پھر فرمایا: وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا فرمایا: مجبوری سے اطاعت کرنے والا منافق ہے جسے اس کا عمل کوئی نفع نہ دے گا، اور طَوْعًا وَّ كَرْهًا دونوں مصدر ہیں، حال کے محل میں واقع ہیں۔ حضرت مجاہدؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کی سواری سرکش ہو جائے یا وہ بدکنے لگے تو اسے چاہئے کہ وہ اس کے کان میں یہ آیت پڑھے: اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا الی آخر الآیہ۔

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝۸۵

1۔ صحیح بخاری، باب قول النبی ﷺ لو کنت متخذا خلیلا، حدیث نمبر 3397، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

''اور جو تلاش کرے گا اسلام کے بغیر کوئی (اور) دین تو وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس سے اور وہ قیامت کو زیاں کاروں میں سے ہوگا۔''

غَیْرَ یَبْتَغِ فعل کا مفعول ہے اور دِیْنًا تفسیر کی بناء پر منصوب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ دِیْنًا، یَبْتَغِ فعل کے سبب منصوب ہو اور غَیْرَ، الدِّین سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہو۔

حضرت مجاہد اور سدی رحمۃ اللہ علیہما نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت جلاس بن سوید کے بھائی حارث ابن سوید کے بارے میں نازل ہوئی ہے، وہ انصار میں سے تھا وہ اور اس کے ساتھ بارہ افراد دین اسلام سے مرتد ہو گئے اور وہ مکہ میں کفار سے جا ملے، تو یہ آیت نازل ہوئی، پھر اس نے اپنے بھائی کی طرف پیغام بھیجا جبکہ وہ توبہ کا طالب ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سے یہی مروی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اس نے ان آیات کے نازل ہونے کے بعد اسلام قبول کر لیا۔ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ہشام نے بیان کیا ہے: یعنی وہ آخرت میں زیاں کاروں میں سے ایک زیاں کار ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو صلہ اور موصول کے درمیان تفریق کی جاتی۔ اور مازنی نے کہا ہے: الخاسرین پر الف لام ایسے ہی ہے جیسے الرجل پر ہے۔ اور سورۃ البقرہ میں ارشاد باری تعالیٰ: وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ کے تحت یہ گزر چکا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝86

''کیسے ہو سکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کر لیا ایمان لے آنے کے بعد اور وہ (پہلے خود) گواہی دے چکے تھے کہ رسول سچا ہے اور آ چکی تھیں ان کے پاس کھلی نشانیاں اور اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا ظالم لوگوں کو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ انصار میں سے ایک آدمی نے اسلام قبول کیا پھر وہ مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا، بعد ازاں وہ اپنے کیے پر نادم ہوا، تو اس نے اپنی قوم کی طرف پیغام بھیجا، تم میرے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرو کیا میرے لئے توبہ ہے؟ تو اس کی قوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئی اور عرض کی کیا اس کی توبہ (قبول) ہو سکتی ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝86 اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝87 خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝88 اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝89 پس آپ نے اس کی طرف پیغام بھیجا تو اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اسے نسائی نے نقل کیا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ انصار میں سے ایک آدمی مرتد ہو گیا اور مشرکین سے جا ملا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝86 اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝87 خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝88 اِلَّا الَّذِيْنَ

تَابُوْا (آل عمران) (کیسے ہوسکتا ہے کہ ہدایت دے اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو جنہوں نے کفر اختیار کرلیا ایمان لے آنے کے بعد ...مگر وہ لوگ جنہوں نے سچے دل سے توبہ کرلی)

پس اس کی قوم نے اسے اس کی طرف بھیج دیا، تو جب اس پر یہ آیت پڑھی گئی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میری قوم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مجھے جھٹلایا نہیں اور نہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے بارے میں جھوٹا سمجھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تینوں کو سچا قرار دیا ہے، چنانچہ وہ تائب ہوکر واپس لوٹ آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے توبہ کو قبول فرمالیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اور حسن نے کہا ہے: یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بشارت دیتے تھے اور کفر کرنے والوں کے خلاف آپ کے وسیلہ سے فتح کی دعا مانگتے تھے، لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے سرکشی کی اور کفر اختیار کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ (آل عمران) (ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی، فرشتوں کی اور سب انسانوں کی۔)

پھر کہا گیا ہے: كَيْفَ لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے یعنی لا یھدی اللہ اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ اور اسی کی مثل یہ ارشاد بھی ہے: کیف یکون للمشرکین عھد عند اللہ و عند رسولہ یعنی لا یکون لھم عھد (ان کے لئے کوئی عہد نہیں ہوسکتا۔)

اور شاعر نے کہا ہے:

كيف نومي على الفراش و لَمّا يشمل القومَ غارةٌ شعواءُ

اس میں بھی کیف نومی سے مراد ہے لا نوم لی یعنی میرے لئے کوئی نیند نہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ کہا جاتا ہے کہ ظاہر آیت یہ ہے کہ جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفر اختیار کیا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا اور جو کوئی ظالم ہوا، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دے گا، حالانکہ ہم نے بہت سے مرتدین کو دیکھا کہ وہ اسلام لائے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت عطا فرمائی اور کثیر ظالموں کو دیکھا انہوں نے اپنے ظلم سے توبہ کرلی۔ تو اسے کہا جائے گا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دے گا جب تک وہ اپنے کفر اور اپنے ظلم پر قائم رہے اور انہوں نے اسلام قبول نہ کیا، لیکن جب انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور توبہ کرلی تو اس کے بارے اللہ تعالیٰ نے ہی انہیں توفیق دی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۫ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

''ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر پھٹکار پڑتی رہے اللہ کی فرشتوں کی، اور سب انسانوں کی۔ ہمیشہ رہیں اسی پھٹکار میں نہ ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے (سچے دل سے) توبہ کرلی اس کے بعد اور اپنی اصلاح کرلی تو بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (انہیں بخش دے گا)''۔

یعنی اگروہ اپنے کفر پر قائم رہیں اور لعنۃ اللہ والناس کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔
وَلَا هُمْ يُنظَرُوْنَ یعنی نہ انہیں موخر کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی، پھر اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کی استثناء فرمائی اور ارشاد فرمایا: **اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا** امراد حارث بن سوید ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے معنوی طور پر آیت میں ہر وہ داخل ہے جس نے اسلام کی طرف رجوع کیا اور اس کے لئے مخلص ہو گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝۹۰

"یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے چلے گئے کفر میں ہرگز نہ قبول کی جائے گی ان کی توبہ اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔"

حضرت قتادہ، عطا خراسانی اور حسن نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کے ساتھ کفر کیا اور پھر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کا انکار کر کے اپنے کفر میں اور اضافہ کر لیا۔ اور ابو العالیہ نے کہا ہے۔ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت وصفت کے ساتھ ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔ **ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا** پھر اپنے کفر پر قائم رہ کر انہوں نے اس میں اور اضافہ کر لیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: **ازْدَادُوْا كُفْرًا** وہ کفر میں بڑھتے ہی گئے ان گناہوں کے سبب جو انہوں نے کئے۔ اور یہ علامہ طبری کا اختیار کردہ ہے۔ اور یہ آیت ان کے نزدیک یہود کے بارے میں ہے۔

لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یہ اس آیت کی وجہ سے مشکل ہے: **وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ** (الشوریٰ:25) (اور وہی ہے جو توبہ قبول کرتا ہے اپنے بندوں کی اور درگزر کرتا ہے ان کی غلطیوں سے۔)

سو یہ کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے موت کے وقت ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ** (النساء:18) اور نہیں یہ توبہ (جس کے قبول کرنے کا وعدہ ہے) ان لوگوں کے لئے جو کرتے رہتے ہیں برائیاں (ساری عمر) یہاں تک کہ جب آ جائے کسی ایک کو ان میں سے موت (تو) کہے بے شک میں توبہ کرتا ہوں اب)

اور حضرت حسن، قتادہ اور عطا رحمۃ اللہ علیہم سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یقیناً اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ قبول فرماتا ہے جب تک اس کی جان (روح) حلقوم تک نہ پہنچے(1)"۔ اور اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: **لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ** یعنی وہ حالت جس پر وہ کفر کرنے سے پہلے تھے (اس پر نہیں لوٹ سکتے) کیونکہ کفر نے اسے ضائع کر دیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: **لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ** یعنی جب وہ اپنے کفر سے دوسرے کفر کی طرف رجوع کریں، بلاشبہ ان کی توبہ قبول

1۔ ابن ماجہ، باب ذکر التوبہ، حدیث نمبر 4242، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی جائے گی جب انہوں نے اسلام کی طرف رجوع کیا۔ اور قطرب نے کہا ہے: یہ آیت اہل مکہ میں سے ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی انہوں نے کہا: ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں تکالیف زمانہ کا انتظار کر رہے ہیں، پس اگر ہمارے لئے واپسی ممکن ہوئی تو ہم اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ یعنی ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی درآنحالیکہ وہ کفر پر مقیم رہیں، پس اسے ہی توبہ غیر مقبولہ کا نام دیا ہے، کیونکہ قوم کا عزم صحیح نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ توبہ مکمل طور پر قبول فرماتا ہے بشرطیکہ عزم وارادہ صحیح ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝۹۱

”جن لوگوں نے کفر کیا اور مر گئے کفر ہی کی حالت میں تو ہرگز نہ قبول کیا جائے گا ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا اگرچہ وہ (اپنی نجات کے لئے) عوضانہ دے اتنا سونا، ایسے لوگوں کے لئے عذاب ہے دردناک اور نہیں ہے ان کا کوئی مددگار۔“

المِلْءُ کسرہ کے ساتھ ہو تو مراد وہ مقدار ہے جو کسی شے کو بھر دیتی ہے اور المَلْءُ فتحہ کے ساتھ مصدر ہے تیرا کسی شے کو بھر دینا اور کہا جاتا ہے: أعطنی مِلأهُ وَ مِلأیه و ثلاثة أملایه۔ اور وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ میں واؤ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ مقحم اور زائدہ ہے۔ اور معنی یہ ہے: فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ اور علماء نحو میں سے اہل نظر نے کہا ہے: یہ جائز نہیں ہے کہ واؤ مقحمہ ہو کیونکہ یہ معنی پر دلالت کر رہی ہے۔ اور آیت کا معنی یہ ہے: سو ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا تبرعاً قبول نہیں کیا جائے گا اگرچہ وہ اسے بطور فدیہ دے۔ اور ذَهَبًا فراء کے قول کے مطابق بطور تفسیر منصوب ہے۔ مفضل نے کہا ہے: تفسیر کے لئے شرط یہ ہے کہ کلام تام ہو اور وہ مبہم ہو، جیسے تیرا یہ قول ہے: عندی عشرون، اس میں عدد معلوم ہے اور معدود مبہم ہے، پس جب تو نے درھما کہا تو تو نے تفسیر بیان کر دی۔ بلاشبہ اسے بطور تمیز نصب دی گئی ہے کیونکہ اس کے لئے کوئی ایسا عامل نہیں ہے جو اسے کسرہ دے رہا ہو اور نہ ہی اسے کوئی رفع دینے والا عامل ہے۔ اور نصب خفیف ترین حرکت ہے اور یہ ہر اس کے لئے بنائی گئی ہے جس میں کوئی عامل نہ ہو۔ اور کسائی نے کہا ہے: اسے مِنْ کو مضمر کر کے نصب دی گئی ہے۔ یعنی اصل میں تھا مِن ذَهَبٍ، جیسا کہ اس قول میں ہے: أَو عدل ذٰلِكَ صِيَامًا۔ ای مِنْ صِيَامٍ۔

اور بخاری اور مسلم میں حضرت قتادہ سے اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن کافر کو لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا: تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے لئے زمین بھر سونا ہو۔ کیا تو اسے بطور فدیہ دے سکتا ہے؟ تو وہ کہے گا۔ ہاں۔ پھر اسے کہا جائے گا: تحقیق تجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کیا تھا جو اس سے بہت زیادہ آسان تھی۔“ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ اور مسلم نے قد کنت کی بجائے کذبت، قد سئلت کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ (تو نے جھوٹ بولا ہے حالانکہ تجھ سے اس کا سوال کیا گیا تھا۔)(1)

1۔ صحیح بخاری، باب من نوقش الحساب عذب، حدیث نمبر 6057، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ وَ مَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ ۝

''ہرگز نہ پاسکو گے تم کامل نیکی (کا رتبہ) جب تک نہ خرچ کرو (راہ خدا میں) ان چیزوں سے جن کو تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ ائمہ کرام نے روایت بیان کی ہے اور یہ الفاظ نسائی کے ہیں، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا! ہمارا رب ہمارے مالوں کے بارے میں ہم سے سوال کر رہا ہے پس یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو گواہ بناتا ہوں اس پر کہ میں نے اپنی زمین اللہ تعالیٰ کے لئے دے دی۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے اپنے قرابتداروں حسان ابن ثابت اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما میں تقسیم کر دے۔''(1)

اور الموطا میں ہے ''ان کے اموال میں سے ان کے نزدیک پسندیدہ مال بیرحاء تھا اور وہ مسجد کے سامنے تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لے جاتے تھے اور اس کا میٹھا اور طیب پانی نوش فرماتے تھے۔'' پھر آگے وہی حدیث ذکر کی۔ تو اس آیت میں خطاب کے ظاہر اور اس کے عموم کو عمل میں لانے پر دلیل موجود ہے، کیونکہ جب آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے اکوئی معنی مذکور کلام سے نہیں سمجھے۔ کیا آپ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو دیکھتے نہیں کہ جب انہوں نے آیت لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا الآیۃ سنی تو انہوں نے توقف کی ضرورت محسوس نہیں کی یہاں تک کہ دوسری آیت کے ذریعہ اس کا بیان اور وضاحت آجائے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کے بندے خرچ کریں یا کوئی سنت سامنے آجائے جو اس کی وضاحت کرنے والی ہو کیونکہ وہ تو بہت سی اشیاء کو پسند کرتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ نے بھی کیا کہ آپ نے اپنے پسندیدہ گھوڑے کا قصد کیا اسے سَبَل کہا جاتا تھا اور کہا: اے اللہ! یقیناً تو جانتا ہے کہ میرے نزدیک میرے اس گھوڑے سے زیادہ پسندیدہ مال کوئی نہیں ہے، پس آپ اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے اور عرض کی: یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں قربان ہے (اسے قبول فرمایئے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو فرمایا: ''اسے قبضے میں لے لو'' تو گویا حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے اپنے دل میں کچھ (وہم سا) پایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان اللہ قد قبلہا منك بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اسے تجھ سے قبول فرمالیا ہے۔ اسے اسد بن موسیٰ نے ذکر کیا ہے(2)۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے غلام نافع کو آزاد کیا اور اس میں حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے انہیں ہزار دینار عطا کئے۔ صفیہ بنت ابی عبید نے کہا ہے: میں ان کے بارے گمان کرتی ہوں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل کی: لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰى تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ۔

اور شبل نے ابو نجیح سے اور انہوں نے حضرت مجاہد سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے

1۔ صحیح بخاری، باب الزکاۃ علی الاقارب، حدیث نمبر 1368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 577

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی طرف لکھا کہ وہ مدائن کسریٰ کی فتح کے دن جلولاء کے قیدیوں سے ان کے لئے ایک لونڈی خریدیں، تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بلایا تو اس نے آپ کو بہت خوش کیا، تو انہوں نے کہا: بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کر دیا۔ اور حضرت ثوری سے مروی ہے کہ ان تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ربیع بن خثیم کی ام ولد نے بیان کیا ہے کہ جب ان کے پاس کوئی سائل آتا تو وہ مجھے فرماتے اے فلانہ! سائل کو شکر دے دو، کیونکہ ربیع شکر بہت پسند کرتا تھا۔ سفیان نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی (یہی) تاویل کرتے ہیں: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ شکر کی بوریاں خریدتے تھے اور انہیں صدقہ کر دیتے تھے تو آپ سے عرض کی گئی: آپ اس کی قیمت کیوں نہیں صدقہ کر دیتے؟ تو آپ نے فرمایا: کیونکہ شکر میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی زیادہ پسندیدہ اور محبوب شے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کر دوں۔

اور حسن نے کہا ہے: یقیناً تم اسے ہرگز نہیں پاسکو گے جسے تم پسند کرتے ہو مگر اسے چھوڑ کر جس کی خواہش اور چاہت تم رکھتے ہو اور تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے جس کی تم آرزو رکھتے ہو مگر اس پر صبر کرتے ہوئے جسے تم ناپسند کرتے ہو۔

مسئلہ نمبر 2۔ الْبِرَّ کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے بعض نے کہا ہے: اس سے مراد جنت ہے، یہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت عطا، حضرت مجاہد، عمرو بن میمون اور سدی رضی اللہ عنہم و رحمۃ اللہ علیہم سے منقول ہے۔ اور تقدیر کلام یہ ہوگی۔ لن تنالوا ثواب البر حتی تنفقوا مما تحبون (تم نیکی کا ثواب ہرگز نہیں پا سکتے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے (راہ خدا میں) خرچ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔) اور النَّوال بمعنی عطا ہے، یہ تیرے اس قول سے ہے نولتہ تنویلاً یعنی میں نے اسے عطا کیا۔ اور نالنی من فلان معروف ینالنی، یعنی وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ سو معنی یہ ہوگا: تم ہرگز جنت تک نہ پہنچ سکو گے اور نہ تم اسے پاسکو گے یہاں تک کہ تم خرچ کر دو (راہ خدا میں) ان چیزوں میں سے جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔

اور بعض نے کہا ہے: البر سے مراد عمل صالح (نیکی) ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے: ''تم پر سچ بولنا لازم ہے کیونکہ سچائی عمل صالح کی طرف راہنمائی کرتی ہے اور عمل صالح جنت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ (1)'' سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔

عطیہ العوفی نے کہا ہے: الْبِرَّ سے مراد طاعت ہے۔ حضرت عطا نے بیان کیا ہے: تم ہرگز دین اور تقویٰ کا شرف و مرتبہ نہ پا سکو گے یہاں تک کہ تم صدقہ کرو در آنحالیکہ تم صحت مند اور حریص ہو، تم زندگی کی آرزو رکھتے ہو اور فقر و افلاس سے ڈرتے ہو۔ اور حسن سے منقول ہے کہ حَتّٰى تُنْفِقُوْا سے مراد فرض زکوٰۃ ہے۔ مجاہد اور کلبی نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے اسے آیت زکوٰۃ نے منسوخ کیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یہاں تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو خیر اور نیکی کی راہ میں مثلاً صدقہ یا علاوہ ازیں دیگر طاعات وغیرہ اور یہ جامع معنی ہے۔ اور نسائی نے صعصعہ بن معاویہ سے روایت نقل کی ہے، انہوں نے کہا: میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ملا تو میں نے کہا کوئی حدیث بیان فرمائیے تو انہوں نے کہا: ہاں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر 5629، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان آدمی اپنے ہر مال سے جوڑا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو جنت کے تمام دربان اس کا استقبال کریں گے اور ان میں سے ہر کوئی اسے اس کی طرف بلائے گا جو اس کے پاس ہے۔ میں نے پوچھا: وہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے فرمایا: اگر تو وہ (مال) اونٹ ہیں تو پھر دو اونٹ (صدقہ کرے) اور اگر وہ گائیں ہیں تو پھر وہ دو گائیں (صدقہ کرے)۔ اور ابوبکر الوراق نے کہا ہے: (اللہ تعالیٰ نے) اس آیت کے ساتھ مکارم اخلاق پر ان کی راہنمائی کی ہے۔ یعنی تم ہرگز اپنے ساتھ میری نیکی کو نہیں پا سکو گے مگر اس طرح کہ تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی کرو اور اپنے اموال اور جاہ و حشمت میں سے ان پر خرچ کرو، پس جب تم اس طرح کرو گے تو پھر میری نیکی، احسان اور میرا لطف و مہربانی تمہیں آ پہنچے گی۔

حضرت مجاہد نے کہا: یہ اس ارشاد کی مثل ہے: وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا۔ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ یعنی جب وہ جانتا ہے تو اس پر جزا عطا فرمائے گا۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۹۳ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۹۴

''سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کے لئے مگر وہ جسے حرام کیا اسرائیل نے اپنے آپ پر اس سے پہلے کہ نازل کی گئی تورات۔ آپ فرمائیے: لاؤ تورات پھر پڑھو اسے اگر تم سچے ہو۔ پس جو بہتان لگاتا ہے اللہ تعالیٰ پر جھوٹا اس کے بعد تو وہی ظالم ہیں۔''

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: حِلًّا یعنی حلال۔ (کھانے کی ہر چیز حلال تھی۔) پھر استثنا کی اور فرمایا: اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِیْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا: آپ ہمیں بتائیے، کون سی شے اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام) نے اپنے آپ پر حرام کی تھی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ جنگل میں رہتے تھے اور وہ عرق النساء (کی بیماری) میں مبتلا ہو گئے اور وہ اونٹوں کے گوشت اور ان کے دودھ کے سوا کوئی پسندیدہ اور مناسب شے نہ پاتے تھے۔'' انہوں نے کہا: آپ نے سچ فرمایا ہے۔ (1)

اور حدیث ذکر کی۔ اور کہا جاتا ہے: (بے شک آپ نے) نذر مانی کہ اگر آپ اس بیماری سے شفایاب ہو گئے تو وہ اپنا پسندیدہ کھانا پینا چھوڑ دیں گے اور آپ کے نزدیک پسندیدہ کھانا پینا اونٹ کا گوشت اور ان کا دودھ تھا۔

حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سدی رضی اللہ عنہم نے کہا ہے: حضرت یعقوب علیہ السلام حران سے بیت المقدس کا ارادہ کرتے ہوئے آئے جبکہ آپ اپنے بھائی عیصو سے بھاگے، آپ انتہائی مضبوط اور قوی آدمی تھے، پس آپ کی ملاقات ایک

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ الرعد، حدیث 3042، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرشتے سے ہوئی تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے گمان کیا کہ یہ ڈاکو ہے چنانچہ آپ نے اس کے ساتھ لڑائی کی کہ آپ اس کو پچھاڑ دیں، تو فرشتے نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ران پر کچوکا لگایا اور پھر وہ آسمان کی طرف چڑھ گیا اور یعقوب علیہ السلام اس کی طرف دیکھتے رہے تو اس طرح آپ پر عرق النساء کی بیماری غالب آگئی اور اس کے سبب شدید تکلیف میں مبتلا ہو گئے، درد کی وجہ سے رات کو نیند نہ آتی تھی بلکہ آپ چیختے ہوئے رات گزارتے تھے، تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے نذر مانی اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں شفا عطا فرمادی تو (ہڈی نہیں کھائیں گے) اور نہ ہی وہ ایسا کھانا کھائیں گے جس میں ہڈی ہوگی تو انہوں نے اسے اپنے اوپر حرام کرلیا، تو اس کے بعد ان کے بیٹے بھی ان کی پیروی کرنے لگے اور وہ گوشت سے ہڈیوں کو نکال دیتے تھے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو فرشتے کا کچوکا لگانے کا سبب یہ تھا کہ وہ نذر مانیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں بارہ بیٹے عطا فرمائے اور وہ صحیح سالم بیت المقدس آئے تو وہ ان میں سے آخری کو ذبح کریں گے۔ پس وہ ان کی نذر سے نکلنے کے لئے تھا، حضرت ضحاک سے یہی منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا یہ تحریم حضرت یعقوب علیہ السلام کے اپنے اجتہاد سے تھی یا اللہ تعالیٰ کے اذن سے؟ تو اس میں صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تحریم کی نسبت ان کی طرف کی ہے۔ فرمایا **اِلَّا مَا حَرَّمَ** اور یہ کہ نبی کو جب اس کا اجتہاد کسی حکم تک پہنچادے تو وہ دین ہوتا ہے اور اس کی اتباع ہمارے اوپر لازم ہوجاتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے اس پر پختہ فرمادیتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہے جیسا کہ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے اور اس کی اتباع لازم ہوجاتی ہے، اسی طرح اس کو اجازت دی جاتی ہے اور وہ اجتہاد کرتا ہے اور اس کے اجتہاد کا موجب متعین ہوجاتا ہے جب وہ اس پر قادر ہو اور اگر اس کے لئے اس کی تحریم کے بارے پہلے اجازت نہ ہو تو وہ تحلیل وتحریم کی جانب بغیر اجازت کے نہیں بڑھتا۔ ہمارے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح روایت کے مطابق شہد کو حرام کیا (1) یا اپنی کنیز ماریہ کو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریم کی توثیق نہ کی اور یہ ارشاد نازل ہوا۔ **لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ** اس کا بیان سورۃ التحریم میں آئے گا۔

الکیا الطبری نے کہا ہے یہ کہا جانا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مطلق ارشاد **لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ** تقاضا کرتا ہے کہ یہ ماریہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

اور امام شافعی نے یہ رائے بیان کی ہے کہ اس صورت میں کفارہ کا واجب ہونا غیر معقول ہے، تو آپ نے اسے محل نص کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کہا ہے کہ دراصل کفارہ ہر مباح کو حرام قرار دینے کی صورت میں ہے اور آپ نے اسے قسم کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: **قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء میں مبتلا ہوئے تو حکماء نے آپ کے لئے یہ تجویز کیا کہ آپ اونٹ کے گوشت سے پرہیز کریں چنانچہ آپ نے اسے اپنے آپ پر حرام قرار دیا۔ پھر یہودیوں نے کہا: بلاشبہ ہم اپنے آپ پر اونٹ کا گوشت حرام

1۔ صحیح بخاری، باب لم تحرم ما احل اللہ لک، حدیث نمبر 4862، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

قرار دیتے ہیں، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اسے حرام قرار دیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کی تحریم کا حکم تورات میں نازل فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حضرت ضحاک نے کہا ہے: پس اللہ تعالیٰ نے ان کی تکذیب فرمائی اور ان کا رد کر دیا اور فرمایا: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ لیکن وہ نہ لائے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ زجاج نے کہا ہے: ہمارے نبی مکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لئے اس آیت میں بہت بڑی دلیل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بتایا کہ یہ ان کی کتاب میں نہیں ہے اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ وہ تورات لے آئیں لیکن انہوں نے انکار کیا۔ یعنی انہوں نے یہ پہچان لیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے سبب یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اور عطیہ العوفی نے کہا ہے: بلاشبہ وہ ان پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے حرام کرنے کی وجہ سے حرام ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ اسرائیل نے اس وقت کہا جب انہیں عرق النساء کا مرض لاحق ہوا: قسم بخدا اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے عافیت اور صحت عطا فرمائی تو کوئی بچہ اسے (گوشت کو) نہیں کھائے گا، حالانکہ وہ ان پر حرام نہیں کیا گیا تھا۔ اور کلبی نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اسے تورات میں ان پر حرام نہیں کیا بلکہ تورات کے بعد ان کے ظلم اور کفر کی وجہ سے اسے حرام قرار دیا۔ اور بنی اسرائیل جب بڑے بڑے گناہ کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر پاکیزہ اور طیب کھانا حرام کر دیا یا ان پر عذاب نازل کر دیا اور وہ موت ہے، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ الآیہ (النساء: 160) (سو بوجہ ظلم ڈھانے یہود کے ہم نے حرام کر دیں ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو حلال کی گئی تھیں ان کے لئے) اور ارشاد گرامی ہے: وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۗ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ (الانعام) (اور ان لوگوں پر جو یہودی بنے تھے ہم نے حرام کر دیا ہر ناخن والا جانور ... یہ ہم نے سزا دی تھی انہیں بسبب ان کی سرکشی کے اور یقیناً ہم سچے ہیں۔)

مسئلہ نمبر 4۔ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں یہ عنوان ذکر کیا ہے دواء عرق النساء ہشام بن عمار اور راشد ابن سعید الرملی نے بیان کیا ہے کہ ولید بن مسلم، ہشام بن حسان، انس بن سیرین تمام نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا، عرق النساء کا علاج جنگلی بکری کی لاٹ ہے جسے پگھلایا جائے، پھر اسے تین اجزاء میں تقسیم کیا جائے، پھر ہر روز ایک جز نہار منہ پیا جائے۔" (1)

اور ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرق النساء کے بارے میں ارشاد فرمایا: "عربی مینڈھے کی لاٹ لی جائے نہ وہ چھوٹا ہو اور نہ ہی بہت بڑا اور اسے چھوٹا چھوٹا کاٹ لیا جائے اور پھر اس کی چربی پگھلا کر نکال لی جائے اور اسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر روز ایک تہائی حصہ نہار منہ لے لیا جائے۔" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے سو سے زیادہ افراد کو اس کے بارے بتایا اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے

1۔ ابن ماجہ، باب دواء عرق النساء، حدیث نمبر 3453، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تندرست ہو گئے۔

حضرت شعبہ نے بیان کیا ہے: حجاج بن یوسف کے زمانے میں عرق النساء کے متعلق ایک شیخ نے مجھے بتایا: میں تجھے عظمت وشان والے الله کی قسم دیتا ہوں اگر تو (اس سے) تندرست نہ ہو تو میں تجھے آگ کے ساتھ داغ دوں گا یا تجھے استرے کے ساتھ مونڈ دوں گا۔ حضرت شعبہ نے بیان کیا: تحقیق میں نے اس کا تجربہ کیا، تو اسے کہہ، اور تو اس جگہ پر اسے کل دے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۫ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۹۵

"آپ کہہ دیجئے: سچ فرمایا ہے الله نے پس پیروی کرو تم ملت ابراہیم کی جو ہر باطل سے الگ تھلگ تھے اور (بالکل) نہ تھے وہ شرک کرنے والوں سے۔"

اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے: الله تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے، بلاشبہ وہ تورات میں حرام نہیں کیا گیا ہے۔ **فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا** یعنی الله تعالیٰ نے آپ کے دین کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ **وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ** یہ ان کے باطل دعویٰ کو انہی پر رد کرنا اور لوٹانا ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝۹۶ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ۝۹۷

"بے شک پہلا (عبادت) خانہ جو بنایا گیا لوگوں کے لئے وہی ہے جو مکہ میں ہے، بڑا برکت والا، ہدایت (کا سرچشمہ) ہے سب جہانوں کے لئے۔ اس میں روشن نشانیاں ہیں (ان میں سے ایک) مقام ابراہیم ہے اور جو بھی داخل ہوا اس میں ہو جاتا ہے (ہر خطرہ سے) محفوظ۔ اور الله کے لئے فرض ہے لوگوں پر حج اس گھر کا جو طاقت رکھتا ہو وہاں تک پہنچنے کی اور جو شخص (اس کے باوجود) انکار کرے تو بے شک الله بے نیاز ہے سارے جہان سے۔"

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے بیان کیا میں نے رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پہلی مسجد کے بارے میں پوچھا جو زمین پر بنائی گئی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مسجد حرام"۔ میں نے عرض کی پھر کون سی مسجد بنائی گئی؟ تو آپ؟ نے فرمایا: "مسجد اقصیٰ"۔ میں نے عرض کی: ان دونوں کے درمیان کتنی مدت کا فاصلہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چالیس سال، پھر ساری زمین تیرے لئے مسجد بنا دی گئی جہاں کہیں تجھے نماز کا وقت ہو جائے تو تو وہیں نماز پڑھ لے۔"(1)

حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس سے پہلے کوئی عبادت خانہ نہیں بنایا گیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بیت سے پہلے بیوت تو کثیر تھے لیکن یہاں بیت سے مراد وہ ہے جو عبادت کے لئے سب سے

1۔ صحیح بخاری، باب سرلقون النسلان فی المشی، حدیث نمبر 3115، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اول بنایا گیا۔

اور حضرت مجاہد نے بیان کیا: مسلمان اور یہودی ایک دوسرے پر فخر کرنے لگے پس یہودیوں نے کہا: بیت المقدس کعبہ سے افضل اور اعظم ہے، کیونکہ وہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت گاہ ہے اور ارض مقدس میں ہے۔ اور مسلمانوں نے کہا: (نہیں) بلکہ کعبہ معظمہ افضل ہے۔

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور سورۃ البقرہ میں بیت اللہ کی بناوٹ اور سب سے اول جس نے اسے بنایا اس کا ذکر گزر چکا ہے۔

حضرت مجاہد نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین کی کسی شے کو تخلیق فرمانے سے دو ہزار برس پہلے اس بیت کی جگہ کو تخلیق فرمایا اور اس کی بنیادیں نیچے والی ساتویں زمین میں ہیں اور جہاں تک مسجد اقصیٰ کا تعلق ہے تو اسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بنایا ہے، جیسا کہ اسے امام نسائی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث سے نقل کیا ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بیت المقدس کو بنایا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے تین خصلتوں اور اعزاز کا سوال کیا [انہوں نے اللہ تعالیٰ سے] حاکم بنائے جانے کی التجا کی کہ وہ انہیں حکومت عطا فرمائے۔ پس وہ انہیں عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملک کی التجا کی کہ آپ کے بعد کسی کے لئے ایسی بادشاہی نہ ہو پس وہ بھی آپ کو عطا کر دی گئی اور انہوں نے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں عرض کی جب وہ مسجد بنانے سے فارغ ہوئے کہ جو بھی اس میں آ کر نماز ادا کرے تو وہ اسے گناہوں سے اسی طرح پاک کر دے جس طرح وہ اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا پس یہ اعزاز بھی انہیں عطا کر دیا گیا۔'' دونوں حدیثوں کے درمیان اشکال ہے، کیونکہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے درمیان طویل مدت کا فاصلہ ہے اہل تواریخ نے کہا ہے: وہ مدت ہزار برس سے زیادہ ہے۔

پس کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے اسے نئے سرے سے بنایا جس کی بنیاد ان کے سوا (کسی اور) نے رکھی تھی۔ اور یہ روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ شریف بنایا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ پس یہ جائز ہے کہ آپ کے بعد آپ کی اولاد میں سے کسی نے چالیس سال بعد بیت المقدس کو تعمیر کیا اور یہ بھی جائز ہے کہ ملائکہ نے ہی بیت اللہ کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اذن سے اسے بنایا ہو، یہ سب احتمالات ہیں۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو زمین میں گھر بنانے کا حکم ارشاد فرمایا اور یہ کہ وہ اس کا طواف کریں اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے تھا، پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اسے ہی بنایا جو پہلے بنایا جا چکا تھا اور اس کا طواف کیا، پھر ان کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بناوٹ کو مکمل کیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ یہ اِنَّ کی خبر ہے اور اس میں لام برائے تاکید ہے اور بکّۃ سے مراد وہ خاص جگہ ہے جہاں بیت اللہ شریف ہے اور مکہ تو سارا شہر ہے، یہ حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

اور محمد بن شہاب نے کہا ہے کہ بکّۃ سے مراد مسجد ہے اور مکہ سے مراد سارا حرم ہے، اس میں گھر داخل ہوتے ہیں۔ اور مجاہد

نے کہا ہے: بکۃ سے مراد مکہ ہی ہے۔ پس اس میں میم کو با سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ عربوں نے کہا ہے: طین لازب و لازم، حضرت ضحاک اور مورج نے یہی کہا ہے۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ بکۃ، البلت سے مشتق ہے اور اس کا معنی ازدحام اور بھیڑ ہے۔ جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو کہا جاتا ہے تباك القوم۔ طواف کی جگہ لوگوں کی بھیڑ اور اژدحام ہونے کی وجہ سے اس کا نام بکہ رکھا گیا ہے۔ اور البلک کا معنی ہے دق العنق۔ گردن توڑنا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا نام بکہ اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ بڑے بڑے جابروں کی گردنیں توڑ دیتا ہے جب وہ اس میں ظلم و زیادتی کی طرف مائل ہوں۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب بھی کسی جابر نے برائی کی نیت سے اس کا قصد کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے پاش پاش کر دیا۔ اور رہا مکہ! تو کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام پانی کی قلت کی وجہ سے رکھا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ اس کا قصد کر کے آنے والا اتنی مشقت پاتا ہے جو اس کی ہڈیوں سے گودا اور مغز کو خشک کر دیتی ہے، یہ معنی ان کے اس قول سے ماخوذ ہے: مککت العظم اذا اخرجت ما فیہ۔ یعنی ہڈیوں میں جو کچھ ہے تو وہ سب نکال لے تب کہے گا مککتُ العظم (میں نے ہڈی کو خالی کر لیا) اور مَكَّ الفصیلُ ضرع امہ و امتکہ جب بچھڑا کھیری میں موجود سارا دودھ چوس لے اور اسے پی لے تب یہ کہا جاتا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

مَکَّت فلم تُبقِ فی اجوافها دِرَرًا

انہوں نے دودھ چوسا اور ان میں کوئی دودھ نہ چھوڑا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ اسے ہلاک اور تباہ کر دیتا ہے جو اس میں ظلم و زیادتی کرے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا یہ نام اس لئے ہے کیونکہ لوگ اس میں تمسخر کرتے تھے اور ہنستے تھے اور یہ معنی اس ارشاد باری تعالیٰ سے لیا گیا ہے: وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً۔ یعنی وہ اس میں تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ اور یہ اس کے منصرف ہونے کو ثابت نہیں کرتا، کیونکہ مکۃ دو حرفی مضاعف ہے۔ اور مُکَاء سہ حرفی معتل ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُبٰرَكًا اسے مبارک بنایا کیونکہ اس میں عمل کو کئی گنا بڑھا دیا جاتا ہے اور برکت کا معنی کثرۃ الخیر ہے۔ اور یہ لفظ وُضِعَ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ یا بکۃ سے ظرف ہونے کی بنا پر منصوب ہے۔ اور معنی یہ ہے: الذی استقر ببکۃ مُبارکًا (یعنی وہ جو مکہ میں قیام پذیر رہا جس میں برکت رکھ دی گئی۔)

اور غیر قرآن میں مبارك پڑھنا بھی جائز ہے یا تو اس لئے کہ یہ خبر ثانی ہے یا اس لئے کہ یہ الذی سے بدل ہے یا اس بنا پر کہ مبتدا مضمر ہے وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ یہ اس پر معطوف ہے۔ اور یہ وھو ھدًی لِلعالمین کے معنی میں ہوگا۔ اور غیر قرآن میں اسے مبارکٍ جر کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے اس صورت میں یہ البیت کی نعت اور صفت ہوگا۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ اسے مبتدا یا صفت ہونے کی وجہ سے رفع دیا گیا ہے۔ اہل مکہ، ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم نے آیۃ بینۃ واحد پڑھا ہے، یعنی مقام ابراہیم واحد اور ایک ہے۔ انہوں نے کہا کہ مقام

ابراہیم میں ان کے قدموں کا نشان ایک واضح اور ظاہر علامت ہے۔ اور حضرت مجاہد نے مقام ابراہیم کی تفسیر پورے حرم سے کی ہے۔ اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس کی آیات اور نشانیوں میں سے صفا اور مروہ، رکن اور مقام ابراہیم ہیں۔

اور باقیوں نے اسے جمع کے صیغہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے اس سے ارادہ مقام ابراہیم، حجر اسود، حطیم، زمزم اور دیگر تمام مشاعر کا کیا ہے۔

فرمایا: ابوجعفر النحاس نے کہا ہے: جنہوں نے آیات بینات پڑھا ہے تو ان کی قرأت زیادہ واضح اور بین ہے، کیونکہ صفا اور مروہ بھی آیات و علامات میں سے ہیں۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ پرندہ صحیح سالم حالت میں بیت اللہ شریف سے بلند نہیں ہو سکتا۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جب کوئی شکاری شکار کو تلاش کر رہا ہو تو جب وہ حرم پاک میں داخل ہو جائے تو وہ اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ بارش جب رکن یمانی کی جانب ہو تو ہریالی اور شادابی یمن میں ہوتی ہے۔ اور جب رکن شامی کی جانب ہو تو شادابی شام میں ہوتی ہے۔ اور جب پورے بیت اللہ پر ہو تو شادابی سارے شہروں میں آتی ہے اور ان میں سے یہ بھی ہے کہ جمرات پر جس قدر اضافہ کیا جاتا ہے وہ ایک ہی مقدار پر دکھائی دیتے ہیں۔

اور المقام ان کے اس قول سے ہے قمت مقاما اور یہ وہ جگہ جس میں کھڑا ہوا جاتا ہے اور المقام تیرے اس قول سے ہے اقمت مقاما اور یہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مقام میں اختلاف بھی گزر چکا ہے اور اس میں صحیح یہ ہے اور المقام مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ اور خبر محذوف ہے اور تقدیر کلام ہے: منها مقام ابراهيم۔ اخفش نے یہی کہا ہے اور محمد بن یزید نے بیان کیا ہے کہ مقام، آیات سے بدل ہے اور اس میں ایک تیسرا قول بھی ہے۔ یعنی بمعنی هي مقام ابراهيم ہے۔

اور کلام عرب میں اخفش کا قول معروف ہے جیسا کہ زہیر نے کہا ہے:

لها متاع و أعوان غدون به ۔ قِتبٌ و غرب اذا ما أفرِغ انسَحَقا

یعنی اس کا بہاؤ دور ہو گیا اور ختم ہو گیا ..... اور ابو العباس کا قول ہے۔ بے شک مقام بمعنی مقامات ہے، کیونکہ یہ مصدر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ۔

اور شاعر نے کہا:

إنَّ العيون التي في طرفها مرض

یعنی فی اطرافها۔

اور اسے وہ حدیث جو اس طرح مروی ہے اور تقویت دیتی ہے۔ الحج [كله] مقام ابراهيم (کہ حج سارے کا سارا مقام ابراہیم ہے۔)

مسئلہ نمبر 5۔ قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ بھی حرم پاک کی نشانیوں میں سے ہے۔ نحاس نے کہا ہے: یہ قول اچھا ہے، کیونکہ اس کے گردونواح سے لوگوں کو لوٹ لیا جاتا تھا، لیکن اس میں کوئی جابر اور ظالم نہیں داخل ہوتا تھا، حالانکہ وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اسے پامال کیا اور حرم پاک تک کسی کو نہ پہنچنے دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ

نے ارشاد فرمایا: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ (الفیل) (کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔)

اور بعض اہل معانی نے کہا ہے: آیت صورۃً تو خبر ہے حالانکہ اس میں معنی امر کا ہے، تقدیر کلام یہ ہے ومن دخلہ فأمنوہ (اور جو اس میں داخل ہو جائے تو تم اسے امن اور پناہ دے دو۔) جیسا کہ یہ قول ہے: فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (یعنی نہ تم برائی کی باتیں کرو اور نہ فسق کا ارتکاب کرو اور نہ ہی آپس میں جھگڑا فساد کرو۔) اسی معنی کی وجہ سے امام سابق حضرت نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جس نے گناہ کا ارتکاب کیا اور اس کے سبب وہ حد کا مستحق بن گیا پھر اس نے حرم پاک میں پناہ لے لی تو اس نے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا پس اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے امن اور پناہ کو واجب قرار دیا جو اس میں داخل ہو گیا اور یہی سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے اس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر افراد ہیں۔

ابن عربی نے کہا ہے (1): ''ہر وہ جس نے یہ کہا ہے وہ دو اعتبار سے وہم میں مبتلا ہوا ہے۔'' ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آیت کو سمجھا ہی نہیں کہ یہ ماضی میں ہونے والے واقعہ کی خبر ہے اور اس سے مستقبل کے حکم کا اثبات مقصود نہیں اور دوسرا یہ ہے کہ اسے یہ معلوم نہیں کہ وہ امن اور پناہ گزر چکی ہے اور یہ کہ قتل و قتال اس کے بعد اس میں واقع ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی خبر واقع نہ ہو گی بخلاف اس کے جس کی خبر دی گئی ہے، پس یہ بھی اس پر دلیل ہے کہ یہ ماضی میں ہو چکا ہے اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے مناقضہ کیا اور فرمایا: جب وہ حرم میں پناہ لے لے تو اسے نہ کھلایا جائے گا اور نہ پلایا جائے گا، نہ اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا جائے گا اور نہ ہی کلام اس سے کی جائے گی یہاں تک کہ وہ باہر نکل آئے، پس اسے نکلنے پر مجبور کرنا اس کے ساتھ اس کا امن میں ہونا اور محفوظ ہونا صحیح نہ ہو گا۔ اور آپ ہی سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: حرم پاک میں اعضاء میں قصاص واقع ہو سکتا ہے حالانکہ اس کے ساتھ بھی امن صحیح نہیں ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ حرم پاک میں حدود قائم کی جا سکتی ہیں، تحقیق حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن خطل کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ وہ غلاف کعبہ کے ساتھ چمٹا پڑا تھا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ثوری نے منصور سے، انہوں نے مجاہد سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے: جس کسی نے حرم میں حد کا ارتکاب کیا تو اس پر حرم میں حد قائم کی جائے گی اور اگر حل میں اس کا ارتکاب کیا اور پھر حرم میں پناہ لے لی تو اس سے نہ کلام کی جائے اور نہ خرید و فروخت کی جائے یہاں تک کہ وہ حرم پاک سے نکل آئے تو پھر اس پر حد قائم کی جائے گی اور یہی امام شعبی کا قول ہے اور یہی کوفیوں کی حجت اور دلیل ہے۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما آیت کے معنی سے یہی سمجھے ہیں اور وہ حبر الامۃ اور عالم الامۃ ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ اس سے ہر اس پر نعمتوں کے شمار کرنے کا ارادہ اور قصد کیا گیا ہے جو ان سے جاہل اور ناواقف ہے اور عرب میں اس کے منکر بھی تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت: 67) (کیا

1۔ احکام القرآن لابن العربی، جلد 1، صفحہ 284

انہوں نے (غور سے) نہیں دیکھا کہ ہم نے بنادیا ہے حرم کو امن والا حالانکہ اچک لیا جاتا ہے لوگوں کو ان کے آس پاس سے۔)

پس وہ دور جاہلیت میں تھے جو کوئی اس میں داخل ہوتا اور اس میں پناہ لے لیتا تو وہ قتل و غارت سے امن میں ہو جاتا، جیسا کہ اس کا بیان سورۂ مائدہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت قتادہ نے کہا ہے: جو کوئی دور جاہلیت میں اس میں داخل ہوا وہ امن پانے والا اور محفوظ ہو گیا اور یہ حسن اور اچھا ہے(1)۔

اور روایت ہے کہ کسی ملحد نے بعض علماء کو کہا: کیا قرآن کریم میں نہیں ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا پس ہم اس میں داخل ہوئے اور ہم نے اس اس طرح کیا اور جو کوئی اس میں تھا وہ محفوظ نہیں ہوا۔ تو انہوں نے انہیں کہا: کیا تو عربوں میں سے نہیں ہے! جو کوئی یہ کہتا ہے من دخل داری کان امنا (جو کوئی میرے گھر میں داخل ہو گیا وہ محفوظ ہو گیا) وہ اس سے کیا مراد لیتا ہے؟ کیا یہ اسی طرح نہیں کہ کوئی اپنی اطاعت اور پیروی کرنے والے کو کہے: کف عنه فقد أمنته و كففت عنه؟ (تو اس سے رک جا تحقیق میں نے اسے پناہ دے رکھی ہے اور تو اس سے رک جائے؟ اس نے کہا: ہاں کیوں نہیں۔ تو انہوں نے فرمایا: پس اسی طرح یہ قول ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔

اور یحییٰ بن جعدہ نے کہا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کا معنی ہے یعنی وہ آگ (کے عذاب) سے محفوظ ہو گیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ اپنے عموم پر نہیں ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث شفاعت منقول ہے: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے تم میں سے کوئی بھی قیامت کے دن حق کی بحث میں مومنین سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو قسم دلانے والا نہ ہوگا جو کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے ان بھائیوں کے لئے اصرار کر رہے ہوں جو کہ جہنم میں ہوں گے اے ہمارے رب! وہ ہمارے ساتھ روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج ادا کرتے تھے، تو انہیں کہا جائے گا: اسے نکال لو جسے تم پہچانتے ہو'' الحدیث (2)۔ بلاشبہ وہ آگ سے محفوظ ہو جائے گا جو مناسک ادا کرنے کے لئے اس میں داخل ہوا اس کی تعظیم کرتے ہوئے، اس کے حق کو پہچانتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے۔

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے: جو کوئی پورے اخلاص اور صفائے باطن کے ساتھ اس میں داخل ہوا جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اس میں داخل ہوئے تو یقیناً وہ اس کے عذاب سے محفوظ ہو گیا۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا یہی معنی ہے: ''جس نے حج کیا اور برائی کے بارے کوئی گفتگو نہ کی اور نہ ہی فسق کا مرتکب ہوا تو وہ اپنے گناہوں سے اسی طرح پاک ہو گیا جیسے اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اسے جنم دیا اور حج مبرور کی جزا سوائے جنت کے اور کوئی نہیں''۔

حسن نے بیان کیا ہے: حج مبرور یہ ہے کہ وہ دنیا سے دوری اختیار کرتے ہوئے اور آخرت میں رغبت رکھتے ہوئے واپس لوٹے۔

1۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 601

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور یہ اشعار بھی کہے:

یا کعبة اللہ دعوة اللاجی　　دعوة مستشعر و محتاج

اے کعبہ معظمہ! جو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے پناہ لینے والے کے لئے دعا ہے اور شعار پہننے والے اور محتاج کے لئے جائے دعا ہے۔

ودّع احبابه و مسکنه　　فجاء ما بین خائف راجی

اپنے احباب اور اپنے مکینوں کو الوداع کہہ پس (ہر کوئی) بیم و رجا کی کیفیت لئے ہوئے آیا۔

ان یقبل اللہ سعیه کرما　　نجاء والا فلیس بالنّاجی

اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ اس کی سعی قبول فرمالی تو وہ نجات پا گیا ورنہ کوئی نجات پانے والا نہیں۔

وانت ممن ترجی شفاعتہ　　فاعطف علی وافد بن حجاج

اور تو ان میں سے ہے جن کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے پس تو وافد بن حجاج پر مہربانی فرما۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے کہ جو کوئی عمرہ قضا کے سال حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں اس میں داخل ہوا وہ امان میں آ گیا اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں مَنْ غیر ذوی العقول کے لئے ہے اور یہ آیت شکار کے امان میں ہونے کے بارے ہے اور یہ شاذ ہے اور قرآن کریم میں ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ الآیہ۔

قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس میں نو مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَلِلّٰهِ اس میں لام ایجاب والزام کے لئے ہے پھر اسے ارشاد باری تعالیٰ: عَلَى کے ساتھ مؤکد کیا، یہ عربوں کے نزدیک الفاظ وجوب کی تاکید لگانے والے حروف میں سے ہے۔ پس جب کوئی عربی یہ کہے: لفلان علیّ کذا، تو تحقیق اس نے اسے مؤکد کر دیا اور اپنے اوپر واجب کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے بلیغ ترین الفاظ وجوب کے ساتھ حج کا ذکر کیا اپنے حق کی تاکید لگاتے ہوئے اور اس کی حرمت کی تعظیم کرتے ہوئے۔ اور اس کے فرض ہونے میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ ارکان اسلام میں سے ایک ہے اور یہ ساری عمر میں صرف ایک بار واجب ہوتا ہے۔

اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یہ ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے اور انہوں نے اس بارے میں حدیث بیان کی ہے اور اسے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کیا ہے اور وہ حدیث باطل ہے، صحیح نہیں ہے اور ان کی وجوہ (اور دلائل) میں اجماع مدافعت کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: عبدالرزاق نے ذکر کیا ہے کہ ہمیں حضرت سفیان ثوری نے علاء بن مسیب سے، انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رب کریم فرماتا ہے بلاشبہ میں نے اپنے بندے کو وسیع اور وافر رزق عطا فرمایا ہے اور اس نے ہر چار سال میں میری طرف محروم کے لئے کوئی

شے نہیں لوٹائی۔'' یہ علاء بن مسیب بن رافع کاہلی کوفی کی مشہور حدیث ہے اور آپ محدثین کی اولاد میں سے ہیں، اور ان سے کئی ایک نے روایت کیا ہے، ان میں سے بعض نے پانچ سال کا ذکر کیا ہے اور بعض نے سند اس طرح بیان کی ہے۔ عن العلاء عن یونس بن خباب عن ابی سعید، علاوہ ازیں بھی اس میں اختلاف ہے۔

اور ملاحدہ نے حج کا انکار کیا ہے اور کہا ہے: چونکہ اس میں کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور یہ حیاء کے خلاف ہے اور سعی کرنا ہے اور یہ وقار کو ختم کر دیتی ہے اور بلا مقصد کنکریاں مارنا یہ خلاف عقل ہے، پس انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حج کے یہ تمام افعال باطل ہیں، کیونکہ وہ ان کی حکمت اور علت کو نہیں پہچان سکے اور وہ اس سے جاہل ہیں کہ مولیٰ کی اپنے بندے کے ساتھ یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اسے ان تمام افعال کا مقصود اور مدعیٰ بھی سمجھائے گا جس کا وہ اسے حکم دے گا اور نہ ہی یہ شرط ہے کہ بندہ ہر اس فعل کے فائدہ سے آگاہ ہو جس کا وہ مکلف ہے، بلکہ اس پر تو اطاعت کرنا متعین ہو جاتا ہے اور فائدہ کا مطالبہ اور مقصود کے بارے سوال کئے بغیر پیروی کرنا لازم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تلبیہ میں یہ الفاظ کہتے تھے لبیك حقا حقا تعبدا ورقا لبیك اله الحق۔(1)

اور ائمہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا: ایھا الناس قد فرض اللہ علیکم الحج فحجوا (اے لوگو! تحقیق اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے پس تم حج کرو) تو ایک آدمی نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہر سال؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہ سوال کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لو قلت نعم لوجبت ولما استطعتم (اگر میں کہہ دیتا ہاں تو یقیناً وہ (ہر سال) واجب ہو جاتا اور پھر تم اس کی استطاعت نہ رکھتے) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم مجھے اس (شے) کے بارے چھوڑ دو جو میں تمہارے لئے چھوڑ دوں کیونکہ تم سے پہلے لوگ کثرت سے سوال کرنے اور اپنے انبیاء علیہم السلام سے اختلاف رکھنے کے سبب ہی ہلاک اور برباد ہوئے ہیں۔ پس جب میں تمہیں کسی شے کے بارے میں حکم دوں تو تم اسے بجالاؤ جتنی تم استطاعت رکھتے ہو اور جب میں تمہیں کسی شے سے منع کر دوں تو تم اسے چھوڑ دو۔'' یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ اس حدیث نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ جب خطاب مکلفین پر کسی شے کی فرضیت کے بارے ان کی طرف متوجہ ہو تو اسے ایک بار کرنا ہی کافی ہوتا ہے اور وہ تکرار کا تقاضا نہیں کرتا۔ الاستاذ ابو اسحاق الاسفرائینی وغیرہ نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے اصحاب نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہمارا حج ہمارے اسی سال کے لئے ہے یا ہمیشہ کے لئے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لئے ہے۔'' اور یہ ان کے رد کے بارے میں نص ہے جنہوں نے یہ کہا ہے۔ (حج) ہر پانچ سال میں ایک بار واجب ہوتا ہے، حالانکہ حج عربوں کے نزدیک معلوم اور ان میں مشہور تھا اور یہ ان اعمال میں سے تھا جن میں وہ اپنی منڈیوں، اپنی طاعت و فرمانبرداری اور اپنے دین ابراہیمی پر قائم رہنے میں رغبت اور دلچسپی رکھتے تھے۔ پس جب دین اسلام آیا تو انہیں اس کے بارے خطاب کیا گیا جسے وہ جانتے تھے اور وہ شے ان پر لازم کی گئی

1۔ ابن ماجہ، کتاب التلبیہ، حدیث نمبر 2910، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جسے وہ پہچانتے تھے۔ اور حضور نبی مکرم ﷺ نے فرض حج سے پہلے حج ادا فرمایا (1) اور آپ ﷺ نے عرفات میں وقوف کیا اور آپ ﷺ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور دین میں کوئی تبدیلی نہ کی جسے انہوں نے تبدیل کر لیا تھا، جس وقت قریش مزدلفہ میں وقوف کرتے تھے اور کہتے تھے: ہم اہل حرم ہیں ہم اس سے نہیں نکلیں گے اور ہم مذہب میں بڑے سخت ہیں، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

میں کہتا ہوں: جو میں جانتا ہوں اس میں عجیب ترین یہ ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ہجرت سے پہلے دو بار حج ادا فرمایا اور آپ سے اس کے سبب فرض ساقط ہو گیا، کیونکہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ندا پر لبیک کہی جب انہیں یہ کہا گیا: وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ (آپ لوگوں میں حج کے بارے اعلان کر دیں۔)

الکیا الطبری نے کہا ہے: یہ بعید ہے، کیونکہ جب آپ ﷺ کی شریعت میں یہ موجود ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ پس آپ کی شریعت میں حکم خطاب کے ساتھ آپ پر اس کا واجب ہونا ضروری ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خطاب انہیں کیا ہے جنہوں نے حج ادا نہیں کیا، یہ ایسا فیصلہ اور تخصیص ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ اور اس پر یہ لازم آتا ہے کہ اس خطاب کے ساتھ اس پر حج واجب نہ ہو جس نے دین ابراہیمی کے مطابق حج کر لیا اور یہ حقیقت سے انتہائی بعید ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ کتاب و سنت اس پر دلالت کرتی ہے کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہوتی ہے نہ کہ علی الفور، یہی حضرت امام مالک کا مذہب ہے جو ابن خویز منداد نے ذکر کیا ہے اور یہی امام شافعی اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہما کا قول ہے اور امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت اسی طرح ہے اور متاخرین مالکیہ میں سے بعض اہل بغداد نے یہ کہا ہے کہ اس کی ادائیگی علی الفور واجب ہوتی ہے اور اس پر قدرت رکھتے ہوئے اس میں تاخیر کرنا جائز نہیں ہے اور یہی داؤد کا قول ہے۔ اور صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ سورہ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا (الحج: 27) (اور اعلان عام کر دو لوگوں میں حج کا وہ آئیں گے آپ کے پاس پا پیادہ) اور سورہ حج مکیہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ۔ اور یہ سورۃ غزوہ احد کے سال ۳ھ میں مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی اور رسول اللہ ﷺ نے ۱۰ھ تک حج ادا نہیں فرمایا۔

رہی سنت! تو ضمام بن ثعلبہ سعدی کی حدیث ہے جو کہ بنی سعد بن بکر سے تھے وہ حضور نبی مکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آپ سے اسلام کے بارے سوال کیا تو آپ ﷺ نے کلمہ شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کا ذکر فرمایا۔ اسے حضرت ابن عباس (2)، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور ان تمام میں حج کا ذکر ہے اور یہ کہ وہ فرض قرار دیا گیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث اپنے سیاق کے اعتبار سے احسن اور اتم ہے۔ اور اس کے فرض ہونے کے وقت میں اختلاف ہے، سو بعض نے کہا ہے ۵ھ، بعض نے کہا ہے ۷ھ اور بعض نے کہا ہے اس کا وقت ۹ھ ہے اور ابن ہشام

1۔ ابن ماجہ، باب حجۃ رسول اللہ ﷺ، حدیث نمبر 3066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، باب ما جاء فی العلم وقولہ تعالیٰ قل رب زدنی علما، حدیث نمبر 61، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے ابو عبیدہ الواقدی سے جنگ احزاب سے واپسی کے بعد غزوۂ خندق کا سال ذکر کیا ہے۔

ابن عبد البر نے بیان کیا ہے: اس بات پر دلیل کہ حج کی ادائیگی علی التراخی واجب ہے اس پر اجماع علماء ہے کہ حج پر قدرت رکھنے والا فاسق نہیں جبکہ وہ اسے ایک یا دو سال یا اسی طرح کی کچھ مدت مؤخر کر دے اور یہ کہ جب استطاعت رکھنے کے کئی سال بعد جب اس نے حج ادا کر دیا تو تحقیق اس نے وہ حج اپنے وقت میں ہی ادا کیا، اور تمام کے نزدیک وہ اس آدمی کی طرح نہیں جس کی نماز فوت ہو جائے یہاں تک کہ اس کا وقت نکل گیا اور پھر وقت نکلنے کے بعد وہ اسے قضا کرے اور نہ اس کی طرح ہے جس کے بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے فوت ہو جائیں اور پھر وہ اس کی قضا کرے اور نہ اس کی طرح جس نے اپنا حج فاسد کر دیا ہو اور پھر وہ اس کی قضا کرے، پس جب علماء نے اس پر اجماع کر لیا کہ جس نے اپنی استطاعت کے وقت سے کئی سال بعد حج کیا اسے یہ نہیں کہا جائے گا: تو اسے قضا کرنے والا ہے جو تجھ پر واجب تھا، تو ہم نے یقینا جان لیا کہ حج کے وقت میں وسعت رکھی گئی ہے اور یہ کہ یہ علی التراخی واجب ہوتا ہے نہ کہ علی الفور ابو عمر نے کہا ہے: جس نے بھی بالتراخی کا قول کیا ہے وہ اس بارے میں کوئی حد بیان نہیں کرتا، مگر صرف یہ کہ سحنون سے روایت ہے کہ ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو اتنی استطاعت پاتا ہے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہے اور پھر وہ اس پر قدرت رکھنے کے باوجود بہت سے سالوں تک اسے مؤخر کر دیتا ہے کیا حج میں اس تاخیر کے سبب اسے فاسق کہا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی؟ تو انہوں نے فرمایا: نہیں اگرچہ اس کی عمر کے ساٹھ سال گزر جائیں، البتہ جب اس کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر جائے گی تو اسے فاسق قرار دیا جائے گا اور اس کی شہادت رد کر دی جائے گی۔ یہ توقیف اور حد ہے اور شرع میں حدود صرف اسی سے اخذ کی جاتی ہیں جسے ان کی وضاحت کا اختیار ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اور اسے ابن خویز منداد نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے، ابن قاسم وغیرہ نے کہا ہے: اگر اس نے حج کو ساٹھ برس کی عمر تک مؤخر کیا تو وہ گنہگار نہ ہوگا اور اگر اسے ساٹھ سال کی عمر کے بعد بھی مؤخر کیا تو اسے گنہگار قرار دیا جائے گا، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (1): ''میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر برس کے درمیان ہیں اور وہ کم ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے۔'' تو گویا اس عشرے میں اس پر خطاب تنگ ہو جاتا ہے۔

ابو عمر نے کہا ہے: بعض لوگوں (جیسا کہ سحنون وغیرہ) نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے استدلال کیا ہے: معترك امتي بين الستين الى السبعين و قل من يجاوز ذالك (میری امت کی عمریں ساٹھ برس سے ستر برس تک کے درمیان ہیں اور وہ قلیل ہیں جو اس سے تجاوز کریں گے) اور اس میں کوئی حجت اور دلیل نہیں ہے، کیونکہ یہ ایسا کلام ہے جو آپ نے اپنی امت کی اغلب عمروں کے بارے میں بیان فرمایا ہے، اگر حدیث صحیح ہے اور اس میں ستر برس تک توسیع پر دلیل موجود ہے، کیونکہ اغلباً ایسا ہی ہے اور یہ مناسب نہیں ہے اس جیسی کمزور تاویل کے ساتھ اس کو بالیقین فاسق قرار دیا جائے جس کی عدالت و امانت بالکل صحیح ہو۔ و باللہ التوفیق۔

1۔ ابن ماجہ، باب العمل والاجل، حدیث نمبر 4225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، روایۃ بالمعنی

مسئلہ نمبر 3۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ کے ساتھ خطاب عام ہے اور اس کا اطلاق تمام پر ہے۔ ابن عربی نے کہا ہے: ''اگرچہ لوگوں نے مطلق عمومات میں اختلاف کیا ہے مگر انہوں نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ یہ آیت تمام لوگوں مردوں اور عورتوں پر محمول ہے، سوائے صغیر (نابالغ) بچوں کے کیونکہ وہ بالا جماع اصول تکلیف سے خارج ہیں اور اسی طرح غلام بھی اس میں داخل نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد نے انہیں مطلق عموم سے خارج کردیا ہے مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور غلام قدرت نہیں رکھتا، کیونکہ آقا اسے اس عبادت سے اپنے حقوق کی وجہ سے روکتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حق پر آقا کے حق کو بندوں کے ساتھ نرمی اور ان کی مصلحت کے لئے مقدم کیا ہے اور اس میں امت اور ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، پس ہم اس کے ساتھ تعریف نہیں کریں گے جسے ہم جانتے نہیں اور اس پر اجماع کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔''

ابن منذر نے کہا ہے: عام اہل علم نے اس پر اجماع کیا ہے سوائے ان کے جو ان سے جدا اور الگ رہے اور وہ ان میں سے ہیں جن کے اختلاف کی کوئی قدر و منزلت نہیں، کہ بچہ جب اپنی حالت صغر میں حج کرے اور غلام جب اپنی غلامی کی حالت میں حج کرے، پھر وہ بچہ بالغ ہو جائے اور غلام آزاد ہو جائے تو بلاشبہ ان دونوں پر حج اسلام فرض ہوگا جب وہ اس کی قدرت اور استطاعت پالیں گے۔

اور ابو عمر نے کہا ہے: داؤد نے فقہاء امصار، ائمہ اثر کی غلام کے بارے میں مخالفت کی ہے اور وہ یہ کہ ان کے نزدیک وہ حج کا مخاطب ہے اور وہ جمہور علماء کے نزدیک عام خطاب سے خارج ہے جو اس ارشاد میں ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اور اس میں دلیل اس میں تصرف کی قدرت نہ ہونا ہے (1)۔ اور یہ بھی کہ غلام کے لئے اپنے آقا کی اجازت کے بغیر حج کرنا جائز نہیں ہوتا، جیسا کہ وہ جمعہ کے خطاب سے خارج ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ الآیہ (جمعہ: 9)۔ سوائے چند کے، عام علماء کے نزدیک یہی حکم ہے اور اسی طرح وہ ایجاب شہادت کے خطاب سے خارج ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا (البقرہ: 282) (اور نہ انکار کریں گواہ جب وہ بلائیں جائیں۔) پس اس میں بھی غلام داخل نہیں اور جس طرح بچے کا نکلنا اس قول سے جائز ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ حالانکہ وہ بھی النَّاسِ میں سے ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ بچے سے قلم اٹھالیا گیا ہے۔ اور عورت اس ارشاد سے خارج ہے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ حالانکہ یہ ان میں سے ہے جنہیں اسم ایمان شامل ہے اور اسی طرح مذکورہ خطاب سے غلام بھی خارج ہے اور یہ حجاز، عراق، شام اور افریقہ کے فقہاء کا قول ہے اور ان کی مثل سے ان پر تاویل کتاب کی تحریف جائز نہیں۔

اور اگر کہا جائے: جب غلام مسجد حرام میں حاضر ہو اور اس کا آقا اسے اجازت بھی دے دے تو پھر حج کیونکر لازم نہ ہوگا؟ تو جواباً یہ کہا جائے گا کہ یہ سوال اجماع پر ہے اور بسا اوقات وہ اس کی علت بیان نہیں کرتا لیکن جب یہ حکم علی الاجماع ثابت

1۔ ابن ماجہ، کتاب الطلاق، حدیث نمبر 2030، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہے تو ہم نے اس کے ساتھ اس پر استدلال کیا کہ غلامی کی حالت میں اس کے حج کو حج اسلام شمار نہ کیا جائے گا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی بچے نے حج کیا پھر اس نے حج کی استطاعت پالی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی اعرابی نے حج کیا پھر اس نے ہجرت کی تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے اور جس کسی غلام نے حج کیا پھر اسے آزاد کر دیا گیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ دوسرا حج ادا کرے۔'' ابن عربی نے کہا ہے: ''ہمارے بعض علماء نے نرمی سے کام لیا ہے اور کہا ہے: بلاشبہ غلام پر حج ثابت (لازم) نہیں اگرچہ آقا اسے اجازت دے دے کیونکہ وہ فی الاصل کافر تھا اور کافر کا حج کسی شمار میں نہیں اور پھر جب اس پر غلامی کی ضرب ہمیشہ کے لئے لگا دی گئی تو وہ حکم حج کا مخاطب ہی نہ رہا۔

یہ تین وجوہ سے فاسد ہے پس تم انہیں جان لو:

(۱) بلاشبہ ہمارے نزدیک کفار فروعات شرعیہ کے مخاطب ہیں اور اس بارے میں امام مالک کے قول میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۲) تمام عبادات نماز، روزہ وغیرہ اس پر لازم ہوتی ہیں اس کے باوجود کہ وہ غلام ہے اور اگر وہ یہی فعل اپنی حالت کفر میں کرے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حج بھی انہیں کی مثل ہے۔

(۳) یہ کہ کفر اسلام کے سبب ختم ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کا ختم ہونا بھی ثابت ہے۔ پس یہ واضح ہو گیا کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس میں معتمد علیہ آقا کے حقوق کا مقدم ہونا ہے۔ واللہ الموفق۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا اس میں مَنْ بدل بعض من الکل ہونے کی بنا پر محل جر میں ہے، یہ اکثر نحویوں کا قول ہے۔

اور کسائی نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ من حج البیت کے سبب محل رفع میں ہو اور تقدیر کلام یہ ہو ان یحج البیت من۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ شرط ہے اور استطاع محل جزم میں ہے اور جواب شرط محذوف ہے یعنی من استطاع الیہ سبیلا فعلیہ الحج۔

دار قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا عرض کی گئی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا حج ہر سال فرض ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں بلکہ صرف ایک بار حج کرنا فرض ہے۔'' پھر عرض کی گئی! یہ سبیل کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زاد راہ اور سواری'' اور انہوں نے اسے حضرت انس، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہم سے اپنے باپ کے واسطہ سے اپنے دادا سے اور انہوں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا بیان فرمایا کہ اس کے بارے پوچھا گیا تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اونٹ کی پشت پالے''

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو ابن ماجہ نے بھی اپنی سنن میں نقل کیا ہے اور امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ اپنی جامع میں ذکر کی ہے اور کہا ہے: حدیث حسن۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اور اہل علم کے نزدیک اسی پر عمل ہے کہ آدمی جب زاد

راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس پر حج واجب ہے۔ اور ابراہیم بن یزید خوزی مکی کی قوت حفظ کے بارے میں بعض اہل حدیث نے کلام کیا ہے (1) اور ان دونوں نے اسے وکیع سے اور دار قطنی نے سفیان بن سعید سے اسے نقل کیا ہے...... اور انہوں نے کہا کہ ابراہیم بن یزید نے محمد بن عباد سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ایک آدمی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون سی شے حج کو واجب کر دیتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''زاد راہ اور سواری پر قدرت'' عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاجی کون ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: غبار آلود بالوں والا جس نے خوشبو کا استعمال ترک کر دیا ہو'' اور پھر ایک دوسرا کھڑا ہوا اور عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: العَجّ والثَّجّ۔ وکیع نے کہا ہے: عج سے مراد بلند آواز سے تلبیہ کہنا ہے اور ثج سے مراد قربانی کا جانور ذبح کرنا ہے، یہ الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ زاد راہ اور سواری پر قادر ہونا حج واجب ہونے کے لئے شرط ہے ان میں حضرت عمر بن خطاب اور ان کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطا، اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم ہیں۔ اور یہی موقف حضرت امام شافعی، حضرت ثوری، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب، حضرت امام احمد، حضرت اسحاق، حضرت عبد العزیز بن ابی سلمہ اور حضرت ابن حبیب رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اپنایا ہے اور اسی کی مثل عبدوس نے سحنون سے ذکر کیا ہے۔

امام شافعی نے کہا ہے: استطاعت کی دو صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے بدن کے ساتھ قدرت رکھتا ہو اور وہ اتنا مال پاتا ہو جو اسے حج کے لئے پہنچا سکے گا۔ اور دوسری یہ ہے کہ وہ اپنے بدن میں کمزور ہو وہ اپنی سواری پر ثابت نہ رہ سکتا ہو اور وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی اطاعت و پیروی کرتا ہو (اس میں کہ) جب وہ اسے حکم دے کہ وہ اس کی جانب سے اجرت کے ساتھ اور بغیر اجرت کے حج کرے۔ (یعنی اپنی جانب سے کسی دوسرے کو حج پر بھیج سکتا ہو)

جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔ رہا وہ جو اپنے بدن کے ساتھ استطاعت اور قدرت رکھتا ہے تو اس پر کتاب اللہ کے اس ارشاد کے ساتھ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا حج فرض لازم ہوتا ہے اور جو استطاعت بالمال رکھتا ہے تو اس پر سنت کے مطابق حج فرض لازم ہوتا ہے جیسا کہ حدیث خثعمیہ آگے آرہی ہے۔

اور مستطیع بنفسہ سے مراد وہ قوی اور طاقتور آدمی ہے جسے سواری پر سوار ہونے کی مشقت کے بغیر کوئی مشقت لاحق نہ ہو، کیونکہ یہ آدمی جب زاد راہ اور سواری کا مالک ہو تو اس کی ذات پر فرض حج لازم ہو جاتا ہے اور بلا شبہ زاد راہ اور سواری دونوں کے نہ ہونے یا ان میں سے ایک کے نہ ہونے کی صورت میں اس سے حج کا فرض ساقط ہو جاتا ہے، پس اگر وہ پیدل چلنے پر قادر ہو تو وہ زاد راہ پالے یا راستے میں زاد راہ کمانے پر قادر ہو اپنے کاروبار اور پیشہ سے مثلاً نگینے اور منکے بیچنا اور حجامۃ (پچھ لگانا) یا اسی طرح کا کوئی کام، تو اس کے لئے مستحب ہے کہ وہ پیدل حج کرے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ امام شافعی نے کہا ہے: مرد عورت کے مقابلہ میں کم معذور ہوتا ہے کیونکہ وہ زیادہ قوی اور طاقتور ہوتا ہے اور یہ حکم ان کے نزدیک بطریق

1۔ ابن ماجہ، باب مایوجب الحج، حدیث نمبر 2886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

استحباب ہے نہ کہ بطریق وجوب پس اگر وہ راستے میں لوگوں سے مانگنے کے سبب زادراہ پر قادر ہو تو اس کے لئے حج کرنا مکروہ ہے کیونکہ وہ لوگوں پر بوجھ اور بھاری ہو جائے گا۔

اور امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جب وہ چلنے پر قادر ہو اور زادراہ پالے تو اس پر حج کرنا فرض ہے اور اگر وہ سواری کا مالک نہ ہو، البتہ وہ راستے میں چلنے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ زادراہ کا مالک ہو تو اس پر فرض حج کی ادائیگی واجب ہے اور اگر وہ زادراہ کا مالک نہ ہو لیکن وہ راستے میں اپنی حاجت کے مطابق کمانے کی قدرت رکھتا ہو تو اس کے بارے بھی غور و فکر کی جائے گی اور اگر وہ ایسے اہل مروّت میں سے ہو جو بذات خود کمائی نہیں کر سکتے تو اس پر واجب نہ ہوگا اور اگر وہ ان میں سے ہو جو تجارت یا کسی کاروبار کے ذریعہ اپنی کفایت اور ضرورت پوری کر سکتا ہے تو اس پر فرض حج لازم ہے اور اسی طرح اگر اس کی عادت لوگوں سے سوال کرنا اور مانگنا ہو تو اس پر بھی فرض حج لازم ہے۔

اور اسی طرح امام مالک نے چلنے کی طاقت رکھنے والے پر حج کو واجب کیا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ زادراہ اور سواری نہ بھی ہو۔ اور یہی حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، شعبی اور عکرمہ کا قول ہے۔ اور ضحاک نے کہا ہے: اگر وہ جوان، طاقتور اور صحت مند ہو اور اس کا مال نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنے کھانے کے عوض اپنے آپ کو اجرت پر دے دے یا اپنے کسی بیٹے کو یہاں تک کہ وہ اپنا حج پورا کر لے۔

تو حضرت مقاتل نے انہیں کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس کا مکلف بنایا ہے کہ وہ بیت اللہ شریف کی طرف پیدل چل کر آئیں؟ تو انہوں نے فرمایا: اگر ان میں سے کسی کی مکہ مکرمہ میں میراث ہو کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ بلکہ وہ تو اس کی طرف چلے گا اگرچہ سرین کے بل گھسٹ کر ہی آنا پڑے، اسی طرح اس پر حج بھی واجب ہوگا۔ اور انہوں نے اس قول باری تعالیٰ سے استدلال کیا ہے وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالًا اس میں رِجَالًا بمعنی مشاۃ ہے یعنی پیدل چلتے ہوئے۔

انہوں نے کہا ہے: کیونکہ فرائض اعیان میں سے حج عبادات بدنیہ میں سے ہے، لہٰذا یہ واجب ہے کہ اس کے واجب ہونے کی شرائط میں سے نہ زادراہ ہو اور نہ ہی سواری ہو جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔

انہوں نے کہا: اگر زادراہ اور سواری کے بارے خوزی کی حدیث صحیح ہے تو ہم نے اسے عوام الناس پر محمول کیا ہے اور ان میں سے اکثر دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے ہیں..... اور مطلق کلام کو غالب احوال پر محمول کرنا شریعت میں بہت زیادہ ہے اور کلام عرب اور اس کے اشعار میں وافر ہے۔

ابن وہب، ابن القاسم اور اشہب نے امام مالک سے روایت کیا ہے کہ ان سے اس آیت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: اس میں لوگ اپنی طاقت اپنی سہولت اور اپنی مضبوطی کی مقدار پر ہیں۔ اشہب نے مالک کو کہا: کیا وہ زادراہ اور سواری ہے؟ انہوں نے فرمایا: نہیں قسم بخدا، وہ نہیں ہے مگر لوگوں کی طاقت کی مقدار پر، کبھی آدمی زادراہ اور سواری پاتا ہے لیکن وہ چلنے پر قدرت نہیں رکھتا اور دوسرا پیدل چلنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب استطاعت پائی جائے اور حج کا فرض متوجہ ہو تو کبھی ایسا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے جو حج سے روک

دیتا ہے، مثلاً قرض خواہ اسے نکلنے سے روک دے یہاں تک کہ وہ قرض ادا کردے۔ اور اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کے بچے ہوں اس پر ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے تو اس پر حج لازم نہیں ہوگا یہاں تک کہ ان کے لئے اتنا نفقہ ہو جو اس کے جانے سے لے کر واپس لوٹنے تک غائب رہنے کی مدت کے لئے کافی ہو، کیونکہ اہل وعیال کا یہ خرچہ تو علی الفور فرض ہے اور حج علی التراخی فرض ہے، پس عیال کو مقدم کرنا اولیٰ ہے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی کے لئے اتنا گناہ ہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کردے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔'' اور اسی طرح والدین ہیں آدمی ان پر ہلاکت اور مصیبت لانے اور ان کی مہربانیوں اور شفقتوں کا عوض اور بدلہ نہ دینے سے خوفزدہ رہتا ہے، پس اس کے لئے حج کی طرف کوئی راستہ نہیں ہے اور اگر وہ اسے شوق ومحبت اور وحشت کی وجہ سے روک لیں تو اس کی طرف توجہ نہ کی جائے گی۔

اور عورت کو اس کا خاوند روک سکتا ہے اور بعض نے کہا ہے: وہ اسے نہیں روک سکتا۔ اور صحیح قول یہی ہے کہ روکنا جائز ہے، بالخصوص جب ہم نے یہ کہا ہے کہ حج بالفور لازم نہیں ہوتا۔ اور سمندر اس کے وجوب کے مانع نہیں ہوتا جبکہ غالب گمان سلامتی کا ہو، جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں پہلے گزر چکا ہے۔ اور وہ اپنے بارے میں یہ جانتا ہو کہ اس کا سر نہیں چکرائے گا۔ اور اگر اس پر غالب گمان ہلاکت یا سر چکرانے کا ہو یہاں تک کہ وہ نماز بھی معطل کردے تو پھر نہیں۔ اور اگر وہ سواروں کی کثرت اور جگہ کی تنگی کے سبب سجدہ کرنے کی جگہ نہ پائے تو امام مالک نے کہا ہے: جب وہ رکوع وسجود کی استطاعت نہ رکھے مگر اپنے بھائی کی پشت پر تو پھر وہ اس پر سوار نہ ہوگا۔ پھر کہا: کیا وہ وہاں سوار ہو سکتا ہے جہاں وہ نماز نہ پڑھ سکے؟ اس کے لئے ہلاکت اور بربادی ہے جو نماز کو ترک کردے۔ اور حج ساقط ہو جاتا ہے جب راستے میں ایسا دشمن ہو جو جانوں کو ضائع کرنے کا سبب ہو یا اموال کو لوٹتا ہو جبکہ وہ کسی مخصوص دھمکی کے ساتھ دھمکائے یا وہ کسی برباد اور ہلاک کرنے والی مقدار کے ساتھ دھمکائے اور اگر دھمکی ہلاک وبرباد کرنے کی نہ ہو تو حج کے ساقط ہونے میں اختلاف ہے۔

اور امام شافعی نے کہا ہے: وہ ایک حبہ بھی نہیں دے گا اور حج کا فرض ساقط ہو جائے گا۔ اور مانگنے والے پر حج واجب ہوتا ہے جبکہ وہ اس کی عادت ہو اور اس کا ظن غالب یہ ہو کہ وہ اسے پالے گا جو اسے عطا کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے: اس پر واجب نہ ہوگا، اس بنا پر کہ اس میں استطاعت کی رعایت لازم ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 6۔ جب موانع زائل ہو جائیں اور اس کے پاس دراہم ودنانیر میں سے ایسی کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو اور اس کے پاس سامان ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ حج کے لئے اپنے سامان میں سے وہ بیچ دے جو اس حال میں بیچا جا سکتا ہے جب اس پر دین اور قرض ہو۔ اور ابن القاسم سے ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جس کا مشکیزہ ہو اور اس کے سوا اس کا کچھ نہ ہو، کیا وہ حج اسلام کے لئے اسے بیچ دے گا اور اپنی اولاد کو چھوڑ دے گا درآنحالیکہ ان کے لئے کوئی شے نہ ہو جس کے ساتھ وہ زندگی گزار سکتے ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں، وہ اس پر ہے اور وہ اپنی اولاد کو صدقہ میں چھوڑ دے گا۔ لیکن صحیح پہلا قول ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''آدمی کے لئے گناہ کے اعتبار سے یہی کافی ہے کہ وہ اسے ضائع کردے جس کی وہ کفالت کرتا ہے۔'' اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔ ان کے مذہب سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ حج لازم نہیں ہوتا مگر

اس کے لئے جس کے پاس اتنے اخراجات موجود ہوں جو جانے سے لے کر لوٹنے تک کافی ہوں۔ آپ نے یہ الاملاء میں کہا ہے: اگرچہ اس کے اہل وعیال نہ ہوں۔ اور بعض نے کہا ہے: رجوع کا اعتبار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس پر اپنے شہر کے قیام کو ترک کرنے میں کوئی بڑی مشقت نہیں ہے، کیونکہ اس میں نہ اس کے اہل ہیں اور نہ کوئی عیال اور ہر شہر (ملک) اس کے لئے وطن ہے۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ انسان اپنے وطن سے جدائی کے سبب اسی طرح وحشت سی محسوس کرتا ہے جس طرح وہ اپنے گھر والوں کے فراق میں مضطرب رہتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ باکرہ عورت جب زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اسے اس کے شہر سے جلاوطن کر دیا جاتا ہے چاہے وہاں اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

امام شافعی نے ''الام'' میں کہا ہے: جب آدمی کا گھر اور خادم ہو اور اس کے پاس اپنے گھر والوں کے لئے اتنا خرچہ موجود ہو جو اس کی عدم موجودگی میں ان کے لئے کافی ہو جائے تو اس پر حج لازم ہوگا۔ اور اس کا ظاہر یہ ہے کہ آپ نے یہ اعتبار کیا ہے کہ حج کا مال خادم اور گھر سے فالتو اور زائد ہو، کیونکہ آپ نے اسے گھر والوں کے نفقہ پر مقدم کیا ہے، گویا کہ آپ نے کہا ہے: ان تمام کے بعد (اس کے پاس حج کا مال ہو)۔

اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: اس پر لازم ہے کہ گھر اور خادم فروخت کر دے اور اپنے گھر والوں کے لئے گھر اور خادم کرائے پر لے اور اگر اس کے پاس ایسا سامان ہو جس کے ساتھ وہ تجارت کرتا ہو اور اس کا نفع علی الدوام اس کی ذاتی اور اہل وعیال کی کفایت کی مقدار ہو اور جب وہ اصل مال سے کچھ خرچ کر دے تو اس کا نفع مختل ہو جائے اور وہ اس کی حاجت و ضرورت کے لئے کافی نہ رہے، تو کیا اصل مال سے اس پر حج لازم ہوگا یا نہیں؟

اس میں دو قول ہیں:

پہلا قول جمہور کا ہے اور وہی صحیح اور مشہور ہے، کیونکہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر اس کی زمین ہو اس کا غلہ اسے کافی ہو رہتا ہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ حج میں اصل زمین فروخت کر دے، پس اسی طرح سامان بھی ہے اور ابن شریح نے کہا ہے: وہ اس پر لازم نہ ہوگا اور وہ سامان کو باقی رکھے گا اور اس کے اصل سے حج نہیں کرے گا، کیونکہ اس پر حج اس مال سے واجب ہوتا ہے جو اس کی کفایت اور حاجت سے فالتو ہو۔ پس یہ گفتگو استطاعت بالبدن والمال کے بارے میں ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ مریض اور معضوب (جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو) اور العضب کا معنی کاٹنا ہوتا ہے اور اسی سے تلوار کا نام عضب رکھا گیا ہے، گویا کہ جو اس حالت کو پہنچ چکا ہو کہ وہ سواری کو نہ مضبوطی سے تھامنے کی قدرت رکھتا ہو اور نہ اس پر مضبوطی سے بیٹھ سکتا ہو تو وہ اسی کی طرح ہے جس کے اعضاء کاٹ دیئے گئے ہوں، جبکہ وہ کسی شے پر قدرت نہ رکھتا ہو، علماء نے ان دونوں کے حکم میں اختلاف کیا ہے اپنے اس اجماع کے بعد کہ حج کے لئے چلنا ان دونوں پر لازم نہیں، کیونکہ حج اللہ تعالیٰ نے قدرت رکھنے والے پر فرض کیا ہے اور اس پر اجماع ہے اور مریض اور معضوب دونوں میں استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔

امام مالک نے کہا ہے: جب آدمی معضوب ہو تو اس سے حج کا فریضہ بالکل ساقط ہو جاتا ہے، چاہے وہ اس پر قادر ہو جو اس کی طرف سے مال کے عوض یا بغیر مال کے حج کر سکتا ہو اس پر حج فرض لازم نہ ہوگا۔ اور اگر اس پر حج واجب ہو گیا پھر اس کا

کوئی عضو کاٹ دیا گیا اور وہ اپاہج ہو گیا تو اس سے حج کا فریضہ ساقط ہو جائے گا اور یہ جائز نہ ہو گا کہ اس کی زندگی میں کسی بھی اعتبار سے کوئی اس کی طرف سے حج کرے، بلکہ اگر وہ وصیت کرے کہ اس کی موت کے بعد اس کی طرف سے حج کیا جائے اور اس کے ترکہ کے تیسرے حصہ سے حج کیا جائے تو یہ نفل ہو گا۔ اور انہوں نے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ پس اس میں یہ خبر ہے کہ اس کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو اس نے خود کوشش کی۔

پس جس نے کہا ہے: اس کے لئے اس کے سوا کسی اور نے سعی کی ہے تو اس نے ظاہر آیت کا خلاف کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ کے مطابق یہ استطاعت رکھنے والا نہیں ہے، کیونکہ حج سے مراد مکلف آدمی کا بذات خود بیت اللہ شریف کا قصد کرنا ہے، کیونکہ یہ ایک عبادت ہے اور اس سے عاجز ہونے کے ساتھ اس میں نیابت درست نہیں۔ جیسا کہ نماز میں (نیابت درست نہیں ہوتی) اور محمد بن منکدر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ ایک حج کے سبب تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا (ایک) مرنے والے کو (دوسرا) اس کی طرف سے حج کرنے والے کو اور (تیسرا) اسے بھیجنے والے کو" اسے الطبر انی القاسم سلیمان بن احمد نے بیان کیا ہے اور اس طرح سند بیان کی ہے حدثنا عمرو بن حصین السّدوسی قال حدثنا ابو معشر عن محمد بن المنکدر۔ اور آگے انہوں نے اسے بیان کیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابو معشر کا نام نجیح ہے اور وہ ان کے نزدیک ضعیف راوی ہے۔ اور امام شافعی نے کہا ہے: اپاہج مریض وہ جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو اور شیخ کبیر جو ایسے آدمی پر قادر ہو جو اس کی بات ماننے اور پیروی کرنے کے لئے تیار ہو جب وہ اسے اپنی طرف سے حج کرنے کا حکم دے تو وہ بھی من وجہ استطاعت رکھنے والا ہے۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ اتنے مال پر قادر ہو کہ وہ اس کے عوض ایسے آدمی کو اجرت پر لے سکے جو اس کی طرف سے حج کرے گا کیونکہ وہ اس پر حج کا فریضہ لازم کر رہا ہے اور یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ نے شیخ کبیر (انتہائی بوڑھا آدمی) کو فرمایا جو حج نہ کر سکے وہ ایک آدمی کو تیار کرے جو اس کی طرف سے حج کرے گا اور یہی موقف ثوری، امام اعظم ابوحنیفہ اور آپ کے اصحاب، ابن مبارک، احمد اور اسحاق نے اختیار کیا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے آدمی پر قادر ہو جو طاعت و نیابت اس کے لئے پیش کرے اور وہ اس کی طرف سے حج کرے، پس امام شافعی، امام احمد اور ابن راہویہ کے نزدیک اس پر بھی حج لازم ہو گا۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ نے کہا ہے: صرف طاعت و پیروی پیش کرنے کے ساتھ کسی حال میں حج لازم نہیں ہو گا۔

امام شافعی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے جسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے کہ بنی خثعم کی ایک عورت نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ حج اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں پر فرض ہے میں نے اپنے باپ کو انتہائی بوڑھا پایا ہے وہ سواری پر بیٹھنے کی طاقت نہیں رکھتا، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ

ﷺ نے فرمایا: ''ہاں'' اور یہ حجۃ الوداع کے موقع پر ہوا (1)۔ اور ایک روایت میں ہے: وہ طاقت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے اونٹ کی پیٹھ پر سکون سے بیٹھ سکے، تو حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''تو اس کی طرف سے حج کر تیرا کیا خیال ہے اگر تیرے باپ پر قرض ہوتا تو کیا تو اسے ادا کر دیتی؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: ''پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے (2)''۔ پس حضور نبی مکرم ﷺ نے اس بنا پر حج کو واجب قرار دیا کہ اس کی بیٹی نے اس کی اطاعت و پیروی کی اور اس نے اپنا آپ اس کے لئے پیش کیا کہ وہ اس کی طرف سے حج کرے گی۔ تو جب بیٹی کی پیروی کے سبب اس پر حج واجب ہے تو پھر بدرجہ اولیٰ اتنے مال پر قادر ہونے کی صورت میں حج واجب ہوگا جس کے عوض وہ کسی کو اجرت پر لے سکتا ہے۔

پھر اگر وہ طاعت کے بغیر مال اس کے لئے خرچ کرے تو صحیح یہ ہے کہ اس کا قبول کرنا اس کے لئے لازم نہیں ہے اور اس کے ساتھ حج کرنا اس کی اپنی طرف سے ہوگا اور وہ اس کے لئے مال خرچ کرنے کے سبب مستطیع شمار نہ ہوگا۔

اور ہمارے علماء نے کہا ہے: خثعمیہ کی حدیث سے مقصود (حج کو) واجب کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصود والدین کے ساتھ حسن سلوک، ان کے دینی اور دنیوی مصالح کے بارے غور و فکر اور طبعاً اور شرعاً ان کے لئے جانب منفعت پر ابھارنا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ پس جب آپ ﷺ نے ایک عورت کے اپنے والد کے بارے میں خیر اور نیکی کے جذبات، ظاہری فرمانبرداری، رغبت صادقہ اور اسے نیکی اور ثواب پہنچانے کی حرص کو دیکھا اور یہ کہ وہ اس کے حج کی برکت سے محروم رہنے پر اظہار تاسف کر رہی ہے تو آپ ﷺ نے اسے اس طرح جواب دیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایک دوسری عورت کو فرمایا جس نے یہ عرض کی: میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی لیکن وہ حج نہ کر سکی یہاں تک کہ وہ فوت ہو گئی کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو اس کی طرف سے حج کر، تیری کیا رائے ہے اگر تیری ماں پر قرض ہوتا کیا تو اسے ادا کر دیتی؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں (3)۔ تو اس میں جو کچھ ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ احسانات اور مردوں کو نیکی اور خیرات کا ثواب پہنچانے کے باب سے ہے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ آپ ﷺ نے فعل حج کو قرضے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ اگر کوئی فوت ہو جائے اور اس پر قرض ہو تو اس کے ولی پر اسے اپنے مال سے ادا کرنا واجب نہیں اور اگر اس نے بطور احسان ادا کر دیا تو اس کی طرف سے قرض ادا ہو جائے گا۔

اور اس میں اس پر بھی دلیل موجود ہے کہ اس حدیث میں حج اس کے باپ پر فرض نہیں جس کی تصریح اس عورت نے اپنے اس قول سے کی ہے لا یستطیع اور جو استطاعت نہیں رکھتا اس پر حج فرض نہیں ہوتا اور یہ تصریح وجوب کی نفی اور فرض کے منع کے بارے میں ہے اور یہ جائز نہیں ہوتا کہ جس کی حدیث کی ابتدا میں بالیقین نفی ہو وہی حدیث کے آخر میں ظناً ثابت ہو۔

اسے آپ کا یہ قول ثابت کر رہا ہے: فدین اللہ احق ان یقضی (پس اللہ تعالیٰ کا قرض زیادہ حق رکھتا ہے کہ اسے ادا کیا جائے) کیونکہ یہ بالاجماع اپنے ظاہر پر نہیں ہے، کیونکہ بلاشبہ بندے کا قرض ادائیگی اور قضا کے زیادہ قریب ہے اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الحج، حدیث نمبر 1417، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ابن ماجہ، باب الحج عن المیت، حدیث 2899، ایضاً

3۔ صحیح بخاری، باب الحج والنذور... الخ، حدیث 1720، ایضاً

بالاجماع اسی سے ابتدا ہوتی ہے کیونکہ بندہ فقیر ہے اور اللہ تعالیٰ مستغنی ہے۔

ابن عربی نے یہی کہا ہے۔ ابو عمر بن عبد البر نے ذکر کیا ہے کہ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک خثعمیہ کی حدیث اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: اس میں اضطراب ہے اور ابن وہب اور ابو مصعب نے کہا ہے: یہ صرف اولاد کے حق میں ہے۔ اور ابن حبیب نے کہا ہے: یہ ایسے بوڑھے کے بارے میں ہے جسے اٹھانے والا کوئی نہ ہو اور وہ حج نہ کر سکے، حج کی رخصت کے لئے ہے اور اس آدمی کے بارے میں رخصت ہے جو فوت ہو گیا اور وہ حج نہ کر سکا، کہ اس کی طرف سے اس کا بیٹا حج کرے اگرچہ وہ اسے اس بارے میں وصیت نہ بھی کرے اور یہ اس کی طرف سے جائز ہو گا اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ پس یہ معضوب اور اس کے ہم مثل کے بارے کلام ہے۔ اور خثعمیہ کی حدیث کو ائمہ نے نقل کیا ہے اور یہ حسن کے اس قول کی تردید کرتی ہے کہ عورت کا مرد کی جانب سے حج کرنا جائز نہیں۔

مسئلہ نمبر 8۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ جب مکلف کے پاس ایسی خوراک نہ ہو جسے وہ راستے میں استعمال کرے گا تو اس پر حج لازم نہیں۔ اور اگر اسے کوئی اجنبی ایسا مال ہبہ کرے جس کے ساتھ وہ حج کر سکتا ہو تو اسے قبول کرنا بالاجماع اس پر لازم نہیں، کیونکہ اس میں احسان کا احساس اسے لاحق ہو سکتا ہے۔ اور اگر کسی آدمی نے اپنے باپ کو مال ہبہ کیا، تو امام شافعی نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس کے ذمہ لازم ہے، کیونکہ آدمی کا بیٹا اس کی اپنی کمائی ہے، اس میں اس پر کوئی احسان نہیں ہے۔

اور امام مالک اور امام اعظم ابو حنیفہ نے کہا ہے: اسے قبول کرنا اس پر لازم نہیں ہے، کیونکہ اس میں حرمت ابوت کا ساقط ہونا ہے، جب کہ کہا یہ جاتا ہے **فقد جزاہ و قد وفا**، تحقیق اس نے اسے جزا دی اور اس نے اس کے ساتھ وفا کی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: **وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ** حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے اور جو کوئی فرض حج کا انکار کرے اور وہ اسے واجب نہ جانے۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا ہے: بے شک وہ جس نے حج کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے ترک کر دیا تو وہ کافر ہے۔

اور ترمذی نے حارث سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو آدمی مالک ہو زادِ راہ کا اور ایسی سواری کا جو اسے بیت اللہ شریف تک پہنچا سکتی ہو اور وہ حج نہ کرے تو اس پر (کوئی حرج) نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا عیسائی ہو کر مرے اور وہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرما رہا ہے **وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا** ابو عیسیٰ ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے ہم اسے اس سند کے سوا نہیں پہنچانتے اور اس کی اسناد میں کلام ہے اور ہلال بن عبد اللہ مجہول راوی ہے اور حارث کو ضعیف قرار دیا جاتا ہے (1)'' اور اسی طرح حضرت ابو امامہ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ اور عبد خیر بن یزید نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں پر

1۔ جامع ترمذی، باب ما جاء فی التغلیظ فی ترک الحج، حدیث 740، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حج فرض کیا ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اور جس نے نہ کیا تو اسے چاہیے کہ وہ جس حال پر چاہے مر جائے اگر چاہے تو وہ یہودی یا نصرانی ہو یا مجوسی مگر یہ کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو بیمار ہو یا جابر سلطان (کی طرف سے کوئی رکاوٹ ہو) خبردار! جان لو نہ اس کے لئے میری شفاعت میں کوئی حصہ ہے اور نہ وہ میرے حوض پر آئے گا۔'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جس کے پاس اتنا مال ہو جو اسے حج تک پہنچا سکتا ہو اور اس نے حج نہ کیا یا اس کے پاس اتنا مال ہو جس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اور اس نے زکوٰۃ نہ دی تو وہ موت کے وقت رجعت (واپسی کا سوال کرے گا۔'' تو کہا گیا: اے ابن عباس! رضی اللہ عنہما بے شک ہم تو اسے کافروں کے لئے دیکھتے رہے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: میں اس بارے تم پر قرآن کریم پڑھتا ہوں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَ اَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَ اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ (1) (المنافقون) (اے ایمان والو! تمہیں غافل نہ کر دیں تمہارے اموال اور نہ تمہاری اولاد اللہ کے ذکر سے۔ اور جنہوں نے ایسا کیا تو وہی لوگ گھاٹے میں ہوں گے۔ اور خرچ کر لو اس رزق سے جو ہم نے تم کو دیا اس سے پیشتر کہ آ جائے تم میں سے کسی کے پاس موت تو (اس وقت) وہ کہنے لگے کہ اے میرے رب! تو نے مجھے تھوڑی مدت کے لئے کیوں مہلت نہ دی تا کہ میں صدقہ (وخیرات) کر لیتا اور نیکوں میں شامل ہو جاتا۔)

حسن بن صالح نے اس کی تفسیر میں کہا ہے: پس میں زکوٰۃ دوں گا اور میں حج کروں گا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ کسی آدمی نے آپ سے اس آیت کے بارے پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا: من حج لا یرجو ثوابا او جلس لا یخاف عقابا فقد کفر بہ (جس نے حج کیا اور ثواب کی امید نہ رکھی یا بیٹھا رہا اور سزا کا خوف نہ رکھا تو اس نے اس کے ساتھ کفر کیا۔)

اور حضرت قتادہ نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تحقیق میں نے ارادہ کیا کہ میں لوگوں کو شہروں کی طرف بھیجوں اور وہ ایسے آدمی پر نظر رکھیں جس کے پاس مال ہے اور اس نے حج نہیں کیا پس وہ اس پر جزیہ لگا دیں، پس یہی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ۔

میں کہتا ہوں: یہ انتہائی شدت اور سختی کے محل میں وارد ہوئی ہے اور اسی لئے ہمارے علماء نے کہا ہے: آیت اس معنی کو متضمن ہے کہ جو آدمی فوت ہوا اور اس نے حج نہ کیا حالانکہ وہ اس کی قدرت رکھتا تھا تو وعید اس کی طرف متوجہ ہوگی اور کسی دوسرے کا اس کی طرف سے حج کرنا جائز نہ ہوگا، کیونکہ اگر غیر کا حج کرنا اس سے فرض کو ساقط کر دے تو اس سے وعید ساقط ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اگر میرا کوئی پڑوسی فوت ہوا اور اس کے پاس وسعت اور خوشحالی ہو اور اس نے حج نہ کیا تو میں نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۖۗ وَ اللّٰهُ شَهِیْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ

1۔ جامع ترمذی، باب ومن سورۃ المنافقین، حدیث 3238، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۹۹

''آپ فرمایئے اے اہل کتاب! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کی آیتوں کا اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ آپ فرمایئے اے اہل کتاب! تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اسے جو ایمان لا چکا تم چاہتے ہو کہ اس راہ (راست) کو ٹیڑھا بنا دو حالانکہ تم خود (اس کی راستی کے) گواہ ہو۔ اور نہیں ہے اللہ بے خبر ان (کرتوتوں) سے جو تم کرتے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ یعنی (اے اہل کتاب!) تم کیونکر اللہ تعالیٰ کے دین سے پھرتے ہو۔ مَنْ اٰمَنَ (اسے جو ایمان لا چکا) حسن نے تُصِدُّون تاء کے ضمہ اور صاد کے کسرہ کے ساتھ قرأت کی ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ (یعنی) صَدَّ اور اَصَدَّ، مثلاً صلّ اللحمُ اور أَصَلَّ جب گوشت بدبودار ہو جائے، اور خَنَمَ اور اَخْنَمَ بھی ہے جب تغیر اور تبدیلی آ جائے۔ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا یعنی تم اس کے لئے چاہتے ہو (یعنی تَبْغُوْنَهَا بمعنی تطلبون لها ہے) پھر اس سے لام کو حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ وَ اِذَا كَالُوْهُمْ میں کہا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: بغيت له كذا یعنی طلبته میں نے اسے طلب کیا، چاہا۔ اور أبغيته كذا یعنی میں نے اس کی مدد کی۔ اور العوج کا معنی جھکنا اور ٹیڑھا ہونا ہے دین میں، قول میں اور عمل میں اور ہر وہ جو سیدھے راستے سے نکل جائے۔ (یہ معنی تب ہے جب عین مکسور ہو۔) اور اگر عین مفتوح ہو تو پھر معنی ہے دیوار کا ٹیڑھا ہونا اور ہر کھڑے ہونے والے شخص کا ٹیڑھا ہونا، یہ ابو عبیدہ وغیرہ سے منقول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد یتبعون الداعی لاعوج له کا معنی ہے وہ اس کی دعوت سے ٹیڑھا ہونے کی قدرت نہیں رکھتے اور عاج بالمکان وعوّج کا معنی ہے (سیدھا) کھڑا ہوا اور ٹھہرا۔ اور العائج ٹھہرنے والے کو کہتے ہیں۔

شاعر کا قول ہے:

هل انتم عائجون بنا لَعَنّا　　نرى العَرَصَاتِ أو اثر الخِيام

اس میں عائجون ٹھہرنے والے کے معنی میں ہے۔

اور الرجل الأعوج کا معنی ہے بداخلاق آدمی اور وہ جس کا ٹیڑھا پن واضح اور ظاہر ہو اور العُوج من الخیل سے مراد وہ گھوڑ ہے جس کی ٹانگوں میں ٹیڑھا پن اور دوری ہو۔ اور اعوجية من الخيل کی نسبت ایسے گھوڑے کی طرف کی جاتی ہے جو زما جاہلیت میں (تیز رفتار اور) دوسروں پر سبقت لے جانے والا ہوتا۔

اور کہا جاتا ہے: فرسٌ مُحَنَّب یعنی جب گھوڑے کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بغیر پھیلاؤ کے دوری ہو اور یہ مدح ا تعریف ہے اور کہا جاتا ہے: الحَنَب یعنی دونوں پنڈلیوں میں ٹیڑھا پن ہونا۔ خلیل نے کہا ہے: الشُّخنيب جو شدت (ا قوت) سے متصف ہے اور یہ اعوجاج (ٹیڑھا پن) نہیں ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنْتُمْ شُهَدَآءُ حالانکہ تم عقلمند ہو (اور سمجھ بوجھ رکھتے ہو) اور یہ بھی کہا گیا ہے: حالانکہ تم تورات میں ا

لکھے ہوئے پر گواہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین جس کے بغیر کوئی دین قبول نہ کیا جائے گا وہ اسلام ہے، کیونکہ اس میں حضور نبی رحمت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت (اور اوصاف کا بیان) ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾

"اے ایمان والو! اگر تم کہا مانو گے ایک گروہ کا اہل کتاب سے (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں۔"

یہ آیت ایک یہودی کے بارے میں نازل ہوئی جس نے اوس اور خزرج کے درمیان اس فتنہ کو از سر نو اٹھانے کا ارادہ کیا جو ایک بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے ختم ہو چکا تھا پس وہ ان کے درمیان بیٹھ گیا اور انہیں شعر سنائے دونوں قبیلوں میں سے ایک نے اسے اپنی جنگ کے بارے کہا، تو دوسرے قبیلے نے کہا: تحقیق ہمارے شاعر نے فلاں فلاں دن کہا، تو گویا اس طرح ان میں اختلاف اور شدت داخل ہوگئی، تو انہوں نے کہا: آؤ ہم جنگ کو پھر سے اسی طرح شروع کر دیں جس طرح پہلے تھی۔ تو انہوں نے آواز دی: اے آل اوس۔ اور دوسروں نے پکارا: اے آل خزرج، پس وہ اکٹھے ہوگئے اور انہوں نے ہتھیار اٹھالئے اور لڑنے کے لئے صفیں باندھ لیں۔ تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دونوں صفوں کے درمیان آکر کھڑے ہوگئے اور خوب بلند آواز سے یہ آیت پڑھی۔ پس جب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سنی تو وہ آپ کے لئے خاموش ہوگئے اور توجہ سے سننے لگے اور جب آپ فارغ ہوئے تو انہوں نے ہتھیار رکھ دیئے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے اور رونے لگے، یہ حضرت عکرمہ، ابن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور جس نے ایسا کیا وہ شاس بن قیس یہودی تھا، اس نے اوس اور خزرج کے خلاف سازش کی اور انہیں وہ جنگیں یاد دلانے لگا جو ان کے درمیان واقع ہوئیں تھیں اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور آپ نے انہیں نصیحت فرمائی، تو قوم نے پہچان لیا کہ یہ شیطان کا کچوکا ہے اور ان کے دشمن کا مکر ہے۔ پس انہوں نے اپنے ہاتھوں سے ہتھیار پھینک دیئے اور رونے لگے اور آپس میں ایک دوسرے کو گلے ملنے لگے، پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ارشاد سنتے ہوئے اور اطاعت و فرمانبرداری کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا۔ مراد اوس و خزرج ہیں۔ اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یعنی شاس اور اس کے ساتھی۔ (اگر تم کہا مانو گے اہل کتاب میں سے ایک گروہ کا) یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ (تو نتیجہ یہ ہوگا کہ) وہ لوٹا کر چھوڑیں گے تمہیں تمہارے ایمان قبول کرنے کے بعد کافروں میں)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: کوئی ہماری طرف آنے والا نہ تھا جو ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ناپسندیدہ ہو، پس آپ نے ہماری طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا تو ہم رک گئے، باز آگئے اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے معاملات کی اصلاح فرمادی۔ پس ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ کوئی شخص نہ تھا، سو میں نے

کوئی دن نہیں دیکھا جو اس دن کے اول حصہ سے زیادہ قبیح اور وحشت ناک ہو اور اس کے آخری حصہ سے زیادہ حسین اور پسندیدہ ہو۔

وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۰۱

''اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم (اب پھر) کفر کرنے لگے حالانکہ تم وہ ہو کہ پڑھی جاتی ہیں تم پر اللہ کی آیتیں اور تم میں اللہ کا رسول بھی تشریف فرما ہے اور جو مضبوطی سے پکڑتا ہے اللہ (کے دامن) کو تو ضرور پہنچایا جاتا ہے اسے سیدھی راہ تک۔''

اللہ تعالیٰ نے بطور تعجب یہ ارشاد فرمایا: وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ آیات اللہ سے مراد قرآن کریم ہے وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ اور تم میں اس کا رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: زمانہ جاہلیت میں قبیلہ اوس اور خزرج کے درمیان جنگ وجدال جاری رہا تو انہوں نے اسی کا ذکر کیا جو ان کے درمیان ہوتا تھا، نتیجتاً ان میں سے بعض نے بعض پر تلواریں سونت لیں۔ پس حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا گیا اور اس کا تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کیا گیا تو آپ ان کی طرف تشریف لے گئے، چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی وَ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا

اور اس آیت میں وہ بھی داخل ہیں جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دیکھا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں سے جو بھی ان میں ہے وہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے قائم مقام ہے۔ زجاج نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ یہ خطاب صرف حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو ہو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں تشریف فرما تھے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ کرتے تھے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خطاب ساری امت کو ہو، کیونکہ آپ کے آثار وعلامات اور وہ قرآن کریم جو ہمیں عطا کیا گیا وہ ہم میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ ہی ہے اگرچہ ہم نے آپ کا مشاہدہ نہیں کیا۔ اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: اس آیت میں دو واضح علم ہیں۔ ایک کتاب اللہ کا اور ایک نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ پس نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو گزر گئے اور رہی کتاب اللہ تو اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص رحمت اور نعمت کے طور پر ان کے درمیان باقی رکھا اور اس میں اس کے حلال وحرام سے متعلقہ احکام اور طاعت و معصیت سبھی کا ذکر ہے۔ وَ كَيْفَ یہ محل نصب میں ہے اور التقائے ساکنین کی وجہ سے خلیل اور سیبویہ کے نزدیک فا کو فتحہ دیا گیا ہے اور فتحہ کی وجہ یہ ہے کیونکہ فا کا ماقبل یا ہے اور یا اور کسرہ کا جمع ہونا باعث ثقل ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کے دین اور اس کی طاعت کو مضبوطی سے تھامتا اور پکڑتا ہے۔ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ تو اسے ضرور سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جاتی ہے اور اسے اس کی توفیق دی جاتی ہے۔

ابن جریج نے کہا ہے: يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَ مَنْ يَعْتَصِمْ بِاللّٰهِ کا معنی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑتا ہے اور وہ قرآن ہے۔ کہا جاتا ہے: أعصم به و اعتصم اور تمسّك و استمسك جب وہ اس کے ساتھ چمٹ جائے اور غیر کو چھوڑ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لے۔ اور اعتصمت فلان (یعنی) میں نے اس کے لئے وہ تیار کیا جسے وہ مضبوطی سے پکڑ سکتا ہے اور ہر وہ جو کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے والا ہو وہ مُعصم اور مُعْتصم ہے۔ اور جو کسی شے کو روکنے والا ہو تو وہ عاصم کہلاتا ہے۔

جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے:

أنا ابن العاصِمينَ بني تميم اذا ما اعظَمُ الحدثانِ نابا

اس میں عاصمین (روکنے والے) کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور نابغہ نے کہا ہے:

يظلّ من خوفه الملاّح معتصِما بالخيزُرانة بعد الأين والنَّجَد

اس میں معتصِم مضبوطی کے ساتھ پکڑنے کے معنی میں ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

فَأَشرط فيها نفسه و هو مُعتصِمٌ والقى بأسباب له و توكّلا

پس اس نے اس میں اپنی جان کو پیش کر دیا حالانکہ وہ اسے روکنے اور بچانے والا تھا اور اس نے اسباب (ووسائل) پھینک دیئے اور توکل اپنا لیا۔

اور عصمه الطعام: یعنی کھانے نے اس سے بھوک کو دور کر دیا، عرب کہتے ہیں: عصم فلاناً الطعامُ ای منعه من الجوع۔ پس اسی لئے انہوں نے سویق (ستو) کی کنیت ابو عاصم رکھی ہے۔ احمد بن یحییٰ نے کہا: عرب روٹی کو عاصم اور جابر کا نام دیتے ہیں۔

جیسا کہ شعر میں ہے:

فلاتلوميني و لُومي جابرًا فجابرٌ كلّفني الهواجرا

پس تو مجھے ملامت نہ کر بلکہ تو روٹی کو ملامت کر پس روٹی نے ہی مجھے دوپہر کے وقت مشقت میں ڈال رکھا ہے۔

اور وہ اسے عامر کا نام بھی دیتے ہیں۔

کسی شاعر نے کہا:

ابو مالك يعتادني بالظهائر يجئ فيُلقي رحله عند عامر

بھوک کو دوپہر کے وقت میرے پاس آنے کی عادت ہے وہ آتی ہے اور روٹی کے پاس اپنی ٹانگیں پھیلا دیتی ہے۔

ابو مالک بھوک کی کنیت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

''اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے جیسے حق ہے اس سے ڈرنے کا اور (خبردار) نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو''

اس میں ایک مسئلہ ہے۔

امام بخاری (نحاس) نے مرہ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حق تقاته ان یطاع فلا یعصی وان یذکر فلا ینسی وان یشکر فلا یکفر(1) (حق تقاته کا مفہوم یہ ہے کہ اطاعت کی جائے اور نافرمانی نہ کی جائے اور اس کا ذکر کیا جائے اور اسے بھلایا نہ جائے اور شکر ادا کیا جائے اور ناشکری نہ کی جائے۔) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس کا مفہوم یہ ہے کہ آنکھ جھپکنے کی دیر بھی نافرمانی نہ کی جائے۔ اور مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اس پر کون قادر ہوگا؟ اور یہ ان پر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔) تو اس نے اس آیت کو منسوخ کر دیا، یہ حضرت قتادہ، ربیع، اور ابن زید سے منقول ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ارشاد گرامی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ اس آیت کا بیان ہے۔ اور معنی یہ ہے: پس تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے جتنی تم طاقت رکھتے ہو۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ نسخ تب ہوتا ہے جب دونوں کو جمع کرنا ممکن نہ ہو اور جمع کرنا ممکن ہو تو وہ اولیٰ ہے۔

اور حضرت علی بن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ منسوخ نہیں ہے، البتہ حَقَّ تُقٰتِهٖ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا جائے جیسے جہاد کرنے کا حق ہے۔ اور تمہیں اللہ کی راہ میں کسی لومۃ لائم (ملامت کرنے والے کی ملامت) کی پرواہ نہ ہو۔ اور تم عدل وانصاف کو قائم کرو اگرچہ وہ تمہاری ذاتوں اور تمہارے بیٹوں کے خلاف ہی ہو۔

نحاس نے کہا ہے: جب بھی آیت میں مسلمانوں پر کسی واجب کا ذکر کیا جائے کہ وہ اس پر عمل کریں تو اس میں نسخ واقع نہیں ہوتا۔ اور قول باری تعالیٰ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کا معنی ومفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

''اور مضبوطی سے پکڑ لو اللہ کی رسی سب مل کر اور جدا جدا نہ ہونا اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت (جو اس نے) تم پر فرمائی جب کہ تم تھے (آپس میں) دشمن پس اس نے الفت پیدا کر دی تمہارے دلوں میں تو بن گئے تم اس کے

1۔ ناسخ ومنسوخ للنحاس، صفحہ 299۔ تفسیر طبری، جلد 5، صفحہ 637

احسان سے بھائی بھائی اور تم (کھڑے) تھے دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تو اس نے بچالیا تمہیں اس (میں گرنے) سے۔ یونہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں تا کہ تم ہدایت پر ثابت رہو۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَاعْتَصِمُوْا۔ العصمة کا معنی ہے المنعةُ (یعنی عزت اور قوت) اور اسی وجہ سے بَذْرَقہ کو عِصمۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور بذرقه: قافلہ کی حفاظت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ (یعنی محافظ و نگران) اور وہ یہ ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ ایسے افراد کو بھیجے جو اس کی ان سے حفاظت کریں گے جو اسے اذیت اور تکلیف پہنچائیں گے۔ ابن خالویہ نے کہا ہے: البذرقه عربی زبان کا لفظ نہیں ہے بلکہ یہ فارسی کلمہ ہے اور عربوں نے اسے عربی بنا لیا ہے، کہا جاتا ہے: بعث السلطان بذرقة مع القافلة (سلطان نے قافلہ کے ساتھ محافظ بھیجے۔)

اور لفظ الحَبْل مشترک ہے اور لغت میں اس کا اصلی معنی یہ ہے السبب الذی یوصل به الی البغیة والحاجة وہ سبب جس کے ذریعہ مقصد اور حاجت تک پہنچا جاتا ہے اور حبل کا معنی حبل العاتق (کندھے کا پٹھا) بھی ہے اور حبل سے مراد ریت کا ایک لمبا اور طویل قطعہ بھی ہے اور اسی معنی میں ایک حدیث ہے: واللہ ما ترکت من حبل الا وقفت علیه، فهل لی من حج(1) (قسم بخدا میں نے کوئی ریت کا لمبا ٹکڑا نہیں چھوڑا مگر میں نے اس پر وقوف کیا، تو کیا میرا حج ہو گیا؟)

اور حبل کا معنی رسی بھی ہے اور اس کا معنی عہد بھی ہے۔

اعشیٰ نے کہا ہے:

وإذا تُجوِّزُهَا حِبَالُ قبیلة اخذتْ من الأُخری الیك حِبالَها

اس میں حبل سے مراد امان اور پناہ ہے۔

اور حبل کا معنی مصیبت بھی ہے۔

کثیر نے کہا ہے:

فلا تعجلِی یا عَزُّ اَنْ تَتَفَهَّمِی بنُصْحٍ أتَی الواشُون ام بِحُبُولِ

اس میں حبول مصائب کے معنی میں ہے۔

اور حِبَالَۃٌ کا معنی شکاری کا پھندا (اور جال) ہے۔ اور آیت میں سوائے عہد کے معنی کے کوئی معنی مراد نہیں ہے یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حبل اللہ سے مراد قرآن کریم ہے اور اسے حضرت علی اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے(2) اور حضرت مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اور ابو

1۔ ابن ماجہ، باب فی عرفة قبل الفجر لیلة جمع، حدیث نمبر 3006، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فضل القرآن، حدیث نمبر 2831، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

معاویہ نے ھَجَری (مراد ابراہیم بن مسلم العبدی ہے) سے، انہوں نے ابوالاحوص سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ یہ قرآن ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی) ہے۔''

اور تقی بن مخلد نے اسی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، حدثنا یحییٰ بن عبد الحمید حدثنا هشیم عن العوّام بن حوشب عن الشعبی عن عبداللہ بن مسعود وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا فرمایا: حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

اور آپ سے اور کئی دوسروں سے یہ کئی وجوہ سے مروی ہے اور تمام کا معنی باہم متقارب اور ایک دوسرے میں داخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ الفت و محبت کا حکم ارشاد فرما رہا ہے اور فرقت و جدائی سے منع فرما رہا ہے، کیونکہ فرقت ہلاکت ہے اور جماعت و اتفاق (باعث) نجات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ابن مبارک پر رحم فرمائے۔

اس نے کہا:

ان الجماعة حبل الله فاعتصموا منه بعروته الوثقى لمن دانا

اس میں حبل اللہ سے مراد جماعت ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَلَا تَفَرَّقُوْا یعنی تم اپنے دین میں جدا جدا نہ ہونا جیسا کہ یہود و نصاریٰ اپنے ادیان میں جدا جدا ہو گئے، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے اور یہ معنی مراد لینا بھی جائز ہے کہ مختلف اغراض اور خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے جدا جدا نہ ہو جانا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دین کے سلسلہ میں بھائی بھائی ہو جاؤ، تو وہ ان کے لئے باہمی قطع تعلقی اور باہمی عداوت و دشمنی سے ڈھال اور روکنے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کا مابعد ارشاد گرامی اسی پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ ہے: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔

اور اس میں فروعات میں اختلاف کے حرام ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ وہ کوئی اختلاف نہیں، جبکہ اختلاف وہ ہوتا ہے جس کے ہوتے ہوئے آپس میں محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہونا متعذر رہو اور رہا مسائل اجتہادیہ کا حکم، تو ان میں اختلاف فرائض اور معانی شرع کی باریکیاں اور لطائف نکالنے اور مستنبط کرنے کے سبب سے ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پیش آنے والے حوادث و واقعات کے احکام میں مسلسل اختلاف بھی کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے محبت اور الفت سے پیش آتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے'' اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ایسے اختلاف سے منع فرمایا ہے جو جھگڑے اور فساد کا سبب ہے۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہودی اکہتر فرقوں میں یا بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور عیسائی بھی اسی کی مثل (فرقوں میں تقسیم ہوئے) اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی۔''

ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے۔(1)

1۔ ابن ماجہ، باب افتراق الامم، حدیث نمبر 3980، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا ہے(1)۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً میری امت پر بالکل برابر برابر وہی حالات آئیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے یہاں تک کہ اگر ان میں سے کوئی آدمی اپنی ماں کے پاس اعلانیہ (برائی کے لئے) آتا تھا تو یقیناً میری امت میں سے بھی ایسا ہوگا جو اسی طرح کا فعل کرے گا اور بلاشبہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری امت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی سوائے ایک گروہ کے وہ تمام کے تمام جہنم میں ہوں گے'' صحابہ کرام نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم وہ ایک کون سا فرقہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا انا علیہ و اصحابی جو اس (دین) پر ہوگا جس پر میں اور میرے صحابہ کرام ہیں۔ انہوں نے اسے عبداللہ بن زیاد الافریقی کی حدیث سے عبداللہ بن یزید عن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی سند سے بیان کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے اور ہم اسے اس سند کے سوا سے نہیں پہچانتے۔ ابوعمر نے کہا ہے: عبداللہ افریقی ثقہ راوی ہے، اس کی قوم نے اس کی توثیق کی ہے اور انہوں نے اس کی تعریف کی ہے اور دوسروں نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

اور ابوداؤد نے اسے اپنی سنن میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! سنو تم سے پہلے اہل کتاب بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور یہ ملت عنقریب تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی بہتر جہنم میں ہوں گے اور ایک فرقہ جنت میں ہوگا اور وہ الجماعۃ ہے۔ بلاشبہ عنقریب میری امت سے کچھ تجارتی گروہ نکلیں گے ان کے ساتھ خواہشات اس طرح ہوں گی جس طرح الکلب (باولا کتا کاٹنے کی بیماری) اپنے مریض کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کے بدن کی کوئی رگ اور روئی جوڑ باقی نہیں رہتا مگر وہ اس میں داخل ہو جاتی ہے۔''(2)

اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو دنیا سے اس حال میں جدا ہوا کہ اس میں اللہ تعالیٰ وحدہٗ کے بارے میں اخلاص ہو، اس کی عبادت میں کوئی اور شریک نہ ہو، وہ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرتا رہے تو وہ اس حال میں فوت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اور وہ اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جسے رسل علیہم السلام نے کر آئے اور انہوں نے اسے اپنے رب کی طرف سے پہنچایا اس سے پہلے کہ احادیث میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو اور اھواء وخواہشات میں اختلاف ہو اور اس کی تصدیق سب سے آخر میں نازل ہوئی کتاب اللہ میں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَاِنْ تَابُوْا فرمایا: پس اگر وہ بتوں اور ان کی عبادت کو چھوڑ دیں وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ اور دوسری آیت میں فرمایا: فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ (التوبہ: 11) (پس اگر یہ توبہ کرلیں اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں دین میں۔)

انہوں نے اسے نصر بن علی جہضمی عن ابی احمد بن ابی جعفر الرازی عن الربیع بن انس عن انس رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے۔(3)

ابوالفرج جوزی نے کہا ہے: اگر کہا جائے یہ فرقے تو معروف ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہم افتراق اور اصولی فرقوں کو

1۔ سنن ترمذی، باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامۃ، حدیث نمبر 2565، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابی داؤد، کتاب السنۃ، حدیث نمبر 3981، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　　3۔ ابن ماجہ، باب فی الایمان، حدیث نمبر 68، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جانتے ہیں اور پھر فرقوں میں سے ہر گروہ کئی فرقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اگرچہ ہم نے ان فرقوں کے اسماء اور ان کے مذاہب کا احاطہ نہیں کیا ہے۔ لیکن اصولی فرقوں میں سے یہ ہمارے لئے بالکل ظاہر ہیں حرور یہ، قدریہ، جھمیہ، مرجئہ، رافضہ، اور جبریہ۔ اور بعض اہل علم نے کہا ہے: اصل گمراہ فرقے یہی چھ فرقے ہیں اور ان میں سے ہر فرقہ بارہ فرقوں میں منقسم ہے تو اس طرح بہتر فرقے ہو گئے۔

حرور یہ بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلا ازرقیہ ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم کسی کو مومن نہیں جانتے۔ اور انہوں نے اہل قبلہ کو کافر قرار دیا سوائے ان کے جنہوں نے ان کے قول کو قبول کیا۔

(۲) اباضیۃ: انہوں نے کہا ہے: جس نے ہمارے قول کو لے لیا تو وہ مومن ہے اور جس نے اس سے اعراض کیا تو وہ منافق ہے۔

(۳) ثعلبیہ: ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی فیصلہ نہیں فرمایا اور نہ کوئی تقدیر بنائی۔

(۴) خازمیہ: انہوں نے کہا: ہم نہیں جانتے ایمان کیا ہے اور تمام مخلوق معذور ہے۔

(۵) خَلَفیہ: ان کا گمان ہے کہ مرد یا عورت میں سے جس نے بھی جہاد ترک کیا تو وہ کافر ہو گیا۔

(۶) کوزیہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کو مس کرے کیونکہ پاک چیز کو نجس سے نہیں پہچانا جاسکتا اور نہ کوئی اپنے ساتھ کسی کو کھانا کھلائے یہاں تک کہ وہ توبہ کرلے اور غسل کرلے۔

(۷) کنزیہ: انہوں نے کہا ہے: کوئی کسی کو یہ اختیار اور گنجائش نہ دے کہ وہ اپنا مال کسی کو دے دے، کیونکہ بسا اوقات وہ مستحق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے زمین میں جمع کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اہل حق ظاہر ہو جائیں۔

(۸) شمراخیہ: انہوں نے کہا ہے: اجنبی عورتوں کو مس کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ خوشبودار پودے (پھول) ہیں۔

(۹) اخنسیہ: انہوں نے کہا ہے: میت کو اس کی موت کے بعد کوئی خیر و شر لاحق نہیں ہوتا۔

(۱۰) حکمیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے مخلوق کی طرف بلایا تو وہ کافر ہے۔

(۱۱) معتزلہ: انہوں نے کہا ہے: ہم پر حضرت علی اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کا معاملہ مشتبہ ہے لہٰذا ہم دونوں فریقوں سے بری الذمہ ہیں۔

(۱۲) میمونیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے اہل محبت کی رضا کے بغیر کوئی امام نہیں ہوسکتا۔

اور قدریہ بھی بارہ فرقوں میں تقسیم ہوئے۔

(۱) أحمریہ: یہ وہ فرقہ ہے جن کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عدل کی شرط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ان کے امور کا مالک بنائے اور وہ ان کے اور ان کے گناہوں کے درمیان حائل رہے۔

(۲) ثنویہ: ان کا خیال ہے کہ خیر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور شر شیطان کی طرف سے ہے۔

(۳) معتزلہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے کہا کہ قرآن کریم مخلوق ہے اور انہوں نے [صفات] ربوبیۃ کا انکار کیا ہے۔

(۴) کَیسانیہ: انہوں نے کہا ہے: ہم نہیں جانتے کہ یہ افعال اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں یا بندوں کی جانب سے اور نہ ہم یہ

جانتے ہیں کہ کیا اس کے بعد لوگوں کو ثواب دیا جائے گا یا انہیں سزا دی جائے گی۔

(۵) شیطانیہ: ان کا کہنا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا ہے۔

(۶) شریکیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک کفر کے سوا تمام برائیاں مقدر ہیں۔

(۷) وھمیہ: انہوں نے کہا ہے: مخلوق کے افعال اور ان کے کلام کے لئے کوئی ذات نہیں اور نہ ہی نیکی اور بدی کے لئے کوئی ذات ہے۔

(۸) زبریہ: انہوں نے کہا ہے: ہر کتاب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اس کے مطابق عمل کرنا فرض ہے چاہے وہ ناسخ ہو یا منسوخ۔

(۹) مسعدیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے نافرمانی کی پھر توبہ کی تو اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی۔

(۱۰) ناکثیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ جس نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت توڑ دی تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

(۱۱) قاسطیہ: انہوں نے ابراہیم بن نظام کی اس کے اس قول میں اتباع اور پیروی کی ہے کہ جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ تعالیٰ شے ہے تو وہ کافر ہے۔

اور جہمیہ بارہ فرقوں میں منقسم ہیں۔

(۱) معطلہ: انہوں نے خیال کیا ہے کہ ہر وہ شے جس پر انسان کا وہم واقع ہو سکتا ہے تو وہ مخلوق ہے اور یہ کہ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے تو وہ کافر ہے۔

(۲) مریسیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کی اکثر صفات مخلوق ہیں۔

(۳) ملتزقہ: انہوں نے یہ نظریہ اختیار کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ میں موجود ہے۔

(۴) واردیہ: انہوں نے کہا ہے: وہ آتش جہنم میں داخل نہ ہوگا جس نے اپنے رب کو پہچان لیا اور جو اس میں داخل ہوا وہ اس سے کبھی نہ نکالا جائے گا۔

(۵) زنادقہ: انہوں نے کہا ہے: کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے لئے رب ثابت کرے، کیونکہ حواس کے ادراک کے بغیر اثبات نہیں ہو سکتا اور جس کا ادراک نہ ہو وہ ثابت نہیں ہو سکتا۔

(۶) حرقیہ: انہوں نے یہ گمان کیا ہے کہ کافر کو ایک بار آگ جلا دے گی پھر وہ ہمیشہ جلا ہوا باقی رہے گا اور وہ آگ کی حرارت کو نہیں پائے گا۔

(۷) مخلوقیہ: انہوں نے گمان کیا ہے کہ قرآن مخلوق ہے۔

(۸) فانیہ: ان کا گمان ہے کہ جنت اور جہنم دونوں فناہ ہو جائیں گی اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے کہا کہ انہیں پیدا ہی نہیں کیا گیا۔

(۹) عبدیہ: انہوں نے رسل علیہم السلام کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ حکماء تھے۔

(۱۰) واقفیہ: انہوں نے کہا: نہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن مخلوق ہے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر مخلوق ہے۔

(۱۱) قبریہ: یہ عذاب قبر اور شفاعت کا انکار کرتے ہیں۔

(۱۲) لفظیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارا قرآن کا تلفظ کرنا مخلوق ہے۔

اور مرجئہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) تارکیہ: انہوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق پر کوئی فریضہ نہیں ہے سوائے اس کے ساتھ ایمان لانے کے، پس جو کوئی اس کے ساتھ ایمان لایا تو اسے چاہیے وہ جو چاہے کرے۔

(۲) سائبیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو آزاد چھوڑ دیا ہے تاکہ وہ جو چاہیں کریں۔

(۳) راجیہ: انہوں نے کہا ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے کو طائع اور گناہ کرنے والے کو عاصی نہیں کہا جائے گا کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس کیا ہے۔

(۴) سالبیہ: انہوں نے کہا ہے کہ طاعت ایمان میں سے نہیں ہے۔

(۵) بہیشیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ایمان علم ہے اور جو حق کو باطل سے اور حلال کو حرام سے نہیں پہچان سکتا تو وہ کافر ہے۔

(۶) عملیہ: ان کا کہنا ہے کہ ایمان عمل کا نام ہے۔

(۷) منقوصیہ: انہوں نے کہا ہے: ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔

(۸) مستثنیہ: انہوں نے کہا ہے: استثناء ایمان میں سے ہے۔ (یعنی ان شاء اللہ کہنا)

(۹) مشبّہ: انہوں نے کہا ہے: آنکھ آنکھ کی طرح ہے اور ہاتھ ہاتھ کی طرح ہے (یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم ثابت کرتے ہیں نعوذ باللہ من ذالک)

(۱۰) حشویہ: انہوں نے کہا ہے: تمام احادیث کا حکم ایک ہے، پس ان کے نزدیک نفل کو ترک کرنے والا فرض کو چھوڑنے والے کی طرح ہے۔

(۱۱) ظاہریہ: یہ وہ ہیں جنہوں نے قیاس کی نفی کی ہے۔

(۱۲) بدعیہ: وہ پہلا آدمی جس نے اس امت میں ان واقعات کا آغاز کیا۔

اور رافضیہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:

(۱) علویہ: انہوں نے کہا کہ رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنایا گیا تھا لیکن حضرت جبریل امین نے خطا کی (اور پیغام رسالت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دیا)۔

(۲) امریہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے کام میں شریک ہیں۔

(۳) شیعیہ: ان کا موقف ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں اور آپ کے بعد آپ کے ولی ہیں۔ بلاشبہ امت نے دوسروں کی بیعت کے سبب کفر کیا ہے۔

(۴) اسحاقیہ: انہوں نے کہا ہے: بے شک نبوت یوم قیامت تک متصل ہے اور ہر وہ جو اہل بیت کا علم جانتا ہے تو وہ نبی ہے۔
(۵) ناؤوسیہ: انہوں نے کہا ہے: حضرت علی رضی اللہ عنہ ساری امت سے افضل ہیں۔ اور جس کسی نے کسی غیر کو آپ پر فضیلت دی تو وہ کافر ہو گیا۔
(۶) امامیہ: انہوں نے کہا ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے کسی امام کے بغیر ہو، بلاشبہ امام کو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تعلیم دیتے ہیں۔ اور جب ایک فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرے کو بدل دیتے ہیں۔
(۷) زیدیہ: انہوں نے کہا ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد نمازوں میں ائمہ ہوں گے پس جب ان میں سے کوئی موجود ہو تو پھر کسی غیر کے پیچھے نماز جائز نہیں ان کے نیکوکار اور ان کے فاجر (سبھی برابر ہیں)
(۸) عباسیہ: ان کا گمان ہے کہ حضرت عباس کا کسی غیر کی نسبت خلافت کا حق زیادہ ہے۔
(۹) تناسخیہ: انہوں نے کہا ہے کہ ارواح میں تناسخ ہوتا رہتا ہے، پس جو کوئی محسن اور نیکوکار ہو اس کی روح نکلتی ہے اور ایسی مخلوق میں داخل ہو جاتی ہے جو اپنی زندگی کے ساتھ سعادت اندوز ہو رہی ہوتی ہے۔
(۱۰) رجعیہ: ان کا نظریہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب دنیا کی طرف لوٹ کر آئیں گے اور اپنے دشمنوں سے انتقام لیں گے۔
(۱۱) لاعنہ: یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت معاویہ، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم وغیرہ پر لعن کرتے ہیں۔
(۱۲) متربصہ: یہ زاہدوں کے لباس کی طرح لباس پہنتے ہیں اور ہر زمانے میں ایک آدمی کھڑا کرتے ہیں جس کی طرف امر کی نسبت کرتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ اس امت کا امام مہدی ہے اور جب وہ فوت ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا مقرر کر دیتے ہیں۔

پھر جبریہ بھی بارہ فرقوں میں منقسم ہیں:
(۱) مضطریہ: انہوں نے کہا ہے: آدمی کا کوئی فعل (اور اختیار) نہیں ہے بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔
(۲) افعالیہ: انہوں نے کہا ہے: ہمارے لئے افعال ہیں لیکن ہمارے پاس ان کے لئے کوئی استطاعت اور قدرت نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم چوپاؤں کی مانند ہیں کہ ہم انہیں رسی ڈال کر ہانکتے اور چلاتے ہیں۔
(۳) مفروغیہ: انہوں نے کہا ہے: تمام اشیاء پیدا کر دی گئی ہیں اور اب کوئی شے پیدا نہیں کی جائے گی۔
(۴) نجاریہ: ان کا گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فعل پر عذاب دے گا نہ کہ ان کے فعل پر۔
(۵) مناتیہ: انہوں نے کہا ہے: تجھ پر اس کے بارے عمل کرنا لازم ہے جو تیرے دل میں کھٹکے پس تو وہ کام کر جس میں تجھے بھلائی اور خیر معلوم ہو۔
(۶) کسبیہ: انہوں نے کہا ہے: بندہ نہ ثواب طلب کرے گا نہ سزا۔

(۷) سابقیہ: ان کا کہنا ہے: جو چاہے وہ عمل کرے اور جو چاہے وہ عمل نہ کرے، کیونکہ سعید کو اس کے گناہ کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے اور شقی اور بدبخت کو اس کی نیکی کوئی فائدہ نہ دے گی۔

(۸) حِبّیہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا جام پی لیا تو اس سے ارکان کی عبادت ساقط ہوگئی۔

(۹) خوفیہ: ان کا نظریہ ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی اس کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اس سے ڈرے، کیونکہ ایک دوست اپنے دوست سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔

(۱۰) فکریہ: انہوں نے کہا ہے: جس نے علم میں اضافہ کیا تو اس نے اپنی مقدار عبادت اس سے ساقط کر دی۔

(۱۱) خشبیہ: انہوں نے کہا ہے: دنیا بندوں کے درمیان برابر ہے، ان کے درمیان اس میں کوئی فضیلت نہیں جس کے لئے ان کے باپ آدم نے انہیں وارث بنایا ہے۔

(۱۲) منّیہ: انہوں نے کہا ہے: ہماری طرف سے فعل ہے اور ہمارے لئے استطاعت وقدرت ہے۔

وہ فرقے جو اس امت میں زائد ہوئے ان کا بیان عنقریب سورۃ الانعام کے آخر میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سماک الحنفی کو کہا: اے حنفی، جماعت کو لازم پکڑ لے جماعت کو اختیار کر لے، کیونکہ سابقہ امتیں اپنے تفرقہ کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔ کیا تو نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے تین چیزیں پسند فرماتا ہے اور تین چیزیں ناپسند فرماتا ہے: وہ تمہارے لئے پسند فرماتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور یہ کہ تم سب مل کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور وہ تمہارے لئے یہ تین چیزیں ناپسند کرتا ہے۔ قیل وقال، کثرۃ سوال اور مال کو ضائع کرنا۔''

پس اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی کتاب اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا واجب قرار دیا ہے اور اختلاف کے وقت ان دونوں کی طرف رجوع کرنا لازم قرار دیا ہے۔ اور اس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اعتقاداً اور عملاً کتاب وسنت کو مضبوط پکڑنے پر اجماع کریں اور یہی کلمات میں اتفاق لانے اور متفرقات کو منظم کرنے کا وہ سبب ہے جس کے ساتھ دنیا اور دین کے مصالح مکمل ہوتے ہیں اور (اسی میں) اختلاف سے بچاؤ اور سلامتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جمع اور اکٹھا رہنے کا حکم دیا ہے اور اس افتراق سے منع کیا ہے جو اہل کتابین (یہود ونصاریٰ) میں موجود تھا۔ مکمل آیت کا یہی معنی ہے اور اس میں اس اجماع کے صحیح ہونے پر دلیل بھی موجود ہے جو اصول فقہ میں مذکور ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کو یاد کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور سب سے عظیم اور بڑی نعمت اسلام اور اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے، کیونکہ اس کے سبب عداوت اور نفرت وفرقت زائل ہو گئی اور باہمی محبت والفت پیدا ہوگئی۔ اور اس میں مراد قبیلہ اوس اور خزرج ہیں اور یہ آیت عام ہے۔

اور فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا کا معنی ہے کہ تم نعمت اسلام کے سبب دین میں بھائی بھائی ہو گئے اور قرآن کریم میں جہاں بھی ''اَصْبَحْتُمْ'' ہے وہ بمعنی صِرْتُمْ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا۔ ای صار غائرًا۔

اخوان اخ کی جمع ہے اور اس کا نام اخا اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ وہ اپنے بھائی کے مذہب کا قصد وارادہ کرتا ہے، اور شفا ہر شے کی طرف اور اس کے کنارے کو کہتے ہیں۔ اور اسی طرح شفیر بھی ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (التوبہ:109) (وادی کے کھوکھلے دھانے کے کنارے پر)

راجز نے کہا:

نحن حضرنا للحجیج سجلة نابتة فوق شفاها بقلة

اس میں بھی شفا طرف اور کنارہ کے معنی میں ہے۔

اور اشفی علی الشئی کا معنی ہے اشرف علیہ یعنی وہ اس پر جھانکا اور اسی سے ہے أشفی المریض علی الموت یعنی مریض موت پر جھانکنے لگا (مراد یہ ہے کہ وہ قریب الموت ہو گیا) اور ما بقی منہ الا شَفًا ای قلیل یعنی اس سے تھوڑا باقی رہ گیا۔

ابن السکیت نے کہا ہے: آدمی کے لئے اس کی موت کے وقت چاند کے لئے اس کی آخری راتوں میں اور سورج کے لئے اس کے غروب ہونے کے وقت کہا جاتا ہے: مابقی منہ الاّ شفاً ای قلیل۔

عجاج نے کہا ہے:

و مَرْبَاء عالٍ لمن تشرّفا أشرفته بلا شفیً أو بشفی

قولہ: بلا شفی۔ ای غابت الشمس یعنی مراد ہے سورج غروب ہو گیا او بشفی کا معنی ہے تحقیق اس سے تھوڑا سا باقی ہے۔ اور یہ لفظ ذوات الیاء (یائی) میں سے ہے اور اس میں ایک لغت یہ بھی ہے کہ یہ واوی ہے۔ اور نحاس نے کہا ہے: شفا اصل میں شَفَوٌ ہے، اسی لئے اس کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور اس میں امالہ نہیں کیا جاتا۔ اور اخفش نے کہا ہے: جب اس میں امالہ جائز نہیں تو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ واوی کلمات میں سے ہے اور اس لئے بھی کہ امالہ یا کو واضح کرتا ہے اور اس کا تثنیہ شفوان ہے۔

مہدوی نے کہا ہے: یہ تمثیل ہے اس سے ان کا کفر سے ایمان کی طرف نکلنا مراد لیا جا رہا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴

''ضرور ہونی چاہیے تم میں ایک جماعت جو بلایا کرے نیکی کی طرف اور حکم دیا کرے بھلائی کا اور روکا کرے بدی سے اور یہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔''

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں گفتگو اسی سورۃ میں گزر چکی ہے۔

اور مِّنْكُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے اور اس کا معنی ہے کہ حکم دینے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ علماء ہوں اور تمام لوگ علماء

نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بیان جنس کے لیے ہے اور معنی ہے چاہیے کہ تم تمام کے تمام اسی طرح ہو۔
میں (مفسر) کہتا ہوں: پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کے ساتھ انہیں معین کیا: اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ الآیۃ (الحج: 41) (وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں اقتدار بخشیں زمین میں تو وہ صحیح صحیح ادا کرتے ہیں نماز کو۔)

اور تمام لوگوں کو قدرت نہیں دی گئی اور ابن زبیر نے پڑھا ہے: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ویستعینون اللہ علی ما اصابھم (اور وہ اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں جو کچھ انہیں پہنچے) ابو بکر الانباری نے کہا ہے: یہ زیادتی ابن زبیر کی طرف سے تفسیر ہے اور یہ ان کا اپنا کلام ہے اس میں نقل کرنے والوں میں سے بعض نے غلطی کی ہے اور اس نے اسے الفاظ قرآن کے ساتھ ملا دیا ہے، جو کچھ بیان کر رہا ہوں اس کی صحت پر وہ حدیث دلالت کرتی ہے جو میرے باپ نے مجھے اس سند سے بیان کی ہے حدثنا [حسن] بن عرفۃ حدثنا وکیع عن ابی عاصم بن ابی عون عن صبیح انہوں نے کہا: میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس طرح پڑھتے ہوئے سنا: وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ویستعینون اللہ علی ما اصابھم اور کوئی عقلمند اس میں شک نہیں کر سکتا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس زیادتی کے قرآن میں سے ہونے کا اعتقاد نہ رکھتے تھے، کیونکہ آپ نے اسے اپنے اس مصحف میں نہیں لکھا جو امام المسلمین ہے، بلکہ آپ نے اسے وعظ و نصیحت کرنے کے لئے اور ماقبل رب العالمین کے کلام کو موکد کرنے کے لئے اس کا ذکر کیا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾

''اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور اختلاف کرنے لگے تھے اس کے بعد بھی جب آ چکی تھیں ان کے پاس روشن نشانیاں اور ان لوگوں کے لئے عذاب ہے، بہت بڑا۔''

جمہور مفسرین کے قول کے مطابق مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے: مراد اس امت کے مبتدع (بدعت کا ارتکاب کرنے والے) لوگ ہیں۔ اور ابو امامہ نے کہا ہے: وہ لوگ حروریہ ہیں، اور پھر یہ آیت تلاوت کی۔ اور جابر بن عبد اللہ نے کہا ہے: كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ اور وہ لوگ یہود و نصاریٰ ہیں۔ جَآءَهُمُ جمع کی بنا پر مذکر ذکر کیا گیا ہے اور جَآءَتْهُمُ جماعت کی بنا پر ذکر کیا گیا ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

''اس دن (جبکہ) روشن ہوں گے کئی چہرے اور کالے ہوں گے کئی منہ تو وہ جو سیاہ رو ہوں گے (انہیں کہا جائے

گا) کہ کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد تو اب چکھو عذاب (کی اذیتیں) بوجہ اس کفر کے جو تم کیا کرتے تھے۔ اور وہ (خوش نصیب) لوگ روشن ہوں گے جن کے چہرے تو وہ رحمت الٰہی (کے سائے) میں ہوں گے وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ یعنی قیامت کے دن جب وہ اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو مومنین کے چہرے روشن اور سفید ہوں گے اور کافروں کے منہ کالے ہوں گے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ نامہ اعمال پڑھنے کے وقت ہوگا جب مومن اپنا نامہ عمل پڑھے گا اور اس میں اپنی نیکیاں دیکھے گا تو وہ انتہائی خوش ہوگا اور اس کا چہرہ چمک اٹھے گا اور جب کافر اور منافق اپنا نامہ عمل پڑھیں گے اور اس میں اپنی برائیاں اور گناہ دیکھیں گے تو ان کا چہرہ سیاہ کالا ہو جائے گا۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے: بے شک ایسا میزان کے پاس ہوگا کہ جب اس کی نیکیاں بھاری ہو جائیں گی تو اس کا چہرہ روشن ہو جائے گا اور جب (کافر) کے گناہ بھاری ہو جائیں گے تو اس کا منہ سیاہ ہو جائے گا۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے وقت ہوگا وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (یٰس)

اور کہا جاتا ہے: جب قیامت کا دن ہوگا تو ہر فریق کو حکم دیا جائے گا کہ وہ اپنے معبود کے پاس جمع ہو جائیں، پس جب وہ اس تک پہنچیں گے تو پریشان اور غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے، پس مومنین، اہل کتاب اور منافقین باقی رہ جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ مومنوں کو فرمائے گا: مَنْ رَّبُّکُمْ؟ تمہارا رب کون ہے؟ تو وہ عرض کریں گے: ربنا اللہ عزوجل ہمارا رب اللہ عزوجل ہے۔ تو وہ انہیں فرمائے گا: "کیا تم اسے پہچان لو گے جب تم اسے دیکھو گے؟" تو وہ عرض کریں گے: اس کی ذات پاک ہے! جب اس نے اعتراف کر لیا تو ہم اسے پہچان لیں گے، پس وہ اس کا دیدار کرنے لگیں گے جیسے اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ اور مومنین اللہ تعالیٰ کے لئے سجدے میں گر جائیں گے اور ان کے چہرے برف کی مثل سفید ہو جائیں گے اور منافقین اور اہل کتاب باقی رہ جائیں گے، وہ سجدہ کرنے پر قادر نہیں ہوں گے تو غمزدہ ہو جائیں گے اور ان کے چہرے سیاہ ہو جائیں گے اور اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ اور اس کی قرأت میں تبیض و تسود دونوں تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں: اِبْیَضَضْتُ، پس تا کو اسی طرح کسرہ دیا جاتا ہے جیسے اس میں الف کو ... اور یہ بنی تمیم کی لغت ہے اور اسی کے مطابق یحییٰ بن وثاب نے پڑھا ہے اور زہری نے یوم تبیاض و تسواد پڑھا ہے۔ اور تا کو مکسور پڑھنا بھی جائز ہے اور یوم ییبیض وجوہ جمع مذکر کی بنا پر یا کے ساتھ پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور اُقِّتَتْ کی مثل اُجُوْهٌ بھی جائز ہے۔ اور ابیضاض الوجوہ سے مراد ان کا نعمتوں کے ساتھ چمک اٹھنا اور روشن ہونا ہے اور ان کی سیاہی سے مراد وہ ہے جو دردناک عذاب میں سے ان پر چھا جائے گا۔

مسئلہ نمبر 2۔ اور علماء نے تعیین میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اہل سنت کے چہرے روشن (اور منور) ہوں گے اور اہل بدعت کے منہ سیاہ کالے ہوں گے۔

(مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کو مالک بن سلیمان ہروی غسان کے بھائی نے مالک بن انس سے انہوں نے حضرت نافع سے اور انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول باری تعالیٰ یَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّتَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ کے بارے میں ارشاد فرمایا: یعنی تبیض وجوہ اهل السنة و تسود وجوہ اهل البدعة۔ اسے ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے ذکر کیا ہے۔ اور اس میں کہا ہے: یہ مالک کی حدیث میں سے منکر ہے۔

حضرت عطا نے کہا ہے: مہاجرین و انصار کے چہرے روشن ہوں گے اور بنی قریظہ اور نضیر کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ اور حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ جن کے چہرے سیاہ ہوں گے وہ کفار ہیں اور ان کو کہا جائے گا: کیا تم نے کفر اختیار کر لیا تھا ایمان لانے کے بعد کیونکہ تم نے اس وقت اقرار کیا تھا جب تم حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے چونٹیوں کی مثل نکالے گئے تھے۔ اسے علامہ طبری نے اختیار کیا ہے: حسن نے کہا ہے: یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے۔ قتادہ نے کہا ہے: یہ مرتدین کے بارے ہے۔ عکرمہ نے کہا ہے: وہ اہل کتاب میں سے ایک قوم ہے۔ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کرتے تھے اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کی بھی تصدیق کرتے تھے لیکن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو انہوں نے آپ کے ساتھ کفر کیا۔ پس اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: اَكَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ اسے بھی زجاج نے اختیار کیا ہے۔ اور مالک بن انس نے کہا ہے: یہ اہل اھواء کے بارے ہے۔

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ یہ حروریہ کے بارے ہے۔ اور ایک دوسری خبر میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قدریہ کے بارے ہے۔ اور ترمذی نے ابوغالب سے روایت کیا ہے کہ اس نے کہا: ابوامامہ رضی اللہ عنہ باب دمشق پر کھڑے کئے گئے سروں کو دیکھا(1)، تو حضرت ابوامامہ نے کہا: جہنمی کتے ہیں آسمان کی چھت کے نیچے شریر ترین مقتول ہیں، بہترین اور اچھے نیکوکار مقتول وہ تھے جنہیں انہوں نے قتل کیا تھا ..... پھر آپ نے یہ آیت پڑھی یَّوۡمَ تَبۡيَضُّ وُجُوۡهٌ وَّتَسۡوَدُّ وُجُوۡهٌ الی آخر الایۃ۔ میں نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے؟ تو انہوں نے کہا: اگر میں نے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہوتا سوائے ایک بار یا دو بار یا تین بار کے یہاں تک کہ انہوں نے سات بار تک گنا تو میں تمہیں یہ بیان نہ کرتا۔ (امام ترمذی نے) کہا: یہ حدیث حسن ہے۔

اور صحیح بخاری میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں تمہارے لئے حوض (کوثر) پر پہلے موجود ہوں گا جو کوئی میرے پاس سے گزرے گا وہ وہاں سے پیئے گا اور جس نے (ایک بار) پی لیا وہ کبھی پیاس محسوس نہیں کرے گا یقیناً کئی گروہ میرے پاس آئیں گے میں انہیں پہچانتا ہوں گا اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے پھر میرے اور ان کے درمیان کچھ حائل کر دیا جائے گا۔''

ابوحازم نے کہا ہے: نعمان بن ابی عیاش نے مجھے سنا اور کہا: کیا تو نے سہل بن سعد سے اسی طرح سنا ہے؟ میں نے کہا:

1۔ سنن ترمذی، باب ومن سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 2926، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہاں۔ تو اس نے کہا: میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر تھا اور میں نے آپ سے سنا، وہ اس میں یہ اضافہ بیان کرتے تھے: ''تو میں کہوں گا بلاشبہ وہ تو میرے ہیں تو کہا جائے گا بلاشبہ آپ نہیں جانتے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے۔ اس کے لئے ہلاکت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری ہے جس نے میرے بعد (دین) تبدیل کرلیا۔'' (1)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے اصحاب کا ایک گروہ قیامت کے دن میرے پاس حوض پر آئے گا، تو انہیں حوض سے نکال دیا جائے گا تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار! میرے اصحاب ہیں تو وہ فرمائے گا آپ کے علم میں وہ نہیں ہے جو کچھ انہوں نے آپ کے بعد کیا ہے بلاشبہ یہ لوگ الٹے پاؤں لوٹ کر مرتد ہو گئے۔'' (2)

اس معنی میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔ پس جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں تغیر و تبدل کیا یا ایسی بدعت کا ارتکاب کیا جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو اور نہ اس کے بارے اللہ تعالیٰ اجازت دے تو وہ حوض سے بھگائے جانے والوں میں سے ہوگا اور اس سے دور رہنے والوں میں سے ہوگا جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اور ان میں سب سے زیادہ مطرود اور بعید وہ ہوگا جس نے جماعت مسلمین سے اختلاف کیا اور ان کے راستہ سے علیحدہ ہو گیا جیسا کہ خوارج اپنے مختلف فرقوں کی بنا پر اور روافض اپنی واضح گمراہی کی بنا پر اور معتزلہ طرح طرح کی خواہشات اور ہوس پرستی کی بنا پر، یہ تمام کے تمام دین میں تبدیلی لانے والے اور بدعت کا ارتکاب کرنے والے ہیں اور اسی طرح وہ ظالم جو ظلم وستم میں، حق کو مٹانے میں اور اہل حق کو قتل اور ذلیل و رسوا کرنے میں انتہائی زیادتی کرنے والے ہیں اور وہ جو اعلانیہ گناہ کبیرہ کرنے والے ہیں اور جو معاصی اور گناہوں کو حقیر اور ہلکا سمجھنے والے ہیں اور راہ حق سے انحراف کرنے والوں، خواہش پرستوں اور بدعت کا ارتکاب کرنے والوں کی جماعت، ان تمام کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہی اس آیت سے مراد ہوں۔ اور مثال اسی طرح ہے جو ہم نے بیان کردی ہے، کسی کو ہمیشہ کے لئے جہنم میں نہیں رکھا جائے گا سوائے اس انکار کرنے والے کافر کے جس کے دل میں رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہ ہوگا۔

اور ابن قاسم نے کہا ہے: کبھی اہل اھواء کے سوا بھی کوئی ایسا ہوتا ہے جو اہل اھواء کی نسبت زیادہ شریر ہوتا ہے یہ کہتے ہیں: اخلاص کی تکمیل گناہوں سے اجتناب کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اس کلام میں حذف ہے یعنی فیقال لھم۔ (تو انہیں کہا جائے گا) اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ (کیا تم نے کفر اختیار کرلیا تھا ایمان لانے کے بعد) یعنی یوم میثاق کو جب انہوں نے کہہ دیا بلی (ہاں تو ہمارا رب ہے) اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ یہود کے لئے ہے۔ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے لیکن جب آپ تشریف لائے تو انہوں نے (آپ کا انکار کیا اور) آپ کے ساتھ کفر کیا۔ اور ابو العالیہ نے کہا: یہ خطاب منافقین کے لئے ہے کہا جائے گا: کیا تم نے سراً اور خفیۃً کفر کیا تھا اعلانیہ اقرار کرنے کے بعد۔ اور اہل عرب کا اس پر اجماع ہے کہ اَمَّا کے جواب میں فا لانا ضروری ہے کیونکہ اس کا معنی میرے اس قول میں ہے: أما زید فمنطلق،

1۔ صحیح بخاری، باب فی الحوض و قول تعالیٰ انا اعطیناک الکوثر، حدیث نمبر 6097، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً، حدیث نمبر 6098، ایضاً

مهمایکن من شیٔ فزید منطلق۔

اورقول باری تعالیٰ: وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ یہ سب اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے اور اس کے عہد کو پورا کرنے والے لوگ ہوں گے۔ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ یعنی وہ ہمیشہ اس کی جنت اور دار عزت و کرامت میں باقی رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں انہیں میں سے بنائے اور بدعتوں اور ضلالتوں کی راہوں سے ہمیں بچائے اور محفوظ رکھے اور ہمیں ان کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کرتے رہے۔ آمین۔

تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾

''یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم پڑھ کر سناتے ہیں آپ کو ٹھیک ٹھیک اور نہیں ارادہ رکھتا اللہ ظلم کرنے کا دنیا والوں پر۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کی طرف ہی لوٹائے جائیں گے سارے کام۔''

قولہ تعالیٰ: تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ یہ مبتدا اور خبر ہے اور مراد قرآن کریم ہے۔ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ یعنی آپ پر جبریل امین کو نازل کرتے ہیں سو وہ آپ پر آیات پڑھتا ہے۔ بِالْحَقِّ یعنی صدق وسچائی کے ساتھ۔ اور زجاج نے کہا ہے: تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ یہ آیات جو ذکر کی گئی ہیں اللہ تعالیٰ کی حجتیں اور اس کے دلائل ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ تِلْكَ بمعنی هذه ہے۔ لیکن جب یہ گزر گئیں تو اس طرح ہو گئیں گویا یہ دور اور بعید ہیں۔ لہٰذا تِلْكَ ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ اٰیٰتُ اللّٰهِ، تِلْكَ سے بدل ہو۔ اور وہ نعت اور صفت نہ ہو، کیونکہ مبہم مضاف کے ساتھ نعت نہیں بن سکتا۔ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِیْنَ یعنی وہ انہیں بغیر گناہ کے عذاب نہ دے گا۔ وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ۔ مہدوی نے کہا ہے کہ اس کی ماقبل کے ساتھ وجہ اتصال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مومنین اور کافرین کے احوال کا ذکر کیا اور یہ کہ وہ دنیا والوں پر ظلم نہیں کرے گا، تو اس کے متصل بعد اپنی قدرتوں کی وسعت اور ظلم سے اپنے مستغنی ہونے کا ذکر کیا، اس لئے کہ جو کچھ زمین وآسمان میں ہے وہ سب اس کے قبضہ میں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ابتدائے کلام ہے، اس نے اپنے بندوں کے لئے بیان کیا ہے کہ زمین وآسمان میں سب کا سب اسی کا ہے یہاں تک کہ وہ اسی سے سوال کریں اور اسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

''ہو تم بہترین امت جو ظاہر کی گئی ہے لوگوں (کی ہدایت وبھلائی) کے لئے تم حکم دیتے ہو نیکی کا اور روکتے ہو

برائی سے اور ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو یہ بہتر ہوتا ان کے لئے بعض ان میں سے مومن ہیں اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

اس میں تین مسائل ہیں۔

مسئلہ نمبر 1۔ ترمذی نے بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ کی سند سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے قول باری تعالیٰ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: "تم ستر امتوں کو مکمل کرنے والے ہو تم ان میں بہتر ہو اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے زیادہ مکرم و محترم ہو" اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔(1)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم لوگوں کے لئے لوگوں کی نسبت بہترین (اور نفع بخش) ہیں ہم انہیں زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لا رہے ہیں(2)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس نے ان کے کام کی طرح کام کیا وہ انہیں کی مثل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے یعنی جو ان میں سے صالحین اور اہل فضل ہیں۔ اور وہ قیامت کے دن لوگوں پر شاہد ہوں گے جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: "تم آیت میں ذکر کردہ شرائط کی بنا پر بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت و بھلائی کے لئے ظاہر کی گئی ہے۔"

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے تم لوح محفوظ میں ہو(3) اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم جب سے ایمان لائے ہو بہترین امت ہو۔ اور کہا گیا ہے: یہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے ساتھ پہلے آنے والوں کے لئے بشارت کے طور پر آئی ہے۔ سو معنی یہ ہے کہ تم اپنے سے پہلے آنے والے اہل کتاب کے نزدیک بہترین امت ہو۔ اور اخفش نے کہا ہے: مراد اہل امت، یعنی بہترین دین والے ہیں۔

اور کسی شاعر نے کہا:

حلفتُ فلم اترك لنفسك ريبةً   وهل يأثَمَنْ ذو أُمَّةٍ وهو طائع

میں نے قسم کھائی سو میں نے تیری ذات کے لئے کوئی شک نہیں چھوڑا اور کیا دیندار گناہ کرے گا حالانکہ وہ طاعت شعار اور فرمانبردار ہے۔

اور یہ قول بھی ہے کہ یہ کان تامہ ہے اور معنی ہے تم پیدا کئے گئے اور تم بہترین امت قرار پائے گئے۔ اور خَيْرَ أُمَّةٍ حال ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: کان زائدہ ہے اور معنی ہے انتم خیر امۃ (تم بہترین امت ہو)۔

1۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من سورۃ آل عمران، جلد 2، صفحہ 125، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 4277، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 4191، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531

اور سیبویہ نے کہا ہے:

وَ جِيْرَانٍ لَنَا كَانُوا كِرَامِ

(اور ہمارے عزت واکرام والے پڑوسی ہیں) اس میں کان زائدہ ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (مریم) (ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کمسن بچہ ہے۔) اور وَاذْكُرُوْٓا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا فَكَثَّرَكُمْ (الاعراف:86) (اور یاد کرو (وہ وقت) جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں بڑھا دیا) اور دوسرے مقام پر فرمایا: وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ (الانفال:26) (اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے۔) اور سفیان نے میسرہ اشجعی سے، انہوں نے ابو حازم سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے تحت روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: تم لوگوں کو زنجیروں کے ساتھ اسلام کی طرف کھینچ کر لاتے ہو(1)۔ نحاس نے کہا ہے: اس کے مطابق تقدیر کلام اس طرح ہے کنتم للناس خیر امۃ تم لوگوں کے لئے بہترین امت ہو۔

اور حضرت مجاہد کے قول کے مطابق تقدیر کلام یہ ہے: کنتم خیر امۃ اذ کنتم تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر (تم بہترین امت ہو جبکہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔) اور یہ قول بھی ہے: حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بہترین امت ہوگئی کیونکہ ان میں سے مسلمان زیادہ ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان میں عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے لئے ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خیر الناس قرنی۔ بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جن میں مجھے مبعوث کیا گیا۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب قرآن کی نص سے ثابت ہوگیا کہ یہ امت تمام امتوں سے بہتر اور افضل ہے۔ ائمہ نے عمران بن حصین سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تابعین) پھر وہ جو ان کے ساتھ ملتے ہیں (یعنی تبع تابعین)''(2) (الحدیث) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس امت کے پہلے لوگ بعد میں آنے والوں سے افضل ہیں، یہی موقف جید اور عظیم علماء نے اپنایا ہے اور یہ کہ جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کی اور آپ کو دیکھا اگرچہ عمر میں ایک ہی بار، وہ آپ کے بعد آنے والوں سے افضل ہے اور یہ کہ فضیلت صحبت کے برابر مساوی کوئی عمل نہیں ہوسکتا۔

ابو عمر بن عبد البر اس طرف گئے ہیں کہ کبھی کوئی وصف صحابہ کرام کے بعد آنے والے میں اس سے افضل ہوسکتا ہے جو جملہ صحابہ کرام میں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد: خیر الناس قرنی۔ اپنے عموم پر نہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں بھی

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 531

2۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل صحابہ، باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم، جلد 2، صفحہ 309، اسلام آباد۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 2457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فاضل اور مفضول دونوں قسم کے لوگ جمع تھے۔ آپ کے زمانہ میں منافقین کی وہ جماعت جو ایمان کا اظہار کرتے تھے اور وہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے جن پر یا ان میں سے بعض پر حدود قائم کی گئیں سبھی جمع تھے۔ اور آپ نے ان کے لئے ہی کہا: جو تم چور، شرابی اور زانی کے بارے میں کہتے ہو۔ اور آپ نے اپنے زمانے کے لوگوں کے سامنے فرمایا: لا تسبّوا اصحابی (تم میرے صحابہ کرام کو گالی گلوچ نہ دو۔ (1)) اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے بارے فرمایا: لا تسبب من ھو خیر منك (تو اسے گالی نہ دے جو تجھ سے بہتر ہے) اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طوبى لمن رآني وآمن بي طوبى سبع مرات لمن لم يرني و آمن بي (سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا اور سات بار سعادت ہے اس کے لئے جس نے مجھے نہیں دیکھا اور میرے ساتھ ایمان لایا)

اور مسند ابی داؤد الطیالسی میں عن محمد بن ابی حمید عن زید بن اسلم عن ابیہ عن عمر رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت موجود ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو آپ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کون سی مخلوق ایمان کے اعتبار سے افضل ہے۔'' ہم نے عرض کی ''ملائکہ'' آپ نے فرمایا: ''ان کے بارے تو حق ہے ان کے علاوہ کون ہیں؟'' ہم نے عرض کی انبیاء علیہم السلام۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے بارے تو حق ہے بلکہ ان کے علاوہ کون ہے'' بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان کے اعتبار سے مخلوق میں سے افضل وہ قوم ہے جو ابھی مردوں کی صلبوں میں ہے وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں وہ ورق (کتاب) پائیں گے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے مطابق عمل کریں گے پس وہی ایمان کے اعتبار سے افضل الخلق ہیں۔''

اور صالح بن جبیر نے ابو جمعہ سے روایت کیا ہے، انہوں نے بیان کیا: ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم سے کوئی بہتر ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے اور دو تختیوں کے درمیان ایک کتاب پائیں گے جو کچھ اس میں ہے اس کے ساتھ وہ ایمان لے آئیں گے اور وہ میرے ساتھ ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں۔'' اور ابو عمر نے کہا ہے: ابو جمعہ صحابی ہیں اور ان کا نام حبیب بن سباع ہے اور صالح بن جبیر ثقہ تابعین میں سے ہیں۔ اور حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ تمہارے ایسے دن آنے والے ہیں کہ ان میں اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا ان میں عمل کرنے والے کے لئے اس کی مثل عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کا اجر ہوگا (2)'' (یعنی ان کے اجر کی مثل اسے اجر دیا جائے گا) عرض کی گئی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا ان میں سے (پچاس آدمیوں کی مثل)؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(نہیں) بلکہ تم میں سے'' (پچاس آدمیوں کی مثل)۔

ابو عمر نے کہا: بل منکم کے الفاظ سے بعض محدثین خاموش ہیں۔ اور انہوں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قول باری تعالیٰ: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تاویل میں کہا ہے: جس نے تمہارے فعل کی مثل فعل کیا وہ تمہاری مثل ہے۔ احادیث کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ پہلی (روایات) خصوصیت کی بنا پر ہیں۔ واللہ الموفق۔

1۔ مسلم کتاب فضائل صحابہ، باب تحریم سبّ الصحابہ، جلد 2، صفحہ 310　2۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث نمبر 4003، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور اس باب کی احادیث کی توجیہ میں یہ بھی کہا گیا ہے: بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کو اس بنا پر فضیلت دی گئی ہے کیونکہ وہ لوگ کفار کی کثرت، ان کی اذیتوں پر اپنے صبر کرنے اور اپنے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھنے کے سبب اپنے ایمان میں غرباء تھے اور بلاشبہ اس امت کے آخر میں آنے والے لوگوں نے جب دین کو قائم کیا اور اسے مضبوطی سے تھام لیا اور جب شر، فسق، فتنہ وفساد، گناہ اور کبائر کے ظہور کے وقت وہ اپنے رب کی اطاعت وفرمانبرداری پر ثابت قدم رہے تو اس وقت وہ بھی غرباء ہو گئے اور اس وقت میں ان کے اعمال اسی طرح پاکیزہ رہے جس طرح پہلے لوگوں کے اعمال پاکیزہ تھے اور اس کی شہادت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی دیتا ہے: بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ فطوبی للغرباء (اسلام کا آغاز ہوا درآنحالیکہ وہ غریب تھا اور عنقریب اس حالت کی طرف لوٹ جائے گا جیسے شروع ہوا تھا پس غرباء کے لئے مبارکباد اور سعادتمندی ہے (1)‘‘۔ اور ابو ثعلبہ کی حدیث بھی اس کی شہادت دیتی ہے اور اس کی شہادت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد بھی دیتا ہے۔ ’’میری امت بارش کی طرح ہے یہ معلوم نہیں ہو سکتا اس کا اول بہتر ہے یا اس کا آخر‘‘ اسے ابوداؤد طیالسی اور ابو عیسیٰ ترمذی نے ذکر کیا ہے اور اسے ہشام بن عبید اللہ رازی نے مالک سے، انہوں نے زہری سے اور انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مثلُ امتی مثل المطر لایُدرَی أوّله خیرٌ أم آخرہ (2)۔ اسے دارقطنی نے مسند حدیث مالک میں ذکر کیا ہے۔ ابو عمر نے کہا ہے: ہشام بن عبید اللہ ثقہ راوی ہے محدثین اس میں اختلاف نہیں کرتے۔

اور روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ جب مسند خلافت کے والی بنے تو آپ نے حضرت سالم بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی طرف لکھا کہ میری طرف حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی سیرت لکھو تاکہ میں اس کے مطابق (عمل) کروں، تو حضرت سالم رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: اگر تم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت پر عمل کیا تو پھر تم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے افضل ہو کیونکہ تمہارا زمانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آدمیوں کی طرح ہیں۔ راوی کا بیان ہے: اور آپ نے اپنے زمانہ کے فقہاء کی طرف لکھا، تو ان تمام نے بھی آپ کی طرف حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے قول کی طرح ہی لکھا۔

بعض اجل علماء نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد خیر الناس قرنی کا اس ارشاد کو معارض قرار دیا ہے: خیر الناس من طال عمرہ و حسن عمله و شر الناس من طال عمرہ و ساء عمله (3) (لوگوں میں سے بہتر اور اچھا وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل حسین وجمیل رہا۔ اور لوگوں میں سے شریر وہ ہے جس کی عمر طویل ہوئی اور اس کا عمل برا رہا) ابو عمر نے کہا: یہ احادیث اپنی اسناد کے تواتر اور حسن ہونے کے ساتھ اس امت کے اول اور اس کے آخر کے درمیان مساوات اور

1۔ جامع الترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 547، اسلام آباد۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، حدیث 3975، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
ایضاً صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 84، اسلام آباد

2۔ جامع ترمذی، کتاب الامثال باب ماجاء فی صلوات الخمس، جلد 2، صفحہ 110/577، اسلام آباد

3۔ جامع ترمذی، کتاب الزهد باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد
ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزهد باب ماجاء فی طول العمر للمؤمن، حدیث نمبر 2252، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

برابری کا تقاضا کرتی ہیں۔ اور اس کا معنی وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ ایمان لانا اور عمل صالح کر: ایسے زمانہ میں جو فاسد ہو چکا ہے اور اس میں اہل علم و دین کو اٹھا لیا جائے گا اور اس میں فسق اور فتنہ و فساد وافر ہو جائے گا اور مومن کو ذلیل و رسوا کیا جائے گا اور فاجر کی عزت و تکریم کی جائے گی۔ اور دین غربت کی طرف لوٹ آئے گا جیسا کہ شروع میں غریب تھا اور اس میں دین پر قائم رہنے والا انگارہ پکڑنے والے کی طرح ہوگا۔ پس اس وقت اس امت کا اول عمل کی فضیلت میں اس کے آخر کے ساتھ برابر ہو جائے گا، سوائے اہل بدر اور حدیبیہ کے اور جس نے اس باب کے آثار میں تدبر اور غور و فکر کیا تو اس کے لئے یہ صحیح اور سیدھی راہ ہے۔ واللہ یوتی فضلہ من یشاء۔ (اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اسے اپنا فضل عطا فرما دیتا ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یہ اس امت کی مدح ہے کہ جس دین پر وہ قائم ہیں اور وہ اس کے ساتھ متصف ہیں۔ اور جب انہوں نے تبدیلی کو چھوڑ دیا اور منکر (گناہ کا عمل) پر اتفاق کر لیا تو ان سے مدح و تعریف کا اسم ختم اور زائل ہو گیا۔ اور انہیں ذم اور برائی کا نام لاحق ہو گیا ... اور وہی ان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب بن گیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے کلام سورۃ کی ابتدا میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ یہ خبر دی ہے کہ اہل کتاب کا نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانا ان کے لئے بہتر تھا اور یہ خبر دی ہے کہ ان میں مومن اور فاسق دونوں قسم کے لوگ ہیں۔ البتہ فاسق زیادہ ہیں۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝

"(کچھ) نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا سوائے ستانے کے اور اگر لڑیں گے تمہارے ساتھ تو پھیر دیں گے تمہاری طرف اپنی پیٹھیں (اور بھاگ جائیں گے) پھر ان کی امداد نہ کی جائے گی۔"

قولہ تعالیٰ: لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى یعنی ان کا جھٹلانا، تحریف کرنا اور ان کا بہتان لگانا (تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا) اور نہ ہی ان کو غلبہ حاصل ہوگا۔ یہ حسن اور قتادہ سے منقول ہے۔ اور استثنا متصل ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ تمہیں سوائے معمولی ضرر اور تکلیف کے کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، پس الاذی مصدر کے محل میں واقع ہے اور یہ آیت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے لئے ایک وعدہ ہے کہ اہل کتاب ان پر غالب نہ آ سکیں گے اور یہ کہ ان کی ان کے خلاف مدد کی جائے گی اور انہیں ان کی طرف سے سوائے بہتان اور تحریف کی اذیت کے اور کوئی بگاڑ اور استیصال نہیں پہنچے گا اور رہا انجام (اور آخرت) تو وہ مومنین کے لئے ہی ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ استثنا منقطع ہے اور معنی ہے وہ بالیقین تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے، البتہ وہ تمہیں اس کے ساتھ اذیت دیں گے جو کچھ تمہیں سنائیں گے۔ مقاتل نے کہا ہے: سرداران یہود کعب، عدی، نعمان، ابو رافع، ابو یاسر، کنانہ اور ابن صوریا وہ اپنے میں سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی طرف جاتے اور انہیں ان کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے ستاتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى (1) یعنی سوائے زبانی اذیت کے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ یہاں کلام مکمل ہو گیا۔ پھر فرمایا: وَاِنْ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 78

يُقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ اور اگر وہ گروہ تمہارے ساتھ لڑیں گے تو شکست خوردہ ہو کر بھاگ جائیں گے، یہ کلام بھی مکمل ہو گیا۔ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ یہ نیا کلام ہے اسی لئے ان میں نون ثابت ہے۔ اور اس آیت میں نبی مکرم ﷺ کے لئے معجزہ ہے، کیونکہ یہودیوں میں سے جو بھی لڑا وہ اپنی پیٹھ پھیر کر بھاگ گیا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

''مسلط کر دی گئی ہے ان پر ذلت (و رسوائی) جہاں کہیں یہ پائے گئے بجز اس کے کہ اللہ کے عہد سے یا لوگوں کے عہد سے (کہیں پناہ مل جائے) اور یہ مستحق ہو گئے ہیں غضب الٰہی کے اور مسلط کر دی گئی ہے ان پر محتاجی، یہ اس لئے کہ وہ کفر کیا کرتے تھے اللہ کی آیتوں سے اور قتل کیا کرتے تھے انبیاء کو ناحق یہ (بے باکی) اس لئے تھی کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور سرکشی کیا کرتے تھے۔ سب یکساں نہیں اہل کتاب سے ایک گروہ حق پر قائم ہے یہ تلاوت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی رات کے اوقات میں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر اور حکم دیتے ہیں بھلائی کا اور منع کرتے ہیں برائی سے اور جلدی کرتے ہیں نیکیوں میں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ اور جو یہ کریں گے نیک کاموں سے تو ہرگز انکار نہ کیا جائے گا اس کار خیر کا۔ اور اللہ جاننے والا ہے پرہیزگاروں کو۔''

قولہ تعالیٰ: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ یعنی جہاں کہیں یہ پائے گئے اور یہ ملے۔ کلام مکمل ہوا۔ اور ان پر ذلت مسلط کرنے کا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ یہ استثنا منقطع ہے یہ اول کا جز نہیں ہے۔ یعنی بجز ان کے جو اللہ تعالیٰ سے عہد کو مضبوط کرتے ہیں۔ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ مراد وہ ذمہ داری (معاہدہ) ہے جو لوگوں کی جانب سے ان پر ہے۔ اور النَّاسِ سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور وہ مومنین ہیں جنہیں وہ خراج ادا کرتے ہیں اور وہ انہیں امن اور پناہ دیتے ہیں۔ کلام میں اختصار ہے اور معنی یہ ہے: الا ان یعتصموا بحبل من اللہ، پھر اس سے فعل کو حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے یہی کہا ہے۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ یعنی وہ لوٹ آئے ہیں اللہ کے غضب کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ

بمعنی احتملوا ہے یعنی انہوں نے اللہ کا غضب اٹھایا، برداشت کیا۔ اور لغت میں اس کا اصل معنی ہے کہ ان پر غضب لازم ہو گیا۔ اور سورۃ البقرہ میں یہ گزر چکا ہے۔ پھر خبر دی کہ ان کے ساتھ یہ کیوں کیا گیا، تو فرمایا: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ اس کی مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔ پھر خبر دی اور فرمایا: لیسوا سواء وہ سب برابر نہیں۔ اور کلام مکمل ہو گیا اور معنی یہ ہے کہ اہل کتاب اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت برابر اور یکساں نہیں (1)۔ اور ابو خیثمہ زہیر بن حرب نے بیان کیا ہے حدثنا ہاشم بن القاسم حدثنا شیبان عن عاصم عن زرعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ آپ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے [ایک رات] عشاء کی نماز مؤخر فرمائی پھر آپ مسجد کی طرف تشریف لے گئے تو دیکھا لوگ نماز کے لئے انتظار کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا: "بلاشبہ تمہارے سوا اہل ادیان میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو اس وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہوں۔" فرمایا: اور یہ آیت نازل کی گئی لَيْسُوْا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ (2) ابن وہب نے اسی طرح روایت کیا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ یعنی وہ جو حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ ایمان لائے۔

اور ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے جب حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ، ثعلبہ بن سعیہ، اسید بن سعیہ اور اسید بن عبید اسلام لائے اور جو بھی یہود میں سے اسلام لایا، پس وہ ایمان لائے، انہوں نے تصدیق کی، اسلام کی طرف راغب ہوئے اور اس میں پختگی اور رسوخ حاصل کیا، تو یہودی علماء اور ان میں سے اہل کفر کہتے: محمد (ﷺ) کے ساتھ نہ ایمان لائے اور نہ ہی آپ کی اتباع و پیروی کی مگر ہمارے شریر لوگوں نے، اگر وہ ہمارے اچھے اور نیک لوگوں میں سے ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کے دین کو نہ چھوڑتے اور کسی غیر کی طرف نہ جاتے، تو ان کے اس قول کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا (3): لَيْسُوْا سَوَآءً ۗ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

اور اخفش نے کہا ہے: تقدیر کلام یہ ہے من اهل الكتاب ذو امة، ای ذو طريقة حسنة (4)۔ یعنی اچھے طریقے اور راستے والے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

و هل یأثمن ذو أمة و هو طائع

(کیا اچھے طریقے والا گناہ کرتا ہے حالانکہ وہ اطاعت و فرمانبرداری کر رہا ہے۔)

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 295　2۔ اسباب النزول، صفحہ 79　3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 534　4۔ ایضاً

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلام میں حذف ہے اور تقدیر کلام ہے من اهل الکتاب امة قائمة و اخری غیر قائمة۔ پس پہلے پر اکتفا کرتے ہوئے دوسرے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابوذ ؤیب کا قول بھی ہے:

عصانی الیها القلبُ اِنّی لأمرِهٖ مطیعٌ فما ادری أرُشْدٌ طِلابُها (1)

اس کی طرف مائل ہونے میں دل نے میرا ساتھ نہ دیا بلاشبہ میں تو اس کے حکم کا مطیع و فرمانبردار ہوں سو میں نہیں جانتا کہ اس سے (حق کا) مطالبہ کرنا ہدایت ہے (یا گمراہی)۔ تو اس میں مراد أرُشْدٌ ام غیٌّ ہے اور اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

فراء نے کہا ہے: امة، سواء کے سبب مرفوع ہے (2) اور تقدیر عبارت ہے: لیس یستوی امة من اهل الکتاب قائمة یتلون آیات الله و امة کافرة۔ (اہل کتاب میں سے ایک گروہ جو حق پر قائم ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں وہ اور کفر کرنے والا گروہ برابر نہیں ہیں۔)

نحاس نے کہا ہے: یہ قول کئی اعتبار سے غلط ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ امة کو سواء کے ساتھ رفع دیا گیا ہے تو اس میں لیس کے اسم کی طرف لوٹنے والی کوئی شے نہیں ہے اور رفع ایسی شے کے سبب دیا جا رہا ہے جو فعل کے قائم مقام نہیں ہے اور اسے مضمر مانا جائے گا جس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کافر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لہٰذا اسے مضمر ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اور ابو عبیدہ نے کہا ہے: یہ عربوں کے اس قول کی مثل ہے: اکلونی البراغیثُ (3) اور ذهبوا اصحابُك۔ نحاس نے کہا: یہ غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اور و اکلونی البراغیث ان کا پہلے ذکر نہیں ہوا۔

اور اٰنَآءَ الَّیْلِ اس سے مراد رات کی ساعتیں ہیں (4)۔ اس کا واحد اِنًی و أَنًی اور اِنْیٌ ہے۔ اور یہ ظرف کی بنا پر منصوب ہے۔ اور یَسْجُدُوْنَ بمعنی یصلون (وہ نماز پڑھتے ہیں) ہے۔

یہ فراء اور زجاج سے مروی ہے، کیونکہ تلاوت رکوع و سجود میں نہیں ہوتی۔ اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَلَهٗ یَسْجُدُوْنَ۔ ای یصلون۔ اور سورۃ الفرقان میں ہے: وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ اور سورۃ النجم میں ہے فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ۝ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس سے مراد صرف معروف سجدہ ہی لیا جا رہا ہے۔ اور سبب نزول اسے رد کر رہا ہے اور یہ کہ مراد عشاء کی نماز ہے جیسا کہ ہم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے، پس بتوں کی پوجا کرنے والوں پر جونہی رات چھا جاتی ہے تو وہ سو جاتے اور موحدین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نماز عشاء کے لئے کھڑے ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت کرتے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب ان کے قیام کا ذکر کیا تو فرمایا وَ هُمْ یَسْجُدُوْنَ یعنی (سجدوں کے) ساتھ قیام بھی تھا۔ اور ثوری نے کہا ہے: یہ مغرب و عشاء کے درمیان کی نماز ہے (5) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قیام لیل کے بارے میں ہے۔ اور بنی شیبہ کے ایک آدمی سے روایت ہے وہ کتابیں پڑھتا تھا اس نے کہا: بلاشبہ ہم رب العالمین کے کلام میں سے ایک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 492 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

4۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 534 5۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 493

کلام پاتے ہیں۔ کیا اونٹ یا بکریاں چرانے والا گمان کرتا ہے جو کہ رات آتے ہی منفرد اور علیحدہ ہو (کر سو) جاتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو رات کے وقت قیام و سجود کرتا ہے؟ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتے ہیں اور حضور نبی مکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں۔ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کہا گیا ہے کہ یہ کلام عام ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع و پیروی کا حکم ہے۔ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ نہی عن المنکر سے مراد آپ کی مخالفت سے منع کرنا اور روکنا ہے۔ وَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ یعنی وہ نیکی کے اعمال بغیر کسی بوجھ اور ثقل کے جلدی سے کرتے ہیں اس لئے کہ وہ ثواب اور اجر کی مقدار سے واقف و آگاہ ہیں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ فوت ہونے سے پہلے اعمال کرنے میں جلدی اور تیزی کرتے ہیں۔ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ اور یہ لوگ صالحین کے ساتھ ہوں گے جنت میں اور وہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ وَ مَا یَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلَنْ یُّكْفَرُوْهُ اعمش، ابن وثاب، حمزہ، کسائی، حفص اور خلف نے دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے، (اس لئے کہ یہ) امۃ قائمۃ کے بارے خبر ہے۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابوعبید کی پسند ہے۔ اور باقیوں نے خطاب کی بنا پر دونوں کو تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اسے ابو حاتم نے اختیار کیا ہے اور ابو عمرو دونوں قرأتوں کو یعنی یا اور تا کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ اور آیت کا معنی ہے: تم جو بھی نیک عمل کرو گے تو ہرگز تمہیں اس کے ثواب سے انکار نہیں کیا جائے گا بلکہ تمہاری قدر افزائی کی جائے گی اور اس پر تمہیں اجر و ثواب اور جزا دی جائے گی۔(1)

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

"بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرہ بھر۔ اور وہ دوزخی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یہ اِنَّ کا اسم ہے اور اس کی خبر یہ ہے لَنْ تُغْنِیَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَ لَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا مقاتل نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب میں سے مومنین کا ذکر کیا تو پھر ان کے کفار کا ذکر کیا اور وہ اس کا یہ قول ہے اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اور کلبی نے کہا ہے: اسے ابتداء بنایا اور فرمایا: بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے مال کی کثرت اور ان کی اولاد کی کثرت انہیں ہرگز اللہ کے عذاب سے ذرہ بھر نہیں بچا سکیں گے۔ اولاد کا ذکر خاص طور پر کیا گیا کیونکہ نسب کے اعتبار سے وہی ان کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہ مبتدا اور خبر ہیں اور اسی طرح هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ بھی ہے ان تمام کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مَثَلُ مَا یُنْفِقُوْنَ فِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا كَمَثَلِ رِیْحٍ فِیْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 535

ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۷

''مثال اس کی جو وہ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگی میں ایسی ہے جیسے ہوا ہو اس میں سخت ٹھنڈک ہو (اور) لگے وہ ایک قوم کے کھیت کو جنہوں نے ظلم کیا ہو اپنے نفسوں پر پھر فنا کر دے اس کھیت کو۔ نہیں ظلم کیا ان پر اللہ تعالیٰ نے لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔''

قولہ تعالیٰ: مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اس میں مَا یہ صلاحیت بھی رکھتا ہے کہ وہ مصدریہ ہو اور یہ بھی کہ وہ بمعنی الذی ہو، اور ضمیر عائد محذوف ہو، یعنی مثل ماینفقونه۔ اور کمثل ریح کا معنی ہے کمثل مهب ریح (ہوا چلنے کی طرح) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: الصر کا معنی سخت ٹھنڈک ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی اصل الصریر ہے جس کا معنی آواز ہے، پس مراد شدید ہوا کی آواز ہے۔

زجاج نے کہا ہے: یہ اس آگ کے بھڑکنے کی آواز ہے جو اس ہوا میں ہو۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور حدیث طیبہ میں ہے: بلاشبہ اس ٹڈی کو کھانے سے منع کیا گیا ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوا نے مار دیا ہو۔ اور آیت کا معنی ہے: کافروں کے خرچ کیے ہوئے مال کے باطل اور ضائع ہونے اور اس کے نفع بخش نہ ہونے کی مثال اس کھیتی اور فصل کی طرح ہے جسے سخت ٹھنڈی ہوا یا آگ لگی ہو اور اس نے اسے جلا کر خاکستر کر دیا ہو۔ اور اس کے مالکوں کو ذرہ بھر فائدہ نہ ہو حالانکہ وہ اس سے نفع اور فائدہ کی امید رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ان پر ظلم نہیں کیا وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ لیکن وہ خود ہی کفر و معصیت کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کے حق کا انکار کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ انہوں نے زراعت کے وقت کے بغیر اور اس کی جگہ کے بغیر کھیتی کاشت کی پس اللہ تعالیٰ نے انہیں ادب سکھایا، اس لئے کہ انہوں نے ایک شے کو غیر محل میں رکھا۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۱۱۸

''اے ایمان والو! نہ بناؤ اپنا راز دار غیروں کو وہ کسر نہ اٹھا رکھیں گے تمہیں خرابی پہنچانے میں وہ پسند کرتے ہیں جو چیز تمہیں ضرر دے، ظاہر ہو چکا ہے بغض ان کے مونہوں (یعنی زبانوں) سے اور جو چھپا رکھا ہے ان کے سینوں نے وہ اس سے بھی بڑا ہے۔ ہم نے صاف بیان کر دیں تمہارے لئے اپنی آیتیں اگر تم سمجھ دار ہو۔''

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی طرف میلان اور جھکاؤ رکھنے سے منع کرنے اور اس پر زجر و توبیخ کرنے کو مؤکد

کیا ہے۔ اور اس کا تعلق سابقہ اس ارشاد کے ساتھ ہے۔ ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب اور البطانۃ مصدر ہے اور اس کے ساتھ واحد اور جمع دونوں کا نام رکھا جا سکتا ہے اور بطانۃ الرجل سے مراد وہ خاص دوست اور افراد ہیں جو اس کے خفیہ معاملات پر بھی آگاہ ہوتے ہیں اور یہ اصل میں البطن سے ماخوذ ہے جو الظھر کے خلاف ہے۔ اور بطن فلان بفلان یبطن بطونا و بطانۃ جب کوئی کسی کے ساتھ خاص ہو اور اس کے اندرونی معاملات میں تہہ تک پہنچا ہوا ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

اولئك خلصائی نعم و بطانتی و هم عیبتی من دون كلّ قریب

مسئلہ نمبر 2۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس آیت کے ساتھ منع فرمایا ہے کہ وہ کفار، یہود اور اہل اھواء کو اپنے معاملات میں دخیل اور راز دار بنائیں کہ وہ آراء اور مشاورت میں ان کے ساتھ تبادلہ خیالات کر کے اور اپنے معاملات ان کے سپرد کر دیں۔ اور کہا جاتا ہے: کل من کان علی خلاف مذھبك و دینك فلا ینبغی لك ان تحادثه۔ یعنی ہر وہ جو تیرے مذہب اور تیرے دین کے خلاف ہے اس کے ساتھ تیرا مشاورت اور گفتگو کرنا مناسب نہیں۔

شاعر نے کہا:

عن المرء لا تسأل وسل عن قرینه فكل قرین بالمقارن یقتدی

ہر آدمی سے سوال نہ کر بلکہ اپنے ساتھی سے سوال کر پس ہر ساتھی اپنے مصاحب کی ہی اقتدی کرتا ہے اور سنن ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک کو اس کے بارے غور و فکر کرنی چاہیے جسے وہ دوست بنا رہا ہے۔''(1)

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: تم لوگوں کو ان کے بھائیوں (دوستوں) پر قیاس کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس معنی اور سبب کو بیان فرمایا جس کے لئے اس نے اس تعلق اور دوستی سے منع فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا، خبالا بمعنی فسادا ہے یعنی تمہارے فساد اور بربادی میں وہ کوئی کسر اور کمی نہیں چھوڑیں گے۔ یعنی بلاشبہ اگرچہ وہ ظاہر میں تمہارے ساتھ قتال اور جنگ نہیں کریں گے لیکن مکر و فریب اور دھوکہ دینے میں وہ کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قول باری تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان سے مراد خوارج ہیں۔'' اور روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی کو کاتب بنایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف شدید عتاب آمیز خط لکھا اور یہ آیت بھی ساتھ تحریر فرمائی۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الآداب باب من یومر ان یجالس، جلد 2، صفحہ 308۔

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی اخذ المال ۔۔۔ الخ، حدیث 2300، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی اخذ المال، جلد 2، صفحہ 60/513، اسلام آباد

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حساب لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آپ کو وہ پیش کیا اور آپ کو تعجب میں ڈال دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک کتاب (تحریر) لائے اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا: تیرا کاتب کہاں ہے یہ کتاب لوگوں پر پڑھے؟ تو انہوں نے عرض کی: وہ تو مسجد میں داخل نہیں ہوگا۔ تو آپ نے فرمایا: کیوں! کیا وہ جنبی ہے؟ انہوں نے عرض کی: وہ نصرانی ہے، تو آپ نے انہیں خوب جھڑکا اور فرمایا۔ تو انہیں قریب نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دور کیا ہے اور تو ان کی عزت و تکریم نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل و رسوا کیا ہے اور تو انہیں امین نہ بنا جبکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خائن قرار دیا ہے۔ (لا تدنهم و قد اقصاهم الله ولا تكرمهم و قد اهانهم الله ولا تأمنهم قد خونهم الله)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: تم اہل کتاب کو عامل نہ بناؤ کیونکہ وہ سود اور رشوت کو حلال سمجھتے ہیں اور اپنے اموال اور اپنی رعایا پر ان لوگوں سے مدد طلب کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔ (لا تستعملوا اهل الكتاب فانهم يستحلون الرشا واستعينوا على امور كم و على رعيتكم بالذين يخشون الله تعالى) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا گیا: یہاں حیرہ کی عیسائیوں میں سے ایک آدمی ہے اس سے بہتر لکھنے والا کوئی نہیں ہے اور نہ ہی قلم کے ساتھ اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے۔ کیا وہ آپ کی طرف سے کاتب نہ ہو جائے؟ تو آپ نے فرمایا: میں مومنین کے سوا کسی کو راز دار نہیں بناؤں گا(1)۔ پس اہل ذمہ کو کاتب بنانا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سوا دیگر بیع و شراء کے معاملات میں سے کسی میں ان کا تصرف کرنا اور انہیں نیابت کی ذمہ داری سونپنا جائز ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس زمانے میں اہل کتاب کو کاتب اور امین بنانے کے سبب احوال بدل چکے ہیں اور وہ والیوں اور امراء کے کند ذہن اور جاہل ہونے کے سبب سردار بن گئے ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کوئی خلیفہ بنایا ہے مگر اس کے دو راز دان اور خواص ہیں ان میں سے ایک اسے نیکی کا حکم دیتا ہے اور اس پر برانگیختہ کرتا ہے اور دوسرا اسے شر کا حکم دیتا ہے اور اسے اس پر ابھارتا ہے پس معصوم (اور محفوظ) وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا (اور بچا لیا)۔(2)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مشرکین کی آگ سے روشنی حاصل نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں غریب نہ لکھواؤ(3)''۔ حسن بن ابی الحسن نے اس کی تفسیر اور وضاحت کی اور فرمایا: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارادہ یہ فرمایا ہے کہ تم اپنے معاملات میں سے کسی کے بارے مشرکین سے مشاورت نہ کرو اور اپنی انگوٹھیوں میں اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کندہ نہ کراؤ۔ حسن نے کہا: اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ الآیہ۔(4)

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 496

2۔ صحیح البخاری، کتاب الاحکام، جلد 2، صفحہ 1068، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث 6121، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ مسند احمد بن حنبل، کتاب مسند المکثرین، باب مسند جابر بن عبد اللہ، جلد 3، صفحہ 99، مطبوعہ دار صادر

4۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 296

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ ای من سواکم (یعنی تم اپنے سوا کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ)

فراء نے کہا: وَ یَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِكَ بمعنی سوی ذالك۔ یعنی اس میں دُوۡنَ بمعنی سوئی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِنۡ دُوۡنِكُمۡ یعنی سیرت اور حسن مذہب میں (کسی غیر کو راز دار نہ بناؤ) اور لَا یَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا کا معنی ہے وہ ایسے معاملہ میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے جس میں تمہارے لئے فساد اور بگاڑ ہوگا۔ اور یہ بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ کی صفت کے محل میں ہے۔ کہا جاتا ہے: لا آلو جهدًا یعنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا (کوئی کوتاہی نہیں کروں گا) اور اَلَوۡتُ اَلۡوًا کا معنی ہے میں نے کوتاہی کی۔

امرؤالقیس نے کہا ہے:

وما المرءُ مادامت حُشاشةُ نفسه ... بمدرِكِ اطرافِ الخُطُوبِ ولا آلِ

اس میں ولا آل کا لفظ مذکورہ معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور الخَبَال، الخَبۡل ہے اور الخَبۡل کا معنی فساد اور بگاڑ ہے اور یہ افعال، ابدان اور عقول میں ہوتا ہے۔ اور حدیث میں ہے: من أُصیب بدم أو خَبۡل (1) یعنی وہ جسے ایسا زخم لگا جو عضو کو ضائع اور فاسد کر دے۔ اور الخَبۡل کا معنی اعضاء کا فاسد ہونا ہے اور رَجُلٌ خَبۡلٌ و مُخۡتَبَلٌ (فاسد اور بگڑا ہوا آدمی) اور خَبَلَهُ الحُبُّ (یعنی محبت نے اسے بگاڑ دیا)

اوس نے کہا ہے:

أبنی لُبَیۡنَی لستُم بیَدٍ ... اِلاَّ یدًا مخبولَةَ العَضُدِ

یہ فاسدۃ العضد ہے۔ (یعنی کٹا ہوا فاسد بازو)

فراء نے کہا ہے:

نظَر ابنُ سعدٍ نظرةً و بَتَّ بها ... کانت لصُحۡبك والمِطِیِّ خَبالًا

اس میں بھی خبال بمعنی فساد ہے۔

اور خَبَالًا مفعول ثانی کے اعتبار سے منصوب ہے، کیونکہ الألوُ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اور اگر چاہے تو مصدر (یعنی مفعول مطلق) کی حیثیت سے منصوب مان لے یعنی یخبلونکم خبالًا۔ اور اگر چاہے تو حرف جر کے حذف کے سبب منصوب تصور کر لے یعنی اصل میں بالخبال تھا، جیسا کہ انہوں نے کہا: اوجعته ضربا (یعنی بالضرب میں نے اسے مار کے ساتھ تکلیف دی۔) اور قول باری تعالیٰ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ میں ما مصدریہ ہے، یعنی ودوا عنتکم یعنی وہ پسند کرتے ہیں اسے جو تم پر شاق گزرتی ہے اور العنت کا معنی مشقت ہے (2) اور اس کا معنی و مفہوم سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ یعنی تمہارے لئے عداوت اور تکذیب ان کے مونہوں

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الدیات من قتل لہ قتیل فھو بالخیار بین احدی ثلاث

ایضاً، ابن ماجہ، حدیث 2613، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3898، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 537

(زبانوں) سے ظاہر ہو چکی ہے اور البغضاء بمعنی بغض ہے اور یہ حب (محبت) کی ضد ہے اور البغضاء مصدر مؤنث ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر مونہوں کا ذکر کیا ہے نہ کہ زبانوں کا یہ ان کے اپنی ان باتوں میں لغویات اور بے احتیاط گفتگو کرنے کی طرف اشارہ ہے، پس وہ اس چھپنے والے سے فوق اور اوپر تھے جس کی آنکھوں میں بغض ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس معنی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نہی ہے "کہ آدمی اپنے بھائی کی عزت کے بارے میں اپنے منہ کو حیاء میں رکھے اس کا معنی منہ کھولنا ہے۔ کہا جاتا ہے: شحی الحمار فاہ بالنھیق (گدھے نے ہینگتے ہوئے اپنا منہ کھولا۔) اور شحی الفم نفسہ (منہ بذات خود کھل گیا) اور شحی اللجامُ فم الفرس شَحْیًا (لگام نے گھوڑے کا منہ مکمل طور پر کھول دیا۔) اور جاءت الخیل شواحی۔ یعنی گھوڑے اپنے منہ کھولے ہوئے آئے۔ اس حدیث سے جواز پر دلیل خطاب نہیں سمجھی جا سکتی کہ کوئی اپنے بھائی کی عزت میں خفیۃً داخل ہو جائے، کیونکہ باتفاق علماء وہ حرام ہے۔(1)

اور قرآن کریم میں ہے ولا یغتب بعضکم بعضا الآیہ۔ (اور تم آپس میں ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام ہیں (2)"۔ اور شحو کا ذکر بے احتیاطی اور بے تکلفی کی طرف اشارہ ہے۔ فاعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ اور اس آیت میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دشمن کی شہادت دشمن کے خلاف جائز نہیں ہوتی اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل حجاز نے کہا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ سے اس کا جواز مروی ہے۔ ابن بطال نے ابن شعبان سے بیان کیا ہے کہ اس نے کہا: علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ کسی دشمن کی شہادت اپنے دشمن کے خلاف کسی بھی شے میں جائز نہیں، اگرچہ وہ سراپا عدل ہو اور عداوت عدالت کو زائل کر دیتی ہے تو پھر کافر کی عداوت کا کیا حال ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ قولہ تعالیٰ: وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ یہ خبر دینا اور آگاہ کرنا ہے کہ وہ جو بغض و حسد چھپائے رکھتے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جس کا وہ اپنے مونہوں سے اظہار کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قَدْ بَدَءَ البغضاءُ پڑھا ہے۔ یعنی فعل کو مذکر ذکر کیا ہے، اس لئے کہ البغضاء بمعنی البغض ہے۔(3)

هٰۤاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾

"سنو! تم تو وہ (پاک دل) ہو کہ محبت کرتے ہو ان سے اور وہ (ذرا) محبت نہیں کرتے تم سے اور مانتے ہو تم سب کتابوں کو اور جب وہ تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں: ہم ایمان لائے ہیں اور جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو چباتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے (اے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ فرمائیے: مرجاؤ اپنے غصہ (کی آگ میں جل کر) یقیناً اللہ خوب جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کا"۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 496۔ 2۔ مسلم کتاب الحج، جلد 1، صفحہ 397، اسلام آباد 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 497

قولہ تعالیٰ: هٰٓاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ مراد منافقین ہیں (یعنی تم تو منافقین سے محبت کرتے ہو۔) اور اس پر دلیل یہ ارشاد ہے: وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا (جب وہ تمہیں ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں)۔ ابو العالیہ اور مقاتل نے یہی کہا ہے یہاں المحبة بمعنی مصافاة (یعنی خالص محبت کرنا) ہے۔ یعنی اے مسلمانو! تم تو ان کے ساتھ خالص محبت کرتے ہو اور وہ اپنے نفاق کی وجہ سے تمہارے ساتھ خالص محبت نہیں کرتے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے: تم تو ان کے لئے اسلام کا ارادہ رکھتے ہو اور وہ تمہارے لئے کفر چاہتے ہیں۔ اور یہ قول بھی ہے کہ ان سے مراد یہود ہیں۔ اکثر (علماء) نے یہی کہا ہے۔ الکتاب اسم جنس ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اس سے مراد کتابیں ہیں۔ اور یہودی بعض کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ (البقرہ:91) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے: ایمان لے آؤ اس پر جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں ہم تو (صرف) اس پر ایمان لائے ہیں جو نازل کی گئی ہم پر اور کفر کرتے ہیں اس کے علاوہ (دوسری کتابوں) کے ساتھ۔)

وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا یعنی کہتے ہیں: ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لائے اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ وَاِذَا خَلَوۡا اور جب وہ اپنوں کے درمیان ہوتے ہیں عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ انامل سے مراد انگلیوں کی اطراف (یعنی پورے) ہیں۔ مِنَ الۡغَيۡظِ یعنی وہ تم پر شدید غصہ سے انگلیوں کے پورے چباتے ہیں اور ان کے بعض بعض کو کہتے ہیں: کیا تم ان کی طرف دیکھتے ہو یہ ظاہر ہوئے اور بہت زیادہ ہو گئے۔ اور العضّ کا مفہوم ہے شدید غصے کا اظہار کرنا (1) اس کے نفاذ کی قدرت نہ رکھتے ہوئے اور اسی معنی میں حضرت ابو طالب کا قول ہے:

یعضون غیظا خلفنا بالانامل

(وہ ہمارے پیچھے شدید غصہ کے سبب انگلیوں کو چباتے ہیں۔)

اور دوسرے نے کہا ہے:

إِذَا رَأَوْنِي أَطَالَ اللهُ غَيْظَهُم عَضُّوا مِن الغَيْظِ اطرافَ الأَبَاهِيمِ

جب انہوں نے مجھے دیکھا تو وہ اپنے انگوٹھوں کے اطراف کو غصے سے کاٹنے لگے۔ اللہ تعالیٰ ان کے غصہ میں اور اضافہ کرے۔

کہا جاتا ہے: عَضَّ يَعُضُّ عَضًّا وَعَضِيضًا اور العُضُّ (عین کے ضمہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: اس نے اہل امصار کے چوپاؤں کو چارہ ڈالا۔ مثلاً الکُسب (کمائی) اور النوی المرضوخ (توڑی ہوئی گٹھلی) اسی سے کہا جاتا ہے: أَعَضَّ القوم، جب ان کے اونٹ گھاس کھانے لگیں۔ اور بعیر عُضَاضِيٌّ، یعنی موٹا تازہ اونٹ گویا اسے اس طرف منسوب کیا گیا ہے اور العِضّ (عین کے کسرہ کے ساتھ ہو) تو معنی ہے: لوگوں میں سے انتہائی ہوشیار اور انتہائی چالاک۔ اور عض الانامل یعنی انگلیوں کو کاٹنا سے مراد ایسا فعل ہے جس پر انتہائی غصہ ہو اور آدمی اسے کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، یا ایسے کام میں پڑنا جسے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 538

تبدیل کرنے پر آدمی قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور یہ دانتوں کے ساتھ کاٹنا اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ قریب المرگ آدمی پر ہاتھ کو (دانتوں کے ساتھ) پکڑنا ہوتا ہے اور اسی طرح شرمندہ آدمی کا دانتوں کو ٹکرانا بھی ہوتا ہے، علاوہ ازیں غمزدہ اور پریشان حال آدمی کا زمین پر بیٹھ کر لکیریں لگانا اور کنکریوں کو گننا بھی اسی قبیلے سے ہے۔ اور یہ عض ضاد ساقطہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور عظ الزمان ظاء مشالہ کے ساتھ۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

وعظ زمانٍ یا بن مروان لم یَدَع من المال الآمُسْحَتًا او مَجلَّفُ

اس میں عظ زمان عض الزمان کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔

الانامل کا واحد انملۃ (میم کے ضمہ کے ساتھ) ہے۔ اور میم کو فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے اور ضمہ زیادہ مشہور ہے۔

اور ابوالجوزاء نے جب یہ آیت تلاوت کی تو اس نے کہا: یہ اباضیہ ہیں۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ صفت قیامت تک آنے والے بہت سے اہل بدعت میں پائی جائے گی۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اگر کہا جائے، وہ کیسے نہیں مرے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو فرمائے: کُنْ (تو ہو جا) فیکون (تو وہ ہو جاتی ہے)؟ تو اس کی طرف سے دو جواب دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔۔۔ اس بارے میں مفسرین میں سے علامہ طبری اور کثیر نے کہا ہے: یہ ان کے لئے بددعا ہے۔

یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم فرماؤ تم مسلسل اپنے غصہ میں جلتے رہو یہاں تک کہ تم مرجاؤ۔ اور اس پر توجیہ یہ ہے کہ آپ ان کے لئے ان کے سامنے اور پیچھے بددعا کرتے رہیں بخلاف لعنت کرنے کے۔(1)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس کا معنی ہے کہ انہیں خبر دے دو کہ وہ اسے بالکل نہ پا سکیں گے جس کی آرزو اور خواہش رکھتے ہیں، کیونکہ موت اس کے قریب ہے تو اس معنی کی بنا پر دعا کا معنی زائل ہو گیا اور تقریع اور غصہ دلانے کا معنی باقی رہا اور یہ معنی مسافر بن ابی عمرو کے قول کے ساتھ بھی جاری ہوتا ہے:

و یتمنی ف اَرومتنا و نفقأ عین من حسدا

اور اسی معنی کی طرف یہ قول باری تعالیٰ بھی راہنمائی کرتا ہے: مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَاۗءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ (الحج: 15) (اور جو شخص یہ خیال کئے بیٹھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کی مدد نہیں کرے گا نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں تو اسے چاہیے کہ لٹک جائے ایک رسی کے ذریعے چھت سے پھر (گلے میں پھندا ڈال کر) اسے کاٹ دے۔)

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾

1۔ تفسیر طبری، کتاب آل عمران، جلد 4، صفحہ 87، اسلام آباد

"(ان کا حال تو یہ ہے کہ) اگر پہنچے تمہیں کوئی بھلائی تو بری لگتی ہے انہیں اور اگر پہنچے تمہیں کوئی تکلیف تو (بڑے) خوش ہوتے ہیں اس سے اور اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو نہ نقصان پہنچائے گا تمہیں ان کا فریب کچھ بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ وہ کرتے ہیں (اس کا) احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

قولہ تعالیٰ: اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ، سلمی نے اسے یا کے ساتھ پڑھا ہے اور باقیوں نے تا کے ساتھ۔ اور یہ لفظ عام ہے ہر اس شے کو شامل ہے جو اچھی ہو سکتی ہے اور بری ہو سکتی ہے۔ اور مفسرین نے جو (خِصب) شادابی (جَدْب) خشک سالی، مومنین کا اجتماع اور ان کے درمیان فرقت کا ہونا اور دیگر ان جیسے اقوال مثالیں ذکر کی ہیں اور یہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور آیت میں معنی یہ ہے کہ ہر وہ جس کی یہ حالت ہو کہ اس میں شدید عداوت اور حقد و کینہ ہو اور مسلمانوں پر تکالیف آنے کے وقت اسے خوشی اور مسرت ہوتی ہو وہ اس اہل نہیں کہ اسے راز دار بنایا جائے، بالخصوص جہاد جیسے اس امر عظیم میں جو کہ دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہے۔

کسی کہنے والے نے کتنا خوب کہا ہے:

کل العداوة قد تُرجی افاقتها الّا عداوة مَن عاداك مِن حسد

ہر عداوت اور دشمنی کے ختم ہونے کی امید کی جا سکتی ہے سوائے اس کی عداوت کے جس نے تیرے ساتھ حسد کیا۔

وَ اِنْ تَصْبِرُوْا اور اگر تم ان کی اذیت رسانی پر صبر کرتے رہو(1) اور طاعت اور مومنین کی محبت و دوستی پر صبر کرتے رہو وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا کہا جاتا ہے: ضارہ یضورہ یَضِیْرُہٗ ضَیْرًا وَ ضَوْرًا، پس اللہ تعالیٰ نے صبر اور تقویٰ کے ساتھ ان کے ضرر اور نقصان کی نفی کی شرط بیان کی ہے اور یہ مومنین کے لئے تسلی اور ان کے دلوں کے لئے باعث تقویت ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں...... کہ حرمیان اور ابو عمرو نے لَا یَضِرْكُمْ پڑھا ہے یہ ضَارَ یَضِیْرُ سے ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا قول لَا ضَیْرَ ہے۔ اور دو ساکن ملنے کی وجہ سے یا کو حذف کر دیا گیا، کیونکہ جب را سے ضمہ کو حذف کر دیا گیا تو را اور یا دونوں ساکن باقی رہ گئیں لہٰذا یا کو حذف کر دیا گیا اور اسے ہی حذف کرنا اولیٰ ہے، کیونکہ اس کا ماقبل اس پر دلالت کرتا ہے اور کسائی نے بیان کیا ہے کہ انہوں نے ضَارَہٗ یَضُوْرُہٗ سنا ہے اور انہوں نے لَا یَضُرُّكُمْ کی اجازت دی ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَا یَضْرُرْكُمْ ہے۔ [اور کوفیوں نے لَا یَضُرُّكُمْ را کو ضمہ اور تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ ضَرَّ یَضُرُّ سے ہے۔] اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فا کو مضمر ماننے کی تقدیر پر مرفوع ہو اور معنی ہو: فلا یضرکم، (پس وہ تمہیں نقصان نہ دے گا)

اور اسی کے مطابق شاعر کا قول ہے:

مَن یفعلِ الحسناتِ اللهُ یشکرُها

(جو نیکیاں کرے گا اللہ تعالیٰ ان کی قدر افزائی فرمائے گا۔) یہ کسائی اور فراء کا قول ہے، یا یہ تقدیم کی نیت پر مرفوع ہوگا۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 539

اور سیبویہ نے کہا ہے:

انك اِن يُصْرَعْ اخوك تُصْرَعُ

(بلاشبہ تو پچھاڑ دیا جائے گا اگر تیرے بھائی کو پچھاڑ دیا گیا۔)

آیت کا مفہوم یہ ہوگا لا یضرکم ان تصبروا و تتقوا (تمہارا صبر کرنا اور تمہارا ڈرنا (اور تقویٰ اختیار کرنا) تمہیں کوئی نقصان نہیں دے گا۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ اسے جزم دی جائے اور دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے راء کو ضمہ دیا جائے کیونکہ وہ ضمہ کے بعد واقع ہے۔ اور اسی طرح فعل مجزوم ہونے کی بنا پر را کے فتحہ کی قرأت بھی ہے اور اجتماع ساکنین کی صورت میں فتحہ کے خفیف حرکت ہونے کی وجہ سے یَضُرَّكُمْ کو مفتوح پڑھا گیا ہے۔ اسے ابوزید نے مفضل عن عاصم سے روایت کیا ہے۔ اسے مہدوی نے بیان کیا ہے۔ اور نحاس نے بیان کیا ہے: اور مفضل ضبی نے عاصم سے لَا يَضُرِّكُمْ گمان کیا ہے کہ اجتماع ساکنین کی وجہ سے را کو کسرہ دیا گیا ہے۔

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۲۱

''اور یاد کرو (اے محبوب!) جب صبح سویرے رخصت ہوئے آپ اپنے گھروں سے (اور میدان احد میں) بٹھا رہے تھے مومنوں کو مورچوں پر جنگ کے لئے۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ، اِذْ میں عامل فعل مضمر ہے اور تقدیر کلام ہے: واذكر اذ غدوت، یعنی اور آپ یاد کرو (اے محبوب!) جب آپ صبح سویرے چلے۔ مِنْ اَهْلِكَ اپنے گھر سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے۔ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ یہ غزوہ احد تھا اور اسی کے بارے یہ مکمل آیت نازل ہوئی۔ اور مجاہد، حسن، مقاتل اور کلبی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: یہ غزوہ خندق کے بارے ہے اور حسن سے یہ بھی منقول ہے کہ یہ غزوہ بدر کے بارے ہے اور جمہور کا قول یہ ہے کہ یہ غزوہ احد کے بارے ہے (1) اور اسی پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں۔) اور یہ بلاشبہ غزوہ احد میں ہوا تھا۔ اور مشرکین نے تین ہزار افراد پر مشتمل لشکر کے ساتھ مدینہ طیبہ پر (چڑھائی کا) قصد کیا تاکہ وہ ان سے غزوہ بدر کی ناکامی اور شکست کا بدلہ و انتقام لیں، پس وہ احد پہاڑ کے نزدیک مدینہ طیبہ کے بالمقابل وادی کے کنارے جا اترے، یہ ۳ھ بارہ شوال بدھ کا دن تھا، ہجرت سے اکتیسواں مہینہ شروع ہو چکا تھا اور وہ جمعرات کے دن وہاں مقیم ہو گئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی مدینہ طیبہ میں تھے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ کی تلوار میں دندانے پڑ گئے ہیں اور یہ کہ آپ کے لئے بیل ذبح کیا جا رہا ہے اور یہ کہ آپ نے اپنا دست مبارک محفوظ اور مضبوط زرہ میں داخل کیا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تعبیر یہ فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کا ایک گروہ شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ آپ کے خاندان میں سے ایک آدمی کو بھی شہید کر دیا جائے گا اور یہ کہ محفوظ زرہ مدینہ طیبہ ہے۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 539

اسے مسلم نے نقل کیا ہے(1)۔ اور یہ سب کچھ اسی کے مطابق ہے جو کچھ اس غزوہ میں سے معروف و مشہور ہے۔ اور تبوّؤ کا اصل معنی ہے گھر بنانا، (ٹھکانا بنانا) بوّأتہ منزلا کہا جائے گا جب تو کسی جگہ سکونت اختیار کرے اور اسی معنی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: من کذب علی متعمد افلیتبوأ مقعدہ من النار(2) (جس نے عمداً میرے بارے میں جھوٹ بولا تو اسے چاہیے کہ وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے) یعنی اس میں گھر بنالے۔ پس تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ کا معنی ہے آپ ان کے لئے صف بندی کی جگہیں بنا رہے تھے اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے خواب میں دیکھا جیسا کہ ایک سونے والا دیکھتا ہے گویا کہ میں پے در پے مینڈھے لا رہا ہوں اور گویا میری تلوار کی دھار ٹوٹ گئی ہے تو میں نے تعبیر یہ کی کہ میں قوم کے مینڈھے کو قتل کروں گا اور میں نے اپنی تلوار کی دھار ٹوٹنے کی تعبیر یہ کی کہ میری آل میں سے ایک آدمی شہید کر دیا جائے گا۔'' پس حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طلحہ کو قتل کیا اور وہ (کفار کا) علمبردار تھا۔ اور موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب سے بیان کیا ہے: مہاجرین کا علمبردار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی تھا تو اس نے کہا: میں ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کروں گا جو میرے ساتھ ہے، تو طلحہ بن عثمان جو کہ سعید بن عثمان لخمی کا بھائی تھا اس نے اسے کہا: اے عاصم! کیا تیرے لئے مقابلے کی طاقت ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں۔ پس وہ آدمی اس پر تیزی سے جھپٹا اور طلحہ کے سر پر تلوار دے ماری یہاں تک کہ تلوار اس کی داڑھی پر لگی اور اس نے اسے قتل کر دیا تو علمبردار کا قتل ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تصدیق ہے کانی مردف کبشا۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

''جب ارادہ کیا دو جماعتوں نے تم میں سے کہ ہمت ہار دیں حالانکہ اللہ تعالیٰ دونوں کا مددگار تھا (اس لئے اس نے اس لغزش سے بچا لیا) اور صرف اللہ پر توکل کرنا چاہیے مومنوں کو۔''

اِذْ میں عامل تُبَوِّئُ یا سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ہے۔ اور دو جماعتوں سے مراد خزرج میں سے بنو سلمہ اور اوس میں سے بنو حارثہ ہیں اور یہ دونوں غزوہ احد میں لشکر کے دو پہلو تھے(3)۔ اور اَنْ تَفْشَلَا کا معنی ہے کہ وہ بزدلی کا اظہار کریں (اور ہمت ہار دیں)۔ بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا: ہمارے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا فرمایا: ہمارے دو گروہ، بنو حارثہ اور بنو سلمہ تھے اور پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ نازل نہ ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا(4) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بنو حارث، بنو خزرج اور بنو نبیت تھے اور نبیت بنی اوس میں سے عمرو بن مالک تھے۔

اور فشل سے مراد بزدلی ہے، اس کا لغوی معنی یہی ہے اور دونوں گروہوں کا ارادہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب لشکر کے

1۔ بخاری کتاب المناقب، حدیث 3352، ضیاء القرآن پبلی کیشنز　2۔ مسلم المقدمہ، جلد 1، صفحہ 7، اسلام آباد

3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 541　4۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4192، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مدینہ منورہ سے باہر نکلنے کے بعد عبداللہ بن ابی اپنے منافق ساتھیوں سمیت واپس لوٹ آیا (تو انہوں نے بھی ارادہ کیا) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی حفاظت فرمائی اور یہ واپس نہ لوٹے، اسی کے بارے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے **وَاللّٰہُ وَلِیُّھُمَا** یعنی اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی حفاظت فرما رہا تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ انہوں نے (لشکر کے ساتھ) نکلنے سے (پیچھے) بیٹھے رہنے کا ارادہ کیا اور وہ ان میں سے صغیر (چھوٹے) تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ان کے دلوں میں آنے والا خیال تھا جو ان کے دلوں میں پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع فرما دیا تو ان کی بصیرت میں اضافہ ہو گیا اور اس بزدلی اور سستی کا مظاہرہ نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بچا لیا اور ان میں سے بعض نے بعض کی مذمت کی اور وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے یہاں تک کہ آپ مشرکین کے قریب جا پہنچے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار افراد کے ساتھ مدینہ طیبہ سے نکلے تھے اور پھر عبداللہ بن ابی بن سلول اپنے تین سو ساتھیوں کو ساتھ لے کر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے واپس لوٹ آیا، کیونکہ اس کی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا جب اس نے مدینہ طیبہ میں بیٹھے رہنے اور وہیں قتال کرنے کا اشارہ دیا تھا اگر دشمن ان پر حملہ آور ہو اور اس کی رائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے موافق تھی (1) اور اکثر انصار نے اس کا انکار کیا تھا، اس کا ذکر آگے آئے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے ساتھ تشریف لے گئے اور ان میں سے وہ شہید ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کے ساتھ عزت و تکریم عطا فرمائی۔ امام مالک نے فرمایا ہے، غزوہ احد میں مہاجرین میں سے چار اور انصار میں سے ستر افراد نے جام شہادت نوش کیا۔

المقاعد: مقعد کی جمع ہے اور اس کا معنی ہے بیٹھنے کی جگہ اور یہ مواقف کے قائم مقام ہے لیکن لفظ قعود ثبوت پر دال ہے اور بالخصوص تیر انداز ثابت قدم تھے۔ مختصراً غزوہ احد کا یہی مفہوم ہے، اس کا تفصیلی اور شافی بیان آگے آئے گا۔

اس دن مشرکین کے ساتھ سو گھوڑ سوار تھے اور ان پر خالد بن ولید سربراہ تھے اور اس دن مسلمانوں کے ساتھ کوئی گھوڑا نہ تھا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک زخمی ہوا اور پتھر کے ساتھ نچلی طرف سے دائیں جانب کے چار دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک کا خود توڑ دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی امت اور دین کی جانب سے افضل و اعلیٰ جزا عطا فرمائی جو اپنے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نبی علیہ السلام کو اس کے صبر پر عطا فرمائی اور وہ جس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دن اعراض کیا تھا وہ عمرو بن قمیہ لیثی اور عتبہ بن ابی وقاص تھا اور کہا گیا ہے: فقیہ محمد بن مسلم بن شہاب کا دادا عبداللہ بن شہاب وہ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو زخمی کیا تھا۔ واقدی نے کہا ہے: ہمارے نزدیک ثابت یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو زخمی کرنے والا ابن قمیہ تھا۔ اور جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر پتھر مار کر آپ کے دندان مبارک کو شہید کیا تھا وہ عتبہ بن ابی وقاص تھا۔ واقدی نے اپنی سند کے ساتھ نافع بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے مہاجرین میں سے ایک آدمی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: میں احد کے دن حاضر تھا اور میں

1۔ دلائل النبوۃ، جلد 3، صفحہ 226

نے تیر دیکھے ہر جانب سے آ رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان میں تھے اور ہر تیر آپ سے پھیر دیا جاتا تھا۔
تحقیق میں نے عبداللہ بن شہاب زہری کو اس دن یہ کہتے ہوئے سنا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر میری راہنمائی کرو، محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر میری راہنمائی کرو، اگر وہ بچ گئے تو میں نہیں بچ سکوں گا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پہلو میں تھے کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ تھا پھر وہ آپ سے آگے گزر گیا، تو اس بارے میں صفوان نے اسے ڈانٹ پلائی تو اس نے کہا: قسم بخدا! میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں، میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں: بلاشبہ انہیں ہم سے محفوظ رکھا گیا ہے! ہم چار آدمی نکلے اور ہم نے آپ کے قتل کا آپس میں پختہ معاہدہ کیا [لیکن ہم آپ پر راہ نہ پا سکے۔] اور ایک پتھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آ لگا یہاں تک کہ آپ گڑھے میں گر گئے، اسے ابو عامر راہب نے مسلمانوں کے لئے بطور دھوکہ اور چال کے کھودا تھا پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پہلو کے بل گرے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہارا دیا یہاں تک کہ آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد مالک بن سنان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم سے خون چوس لیا اور آپ کے خود کے دو حلقے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک میں پیوست ہو گئے اور انہیں حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے نکالا۔ اور اپنے دانتوں کے ساتھ انہیں پکڑا تو وہ گر گئے، تو آپ نے انہیں جڑ سے توڑ دیا اور آپ رضی اللہ عنہ کو ان کا ٹوٹنا خوبصورت لگتا تھا اور اس غزوہ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ آپ کو وحشی نے قتل کیا تھا۔ وحشی جبیر بن مطعم کا غلام تھا اور جبیر نے اس کو کہا: اگر تو نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کیا تو ہم تجھے گھوڑوں کی لگام میں تھ یں گے اور اگر تو نے علی بن ابی طالب کو قتل کیا تو ہم تجھے ایک سو اونٹنیاں دیں گے وہ سب کی سب سیاہ ہوں گی اور اگر تو نے حمزہ کو قتل کیا تو تو آزاد ہو جائے گا، وحشی نے کہا: رہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان پر نگران اور محافظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے کوئی بھی ان تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور جہاں تک علی (رضی اللہ عنہ) کا تعلق ہے تو انہیں جس نے بھی مقابلے کی دعوت دی ہے انہوں نے اسے قتل کر دیا ہے اور رہا حمزہ! تو وہ بہادر آدمی ہیں، قریب ہے کہ میرا ان سے آمنا سامنا ہو جائے تو میں انہیں قتل کر دوں۔ اور وہاں ہند بھی تھی جب وحشی تیار ہوا یا وہ اس کے پاس سے گزری تو اس نے کہا: ہاں ابو دسمہ! تو (سینہ کو) ٹھنڈا کر تو تو بھی پر سکون اور ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پس وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے مشرکین کی جماعت پر حملہ کر دیا، پس جب آپ اپنے حملہ سے کامیابی کے ساتھ واپس لوٹے اور وحشی کے پاس سے گزرے تو اس نے چھوٹے نیزے کے ساتھ آپ پر حملہ کر دیا اور وہ آپ کو جا لگا اور جان لیوا ثابت ہوا رحمۃ اللہ علیہ۔

ابن اسحاق نے بیان کیا ہے: پھر ہند نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چاک کر کے کلیجہ باہر نکالا اور اسے دانتوں کے ساتھ چبایا لیکن اسے نگل نہ سکی اور پھر اسے پھینک دیا پھر ایک بلند چٹان پر چڑھ گئی اور بلند آواز سے چیخ کر یہ کہا:

نحن جزيناكم بيوم بدر والحرب بعد الحرب ذات سُعُرِ

(اے مسلمانو!) ہم نے یوم بدر کا بدلہ چکا دیا اور جنگ کے بعد جنگ آگ کے شعلوں کی طرح بھڑکتی ہے:

ما كان عن عُتْبَة لي من صَبْرِ ولا أخي و عمه و بكرى

مجھے (اپنے باپ) عتبہ، اپنے بھائی (ولید بن عتبہ)، اس کے چچا (شیبہ بن ربیعہ) اور اپنے پہلے بیٹے (حنظلہ بن ابی

سفیان) سے صبر نہیں آتا تھا۔

شفیتُ نفسی و قضیتُ نذری　　شفیتَ وحشی غلیلَ صدری

میں نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا اور اپنی نذر پوری کر لی۔ اے وحشی! تو نے میرے سینے کی جلن کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔

فشکرُ وحشی علیّ عمری　　حتی ترمّ اعظُمی فی قبری

پس مجھ پر ساری زندگی وحشی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے یہاں تک کہ میری ہڈیاں میری قبر میں بوسیدہ ہو جائیں۔

پھر اس کا جواب ہند بنت اثاثہ بن عباد بن عبد المطلب نے دیا اور کہا:

خَزِیتِ فی بدر و بعد بدر　　یابنتَ وَقّاعٍ عظیم الکفر

اے انتہائی گھٹیا اور پرلے درجے کے کافر کی بیٹی! تو بدر میں بھی رسوا ہوئی اور بدر کے بعد بھی۔

صبحکِ اللہُ غداۃَ الفجرِ　　مِلْهَاشمیین الطّوال الزُهرِ

اللہ تعالیٰ علی الصبح دراز قد اور خوش اخلاق ہاشمیوں کو تیرے پاس لے آیا:

بکلّ قَطّاعٍ حُسَامٍ یَفْرِی　　حمزۃُ لیثی و علیّ صقرِی

میرے شیر حضرت حمزہ اور میرے شاہین حضرت علی رضی اللہ عنہما ہر تیز کاٹنے والی تلوار کے ساتھ تمہارے سر قلم کر رہے تھے،

اذ رَامَ شیبُ وابوکِ غدری　　فخضبا منه ضواحِی النّحرِ

و نذرکِ السوءَ فشرّ نَذْرِ

جب شیبہ اور تیرے باپ (عتبہ) نے میرے ساتھ بدعہدی کا ارادہ کیا تو ان دونوں نے (یعنی حضرت حمزہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے) اس کے سینے کے کھلے اطراف کو لہولہان کر دیا اور تیرا بدی کی نذر ماننا بہت بری نذر ہے۔

اور حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پر روتے ہوئے یہ اشعار لکھے:

بکت عینی و حُقَّ لها بکاها　　و ما یغنی البکاءُ ولا العَوِیلُ

میری آنکھ رو پڑی اور رونا اس کا حق بنتا ہے لیکن رونے اور واویلا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں:

علی أسَدِ الالٰه غداۃ قالوا　　أحمزۃ ذاکم الرجل القتیل

(میری آنکھیں) شیر خدا پر اس روز (رو پڑیں) جب لوگوں نے کہا: کیا یہ مقتول آدمی حمزہ ہیں؟

أُصیبَ المسلمون به جمیعا　　هناك، و قد أصیب به الرّسول

آپ کے قتل سے سب مسلمانوں کو تکلیف پہنچی اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تکلیف پہنچی۔

أبا یَعلَی لك الأركان هُدّت　　وأنت الماجد البَرّ الوَصُول

اے ابو یعلیٰ! (یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) آپ کے تمام اعضاء کاٹ دیئے گئے حالانکہ آپ ایک شریف، نیک اور ہر ایک سے تعلق رکھنے والے آدمی تھے۔

علیك سلامِ ربك فی جنان　مخالِطها نعیم لایزول

آپ پر آپ کے رب کی طرف سے ان جنتوں میں سلام پہنچے جن میں لازوال نعمتیں ملتی رہیں گی۔

ألا یا هاشم الأخیار صبرا　فکل فعالِکم حسن جمیل

اے قبیلہ ہاشم میں سب سے بہتر فرد صبر کر، تمہارا ہر کام نہایت حسین وجمیل ہے۔

رسولُ الله مصطبر کریم　بأمر الله ینطق اذ یقول

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صابر اور کریم ہیں، وہ جب بھی کچھ فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہی بولتے ہیں۔

ألا مَنْ مُبْلِغٌ عنّی لُؤَیًّا　فبعد الیومِ دائلَةٌ تدُول

ارے کون شخص ہے جو میری طرف سے قبیلہ لؤی کو یہ پیغام پہنچادے کہ آج کی جنگ کے بعد ایک دوسری جنگ کی نوبت آکر رہے گی۔

و قَبْلَ الیومِ ماعرفوا و ذاقوا　وقائِعنا بها یُشفی الغَلِیلُ

اور آج کی جنگ سے پہلے (غزوہ بدر میں) جو کفار نے ہمیں خوب پہچان لیا۔ اور ہمارے مقابلے کا مزہ چکھ لیا (وہ بھی پہنچ دے) اس جنگ میں ہمارے تصادم سے پیاسوں کی پیاس بجھائی جاتی رہی۔

نَسِیتم ضربَنا بقلیبِ بدر　غداةَ أتاکم الموتُ العَجِیل

قلیب بدر کے پاس تم ہماری شمشیر زنی کو بھول گئے ہو جس روز موت تمہارے پاس بڑی تیزی سے آرہی تھی۔

غداة ثوَی أبوجهل صریعا　علیه الطیر حَائِمَةٌ تجُول

جس روز ابوجہل دھڑام سے گر کر ہلاک ہوگیا اور اس کے اوپر پرندے گھوم گھوم کر آجا رہے تھے۔

و عتبة وابنه خَرّا جمیعا　و شیبةُ عضه السیف الصقیلُ

اور عتبہ اور اس کا بیٹا دونوں زمین پر گر پڑے اور شیبہ کو بھی صیقل کی ہوئی تلوار نے کاٹ کر رکھ دیا۔

و مَتْرُکْنَا أُمَیَّةَ مُجْلَعِبًا　و فی حیزومِهٖ لَدْنٌ نبیلُ

اور ہم نے امیہ کو بھی زمین پر دراز کر دیا درآنحالیکہ اس کے سینے کے نچلے حصے میں ایک بہت بڑا نیزہ داخل تھا۔

و هَامَ بنی ربیعة سائلوها　ففی اسیافنا منها فلول

اور بنی ربیعہ کی کھوپڑیوں سے پوچھو، ان کو کاٹنے کی وجہ سے ہماری تلواروں میں دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

آلا یا هندُ فابکی لا تَمَلِّی　فَانتِ الوَالِهُ العَبْرَی الهبولُ

ارے اے ہند! اب خوب رو اور رونے سے نہ اکتا کیونکہ تو ہی شدت غم کی وجہ سے بڑے بڑے آنسو بہانے والی اور اپنے عزیزوں کو کھودینے والی ہے۔

آلا یا هندُ لاتُبْدِی شمَاتًا　بحمزةَ اِنَّ عِزَّکُم ذَلِیلُ

ارے اے ہند! تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر خوشی کا اظہار نہ کر کیونکہ تمہاری عزت خاک میں مل چکی ہے۔

اور آپ کی بہن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی مرثیہ کہا اور وہ کتب سیرت میں مذکور ہے۔ رضی اللہ عنہم

قولہ تعالیٰ: وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ توکل کا بیان ہے، توکل کا لغوی معنی: اظہار العجز والاعتماد علی الغیر ہے (یعنی عجز کا اظہار کرنا اور غیر پر اعتماد کرنا) اور وَاكَلَ فلان (کہا جاتا ہے) جب کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے اپنا کام ضائع کر دے۔

توکل کی حقیقت میں علماء نے اختلاف کیا ہے، پس حضرت سہل بن عبداللہ سے اس کے بارے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: قالت فرقۃ۔ الرضا بالضمان، وقطع الطّمع من المخلوقین ایک جماعت نے کہا ہے: توکل سے مراد ضمان کے ساتھ راضی ہونا اور مخلوق سے کسی حرص اور لالچ کو ختم کرنا ہے۔ اور ایک قوم نے کہا ہے: التوکل ترك الأسباب والرکون الی مسبب الأسباب کہ توکل سے مراد اسباب کو ترک کرنا ہے اور مسبب الاسباب کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ پس جب کوئی سبب اسے مسبب سے مشغول کر دے گا تو اس سے توکل کا اسم بھی زائل ہو جائے گا۔ حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: جنہوں نے کہا ہے کہ توکل سبب ترک کرنے کے ساتھ ہوتا ہے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں طعن کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا (پس تم اس سے کھاؤ جو تم نے حلال طیب (مال) کمایا) تو اس میں غنیمت بمعنی کمائی ہے اور مزید ارشاد فرمایا: فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (تو یہ بھی عمل ہے۔

اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ العبدَ المحترِفَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ کوئی پیشہ (اور کام) کرنے والے بندے کو پسند فرماتا ہے۔) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سریہ پر قرض دیتے تھے اور آپ کے سوا کسی اور نے کہا ہے: یہ عام فقہاء کا قول ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کا معنی یہ ہے ھو الثقۃ باللہ والایقان بأن قضاءہ ماض کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پختہ یقین رکھنا اور یہ ایقان رکھنا کہ اس کی قضا اور فیصلہ نافذ ہونے والا ہے اور سعی اور محنت کرنے میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع کرنا ایسے کاموں میں جن میں اسباب ضروری ہیں مثلاً کھانا، پینا، دشمن سے احتیاط اور بچاؤ کرنا، اسلحہ تیار کرنا اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو استعمال کرنا جن کا تقاضا اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کرتی ہے اور یہی موقف محققین صوفیہ نے اختیار کیا ہے لیکن ان کے نزدیک اسم توکل ان اسباب کے ساتھ طمانینت وراحت کے حصول اور دلوں کو ان کی طرف ملتفت کرنے کا تقاضا نہیں کرتا، کیونکہ یہ نہ تو کوئی نفع لا سکتے ہیں اور نہ کوئی ضرر دور کر سکتے ہیں، بلکہ سبب اور مسبب دونوں ہی اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں اور سب اسی کی جانب سے اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے اور متوکل کی جانب سے ان اسباب کی طرف جھکاؤ اور میلان واقع ہوتا ہے تو وہ اس اسم (کے مفہوم) سے نکل جاتا ہے پھر توکل کرنے والوں کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔

(۱) توکل کی قدرت رکھنے والے کی حالت! یہ تو ان اسباب میں سے کسی شے کی طرف اپنے دل کے ساتھ متوجہ ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی وہ حکم امر کے سوا ان میں مشغول ہوتا ہے۔

(۲) قدرت نہ رکھنے والے کی حالت: اور یہ وہ ہوتا ہے جس کی توجہ ان اسباب کی طرف وقتاً فوقتاً ہو جاتی ہے مگر وہ عملی

طریقوں اور دلائل قطعیہ اور حالیہ ذوق کے ساتھ ان کو اپنے آپ سے دور رکھتا ہے، پس وہ اسی طرح کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے جود و عطا کے ساتھ قدرت رکھنے والے متوکلین کے مقام پر فائز فرما دیتا ہے اور اسے عارفین کے درجات کے ساتھ ملا دیتا ہے۔

وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

"اور بے شک مدد کی تھی تمہاری اللہ تعالیٰ نے (میدان) بدر میں حالانکہ تم بالکل کمزور تھے۔ پس ڈرتے رہا کرو اللہ سے تاکہ تم (اس بروقت امداد کا) شکر ادا کر سکو۔ (عجب سہانی گھڑی تھی) جب آپ فرما رہے تھے مومنوں سے: کیا تمہیں یہ کافی نہیں کہ تمہاری مدد فرمائے تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے جو اتارے گئے ہیں۔ ہاں کافی ہے بشرطیکہ تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور (اگر) آدھمکیں کفار تم پر تیزی سے اسی وقت تو مدد کرے گا تمہاری تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔"

اس میں چھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ غزوہ بدر سترہ رمضان المبارک، بروز جمعہ ہجرت کے اٹھارہویں ماہ واقع ہوا، اور بدر، وہاں پانی کا ایک کنواں ہے اسی سبب سے اس جگہ کا نام بدر ہے اور شعبی نے کہا ہے: وہ پانی قبیلہ جہینہ کے ایک آدمی کا تھا اس کا نام بدر تھا(1) اور اس وجہ سے اس جگہ کا نام بدر رکھا گیا۔ پہلا معنی زیادہ اور عام ہے۔ واقدی وغیرہ نے کہا ہے: بدر غیر منقول جگہ کا نام ہے اس کا ذکر عنقریب واقعہ بدر کے ضمن میں سورۃ الانفال میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اور اَذِلَّةٌ کا معنی ہے، بہت کم، تھوڑے، کیونکہ وہ اس دن تین سو تیرہ یا چودہ آدمی تھے(2)۔ اور ان کے دشمن کی تعداد نو سو سے ہزار تک کے درمیان تھی۔ اور اذلۃ ذلیل کی جمع ہے۔ اور اس مقام پر ذل کا اسم استعارۃً استعمال کیا گیا ہے، وہ اپنی ذاتوں میں تو یقیناً عزت والے اور غالب تھے، لیکن اپنے دشمنوں کی طرف اپنی نسبت کے اعتبار سے اور زمین کے مختلف حصص میں بسنے والے جمیع کفار کے مقابلے میں غور و فکر کے وقت ان کی قلت اور کمی یہ تقاضا کرتی ہے کہ ان پر غلبہ پا لیا جائے گا۔ اور النصر کا معنی عون (مدد کرنا) ہے، پس اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر کے دن ان کی مدد فرمائی اور ان میں مشرکین کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور اسی دن پر اسلام کی بنیاد پڑی اور یہ وہ پہلی جنگ تھی جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ غزوات میں شرکت

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542　2۔ ایضاً

فرمائی اور ان میں سے آٹھ میں باقاعدہ جنگ میں حصہ لیا(1)۔ اور اسی میں ابن اسحاق سے یہ روایت ہے انہوں نے بیان کیا: میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے ملا اور میں نے ان سے پوچھا: کتنے غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے؟ تو انہوں نے فرمایا: انیس غزوات میں۔ پھر میں نے پوچھا: کتنے غزوات میں تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے؟ تو انہوں نے جواباً کہا: سترہ غزوات میں۔ پھر میں نے کہا: وہ کون سا پہلا غزوہ ہے جس میں آپ شریک ہوئے؟ انہوں نے فرمایا: ذات العُسیر یا ذات العشیر(2)۔ اور یہ سب کچھ اس کے خلاف ہے جو اہل تاریخ وسیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کتاب الطبقات میں کہا ہے: بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات ستائیس ہیں اور آپ کے سرایا چھپن ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ وہ چھیالیس ہیں اور وہ جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قتال کیا ہے وہ بدر، احد، مریسیع، خندق، خیبر، قریظہ، الفتح، حنین اور طائف ہیں۔ ابن سعد نے کہا ہے: یہ وہ ہے جس پر ہمارا اجماع ہے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر میں، خیبر سے واپسی پر وادی القریٰ میں اور الغابہ (شام کی طرف مدینہ طیبہ کے قریب ایک جگہ ہے) میں قتال کیا ہے(3) اور جب یہ ثابت ہو گیا تو ہم کہتے ہیں کہ حضرت زید اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک نے اس کے بارے خبر دی ہے جو اس کے علم یا اس کے مشاہدہ میں تھا۔ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ کا یہ قول: ''پہلا غزوہ جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک ہوئے وہ ذات العسیر ہ ہے''، یہ بھی اس کے خلاف ہے جو اہل التواریخ والسیر نے کہا ہے۔ محمد بن سعد نے کہا ہے: غزوہ عشیرہ سے پہلے تین غزوات ہوئے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس ان میں شریک ہوئے۔ اور ابن عبدالبر نے ''کتاب الدرر فی المغازی والسیر'' میں کہا ہے: پہلا غزوہ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود شریک ہوئے غزوہ ودان ہے اور یہ صفر میں واقع ہوا اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچے تو ماہ ربیع الاول کی بارہ راتیں گزر چکی تھیں، پھر آپ بقیہ ربیع الاول اور ۲ ھ کے صفر تک وہیں مقیم رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذکور صفر کے مہینے میں نکلے اور مدینہ طیبہ پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو عامل مقرر فرمایا حتیٰ کہ آپ ودان پہنچ گئے اور بنی ضمرہ سے مصالحت کر لی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کی جانب لوٹ گئے اور جنگ نہ ہوئی اور اسی کا نام غزوہ ابواء بھی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مذکورہ سال کے ربیع الثانی کے مہینے تک مدینہ طیبہ میں مقیم رہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نکلے اور سائب بن عثمان بن مظعون کو مدینہ طیبہ پر عامل مقرر فرمایا، یہاں تک کہ آپ رَضوىٰ (مدینہ طیبہ میں ایک پہاڑ ہے) کے قریب بواط (قبیلہ جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔) پہنچ گئے پھر آپ مدینہ طیبہ واپس تشریف لے گئے اور جنگ نہ ہوئی۔ بعد ازاں آپ ربیع الثانی کے بقیہ ایام اور کچھ ایام جمادی الاول کے وہیں رہے پھر آپ غزوہ کے ارادہ سے نکلے اور مدینہ طیبہ پر ابوسلمہ بن عبدالاسد کو خلیفہ مقرر کیا اور مِلل (مکہ مکرمہ کی ایک وادی ہے) کے راستے سے عُسیرہ کی طرف چل دیئے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن اسحاق نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں اور حضرت علی

1۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 18، قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ مسلم کتاب الجہاد والسیر، جلد 2، صفحہ 118، قدیمی کتب خانہ کراچی

ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3655، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ الطبقات الکبریٰ لابن سعد، کتاب ذکر عدد مغازی رسول اللہ وسرایاہ، جلد 2، صفحہ 5، دار بیروت

بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ینبع کے بطن میں ہونے والے غزوہ عشیرہ میں دونوں دوست (ایک ساتھ) تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں اترے تو ایک مہینہ تک وہیں مقیم رہے اور وہاں بنی مدلج اور ان کے حلفاء بنی ضمرہ وغیرہ کے ساتھ صلح کر لی اور ان سے عداوت ترک کر دی، تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے مجھے کہا: کیا تیرے لئے ممکن ہے (اے) ابا الیقظان کہ تو ان کے پاس آئے؟ بنی مدلج کی ایک جماعت بیدار رہ کر ان کے لئے کام کر رہی ہے ہم دیکھیں وہ کیسے کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم ان کے پاس آئے اور ان کی طرف کچھ وقت تک دیکھتے رہے پھر ہم پر نیند غالب آ گئی تو ہم نے زمین کی مٹی میں کھجور کے چھوٹے درختوں کا قصد کیا اور ان میں آ کر سو گئے، پھر قسم بخدا! ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر اپنے قدموں کے ساتھ جگایا، تو ہم بیٹھ گئے اور ہم اس مٹی سے لتھڑے پڑے تھے تو اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ما بالک یا ابا تراب تجھے کیا ہوا ہے اے ابا تراب! تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے بارے خبر دی جو ہمیں پیش آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ألا اخبرکم باشقی الناس رجلین (کیا میں تمہیں ایسے دو آدمیوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تمام لوگوں سے زیادہ بدبخت ہیں؟ ہم نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قوم ثمود کا احیمر جس نے (حضرت صالح علیہ السلام کی) اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں اور (دوسرا وہ) جو تجھے اے علی! اس پر مارے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک اپنے سر پر رکھا یہاں تک کہ یہ اس سے تر ہو گیا'' اور (پھر) آپ نے اپنا دست مبارک اپنی ریش مبارک پر رکھا(1)۔ پس ابو عمر نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم بقیہ جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخرہ کی کچھ راتیں وہیں مقیم رہے اور اس میں بنی مدلج سے مصالحت کی، پھر واپس لوٹ آئے اور جنگ تک نوبت نہ آئی، پھر اس کے بعد تھوڑے ہی دنوں کے فاصلے کے ساتھ غزوہ بدر الاولیٰ ہوا، یہ وہ تفصیل ہے جس میں اہل التواریخ والسیر کوئی شک نہیں کرتے، پس حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کے بارے خبر دی جو کچھ ان کے پاس تھا۔ واللہ اعلم۔

اور کہا جاتا ہے: ذات العسیر سین کے ساتھ بھی ہے اور شین کے ساتھ بھی اور اس پر ھا کا اضافہ کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: العشیرۃ۔ پھر غزوہ بدر الکبریٰ ہوا اور جو بھی اس میں حاضر ہوئے ان کے لئے فضیلت کے اعتبار سے یہ بہت بڑی اور عظیم جنگ ہے اس میں علماء کی ایک جماعت کے قول کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے ملائکہ کے ساتھ اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی مدد فرمائی اور ظاہر آیت بھی اسی پر دلالت کرتی ہے، نہ کہ غزوہ احد میں۔ اور جنہوں نے کہا ہے کہ ایسا غزوہ احد میں ہوا تو انہوں نے قول باری تعالیٰ: وَ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ سے تا قولہ تَشْكُرُوْنَ کو دو کلاموں کے درمیان جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ یہ عامر شعبی کا قول ہے۔ اور لوگوں نے ان سے اختلاف کیا ہے اور روایات بالکل ظاہر اور واضح ہیں کہ ملائکہ غزوہ بدر کے دن حاضر ہوئے اور عملاً جنگ میں شریک ہوئے اور اسی کے بارے ابو اسید مالک بن ربیعہ کا قول ہے اور یہ بدر میں حاضر تھے، اگر میں اب تمہارے ساتھ بدر میں ہوتا اور میری آنکھیں سلامت ہوتیں تو میں تمہیں وہ گھاٹی دکھاتا جس سے ملائکہ ظاہر ہوئے تھے مجھے اس میں کوئی شک اور اختلاف نہیں ہے۔ اسے عقیل نے زہری عن ابی حازم سلمہ بن دینار سے روایت کیا

1۔ مسند احمد بن حنبل کتاب اول مسند الکوفیین، جلد 4، صفحہ 263، دار صادر

ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا ہے: اس ایک حدیث کے سوا زہری کی ابو حازم سے کوئی حدیث معروف نہیں اور ابو اسید کے بارے کہا جاتا ہے کہ آپ ہی بدری صحابہ کرام میں سے سب سے آخر میں فوت ہوئے، اسے ابو عمر نے الاستیعاب وغیرہ میں ذکر کیا ہے اور صحیح مسلم میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی حدیث مذکور ہے آپ نے بیان فرمایا: غزوہ بدر کے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی طرف دیکھا کہ ان کی تعداد ایک ہزار ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تعداد تین سو انیس ہے، تو نبی مکرم قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوئے، پھر اپنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے رب کریم کی بارگاہ میں التجا کرنے لگے: اللّٰھم انجزلی ما وعدتنی اللّٰھم آتِ ما وعدتنی اللّٰھم ان تھلك ھذہ العصابۃُ من اھل الاسلام لا تعبد فی الارض (اے اللہ! میرے لئے وہ وعدہ پورا فرما جو تو نے میرے ساتھ کیا ہے، اے اللہ! وہ عطا فرما جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے، اے اللہ! اگر اہل اسلام کی یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو زمین میں تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ شریف کی طرف منہ کئے ہاتھ پھیلا کر مسلسل اپنے رب کریم سے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ آپ کے کندھوں سے آپ کی چادر مبارک گر گئی، پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، انہوں نے چادر اٹھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں پر اسے ڈال دیا، پھر پیچھے کی جانب سے آپ کو پکڑ لیا اور عرض کی: یا نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے رب کی بارگاہ میں تمہاری طرف سے مناجات کافی ہے، وہ تمہارا وہ وعدہ پورا فرمائے گا جو اس نے تمہارے ساتھ فرمایا ہے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ (الانفال) (یاد کرو جب تم فریاد کر رہے تھے اپنے رب سے تو سن لی اس نے تمہاری فریاد (اور فرمایا) یقیناً میں مدد کرنے والا ہوں تمہاری ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ جو پے در پے آنے والے ہیں۔) پس اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ساتھ آپ کی مدد فرمائی۔

ابو زمیل نے کہا ہے کہ مجھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: اس دن مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کسی مشرک کے پیچھے تیز دوڑ رہا تھا تو اس نے اپنے سامنے اس پر کوڑا پڑنے کی آواز اور شہسوار کی آواز سنی کہ وہ کہہ رہا ہے: أقدم حیزوم، (حیزوم آگے بڑھ) تو اس نے اپنے سامنے مشرک کی طرف دیکھا کہ وہ چت گر گیا ہے، تو اس نے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی ناک توڑ دی گئی ہے اور اس کا چہرہ اس طرح پھاڑ دیا گیا ہے [جس طرح کوڑے کی ضرب کے ساتھ۔] پس وہ تمام کے تمام اکٹھے ہو گئے تو ایک انصاری آیا اور اس نے اس کے بارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صدقت ذالك من مدد السمآء الثالثۃ (تو نے سچ کہا ہے وہ تیسرے آسمان سے مدد آئی تھی) پس اس دن وہ ستر مارے گئے اور ستر قیدی بنا لئے گئے۔ آگے حدیث ذکر کی (1) اور عنقریب سورہ الانفال کے آخر میں مکمل آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پس سنت اور قرآن نے اسی کی موافقت کی ہے جو کچھ جمہور نے کہا ہے، والحمد للہ۔

خارجہ بن ابراہیم نے اپنے باپ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام سے پوچھا: "بدر کے دن ملائکہ میں سے کون یہ کہہ رہا تھا اقدِم حیزوم؟ تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے عرض کی:

1۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب الامداد بالملائکۃ فی غزوۃ بدر و اباحۃ الغنائم، جلد 2، صفحہ 93، اسلام آباد

یا محمد (ﷺ) **ماکل اهل السماء أعرف** (اے محمد! ﷺ میں تمام اہل آسمان کو نہیں پہچانتا۔)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا: اس اثنا میں کہ میں بدر کے کنوئیں سے پانی کا ڈول کھینچ رہا تھا کہ تیز ہوا آئی جس کی مثل میں نے کبھی نہ دیکھی تھی، پھر وہ چلی گئی۔ پھر اتنی تیز ہوا آئی کہ میں نے اس کی مثل کبھی نہ دیکھی تھی مگر وہی جو اس سے پہلے آئی تھی۔ راوی کا بیان ہے: میرا گمان ہے کہ انہوں نے ذکر کیا، پھر انتہائی تیز اور شدید ہوا آئی، پس پہلی ہوا کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام ہزار ملائکہ کو ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس اترے اور دوسری ہوا کے وقت حضرت میکائیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب اترے اور آپ ﷺ کی دائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور تیسری ہوا کے وقت حضرت اسرافیل علیہ السلام ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب اترے اور میسرہ میں میں تھا۔

اور حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے: میں نے بذات خود غزوہ بدر کے دن دیکھا کہ ہم میں سے کوئی اپنی تلوار کے ساتھ مشرک کے سر کی طرف اشارہ کرتا ہے تو تلوار اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا سر اس کے جسم سے کٹ کر گر پڑتا۔

اور حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ لوگ غزوہ بدر کے دن کفار کے ان مقتولوں کو پہچانتے تھے جنہیں فرشتوں نے قتل کیا تھا انہوں نے انہیں گردنوں کے اوپر ضرب لگا کر قتل کیا تھا اور پوروں پر آگ کے نشان کی مثل نشان تھے وہ اس کے ساتھ جلا دیئے گئے، یہ سب بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے: بے شک ملائکہ قتال کرتے رہے ہیں اور کفار میں ان کی ضرب کی علامت بالکل ظاہر تھی، کیونکہ جس جگہ ان کی ضرب لگی اس جگہ میں آگ بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ ابوجہل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو کہا: کیا تم نے مجھے قتل کیا ہے؟ بلاشبہ مجھے اس نے قتل کیا ہے جس کے گھوڑے کے سم تک میرا نیزہ بھی نہیں پہنچ سکا اگرچہ کوشش تو نے کی ہے۔ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہوا کہ مومنین کے دلوں کو تسکین اور راحت نصیب ہوئی اور اس لئے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو یوم قیامت تک مجاہدین بنا دیا، پس ہر لشکر جس نے صبر کیا اور اخلاص اپنایا فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور ان کی معیت میں جنگ میں شریک ہوں گے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت مجاہد نے فرمایا: ملائکہ نے بدر کے دن کے سوا کہیں جنگ نہیں لڑی۔ اور اس کے سوا میں وہ صرف حاضر ہوئے ہیں لیکن وہ قتال نہیں کرتے بلاشبہ وہ تعداد (میں اضافہ کا سبب) یا مدد ہوتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کی کثرت کا فائدہ یہ ہے کہ وہ دعا کرتے رہتے ہیں اور تسبیح بیان کرتے ہیں اور وہ ان کے لئے (اجر و ثواب میں) اضافہ کا سبب بنتے ہیں جو اس دن قتال کرتے ہیں، پس اس بناء پر تو ملائکہ نے بدر کے دن بھی قتال نہیں کیا بلکہ وہ صرف ثابت قدم رہنے کی دعا کے لئے حاضر ہوئے، پہلا قول اکثر کا ہے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ بدر کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار کے ساتھ ان کی امداد فرمائی پھر وہ تین ہزار ہو گئے اور پھر بڑھ کر پانچ ہزار ہو گئے (1)، پس اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ**

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542

مُمِدَّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ ۝ اور بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ يَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝ پس مومنین نے بدر کے دن صبر کیا اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو اللہ تعالیٰ نے پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی امداد فرمائی جیسا کہ ان سے وعدہ کیا تھا، پس یہ سب غزوہ بدر کے دن ہوا۔ اور حسن نے کہا ہے: پس یہ پانچ ہزار یوم قیامت تک مومنین کے لئے مدد ومعاون رہیں گے۔

حضرت شعبی نے کہا ہے: بدر کے دن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو یہ خبر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں پر شاق گزری، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ... تا قولہ... مُسَوِّمِيْنَ پس کرز کو شکست اور ہزیمت کی خبر موصول ہوئی تو اس نے اس کی کوئی مدد نہ کی اور واپس لوٹ گیا، پس اللہ تعالیٰ نے بھی پانچ ہزار کے ساتھ ان کی مدد نہ کی، بلکہ ایک ہزار کے ساتھ ان کی مدد کی گئی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن مومنین سے یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ اس کی طاعت وفرمانبرداری پر ڈٹے رہے، اور اس کے محارم سے بچتے رہے تو وہ ان کی تمام جنگوں میں مدد فرمائے گا۔ لیکن جنگ احزاب کے سوا انہوں نے صبر کیا اور نہ ہی وہ محارم سے بچے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی جب انہوں نے بنی قریظہ کا محاصرہ کیا۔ (1)

اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ یہ جنگ احد کا دن تھا، اللہ تعالیٰ نے ان سے مدد کا وعدہ فرمایا بشرطیکہ انہوں نے صبر کیا پس انہوں نے صبر نہ کیا اور نہ ہی ایک فرشتے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی، اگر ان کی مدد کی جاتی تو پھر انہیں ہزیمت نہ اٹھانی پڑتی۔

عکرمہ اور ضحاک نے یہی کہا ہے (2) اور اگر کہا جائے: تحقیق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ ثابت ہے کہ انہوں نے فرمایا میں نے بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دائیں اور بائیں جانب دو آدمیوں کو دیکھا وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور وہ دونوں آپ کی جانب سے انتہائی شدید جنگ لڑ رہے تھے، میں نے ان دونوں کو کبھی نہ اس سے پہلے دیکھا اور نہ ہی اس کے بعد (3) (دیکھا)۔ اس کے بارے کہا گیا ہے: شاید یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مختص ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے دو فرشتے خاص کر دیئے جو آپ کی طرف سے جنگ لڑیں گے اور یہ صحابہ کرام کے لئے امداد نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ ملائکہ کا نازل ہونا مدد ونصرت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ رب العالمین اس کا محتاج اور ضرورت مند نہیں ہے، بلکہ مخلوق اس کی محتاج ہے پس چاہیے کہ دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اسی پر اعتماد اور توکل ہو، کیونکہ سبب اور بغیر سبب کے وہی ناصر اور مدد فرمانے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (یٰسین) (اس کا کام کا حکم، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو صرف اتنا ہی ہے کہ وہ فرماتا ہے اس کو ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے) لیکن اس نے اس کے بارے خبر دی ہے تاکہ مخلوق اس کی پیروی کرے جس کا اللہ تعالیٰ انہیں حکم فرمائے ان اسباب میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں، وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 542　2۔ ایضاً، صفحہ 543

3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

(الاحزاب) (اور آپ سنت الٰہی میں ہرگز کوئی تغیر و تبدل نہ پائیں گے) وراس طرح توکل میں کوئی نقص اور عیب پیدا نہ ہوگا، اور یہ ان کا رد ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اسباب تو ضعفاء اور کمزوروں کے لئے بنائے گئے ہیں نہ کہ اقویاء اور طاقتوروں کے لئے، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام تو اقویا اور طاقتور تھے اور ان کے سوا دوسرے ضعفاء اور کمزور ہیں اور یہ بالکل واضح ہے۔ مدّ کا لفظ شر میں اور أمدّ کا لفظ خیر میں (مدد کے لئے استعمال ہوتا ہے) جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

ابوحیوہ نے مُنْزِلِيْنَ زا کو کسرہ کے ساتھ مخفف پڑھا ہے یعنی وہ مدد و نصرت اتارنے والے ہیں۔ اور ابن عامر نے کثرت کی بنا پر زا کو مشدد اور مفتوح پڑھا ہے۔ پھر فرمایا: بَلٰۤى (ہاں کافی ہے) اور کلام مکمل ہوگئی۔ اِنْ تَصْبِرُوْا یہ شرط ہے یعنی اگر تم دشمن کے مقابلے میں صبر کرو۔ وَ تَتَّقُوْا یہ اس پر معطوف ہے، یعنی تم اس کی معصیت اور نافرمانی سے بچے رہو۔ يُمْدِدْكُمْ یہ جواب شرط ہے۔ (تو وہ تمہاری مدد کرے گا) اور مِّنْ فَوْرِهِمْ کا معنی ہے من وَجْهِهِمْ (یعنی اگر ان کی طرف سے تیزی ہو جائے) یہ عکرمہ، قتادہ اور حسن، ربیع، سدی اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: من غضبهم (یعنی اگر وہ آجائیں اپنے غضب سے) یہ مجاہد اور ضحاک سے منقول ہے۔ وہ غزوہ احد کے دن ان حالات سے غضب میں تھے جن کا غزوہ بدر کے دن انہیں سامنا کرنا پڑا (1)۔ اور الفور کا اصلی معنی کسی شی کی طرف قصد کرنا اور اسے خوب محنت و مشقت کے ساتھ لینا ہے اور یہ ان کے اس قول سے ہے: فارت القِدر تفور فورًا و فَوَرَانًا۔ جب ہانڈی خوب ابلنے لگے اور الفور کا معنی الغَلَيان (ابلنا) ہے۔ اور فار غضبهٗ جب غصہ خوب بھڑک جائے (تو یہ کہا جاتا ہے) اور اس کا فعل فورہ سے ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ ساکن ہو۔ اور الفوارۃ جو کچھ ہانڈی میں سے ابلتا اور کھولتا ہے۔ اور قرآن کریم میں ہے وَفَارَ التَّنُّوْرُ (تنور ابل گیا) شاعر نے کہا ہے:

تفور علینا قِدرُهُمْ فَنُدِيْمُهَا

ہمارے خلاف ان کی ہنڈیاں ابلنے لگتی ہیں تو ہم انہیں ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: مُسَوَّمِيْنَ یہ واؤ کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول ہے۔ اور یہ ابن عامر، حمزہ، کسائی اور نافع کی قرأت ہے یعنی جن کی علامت کے ساتھ پہچان کرائی گئی ہے۔ اور مُسَوِّمِيْنَ واؤ کے کسرہ کے ساتھ اسم فاعل ہے۔ اور یہ ابو عمرو، ابن کثیر اور عاصم کی قرأت ہے (2) اور یہ بھی سابقہ معنی کا احتمال رکھتا ہے یعنی انہوں نے علامت کے ساتھ اپنی اور اپنے گھوڑوں کی پہچان کرائی۔ علامہ طبری وغیرہ نے اس قرأت کو ترجیح دی ہے اور بہت سے مفسرین نے کہا ہے: مُسَوِّمِيْنَ یعنی وہ اپنے گھوڑے جنگ میں بھیجنے والے ہیں۔ اور مہدوی نے مُسَوَّمِيْنَ بفتح واؤ میں یہ معنی ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں کفار کے خلاف بھیجا اور ابن فورک نے بھی یہی کہا ہے۔ اور پہلی قرأت کے مطابق انہوں نے ملائکہ کی نشانی میں اختلاف کیا ہے۔

پس حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ سے مروی ہے کہ ملائکہ سفید عمامے باندھے ہوئے تھے اور (ان کی طرف کو) اپنے کندھوں کے درمیان چھوڑ رکھا تھا (3) (یعنی ایک لڑ کندھوں کے درمیان لٹکا رکھا تھا) اسے بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا ہے اور مہدوی نے اسے زجاج سے بیان کیا ہے مگر حضرت جبرئیل امین علیہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 543　2۔ ایضاً، صفحہ 544　3۔ ایضاً

السلام حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی طرح زرد رنگ کا عمامہ باندھے ہوئے تھے اور ابن اسحاق نے اسے بیان کیا ہے۔ اور ربیع نے بیان کیا ہے کہ ان کی نشانی یہ تھی کہ وہ ابلق گھوڑوں پر سوار تھے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: بیہقی نے حضرت سہل بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا: میں نے بدر کے دن زمین و آسمان کے درمیان ابلق گھوڑوں پر کچھ چمکتے اور روشن آدمی دیکھے درآنحالیکہ وہ نشان زدہ تھے وہ قتل کر رہے تھے اور قیدی بنا رہے تھے۔ پس ان کا قول: معلّمین اس پر دلیل ہے کہ ابلق گھوڑے کوئی نشانی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ان کے گھوڑوں کی دمیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں اور پیشانیوں اور دموں پر رنگ برنگی اون کے ساتھ نشان لگے ہوئے تھے۔ (1)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: بدر کے دن ملائکہ سفید اون کے ساتھ گھوڑوں کی پیشانیوں اور ان کی دموں پر نشان لگائے ہوئے تھے (2) اور عباد بن عبداللہ بن زبیر، ہشام بن عروہ اور کلبی نے کہا ہے: ملائکہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانی میں نازل ہوئے وہ زرد رنگ کے عمامے باندھے ہوئے تھے درآنحالیکہ وہ ان کے کندھوں پر لٹک رہے تھے (3)۔ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے دونوں صاحبزادوں حضرت عبداللہ اور حضرت عروہ رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: زرد رنگ کی چادر تھی جس کو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بطور عمامہ باندھے ہوئے تھے۔

میں کہتا ہوں: اور آیت اس پر دلیل ہے..... اور یہ چوتھا مسئلہ ہے...... (۴) یعنی یہ قبائل اور لشکروں کے لئے کوئی علامت اور کوڈ بنانے پر دلالت کرتی ہے جو ان کے لئے حاکم وقت متعین کرتا ہے تاکہ ہر قبیلہ اور ہر لشکر جنگ کے وقت دوسرے سے ممتاز اور الگ رہے اور یہ آیت ابلق گھوڑوں کی فضیلت پر بھی دلیل ہے کیونکہ ملائکہ نے ان پر نزول فرمایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی موافقت میں ملائکہ ان پر نازل ہوئے، کیونکہ وہ تھوڑا ابلق تھا اور اس کے سوا ان کے پاس کوئی گھوڑا نہ تھا، پس ملائکہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی تعظیم و تکریم میں ابلق گھوڑوں پر اترے، جس طرح حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی طرح حضرت جبرئیل امین علیہ السلام زرد عمامہ باندھ کر نزول فرما ہوئے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت اس پر بھی دلیل ہے ... اور یہی پانچواں مسئلہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ کہ اون کا لباس وہ ہے جو انبیاء علیہم السلام اور صالحین نے پہنا ہے۔ اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے اور الفاظ انہی کے ہیں کہ حضرت ابو بردہ نے اپنے باپ سے روایت کیا اور کہا کہ میرے باپ نے مجھے بتایا: اگر تو ہمارے ساتھ حاضر ہوتا درآنحالیکہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے جب بارش ہم پر برستی تو یقیناً تو گمان کرتا کہ ہماری ہوا بھیڑوں کی ہوا کی طرح ہے (4)، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنگ آستینوں والا اون کا بنا ہوا رومی جبہ زیب تن فرمایا۔

1۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 297 2۔ ایضاً 3۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 544

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، حدیث 3515، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب اللباس، حدیث 3551، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، جامع ترمذی، کتاب اللباس، جلد 1، صفحہ 209، اسلام آباد

اسے ائمہ نے روایت کیا ہے(1) اور حضرت یونس علیہ السلام نے بھی اسے پہنا ہے۔ اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس کا مزید بیان سورۃ النحل میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر6۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: رہا وہ جو حضرت مجاہد نے ذکر کیا ہے کہ ان کے گھوڑوں کی دمیں اور کلغیاں کٹی ہوئی تھیں تو یہ بہت بعید ہے، کیونکہ مصنف ابی داؤد میں عتبہ بن عبد سلمی سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''تم گھوڑوں کی پیشانیاں نہ کاٹو (یعنی ان کے بال نہ کاٹو) اور نہ ہی ان کی کلغیاں اور نہ ہی ان کی دمیں، کیونکہ ان کی دمیں ان کی چربی ہے اور ان کی کلغیاں ان کے لئے حرارت ہیں اور ان کی پیشانیوں میں خیر اور بھلائی رکھ دی گئی ہے۔(2)'' پس حضرت مجاہد کا قول اس حکم توقیفی کا محتاج ہے کہ ملائکہ کے گھوڑے اس صفت پر تھے۔ واللہ اعلم۔

اور آیت رنگوں میں سے سفید اور زرد رنگ کے حسن پر بھی دلالت کرتی ہے کیونکہ ملائکہ انہی کے ساتھ نازل ہوئے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: جس نے زرد رنگ کے نعل پہن لئے اس کی حاجت پوری کر دی گئی(3)۔ ور آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے کپڑوں میں سے سفید پہنو کیونکہ وہ تمہارے بہترین اور خیر و برکت والے کپڑے ہیں اور اپنے مردوں کو سفید کپڑے میں کفن دو(4) اور رہے عمامے تو وہ عربوں کا تاج اور ان کا لباس ہے'' اور رکانہ نے روایت کیا ہے .. اس نے حضور نبی مکرم ﷺ کے ساتھ کشتی لڑی تو حضور نبی مکرم ﷺ نے اسے پچھاڑ دیا۔

رکانہ نے بیان کیا: میں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس(5) (کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپیوں پر عمامے باندھنا ہے) اسے ابوداؤد نے بیان کیا ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے اس کی اسناد مجہول ہے اس کے بعض راویوں کا سماع بعض سے معروف نہیں۔

وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَىٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِیَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ یَكْبِتَهُمْ فَیَنْقَلِبُوْا خَآىٕبِیْنَ ﴿۱۲۷﴾

''اور نہیں بنایا فرشتوں کے اترنے کو اللہ نے مگر خوشخبری تمہارے لئے اور تاکہ مطمئن ہو جائیں تمہارے دل اس سے اور (حقیقت تو یہ ہے) کہ نہیں ہے فتح و نصرت مگر اللہ کی طرف سے جو سب پر غالب (اور) حکمت والا ہے۔ (یہ مدد اس لئے تھی) تاکہ کاٹ دے ایک حصہ کافروں سے یا ذلیل کر دے ان کو پس لوٹ جائیں نامراد ہو کر۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ اس میں ہ ضمیر مدد کے لئے ہے اور وہ ملائکہ ہیں یا وعدہ ہے یا امداد ہے، اور

1۔ صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ حدیث نمبر 350، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2180، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، سنن ابی داؤد، جلد 1، صفحہ 344، اسلام آباد

3۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 297

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الطب، حدیث نمبر 3380، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ جامع ترمذی، کتاب اللباس، باب العمائم علی القلانس، جلد 1، صفحہ 210، اسلام آباد۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 1706، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس پر قول باری تعالیٰ یُمْدِدْكُمْ دلالت کرتا ہے یا پھر ضمیر تسویم (نشان لگانا) یا انزال (اتارنا) یا معنوی طور پر عدد کے لئے ہے، کیونکہ خمسۃ آلاف عدد ہے۔ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ اس میں لام، لام کی ہے، یعنی ولتطمئن قلوبکم به جعله (تا کہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں ایسا کیا۔) اسی طرح یہ ارشاد ہے: وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا۔ ای حفظا لها جعل ذالك (اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں کے ساتھ آراستہ کیا اور اس کی حفاظت کے لئے اسے بنایا۔)

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی مومنین کی مدد و نصرت نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے، اس میں کافروں کی مدد داخل نہیں ہے، کیونکہ انہیں جو غلبہ حاصل ہوتا ہے وہ بلا شبہ رسوائی، برے انجام اور خسارے سے بھرا اور گھرا ہوتا ہے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (یعنی تا کہ وہ قتل کے ساتھ کافروں کا ایک حصہ کاٹ دے) اور نظم آیت اس طرح ہے: ولقد نصركم الله ببدر ليقطع۔ (تحقیق اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن تمہاری مدد فرمائی تا کہ وہ کاٹ دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ معنی ہے وما النصر الا من عند الله ليقطع (مدد نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے تا کہ وہ کاٹ دے۔) اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ یُمْدِدْكُمْ کے متعلق ہو، (یعنی وہ تمہاری مدد کرے گا تا کہ وہ کاٹ دے) اور معنی ہے: مشرکین میں سے جو بدر کے دن قتل کئے گئے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے۔ سدی نے کہا ہے: یعنی اس کے ساتھ جو مشرکین غزوہ احد کے دن قتل کئے گئے اور وہ اٹھارہ آدمی تھے۔

اور يَكْبِتَهُمْ کا معنی ہے یحزنھم (یا وہ انہیں پریشان اور غمزدہ کر دے، اور المکبوت کا معنی محزون (غمگین) ہے۔ اور روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوطلحہ کے پاس آئے تو ان کے بیٹے کو پریشان اور غمزدہ دیکھا۔ تو فرمایا: "اسے کیا ہوا ہے؟" تو عرض کی گئی: اس کا اونٹ مر گیا ہے۔ اور اس کی اصل جو کہ بعض اہل لغت نے بیان کی ہے یکبدھم ہے ای یصیبهم بالحزن والغيظ فی أكبادهم(1) (یعنی وہ انہیں غم واندوہ اور غیظ وغضب ان کے دلوں (کلیجوں) میں پہنچائے۔) پھر دال کو تا سے بدل دیا گیا ہے۔ جیسا کہ سبت رأسه اور سبده میں دال کو تا سے بدلا گیا ہے یعنی اس نے اس کا سر مونڈ دیا(2)۔ كبت الله العدو كبتا (یہ تب کہا جاتا ہے) جب اللہ تعالیٰ دشمن کو پھیر دے اور اسے ذلیل و رسوا کر دے، اور کبدہ کا معنی ہے اصابه فی کبدہ (یعنی اس نے اس کے دل میں تکلیف پہنچائی) کہا جاتا ہے: قد احرق الحزن كبده (غم نے اس کے دل کو جلا دیا) اور احرقت العداوة كبدهٗ (دشمنی نے اس کا جگر جلا دیا۔) اور عرب دشمن کے لئے کہتے ہیں: أسود الكبد۔ (جگر سیاہ ہو گیا)

اعشیٰ نے کہا ہے:

فما أجشمت من اتيانِ قوم هم الأعداءُ والأكبادُ سُودُ

اس میں الاکبادُ سُود جگر سیاہ ہونے کے معنی میں ہے۔

گویا کہ شدت عداوت کے سبب جب جگر جل جاتا ہے تو وہ سیاہ ہو جاتا ہے اور ابو مجلز نے او یکبدھم دال کے ساتھ پڑھا

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 545 2۔ ایضاً

ہے۔ اور الخائب سے مراد وہ ہے جس کی امید ٹوٹ چکی ہو (کچھ ہاتھ نہ آئے) خاب یخیب اذا لم ینل ما طلب یعنی جو طلب کیا جب وہ اسے نہ پائے تو اس کے لئے خاب یخیب کا لفظ کہا جاتا ہے۔ اور الخیاب یعنی ایسا عیب ہے جسے وہ چھپا نہ سکتا ہو۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

”نہیں ہے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل چاہے تو الله ان کی توبہ قبول فرمالے اور چاہے تو عذاب دے انہیں، پس بے شک وہ ظالم ہیں۔ اور الله ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور الله بہت بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔“

اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ صحیح مسلم میں موجود ہے کہ غزوہ احد میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا سر زخمی کر دیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خون صاف کرنے لگے اور فرمانے لگے: ”وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جنہوں نے اپنے نبی کا سر زخمی کر دیا اور اس کے دانت توڑ دیئے حالانکہ وہ انہیں الله تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔“ تب الله تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ۔ (1)

ضحاک نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے لئے بددعا کرنے کا ارادہ فرمایا تو الله تعالیٰ نے یہ نازل فرمایا: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے استیصال اور بربادی کے بارے دعا مانگنے کی اجازت طلب کی، تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے جان لیا کہ ان میں سے بعض عنقریب اسلام قبول کر لیں گے، چنانچہ پھر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے ان میں سے حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عکرمہ بن ابی جہل وغیرہ افراد ہیں۔

ترمذی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم چار آدمیوں کے لئے بددعا کرتے رہے، پھر الله تعالیٰ نے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ آیت نازل فرمائی۔ اور پھر الله تعالیٰ نے انہیں اسلام قبول کرنے کی ہدایت اور توفیق عطا فرما دی۔ اور امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔ (2)

اور قولہ تعالیٰ: اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ کہا گیا ہے یہ لِيَقْطَعَ طَرَفًا پر معطوف ہے اور معنی ہے تاکہ وہ ان میں سے ایک گروہ کو قتل کر دے یا انہیں شکست و ہزیمت کے ساتھ ذلیل و رسوا کر دے یا ان کی توبہ قبول فرمالے یا انہیں عذاب دے۔ اور یہاں اَوْ بمعنی حتّٰی اور اِلّا اَنْ ہے۔ امرؤ القیس نے کہا ہے:

... او نموت فنعذرا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد والسیر باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 108، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی

2۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن سورۂ آل عمران، جلد 1، صفحہ 125، اسلام آباد

ہمارے علماء نے کہا ہے: حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد: کیف یفلح قوم شجوا رأس نبیھم یہ بعید سمجھنا ہے اس کے لئے توفیق کو جس نے آپ کے ساتھ ایسا سلوک کیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ یہ اسے قریب کرنا ہے جسے آپ نے بعید سمجھا اور ان کے اسلام قبول کرنے میں حرص وطمع کا اظہار ہے۔

اور جب اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو طمع دلایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح عرض کی: اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (1) (اے اللہ! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔) جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: گویا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہا ہوں آپ انبیاء میں سے کسی نبی علیہ السلام کا ذکر فرما رہے ہیں کہ آپ کی قوم نے آپ کو مارا اور وہ اپنے چہرے سے خون صاف کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں: ''اے میرے پروردگار! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حکایت کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور وہ محکی عنہ ہیں اور اس پر صریح اور واضح دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید کر دیئے گئے اور آپ کا چہرہ مقدس زخمی کر دیا گیا غزوہ احد میں تو یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر انتہائی شاق گزرا تو انہوں نے عرض کی: اگر آپ ان کے لئے بددعا فرمائیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا بلکہ مجھے تو دعوت دینے والا اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے (2)، اے اللہ! میری قوم کی مغفرت فرما کیونکہ وہ نہیں جانتے۔'' گویا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واقعہ احد پیش آنے سے پہلے اس کے بارے وحی کی گئی اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے لئے معین نہیں کیا اور جب آپ کو یہ واقعہ پیش آیا تو متعین ہو گیا کہ معنی یہی ہے اور اس کی دلیل وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعض کلام میں اس بارے میں جو کہا ہے وہ بھی اس کی وضاحت کرتا ہے: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے بارے میں بددعا کی اور یہ کہا: رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۶﴾ الآیہ (نوح) (اے رب! زمین پر کافروں کا کوئی گھر نہ چھوڑ۔) اور اگر آپ ہمارے خلاف اس طرح کی دعا کرتے تو ہم اپنے آخر کی طرف سے ہلاک ہو جاتے، حالانکہ آپ کی پشت کو روندا گیا، آپ کا چہرہ خون آلود کیا گیا اور آپ کے دندان مبارک شہید کئے گئے لیکن آپ نے کلمہ خیر کے سوا کچھ نہ کہا اور یہ دعا کی: رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون (3) اور آپ کا قول: اشتد غضب اللہ علی قوم کسروا رباعیۃ نبیھم (4) (اللہ تعالیٰ کا غضب شدید اور سخت ہوا اس قوم پر جنہوں نے اپنے نبی علیہ السلام کے دندان مبارک شہید کر دیئے) یہ خالصۃً اس کے لئے ہے جس نے عملاً ایسا کیا اور ہم نے اس کا نام ذکر کر دیا ہے اگرچہ اس کے بارے اختلاف ہے اور ہم نے یہ کہا کہ یہ مباشر (عمل کرنے والے) کے ساتھ خاص ہے، اس لئے کہ ان میں سے ایک جماعت نے

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الفطن باب الصبر علی البلاء، صفحہ 300۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، حدیث 3218، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 323، اسلام آباد 3۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد باب غزوہ احد، جلد 2، صفحہ 208
4۔ صحیح مسلم، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 108۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3785، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اسلام قبول کر لیا جو جنگ احد میں شریک ہوئے تھے اور خوب اچھی طرح اسلام لائے۔

مسئلہ نمبر 2۔ بعض علماء کوفہ نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت اس قنوت کے لئے ناسخ ہے جو حضور نبی کرم ﷺ صبح کی نماز کی دوسری رکعت میں رکوع کے بعد پڑھا کرتے تھے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے حضور نبی کرم ﷺ کو فجر کی نماز میں رکوع سے سر اٹھانے کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا: اللّٰھم ربنا ولك الحمد فی الآخرۃ ... پھر کہا ... اللّٰھم العن فلانا و فلانا پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ الآیہ۔ اسے بخاری نے نقل کیا ہے (1) اور امام مسلم نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے یہ اس سے زیادہ مکمل اور اتم ہے (2) اور یہ نسخ کا محل نہیں ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کرم ﷺ کو اس پر متنبہ کیا ہے کہ امر ان کے پاس نہیں ہے اور یہ کہ وہ غیب میں سے کچھ نہیں جانتے مگر وہی جو میں انہیں بتاتا ہوں اور یہ کہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں وہ جسے چاہے گا اس کی توبہ قبول فرمالے گا اور جس کے لئے چاہے گا اسے جلدی عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور تقدیر کلام اس طرح ہے: لیس لك من الامر شیء و للہ ما فی السموات و ما فی الارض دونك و دونھم یغفر لمن یشاء و یتوب علی من یشاء (آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے نہ آپ کا ہے اور نہ ہی ان کا ہے وہ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور جس کی چاہتا ہے توبہ قبول فرمالیتا ہے) پس اس میں کوئی نسخ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ سے یہ بیان کیا ہے کہ تمام معاملات اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ہوتے ہیں اس میں قدریہ وغیرہ کا رد ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ نماز فجر اور اس کے علاوہ نمازوں میں قنوت پڑھنے کے بارے علماء نے اختلاف کیا ہے۔ پس کوفیوں نے نماز فجر وغیرہا میں قنوت سے منع کیا ہے اور یہی مذہب لیث اور صاحب مالک یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی کا ہے۔ اور شعبیؒ نے اس کا انکار کیا ہے اور مؤطا میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ کسی نماز میں قنوت نہ پڑھتے تھے (3) اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ ہمیں قتیبہ نے عن خلف عن ابی مالك اشجعی عن ابیہ کی سند سے خبر دی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: میں نے حضور نبی کرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے دعائے قنوت نہ پڑھی اور میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز ادا کی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور آپ نے بھی قنوت نہ پڑھی، پھر فرمایا: اے بیٹے! یہ بدعت ہے (4)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فجر کی نماز میں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بکتاب اللہ، جلد 2، صفحہ 1091، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 6800، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4194، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ موطا امام مالک، باب القنوت فی الصبح، صفحہ 143، اسلام آباد

4۔ سنن نسائی، باب ترک القنوت، جلد 1، صفحہ 164۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی ترک القنوت، حدیث نمبر 368، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمیشہ قنوت پڑھی جائے گی اور تمام نمازوں میں (پڑھی جائے گی) جبکہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو۔ امام شافعیؒ اور طبری نے یہی کہا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ نماز فجر میں مستحب ہے اور یہ امام شافعیؒ سے مروی ہے اور حسن اور سحنون نے کہا ہے کہ یہ سنت ہے اور یہی علی بن زیاد کی اس روایت کا تقاضا ہے جو امام مالکؒ سے مروی ہے کہ جان بوجھ کر اسے چھوڑنے والا نماز کا اعادہ کرے گا اور علامہ طبری نے اس پر اجماع بیان کیا ہے کہ اسے چھوڑ دینا نماز کو فاسد نہیں کرتا۔ اور حسن سے منقول ہے کہ قنوت کے ترک ہو جانے میں سجدۂ سہو لازم ہے اور یہی امام شافعیؒ کے دو قولوں میں سے ایک ہے۔ دار قطنی نے سعید ابن عبدالعزیز سے اس کے بارے بیان کیا ہے جو صبح کی نماز میں قنوت بھول گیا۔ فرمایا: وہ سہو کے دو سجدے کرے گا۔ اور امام مالک نے رکوع سے پہلے کو اختیار کیا ہے اور یہی اسحاق کا قول ہے اور یہی امام شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ کا بھی قول ہے۔ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت سے اس بارے میں اختیار مروی ہے (یعنی چاہے تو رکوع سے پہلے پڑھے اور چاہے تو رکوع کے بعد) اور دار قطنی نے اسناد صحیح کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز میں مسلسل قنوت پڑھتے رہے یہاں تک کہ آپ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اور ابوداؤد نے مراسیل میں خالد بن ابی عمران سے ذکر کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اس اثنا میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مضر کے خلاف دعا کر رہے تھے کہ اچانک جبرائیل امین حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ خاموش رہیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، پھر انہوں نے کہا: ''اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو گالی گلوچ اور لعن طعن کرنے کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ اس نے آپ کو رحمت بنا کر مبعوث فرمایا ہے اور اس نے آپ کو عذاب کے لئے نہیں بھیجا، لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ۔ راوی نے بیان کیا: پھر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعائے قنوت سکھائی پس فرمایا: اللهم انا نستعينك و نستغفرك و نؤمن بك و نخنع لك و نخلع و نترك من يكفرك اللهم اياك نعبد و لك نصلى و نسجد و اليك نسعى و نحفد و نرجو رحمتك و نخاف عذابك الجد ان عذابك بالكافرين ملحق۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٣٠﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿١٣١﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٣٢﴾

''اے ایمان والو! نہ کھاؤ سود دوگنا چوگنا کر کے اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور بچو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور رسول (کریم) کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

قولہ تعالیٰ: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً سود کھانے سے یہ نہی قصہ احد کے درمیان جملہ معترضہ ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مجھے اس بارے میں روایت کردہ کوئی شے یاد نہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ حضرت مجاہد نے بیان کیا ہے: وہ ایک مدت تک بیع کرتے تھے اور جب مدت مقررہ گزر جاتی تو وہ اسے مؤخر کرنے کی شرط پر ثمن میں اضافہ کر دیتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا

الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً [میں کہتا ہوں] تمام گناہوں میں سے ربا کو خاص کیا گیا ہے، کیونکہ یہ وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں جنگ کی اجازت دی ہے: فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (البقرہ: 279) (اور تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے) اور جنگ قتل کی خبر دیتی ہے، گویا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے: اگر تم سود سے نہ بچے تو تمہیں ہزیمت کا سامنا ہوگا اور تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں سود چھوڑنے کا حکم دیا، کیونکہ ان کے نزدیک اس پر عمل کیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم۔ اور اَضْعَافًا حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور مُّضٰعَفَةً اس کی صفت ہے۔ اور اسے مُضَعَّفَةً بھی پڑھا گیا ہے۔ اور اس کا معنی ہے وہ سود جس میں عرب قرض کو دوگنا کر لیتے تھے اور طالب کہتا تھا: کیا تو ادا کرے گا یا سود دے گا؟ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اور مُضَاعَفَةً یہ ایک سال کے بعد دوسرے سال دوگنا کو چار گنا کرنے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ وہ کرتے تھے، پس یہ عبارت موکدہ ان کے فعل کے انتہائی برا اور قبیح ہونے پر دلیل ہے، اسی لئے خاص طور پر تضعیف کی حالت ذکر کی گئی ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو سود کے مالوں میں اور تم انہیں نہ کھاؤ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں خوفزدہ کیا(1) اور فرمایا: وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ بہت سے مفسرین نے کہا ہے یہ وعید اس کے لئے ہے جس نے سود کو حلال سمجھا اور جس نے ربا کو حلال سمجھا وہ کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے ایسے عمل سے بچو جو تم سے ایمان کو چھین لیتا ہے کہ تم (اس کے سبب) آتش جہنم کو واجب کر لو گے، کیونکہ گناہوں میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں کرنے والا ایمان کے چھن جانے کو واجب کر لیتا ہے اور اس پر خوف کیا جانے لگتا ہے، انہیں میں سے والدین کی نافرمانی بھی ہے۔ اور اس بارے میں ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک آدمی اپنے والدین کا نافرمان تھا اسے علقمہ کہا جاتا تھا، تو موت کے وقت اسے کہا گیا کہو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، تو وہ اس پر قادر نہ ہو سکا یہاں تک کہ اس کی ماں اس کے پاس آئی اور وہ اس سے راضی ہوئی۔ اور ایسے ہی گناہوں میں سے قطع تعلقی، سود خوری اور امانت میں خیانت کرنا ہے۔ ابو بکر وراق نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: اکثر اوقات موت کے وقت بندے سے ایمان نکال لیا جاتا ہے۔ پھر ابو بکر نے بیان کیا: پس ہم ایسے گناہوں میں غور و فکر کرتے رہے جو ایمان کو نکال دیتے ہیں تو ہم نے بندوں پر ظلم سے بڑھ کر تیزی کے ساتھ کسی کو ایمان نکالنے والا نہیں پایا۔ اس آیت میں اس پر دلیل ہے کہ آگ (جہنم) کو پیدا کیا گیا ہے یہ جہمیہ کا رد ہے، کیونکہ معدوم تیار شدہ نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا: وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ یعنی فرائض میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو وَالرَّسُوْلَ اور سنن میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرو)

اور یہ قول بھی ہے کہ سود کی تحریم میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور تحریم کے بارے میں جو حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں پہنچایا ہے (اس میں ان کی اطاعت کرو) لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ تاکہ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔ اور یہ بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 547

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

''اور دوڑو بخشش کی طرف جو تمہارے رب کی طرف سے ہے اور (دوڑو) جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی ہے جو تیار کی گئی ہے پرہیزگاروں کے لئے۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَسَارِعُوْٓا حضرت نافع اور ابن عامر نے واؤ کے بغیر سَارِعُوْٓا پڑھا ہے۔ اور اسی طرح اہل مدینہ اور اہل شام کے مصاحف میں ہے(1)۔ اور باقی سات نے وَسَارِعُوْٓا واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوعلی نے کہا ہے: دونوں قرائتیں رائج اور صحیح ہیں، پس جنہوں نے واؤ کے ساتھ قرأت کی ہے انہوں نے جملہ کا عطف جملہ پر کیا ہے اور جنہوں نے واؤ کو چھوڑ دیا ہے وہ اس لئے ہے کہ دوسرا جملہ پہلے کے ساتھ اس طرح ملتبس ہے کہ اسے حرف عطف واؤ کی حاجت اور ضرورت ہی نہیں۔ اور المسارعة کا معنی المبادرة (جلدی کرنا، تیزی کرنا) ہے اور یہ باب مفاعلہ ہے۔ اور آیت میں حذف ہے، یعنی سارعوا الی مایوجب المغفرة وھی الطاعة (یعنی اس عمل کی طرف تیزی سے آؤ جو مغفرت وبخشش کو واجب کر دیتا ہے اور وہ طاعت وفرمانبرداری ہے۔

حضرت انس ابن مالک اور مکحول نے وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ کی تفسیر میں کہا ہے: اس کا معنی ہے تم دوڑو تکبیر تحریمہ کی طرف اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم تیزی سے آؤ فرائض ادا کرنے کی طرف، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم جلدی سے آؤ اخلاص کی طرف۔ اور کلبی نے کہا ہے: تم سود سے توبہ کی طرف دوڑو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میدان جنگ میں ثابت قدمی کی طرف آؤ اور ان کے علاوہ بھی کئی اقوال ہیں۔ اور آیت ان تمام کو شامل ہے اور اس کا معنی وہی ہے جو فاستبقوا الخیرات کا معنی ہے (کہ تم خیر اور نیکی کے کاموں کی طرف تیزی سے آگے بڑھو) اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ تقدیر عبارت ہے کعرض السموات والارض۔ اور مضاف محذوف ہے، جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدة۔ ای الا کخلق نفس واحدة وبعثھا۔

شاعر نے کہا ہے:

حسبت بُغام رَاحِلَتی عناقاً　　وما ھی وَیْبَ غَیْرِكَ بالعناق

اس میں مراد صوت عناق (بھیڑ کے بچے کی آواز) ہے۔ اس کی نظیر سورۂ حدید میں ہے: وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (2) (اور جنت اس کا عرض آسمان وزمین کے عرض کی طرح ہے۔)

اس کی تاویل میں علماء کا اختلاف ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: آسمان وزمین آپس میں بعض بعض کے ساتھ ملا دیئے جائیں گے جیسا کہ کپڑوں کو پھیلایا جاتا ہے اور بعض کو بعض کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے، پس یہ جنت کا عرض ہے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 547　2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 548

اور اس کا طول سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ اور یہ جمہور کا قول ہے۔ اور اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے ''کہ سات آسمان اور سات زمینیں کرسی کے مقابلے میں اس طرح ہیں جیسے وہ دراہم جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دیئے جائیں اور کرسی عرش کے مقابلہ میں اس انگوٹھی کی طرح ہے جو زمین کے وسیع بیابان میں پھینک دی گئی ہو۔'' یہ مخلوقات سے آسمانوں اور زمین کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور عظیم ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ان تمام سے اعظم ہے۔

اور کلبی نے کہا ہے: جنتیں چار ہیں، جنة عدن، جنة المأوی، جنة الفردوس اور جنة النعیم اور ان میں سے ہر جنت زمین و آسمان کے عرض کی مثل ہے اگر وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اور اسماعیل السدی نے کہا ہے: اگر آسمانوں اور زمین کو توڑ دیا جائے اور وہ رائی کے دانے ہو جائیں اور پھر ہر دانے کے بدلے جنت ہو تو اس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کی طرح ہے۔ اور صحیح روایت میں ہے: ''بے شک اہل جنت میں سے رتبہ کے اعتبار سے ادنیٰ وہ ہوگا جو تمنا کرے گا اور آرزو کرتا رہے گا یہاں تک کہ جب اس کی آرزوئیں ختم ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: لك ذالك وعشرة أمثاله (تیرے لئے وہ بھی ہے اور اس کی مثل دس اور بھی ہیں۔) اسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے، اسے مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے اور یعلی بن ابی مرہ نے بیان کیا ہے۔ میں حمص میں تنوخی سے ملا جو کہ ہرقل کی طرف سے قاصد بن کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا وہ شیخ کبیر تھا۔ اس نے کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہرقل کا خط لے کر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ صحیفہ اپنی بائیں طرف والے آدمی کو دیا، پھر میں نے پوچھا: تمہارا کون وہ ساتھی ہے جو اسے پڑھے گا؟ انہوں نے کہا: معاویہ، پس تب یہ میرے صاحب کی تحریر ہے۔ بلاشبہ آپ نے لکھا ہے آپ مجھے ایسی جنت کی طرف دعوت دے رہے ہیں جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو جہنم کہاں ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سبحان اللہ رات کہاں ہوتی ہے جب دن آجاتا ہے۔''(1)

اور اسی طرح کی دلیل سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے خلاف استدلال کیا جب انہوں نے آپ کو کہا: کیا تم نے اس قول کو دیکھا ہے **وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ** تو جہنم کہاں ہے؟ اور انہوں نے آپ کو کہا: آپ وہ لائیں جو اس سے مشابہت رکھتا ہو جو تورات میں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے عرض کے سبب طول پر آگاہ فرمایا کیونکہ اغلباً طول عرض سے زیادہ ہوتا ہے اور طول جب ذکر کر دیا جائے تو وہ عرض کی مقدار پر دلالت نہیں کرتا۔ زہری نے کہا ہے: جنت کا عرض بیان کیا گیا ہے اور رہا اس کا طول تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا (2) اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: **مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ** (الرحمن: 54) (وہ تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے بستروں پر جن کے استر قنادیز کے ہوں گے۔) تو اس میں بطانہ کو اس حسین ترین شے کے ساتھ متصف کیا گیا ہے جو زینت اور خوبصورتی سے جانی جاتی ہے جبکہ یہ معلوم ہے کہ ظواہر باطن کے مقابلہ میں زیادہ حسین اور اتقن ہوتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: بلاد عریضۃ وفلاۃ عریضۃ یعنی وسیع شہر اور بیابان۔

شاعر نے کہا ہے:

1۔ تفسیر ابن کثیر، سورۂ آل عمران، جلد 1، صفحہ 318، دار القرآن بیروت

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 548

كَأَنَّ بِلَادَ اللهِ وَهِيَ عَرِيضَةٌ عَلَى الْخَائِفِ الْمَطْلُوبِ كِفَّةُ حَابِلِ

اس میں وھی عریضۃ وسیع وعریض ہونے کے معنی میں ہے۔

اور ایک قوم نے کہا ہے: مقطع عرب پر کلام بطور استعارہ جاری ہے، پس جب جنت وسعت اور انفساح کے اعتبار سے انتہا کو پہنچی ہوئی ہے تو پھر اسے آسمانوں اور زمین کے عرض کے ساتھ بیان کرنا انتہائی حسین عبارت ہے، جیسا کہ تو کسی آدمی کے لئے کہتا ہے: ھذا بحر (یہ تو سمندر ہے) اور حیوانوں میں سے کسی بڑے کے لئے یہ کہتا ہے: ھذا جبل یہ پہاڑ ہے تو آیت نے عرضاحد بیان کرنے کا قصد نہیں کیا، البتہ اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ ہر اس شے سے وسیع تر ہے جسے تم نے دیکھا ہے، اور عام علماء کا نظریہ یہ ہے کہ جنت تخلیق کر دی گئی ہے اور یہ موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ اور اس کا بیان حدیث اسراء وغیرہ میں ہے جو صحیحین وغیرہما میں بیان کی گئی ہے۔

اور معتزلہ نے کہا ہے: بلاشبہ یہ دونوں (جنت اور جہنم) ہمارے وقت میں موجود نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ جب آسمانوں اور زمین کو لپیٹ دے گا تو پھر وہ جنت اور جہنم کو جہاں چاہے گا بنا دے گا، کیونکہ یہ دونوں ثواب وعقاب کے لئے دار جزا ہیں، لہٰذا احکام کا مکلف بنائے جانے کے بعد جزا کے وقت میں انہیں بنایا جائے گا، تاکہ دار التکلیف اور دار الجزاء دنیا میں جمع نہ ہو جائیں۔ اور ابن فورک نے کہا ہے: جنت میں قیامت کے دن اضافہ کر دیا جائے گا۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: اس میں منذر بن سعید وغیرہ کا تعلق قائم کیا گیا ہے ان سے جنہوں نے کہا: بلاشبہ ابھی تک جنت تخلیق نہیں کی گئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ابن فورک کا یہ قول ''کہ اس میں اضافہ کیا جائے گا'' یہ جنت کے موجود ہونے کی طرف اشارہ ہے، لیکن یہ ایسی سند کا محتاج ہے جو زیادتی کے عذر میں قطعی ہو۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن عطیہ نے اس بارے میں سچ کہا ہے کہ جب انہوں نے کہا: جب ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ان دراہم کی طرح ہیں جو زمین کے وسیع بیابان میں ڈال دیئے گئے ہوں اور کرسی عرش کے سامنے اس انگوٹھی کی طرح ہے جسے وسیع زمین میں رکھ دیا گیا ہے، تو جنت اب اسی حالت پر ہے جس پر وہ آخرت میں ہوگی کہ اس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے، کیونکہ عرش اس کی چھت ہے، یہ اس کے مطابق ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ چھت اپنے نیچے آنے والی ہر شے کو گھیرے ہوتا ہے اور کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے اور جب تمام مخلوقات اس (عرش) کی نسبت ایک انگوٹھی کی طرح ہیں تو پھر کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہو اور اس کے طول وعرض کو جانتا ہو سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ایسا خالق ہے جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اور نہ ہی اس کی مملکت کی وسعت کی کوئی غایت اور حد ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

''وہ (پرہیزگار) جو خرچ کرتے ہیں خوشحالی اور تنگ دستی میں اور ضبط کرنے والے ہیں غصہ کو اور درگزر کرنے

والے ہیں لوگوں سے اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے احسان کرنے والوں سے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ یہ ان متقین کی صفت ہے جن کے لیے جنت تیار کی گئی ہے اور ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ فعل مندوب الیہ کے ساتھ مدح اور تعریف ہے اور السَّرَّآءِ کا معنی آسانی اور وَالضَّرَّآءِ کا معنی تنگی ہے۔

یہ ابن عباس، کلبی اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے اور عبید بن عمیر اور ضحاک نے کہا ہے کہ السَّرَّآءِ اور الضَّرَّآءِ کا معنی خوشحالی اور تنگ دستی ہے۔ اور صحت و بیماری کی حالت میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ فِي السَّرَّآءِ کا معنی ہے زندگی میں اور فی الضَّرَّاءِ سے مراد وہ ہے جس کی وہ موت کے بعد وصیت کرتا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد شادی اور ولیموں میں خرچ کرنا ہے اور فی الضراءِ سے مراد تکالیف اور ماتم میں خرچ کرنا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ نفقہ ہے جو تمہیں خوش کرتا ہے مثلاً اولاد اور قرابتداروں پر خرچ کرنا اور ضراء سے مراد دشمنوں پر خرچ کرنا ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فِي السَّرَّآءِ سے مراد وہ ہے جس کے ساتھ وہ جوان کی مہمان نوازی کرتا ہے اور اسے ہدیہ دیتا ہے اور ضراء وہ ہے جس کو وہ تکلیف میں مبتلا لوگوں پر خرچ کرتا اور اس سے ان پر صدقہ کرتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں۔ یہ آیت عام ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ اور یہ ایک مسئلہ ہے:

مسئلہ نمبر 2۔ اور کَظْم الغیظ کا معنی ہے غصے کو پیٹ میں لوٹانا، کہا جاتا ہے: کظم غیظہ یعنی وہ اس پر خاموش رہا اور اس کا اظہار نہ کیا باوجود اس کے کہ وہ اپنے دشمن پر برسنے اور عملاً وہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اور کظمت السِّقاء کا معنی ہے میں نے مشکیزہ بھرا اور اس کا منہ بند کر دیا اور الکظامۃ وہ شے جس کے ساتھ پانی کا راستہ بند کیا جاتا ہے اور اسی سے الکظام اس تسمہ (دھاگے) کو بھی کہا جاتا ہے جس کے ساتھ مشکیزے کا منہ بند کیا جاتا ہے اور کظم البعیر جرتہ جب اونٹ جگالی کو اپنے پیٹ میں لوٹا دے، اور کبھی کظم اس معنی کے لئے بولا جاتا ہے کہ وہ جگالی سے رک گیا قبل اس کے کہ وہ اسے اپنے منہ کی طرف بھیجے۔ اسے زجاج نے بیان کیا ہے۔ کہا جاتا ہے: کظم البعیر و الناقۃ جب یہ جگالی نہ کریں۔

اور اسی سے راعی کا قول ہے:

فَأَفَضْنَ بعد كُظومِهِن بجِرَّة   من ذي الأَبارق اذ رعين حَقِيلا

اس میں جگالی سے رکنے کے معنی میں لفظ کظوم استعمال ہوا ہے۔

الحقیل، ایک جگہ ہے۔ اور الحقیل ایک بوٹی بھی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ گھبراہٹ اور مشقت و تھکاوٹ کے وقت ایسا کرتا ہے اور وہ جگالی نہیں کرتا۔

اعشی نے اونٹوں کو نحر کرنے والے آدمی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہا اور وہ اس سے گھبراتے ہیں:

قد تكظم البُزْلُ منه حين تبصره   حتى تَقَطَّعَ في أجوافها الجِرر

طاقتور اونٹ بھی جب اسے دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے یہاں تک کہ جگالی اس کے پیٹ میں ہی کٹ جاتی ہے۔ (یعنی جگالی کے لئے پیٹ سے باہر کوئی شے نہیں لاسکتا۔)

اور اسی سے ہے، رجل کظیم و مکظوم جب کوئی غم واندوہ اور حزن وملال سے بھرا ہوا ہو۔

اور قرآن کریم میں ہے: وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ (یوسف) (اور سفید ہو گئیں ان کی دونوں آنکھیں غم کے باعث اور وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے) اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ (القلم) (جب اس نے پکارا اور وہ غم واندوہ سے بھرا ہوا تھا) اور غیظ غضب کی اصل اور بنیاد ہے اور اکثر اوقات تو یہ دونوں لازم وملزوم ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ غیظ جوارح (اعضاء بدن) پر ظاہر نہیں ہوتا بخلاف غضب کے کیونکہ یہ جوارح میں ایسے فعل کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جو ضروری ہوتا ہے اسی لئے جب غضب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مقصود وہ افعال ہوتے ہیں جو الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ میں ظاہر ہوتے ہیں اور بعض لوگوں نے غیظ کی تفسیر غضب سے کی ہے اور یہ عمدہ نہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ لوگوں کو معاف کرنا نیکی اور خیر کے افعال میں سے انتہائی عظیم فعل ہے، اس حیثیت سے کہ آدمی کے لئے جائز ہوتا ہے کہ وہ معاف کر دے اور یہ کہ وہ اپنے حق کی طرف متوجہ ہو اور ہر وہ جو سزا کا مستحق ہو لیکن اسے چھوڑ دیا جائے تو تحقیق اسے معاف کر دیا گیا اور عَنِ النَّاسِ کے معنی میں اختلاف ہے پس ابو العالیہ، کلبی اور زجاج نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ سے مراد غلاموں کو معاف کرنا ہے۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: مثال کے طور پر یہ بہت اچھا ہے، کیونکہ وہ خادم ہوتے ہیں اور وہ کثرت سے غلطیاں کرتے ہیں اور ان پر قدرت آسان ہوتی ہے اور سزا کو نافذ کرنا سہل ہوتا ہے، اسی لئے مفسر نے اس کے ساتھ مثال بیان کی ہے۔ اور میمون بن مہران سے روایت ہے کہ ان کی ایک کنیز تھی وہ ایک دن ایک بڑا پیالہ لے کر آئی اس میں گرم شوربہ تھا اور آپ کے پاس کچھ مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ پس وہ گر پڑی اور شوربہ آپ پر پڑ گیا، تو میمون نے اسے مارنا چاہا تو اس لونڈی نے کہا: اے میرے آقا! آپ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کیجئے: وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ تو اس نے کہا: تحقیق میں نے کر دیا، پھر اس سے کہا: جو اس کے بعد ہے اس پر بھی عمل کیجئے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ تو اس نے کہا: میں نے تجھے معاف کر دیا۔ پھر اس لونڈی نے کہا: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ تو میمون نے کہا: میں نے تجھ پر احسان کر دیا، پس تو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے آزاد ہے۔ احنف بن قیس سے اسی طرح مروی ہے۔

اور حضرت زید بن اسلم نے کہا ہے: وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور وہ لوگوں کے ظلم اور ان کی برائیوں سے درگزر کرنے والے ہیں (1)۔ یہ حکم عام ہے اور یہی آیت کا ظاہر معنی ہے اور مقاتل بن حیان نے اس آیت میں کہا ہے: ہم تک خبر پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت فرمایا: ''میری امت میں سے یہ قلیل (لوگ) ہیں سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ حالانکہ گزشتہ امتوں میں یہ کثیر لوگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح اور تعریف فرمائی ہے جو غصے کے وقت بخش دیتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ (الشوری) (اور جب وہ غضبناک ہوتے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 549

ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں) اور غصہ پی جانے والوں کی اس قول کے ساتھ تعریف فرمائی: وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ اور یہ خبر دی ہے کہ وہ انہیں ان کے اس احسان کے سبب پسند کرتا ہے۔

اور غصہ پی جانے، لوگوں سے درگزر کرنے اور غضب کے وقت نفس کا مالک ہونے کے بارے کئی احادیث وارد ہیں۔
اور یہی انتہائی عظیم عبادت اور جہاد بالنفس ہے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''طاقتور وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھتا ہے (1)''۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا ہے: ''جو گھونٹ بھی آدمی پیتا ہے وہ اس کے لئے خیر اور نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں غصہ کے گھونٹ سے بڑھ کر اجر والا کوئی نہیں (2)''۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک آدمی نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، ہر شے سے زیادہ سخت اور شدید کون سی شے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا غضب'' پھر اس نے عرض کی: کون سی شے اللہ تعالیٰ کے غضب سے نجات دلاتی ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو غصہ نہ کر''۔

عرجی نے کہا ہے:

واذا غضبتَ فکن وَقُوْرًا کاظمًا للغیظ تَبْصُرُ ما تقول و تسمع

جب تجھے غصہ آئے تو انتہائی وقار کے ساتھ غصہ پینے والا ہو جا اور اسے غور سے دیکھ جو کہہ رہا ہے اور سن رہا ہے۔

فکفی بہ شرفا تصبُّر ساعۃ یرضٰی بھا عنک الالٰہ و تُرفع

پس ایک ساعت کا صبر کرنا از روئے شرف کے کافی ہے جس کے سبب تجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے اور تو بلند مرتبہ کر دیا جائے اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے عفو کے بارے کہا ہے:

لن یبلغ المجدَ اقوامٌ وان شرفوا حتیٰ یُذَلُّوْا وان عَزُّوْا لِاَقوام

قومیں ہرگز بزرگی کو نہ پا سکیں گی اگرچہ وہ شریف ہوں یہاں تک کہ انہیں ذلیل وخوار کر دیا جائے گا اگرچہ وہ قوموں پر غالب ہوں۔

و یُشْتَمُوا فتری الألوان مُشْرِقَۃ لا عفو ذُلٍّ ولکن عَفْوُ اِکْرامِ

اور انہیں گالی گلوچ نہیں دی جاتیں اور وہ کائنات کو روشن دیکھتی ہیں ان کی یہ عفو ودرگزر ذلت ورسوائی کی نہیں ہوتی بلکہ عزت واکرام کی ہوتی ہے۔

ابو داؤد اور ابو عیسیٰ ترمذی نے حضرت سہل بن معاذ بن انس جہنی سے اور انہوں نے اپنے باپ کے واسطہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے غصہ پی لیا حالانکہ وہ اسے نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کے سامنے اسے بلائے گا یہاں تک کہ اسے حور کے بارے اختیار عطا فرما دے گا کہ جسے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الادب باب الحذر من الغضب، جلد 2، صفحہ 903، کراچی۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 5649، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ ابن ماجہ کتاب الزہد باب الحلم، صفحہ 319، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4178، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چاہے لے لے۔'' فرمایا یہ حدیث حسن غریب ہے۔(1)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا جس کسی کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اسے چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ اور کہا جائے گا: یہ کون ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے؟ تو لوگوں سے درگزر کرنے والے کھڑے ہوں گے اور بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔'' اسے ماوردی نے ذکر کیا ہے۔

اور ابن مبارک نے کہا ہے: میں منصور کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس نے ایک آدمی کو قتل کرنے کا حکم دیا، تو میں نے کہا: اے امیر المومنین! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک منادی ندا دے گا جس کا اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی احسان ہو تو وہ آگے بڑھے پس کوئی آگے نہیں بڑھے گا سوائے اس کے جس نے گناہ اور غلطی سے درگزر کی۔'' پس یہ حکم اپنے اطلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے احسان پر ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت سری سقطی نے کہا ہے: احسان یہ ہے کہ تو امکان کے وقت احسان کرے، پس ہر وقت تیرے لئے احسان ممکن نہیں ہوگا۔ شاعر نے کہا ہے:

بادِرْ بِخَيرٍ اذا ما كنتَ مقتدرا		فليس لى كل وقتٍ انت مقتدرُ

تو خیر اور نیکی کے عمل میں جلدی کر جب تو اس کی قدرت رکھتا ہو۔ ہر وقت میں تو اس پر قادر نہیں ہوگا۔

اور ابو العباس الجمانی نے کہا ہے اور خوب اچھا کہا ہے:

ليس فى كل ساعةٍ وأوانٍ		تتهيّأ صنائعُ الاحسان

ہر ساعت اور ہر وقت میں احسان کرنے والا (اس کے لئے) تیار نہیں ہوتا۔

واذا أمكنتْ فبادِرْ اليها		حذرًا من تعذُّرِ الامكانِ

اور جب امکان ہو تو پھر اس کی طرف جلدی کر اس خوف سے کہ کہیں امکان متعذر نہ ہو جائے۔ محسن اور احسان کے بارے میں قول سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٥﴾

''اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کر بیٹھیں کوئی برا کام یا ظلم کریں اپنے آپ پر (تو فوراً) ذکر کرنے لگتے ہیں اللہ کا اور معافی مانگنے لگتے ہیں اپنے گناہوں کی اور کون بخشتا ہے گناہوں کو اللہ کے سوا۔ اور نہیں اصرار کرتے اس پر جو ان سے سرزد ہوا اس حال میں کہ وہ جانتے ہیں''۔

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب من کظم غیظاً، جلد 2، صفحہ 303، اسلام آباد۔ ایضاً، حدیث نمبر 4147، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک صنف کا ذکر کیا ہے اور یہ پہلی صنف (کے لوگوں) سے (درجہ میں) کم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت اور احسان کے ساتھ ان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ اور یہ توبہ کرنے والے لوگ ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عطا کی روایت میں کہا ہے: یہ آیت نبہان التمار کے بارے میں نازل ہوئی ہے ..... اس کی کنیت ابو مقبل تھی .. اس کے پاس ایک حسین و جمیل عورت آئی اور اس نے اسے کھجوریں فروخت کیں اور پھر اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور اس کا بوسہ لیا اور پھر اپنے اس عمل پر نادم اور شرمندہ ہوا، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، پھر یہ آیت نازل ہوئی۔(1)

ابو داؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے انہوں نے فرمایا: مجھے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے اور ابوبکر نے سچ کہا ہے ..... کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو بندہ بھی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر وضو کرتا ہے اور دو رکعت نماز ادا کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔'' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی .. وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ... الآیہ۔

اور دوسری یہ آیت ..... ومن یعمل سوٓء او یظلم نفسہ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے(2) اور یہ عام ہے۔ تحقیق آیت کسی سبب خاص کے تحت نازل ہوتی ہے اور پھر وہ ان تمام کو شامل ہوتی ہے جو وہ کرے یا اس سے زیادہ فعل کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا سبب نزول یہ ہے کہ ایک ثقفی ایک غزوہ میں گیا اور اس نے اپنا ایک انصاری دوست اپنے گھر والوں کے پاس چھوڑا، تو اس نے اس میں خیانت کی کہ اس نے اسے دبوچ لیا اور وہ عورت اپنے لئے اسے دور ہٹاتی رہی لیکن اس نے اس کے ہاتھ کا بوسہ لے لیا، پھر وہ اس پر نادم ہوا تو وہ زمین میں چیختے چلاتے نکل گیا وہ اپنے فعل پر انتہائی نادم تھا اور توبہ کر رہا تھا، پس وہ ثقفی واپس آیا تو اس کی زوجہ نے اس کے ساتھی کے فعل کے بارے اسے بتایا، تو وہ اس کی تلاش میں نکل پڑا، پس وہ انصاری حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس اس امید سے آیا کہ وہ ان کے پاس کوئی وسعت اور گنجائش پالے گا لیکن انہوں نے اسے خوب جھڑکا اور ڈانٹ ڈپٹ کی، پھر وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور آپ کو اپنے فعل کے بارے میں عرض کی، تو یہ آیت نازل ہوئی(3)۔ حدیث کے مطابق عموم ہی اولیٰ اور بہتر ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہم سے زیادہ مکرم تھے، اس حیثیت سے کہ ان میں سے گناہ کرنے والے کی سزا صبح کے وقت اس کے دروازے پر

1۔ اسباب النزول، صفحہ 81

2۔ جامع الترمذی، کتاب الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 202۔ ایضاً، جامع ترمذی، کتاب التفسیر من سورۃ آل عمران، حدیث 2932، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ اسباب النزول، صفحہ 82

لکھی ہوئی تھی اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے گناہ کا کفارہ اس کے گھر کی دہلیز پر لکھ دیا جاتا تھا'' تو اپنی ناک توڑ دے، تو اپنا کان کاٹ لے، تو اس طرح کر''۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی اور رحمت فرماتے ہوئے اور بنی اسرائیل کے اس فعل کے عوض یہ آیت نازل فرمائی۔

اور روایت کیا جاتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ابلیس رو پڑا۔ اور الفاحشۃ کا اطلاق ہر معصیت (گناہ) پر کیا جاتا ہے، حالانکہ اکثر طور پر یہ زنا کے ساتھ خاص ہے یہاں تک کہ حضرت جابر بن عبداللہ اور سدی نے اس آیت میں اس کی تفسیر زنا کے ساتھ ہی کی ہے۔ اور قول باری تعالیٰ اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ میں لفظ اَوْ کے بارے کہا گیا ہے کہ یہ واؤ کے معنی میں ہے اور مراد وہ (گناہ) ہیں جو کبائر میں شامل نہ ہوں۔

ذَكَرُوا اللّٰهَ اس کا معنی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے اور اس سے حیا کرتے ہوئے اس کا ذکر کرنے لگتے ہیں جو ضحاکؒ نے کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بڑی پیشی کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دل میں یہ فکر کرنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اس کے بارے پوچھے گا، اسے کلبی اور مقاتل نے بیان کیا ہے۔

اور مقاتل سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ گناہ ہو جانے کے وقت زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ یعنی وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے مغفرت طلب کرتے ہیں اور ہر وہ دعا جس میں یہ معنی ہو یا اس کے الفاظ ہوں تو وہ استغفار کہلاتا ہے۔ اس سورۃ کی ابتداء میں سید الاستغفار کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ کہ اس کا وقت سحری کا ہے۔ پس استغفار عظیم ہے اور اس کا ثواب بہت بڑا ہے، حتی کہ ترمذی نے حضور نبی کریم ﷺ سے حدیث ذکر کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ''جس نے یہ کہا استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ (1) تو اس کو بخش دیا جائے گا اگرچہ وہ میدان جہاد سے ہی بھاگا ہو''۔

اور مکحول نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ استغفار کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔'' اور حضرت مکحول نے کہا ہے: میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ استغفار کرتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ اور حضرت مکحول خود بھی کثیر الاستغفار تھے۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: مطلوب استغفار وہ ہے جو اصرار کی گرہ کو کھول دیتا ہے اور اس کا معنی دل میں ثبت ہو جاتا ہے نہ کہ صرف زبان سے تلفظ کرتا ہے۔ پس جس نے اپنی زبان سے کہا: اَسْتَغْفِرُ اللّٰه، اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی پر مصر رہا تو اس کا یہ استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے اور اس کے صغیرہ گناہ کبائر کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہمارا استغفار مزید استغفار کا محتاج ہوتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں کہ آپ یہ قول اپنے زمانے میں کہتے تھے، تو ہمارے اس زمانے میں کیفیت کیا ہوگی جس میں انسان ظلم و ستم پر منہ کے بل گرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے اور اس پر ایسا حریص ہے کہ اسے چھوڑ نہیں سکتا اور تسبیح اس کے ہاتھ

1۔ جامع ترمذی، باب فی دعاء الضیف، حدیث نمبر 3501، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

میں ہوتی ہے درآنحالیکہ یہ گمان کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اپنے گناہ کی اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کر رہا ہے اور یہ اس کی طرف سے استہزا اور استخفاف (حقیر سمجھنا) ہے اور قرآن کریم میں ہے وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات کو تمسخر نہ بناؤ۔) یہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ یعنی سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہے جو گناہوں کی مغفرت فرمادے اور ان کی سزا کو زائل کردے۔

وَلَمْ يُصِرُّوْا یعنی جو کچھ انہوں نے کیا اس پر وہ ثابت قدم نہیں ہوجاتے اور نہ اس کا پختہ عزم کرتے ہیں۔ اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: یعنی وہ اس پر ہمیشگی اور دوام اختیار نہیں کرتے۔ اور معبد بن صبیح نے کہا ہے: میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی اور میری ایک جانب علی رضی اللہ عنہ تھے، پس آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا میں نے بغیر وضو کے نماز پڑھی ہے پھر آپ گئے اور وضو کیا اور پھر نماز پڑھائی۔ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اصرار کا معنی ہے هو العزم بالقلب على الأمر وترك الإقلاع عنه یعنی کسی کام پر دل سے پختہ عزم کرنا اور اس سے باز رہنے کو ترک کرنا۔ اور اسی سے صر الدنانیر ہے یعنی انہیں مضبوط باندھنا۔

حطیئہ نے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

عوابس بالشُّعثِ الكُماة اذا ابتغوا عُلَالَتها بالمُحْصَدَات أَصَرَّتِ

یعنی وہ اپنے دشمنوں کے خلاف ثابت قدم رہے۔

اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الاصرار الثبوت على المعاصي۔ یعنی اصرار سے مراد گناہوں پر ثابت ہونا اور ڈٹ جانا ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

يُصِرُّ بالليل ما تخفى شواكِلُهُ يا ويحَ كل مصِرٍّ القلبِ ختّار

اس میں اصرار کا لفظ مذکورہ معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: جاہل مردہ ہے، بھولنے والا سونے والا ہے، اور گناہ کرنے والا نشے میں ہے اور اصرار کرنے والا ہلاک ہونے والا ہے اور اصرار کا معنی بار بار کرنا ہے۔ یعنی وہ یہ کہتا رہے کہ میں کل توبہ کروں گا؟ اور یہ نفس کا دعویٰ ہے، وہ آنے والے کل کیسے توبہ کرے گا جب کہ وہ اس کا مالک ہی نہ ہوگا۔

اور سہل کے سوا کسی اور نے کہا ہے: اصرار کا معنی ہے کہ وہ توبہ نہ کرنے کی نیت کرے اور جب وہ خالص توبہ کی نیت کرے گا تو اصرار سے نکل جائے گا۔ اور سہل کا قول احسن ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: لا توبة مع اصرار (یعنی (گناہ پر) اصرار کے ساتھ کوئی توبہ نہیں ہے۔)

مسئلہ نمبر 3۔ ہمارے علماء نے کہا ہے: توبہ پر ابھارنے والی اور اصرار کو حل کرنے والی (شے) کتاب اللہ العزیز

الغفار میں دائمی غور و فکر کرتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس میں جنت اور اطاعت کرنے والوں کے ساتھ وعدوں کی تفصیل ذکر کی ہے اور جو کچھ اس میں عذاب جہنم اور گنہگاروں کو ڈرانے کا بیان کیا ہے اور وہ اس پر ہمیشہ غور و فکر کرتا رہے یہاں تک کہ اس کا خوف اور امید قوی ہو جائے اور وہ رغبت رکھتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے اور یہ رغبت اور رہبت ہی خوف اور رجاء کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ وہ سزا سے خوفزدہ رہتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی راہ صواب کی توفیق دینے والا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلاشبہ اس پر ابھارنے والی وہ تنبیہ الٰہی ہے جس کے ساتھ وہ اسے متنبہ کرتا ہے جس کے لئے وہ سعادت کا ارادہ کرے اور گناہوں کے قبح اور ضرر کا کیونکہ وہ تو ہلاک کرنے والا زہر ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اختلاف لفظ میں ہے نہ کہ معنی میں، کیونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں اس کی تنبیہ کے بغیر غور و فکر نہیں کرتا، پس جب بندہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ اپنے آپ کی طرف دیکھتا ہے تو وہ اپنے نفس کو ان گناہوں سے بھرا ہوا پاتا ہے جو اس نے کمائے ہیں اور ان برائیوں سے جن کا اس نے ارتکاب کیا ہے اور پھر اس کوتاہی اور سستی پر اس میں ندامت اور شرمندگی کے جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی سزا کے خوف سے سابقہ اعمال کی مثل اعمال کرنا چھوڑ دیتا ہے تو ایسے آدمی پر یہ صادق آتا ہے کہ وہ تائب (توبہ کرنے والا) ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر وہ معصیت پر اصرار کرنے والا ہوگا اور ہلاکت کے اسباب کو لازم پکڑنے والا ہوگا۔

سہل بن عبداللہ نے کہا ہے: تائب کی علامت یہ ہے کہ گناہ اسے کھانے پینے سے مشغول رکھے جیسا کہ وہ تین صحابہ کرام جو غزوہ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے۔ (1)

مسئلہ نمبر 4۔ قولہ تعالیٰ: وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اس میں کئی اقوال ہیں۔ پس کہا گیا ہے: یعنی وہ اپنے گناہوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان سے توبہ کرتے ہیں۔ نحاس نے کہا ہے: یہ اچھا قول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبداللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ میں اصرار پر سزا دوں گا اور عبداللہ بن عبید بن عمیر نے کہا ہے اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ جانتے ہیں کہ اگر انہوں نے مغفرت طلب کی تو انہیں بخش دیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ ان (چیزوں) کے بارے جانتے ہیں جو میں نے ان پر حرام کی ہیں، یہ ابن اسحاق نے کہا ہے۔ اور حضرت ابن عباس، حسن، مقاتل اور کلبی تمام نے کہا ہے: اور وہ یہ جانتے ہیں کہ اصرار تکلیف دہ ہے اور اسے چھوڑ دینا سرکشی کی نسبت بہتر ہے۔ اور حسن بن فضل نے کہا ہے: اور وہ جانتے ہیں کہ ان کا رب ہے جو گناہ کو بخش دیتا ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: انہوں نے یہ معنی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے لیا ہے وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ اپنے رب کریم سے اسے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بندہ ایک گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے اللہ! میرا گناہ بخش دے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے ایک گناہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا رب ہے جو گناہ کو معاف فرما

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث کعب ابن مالک، حدیث نمبر 4066، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دیتا ہے اور گناہ کے سبب وہ پکڑ لیتا ہے پھر وہ لوٹتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور کہتا ہے: اے میرے پروردگار! میرے لئے میرا گناہ بخش دے ... پس اللہ تعالیٰ نے اسی کی مثل دوبارہ ذکر کیا اور آخر میں فرمایا: اعمل ماشئت فقد غفرت لك تو جو چاہے عمل کر میں نے تجھے بخش دیا (1)۔ اسے مسلم نے نقل کیا ہے۔ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ دوبارہ گناہ کر کے توبہ کو توڑنے کے بعد دوبارہ توبہ کرنا صحیح ہے۔

کیونکہ پہلی توبہ طاعت ہے وہ گزر چکی ہے اور صحیح ہے اور دوسرا گناہ سرزد ہونے کی وجہ سے اب وہ دوسری نئی توبہ کا محتاج ہے اور گناہ کی طرف لوٹنا اگرچہ اس کی ابتدا سے زیادہ قبیح ہے، کیونکہ گناہ کی نسبت توبہ توڑنے کی طرف ہے، تو توبہ کی طرف لوٹنا اس کی ابتدا سے زیادہ اچھا ہے، کیونکہ اس کی طرف کریم اور سخی کے دروازے کو التجا کے اصرار کے ساتھ لازم پکڑنے کی نسبت ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں۔

اور حدیث کے آخر میں یہ قول اِعْمَلْ مَاشِئْتَ یہ امر ہے اور اس کا معنی ایک قول کے مطابق اکرام (عزت کرنا) ہے، پس یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے باب سے ہو جائے گا: اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ (ق: 34) (داخل ہو جاؤ جنت میں سلامتی سے) کلام کا آخر مخاطب کی حالت کے بارے خبر ہے کہ اس کے سابقہ گناہوں سے اس کی مغفرت کر دی گئی ہے اور وہ اپنے مستقبل کے کاموں میں ان شاء اللہ محفوظ ہو گا۔

آیت اور حدیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ گناہ کے اعتراف اور اس سے استغفار کرنے کا عظیم فائدہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان العبد اذا اعترف بذنبه ثم تاب الی الله تاب الله علیه (2) (بندہ جب اپنے گناہ کا اعتراف کر لے پھر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما لیتا ہے۔) اسے صحیحین نے روایت کیا ہے۔

اور کسی شاعر نے کہا ہے:

یستوجب العفو الفتی اذا اعترف بما جنی من الذنوب و اقترف

نوجوان عفو و درگزر کو واجب کر لیتا ہے جب وہ ان گناہوں کا اعتراف کرے جن کا ارتکاب اس نے کیا۔

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

أَقْرِرْ بذنبك ثم اطلب تجاوُزَهُ ان الجحودَ جُحودَ الذَّنْبِ ذنبان

اپنے گناہ کا اقرار کر پھر اس سے درگزر کرنے کا مطالبہ کر بلاشبہ گناہ کا انکار کرنا دو گناہ ہیں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرو تو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے (ختم کر دے) اور ایک ایسی قوم لے آئے جو گناہ کریں گے اور استغفار کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں بخش دے گا۔ (والذی نفسی بیدہ لولم تذنبوا لذهب الله

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 357، کراچی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6953 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب حدیث الافک، جلد 2، صفحہ 596، اسلام آباد۔ صحیح بخاری، کتاب الشہادات، حدیث 2467، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

بکم ولجاءَ بقوم یذنبون ویستغفرون فیغفر لھم (1)) اور اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی غفار اور تواب کا یہی فائدہ ہے۔ ہم نے اسے ''الکتاب الاسنیٰ فی شرح اسماء اللہ الحسنیٰ'' میں بیان کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ گناہ وہ ہیں جن سے توبہ کی جاسکتی ہے چاہے وہ کفر ہو یا اس کے سوا کوئی اور پس کافر کی توبہ اس کا ایمان لانا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ وہ اپنے سابقہ کفر پر نادم بھی ہو، صرف ایمان لانا نفس توبہ نہیں ہے اور اگر گناہ کفر کے علاوہ ہو تو پھر یا تو وہ اللہ تعالیٰ کا حق ہوگا یا وہ کسی بندے کا حق ہوگا، پس حقوق اللہ میں سے ہونے کی صورت میں توبہ کے لئے اسے چھوڑ دینا کافی ہوتا ہے، سوائے ان کے جن میں شریعت نے صرف ترک کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض کی طرف قضا کی نسبت کی ہے جیسا کہ نماز اور روزہ وغیرہ۔ اور ان میں بعض وہ ہیں جن کی طرف کفارہ کی نسبت کی ہے جیسا کہ قسم توڑ دینا اور ظہار وغیرہ میں۔ اور رہے حقوق العباد تو انہیں ان کے مستحقین تک پہنچانا ضروری ہے اور اگر وہ نہ پائے جائیں تو ان کی طرف سے صدقہ کیا جائے گا۔ اور جو کوئی تنگدستی کے سبب اس کی وسعت نہ پائے جو اس کے ذمہ واجب الاداء ہے تو پھر معاف فرمانا اللہ تعالیٰ کا معمول ہے اور اس کا فضل وافر ہے، پس کتنے تبعات کا وہ ضامن بنا ہے اور اس نے سیئات کو حسنات سے بدل دیا ہے۔ عنقریب اس کا مزید بیان آئے گا۔

مسئلہ نمبر 6۔ انسان پر یہ لازم نہیں ہے کہ جب اسے اپنا گناہ یاد نہ ہو اور وہ اسے نہ جانتا ہو کہ وہ اس معین گناہ کی طرف سے توبہ کرے، بلکہ اس پر یہ لازم ہے کہ جب اسے گناہ یاد آجائے تو وہ اس سے توبہ کرلے۔ اور بہت سے لوگوں نے اس میں تاویل کی ہے جو ہمارے شیخ ابو محمد عبد المعطی الاسکندرانی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ امام محاسبی رحمۃ اللہ علیہ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اجناس معاصی سے توبہ کرنا صحیح نہیں ہوتا اور یہ کہ ان تمام پر نادم ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جوارح کے ہر فعل سے اور اپنے دل کے ہر عقیدہ سے معین طور پر توبہ کرے۔ انہوں نے ان کے قول سے یہی گمان کیا ہے، حالانکہ یہ ان کی مراد نہیں ہے اور نہ ان کا کلام اس کا تقاضا کرتا ہے، بلکہ مکلف کا حکم یہ ہے کہ جب وہ اپنے افعال کا حکم پہچان لے اور معصیت کو غیر سے پہچان لے، تو اس کے لئے ان تمام سے توبہ کرنا صحیح ہے جنہیں اس نے پہچان لیا، کیونکہ اگر اس نے اپنے ماضی کے فعل کے گناہ ہونے کو نہ پہچانا تو اس کے لئے اس سے توبہ کرنا ممکن نہ ہوگا نہ انفراداً اور نہ تفصیلاً۔ اس کی مثال وہ آدمی ہے جو سود کے دروازوں میں سے کسی دروازے کو لے لیتا ہے اور وہ یہ نہیں پہچانتا کہ یہ ربوٰا ہے، پھر جب اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (البقرہ) (اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو باقی رہ گیا ہے سود سے اگر تم (سچے دل سے) ایماندار ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اعلان جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے)

تو اس پر یہ تہدید انتہائی شدید ثابت ہوئی اور اس کا گمان تھا کہ وہ سود سے سالم اور محفوظ ہے، لیکن اب جب اسے سود کی حقیقت کا علم ہوا پھر وہ اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بارے میں متفکر ہوا اور اس نے جان لیا کہ وہ سابقہ دنوں میں سود میں

1۔ مسلم، کتاب التوبہ، جلد 2، صفحہ 355، آرام باغ کراچی

سے بہت سی چیزیں لیتا رہا ہے، تو اب اس پر صحیح ہے کہ وہ ان تمام پر نادم ہو، اس کے اوقات کی تعیین اس پر لازم نہیں۔ اور اسی طرح ان تمام گناہوں اور برائیوں کا حکم ہے جن میں وہ واقع ہوتا رہا ہے مثلاً غیبت، چغلخوری اور ان کے علاوہ وہ محرمات جن کے حرام ہونے کا اسے علم نہیں تھا، پس جب فقاہت حاصل کر لے اور اس کے کلام میں سے جو گزر چکا ہے اسے تلاش کرے تو وہ مجموعی طور پر اس سے توبہ کر لے، اور الله تعالیٰ کے حقوق میں سے جس میں اس سے کوتاہی ہوئی ہے اس پر اظہار ندامت کرے، اور جب اس نے حلال سمجھا اسے جو اس پر ظلم تھا تو اس نے مجموعی طور پر اسے حلال قرار دیا اور اس کا نفس اپنا حق چھوڑنے کے ساتھ خوش رہا تو یہ جائز ہے، کیونکہ یہ مجہول شے ہبہ کرنے کے باب سے ہے، یہ بندے کے بخل اور اپنے حق کی طلب پر اس کی حرص کے ساتھ ساتھ ہے۔ تو پھر اس اکرم الاکرمین کے بارے کیفیت کیا ہوگی جو طاعات اور ان کے اسباب عطا فرمانے والا ہے اور صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے درگزر فرمانے والا ہے؟ ہمارے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: یہ امام کی مر ... ہے اور یہی وہ معنی ہے جس پر ان کا کلام دلالت کرتا ہے اس کے لئے جس نے اس کی تلاش کی، اور جو یہ گمان کرنے والے نے گمان کر لیا ہے کہ ندامت صحیح نہ ہوگی مگر ہر معین اور ہر معینہ حرکات و سکنات پر تو یہ تکلیف مالا یطاق کے باب سے ہے، جو شرعاً واقع نہیں ہے اگرچہ عقلاً جائز ہے، اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ یہ پہچان رکھتا ہو کہ شراب پیتے وقت اس نے کتنے گھونٹ پیئے ہیں، اور زنا کرتے وقت اس نے کتنی بار حرکت کی ہے اور حرام کی طرف چلتے ہوئے اس نے کتنے قدم چلے ہیں، اور یہ ایسی شے ہے جس کی کوئی بھی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس سے تفصیلاً توبہ کرنے کا حکم آیا ہے۔ اس بارے میں توبہ کے احکام اور اس کی شرائط کا مزید بیان سورۃ النساء وغیرہا میں آئے گا ان شاء الله تعالیٰ۔

مسئلہ نمبر 7۔ قول باری تعالیٰ: وَلَمْ يُصِرُّوْا میں اس پر واضح حجت اور قطعی دلیل موجود ہے کہ یہ اس کے لئے ہے جو کچھ اس نے زبان سے کہا، اور لسان الامۃ القاضی ابو بکر بن طیب نے کہا ہے کہ انسان کا اس کے سبب بھی مواخذہ کیا جائے گا جس پر اس نے اپنے ضمیر کو ثابت اور پختہ کر لیا اور جس برائی کا اس نے اپنے دل سے عزم مصمم کر لیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: قرآن کریم میں ہے وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۵﴾ (الحج) (اور جو ارادہ کرے اس میں زیادتی کا ناحق تو ہم اسے چکھائیں گے دردناک عذاب)۔

اور مزید فرمایا: فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ (القلم) (چنانچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہو گیا۔) پس انہیں ان کے پختہ عزم کے سبب ان کے فعل سے پہلے ہی سزا دے دی گئی اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور بخاری شریف میں ہے ''جب دو مسلمان اپنی تلواریں لے کر آمنے سامنے آتے ہیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہوں گے۔'' صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول الله! صلی اللہ علیہ وسلم اس قاتل کے بارے میں تو سمجھ آئی، لیکن مقتول نے کیا کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ بھی تو اپنے ساتھی کو قتل کرنے کا حریص تھا۔'' (1)

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید کو حرص کے ساتھ معلق کیا ہے اور یہ عزم اور پختہ ارادہ ہی ہے اور ہتھیار کے اظہار کو لغو کر دیا ہے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الفتن، جلد 2، صفحہ 1049، اسلام آباد

اور اس سے زیادہ نص وہ ہے جسے ترمذی نے نقل کیا ہے ابو کبشہ انماری کی حدیث سے، اور اسے صحیح مرفوع قرار دیا ہے۔ ''بے شک دنیا چار قسم کے آدمیوں کے لئے ہے ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال اور علم عطا فرمایا اور وہ اس میں اپنے رب سے ڈرتا رہتا ہے اور اس میں صلہ رحمی کرتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے حق کو جانتا ہے تو یہ افضل ترین مقام و مرتبہ پر ہوگا، اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اسے مال نہ دیا اور وہ [نیت کے اعتبار سے صادق اور سچا ہو] اور وہ یہ کہتا ہو اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور اس نے اس کی نیت کی تو ان دونوں کا اجر برابر ہوگا۔ اور تیسرا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اسے علم نہیں دیا اور وہ [اپنے مال میں بغیر علم کے تصرف کرتا ہے] اور اس میں اپنے رب سے نہیں ڈرتا، اور نہ وہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ ہی اس میں اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی حق جانتا ہے تو وہ اخبث اور رذیل درجہ میں ہوگا، اور چوتھا وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے نہ مال عطا فرمایا اور نہ ہی علم، اور وہ کہتا ہے اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں یقیناً اس میں فلاں آدمی کے عمل کی طرح عمل کرتا اور وہی اس کی نیت ہو تو دونوں کا بوجھ برابر ہوگا۔ (1)''

اور یہ وہ ہے جس کی طرف قاضی گئے ہیں اور اسی پر عام سلف اور اہل علم فقہاء، محدثین اور متکلمین ہیں، اور اس کے خلاف جس نے یہ گمان کیا ہے کہ جس شے کا انسان قصد کرتا ہے اگرچہ وہ اس پر ثابت اور پختہ ہو جائے تو صرف ارادہ کے سبب اس کا مواخذہ نہیں کیا جائے گا، اس کی طرف توجہ نہیں کی جائے گی۔ اور اس کے لئے حضور نبی مکرم ﷺ کے اس ارشاد میں کوئی حجت نہیں ہے: ''جس نے گناہ کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا تو اس کے بارے کچھ نہیں لکھا جائے گا اور اگر اس کے مطابق عمل کیا تو اس پر ایک گناہ لکھا جائے گا (2)''۔ کیونکہ فلم یعملها کا معنی ہے: اور اس نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ اور اس کی دلیل وہ ہے جو ہم نے ذکر کی ہے، اور فان عملها کا معنی ہے: اگر اس نے اسے ظاہر کیا یا اس کا ارادہ کیا۔ اور اس کی دلیل بھی وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔ وباللہ توفیقنا۔

أُولَٰئِكَ جَزَآؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّٰتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَٰمِلِينَ ﴿١٣٦﴾

''یہ وہ (نیک بخت) ہیں جن کا بدلہ بخشش ہے اپنے رب کی طرف سے اور جنت رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں، ہمیشہ رہیں گے اور ان میں کیا ہی اچھا بدلہ ہے کام کرنے والوں کا۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کے ساتھ گناہوں کی بخشش کو ان کے لئے لازم کیا ہے جو اپنی توبہ میں مخلص ہیں اور اپنے گناہ پر مصر نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ قصہ احد کے ساتھ متصل ہو، یعنی جو بھاگے پھر توبہ کر لی اور اصرار نہ کیا تو ان کے لئے مغفرت ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ

1۔ جامع الترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56، اسلام آباد، صفحہ 507، لاہور

2۔ مسلم، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الی السموات و فرض الصلوات، جلد 1، صفحہ 81، آرام باغ کراچی

الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

"گزر چکے ہیں تم سے پہلے (قوموں کے عروج وزوال کے) قاعدے پس سیر کرو زمین میں اور (اپنی آنکھوں سے) دیکھو کہ کیسا انجام ہوا (دعوت حق کو) جھٹلانے والوں کا۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنین کے لئے تسلی ہے، اور سنن سنة کی جمع ہے اور اس سے مراد صراط مستقیم ہے۔ (کہا جاتا ہے) فلان علی السنة یعنی فلاں سیدھے راستے پر ہے وہ خواہشات نفسانی میں سے کسی شے کی طرف جھکتا نہیں۔

ہذلی نے کہا ہے:

فلا تجزعن من سنة انت سِرْتَها فأوّل راضٍ سُنَّةً مَن يَسيرها

تو اس راستے سے خوفزدہ اور پریشان نہ ہو جس پر تو چلا کیونکہ جو اس پر چلتا ہے وہ پہلے اس راستے سے راضی ہوتا ہے۔

اور سنة سے مراد وہ امام ہے جس کی اتباع اور اقتدا کی جائے، کہا جاتا ہے: سن فلان سنة حسنة و سیئة جب وہ کوئی ایسا کام کرے جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے اس میں خیر ہو یا شر۔

لبید نے کہا ہے:

مِن معشرٍ سَنّت لهم اباؤهم ولكلّ قومٍ سنةٌ وامامها

اہل خانہ کے لئے ان کے آباء نے طریقہ مقرر کر دیا ہے اور ہر قوم کے لئے مقتدا اور ان کا امام ہے۔

اور سنة سے مراد امت، اور سنن سے مراد امم ہیں، یہ معنی مفضل سے منقول ہے۔

اور اس نے شعر کہا ہے:

ماعايَنَ الناسُ من فضلٍ كفضلِهم ولا رَأوا مِثلَهم في سالِف السُّنن

لوگوں نے ان کے فضل کی طرح کوئی فضل نہیں دیکھا اور نہ ان کی مثل سابقہ امتوں میں کوئی دیکھا۔

اور زجاج نے کہا ہے: اس کا معنی اہل سنن ہیں، اور مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

اور ابو زید نے کہا ہے: مراد امثال ہیں۔ عطا کا قول ہے: مراد شرائع ہیں۔ حضرت مجاہد نے کہا ہے: اس کا معنی ہے قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ یعنی ہلاکت کے ساتھ ان میں گزر چکی ہیں جنہوں نے تم سے پہلے جھٹلایا ہے جیسا کہ قوم عاد اور ثمود اور العاقبة کا معنی ہے: کسی امر کا آخر یعنی انجام۔ اور یہ احد کے دن میں ہوا۔ وہ فرماتا ہے: پس میں انہیں مہلت دوں گا اور میں انہیں ڈھیل دیتا رہوں گا اور میں ان کے لئے تدبیر اپناتا رہوں گا یہاں تک کہ لکھی ہوئی تقدیر اپنی مقررہ مدت کو پہنچ جائے گی یعنی حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی نصرت و مدد کے ساتھ اور ان کے دشمن کافروں کو ہلاک کرنے کے ساتھ۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

"یہ ایک بیان ہے لوگوں (کے سمجھانے) کے لئے اور ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے واسطے۔"

یعنی یہ قرآن ایک بیان ہے، حسن وغیرہ سے یہ منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس قول کی طرف اشارہ ہے: قَدْ

خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ سُنَنٌ اور الموعظۃ کا معنی وعظ (نصیحت) ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وَ لَا تَهِنُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۹﴾

''اور نہ (تو) ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تمہیں سربلند ہو گے اگر تم سچے مومن ہو۔''

غزوہ احد میں مومنین کو اپنے شہداء اور زخمی ہونے والے افراد کے سبب جو تکلیف اور غم لاحق ہوا اس آیت میں اس پر انہیں حوصلہ اور تسلی دلائی جا رہی ہے، اور اس میں انہیں اپنے دشمن کے خلاف جہاد پر ابھارا جا رہا ہے اور انہیں عجز اور بزدلی دکھانے سے منع کیا جا رہا ہے۔ پس فرمایا: وَ لَا تَهِنُوۡا یعنی اے اصحاب محمد! صلی اللہ علیہ وسلم کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنے دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے سے بزدلی کا اظہار نہ کرو اس تکلیف کی وجہ سے جو تمہیں پہنچی۔

وَ لَا تَحۡزَنُوۡا اور اپنی پشتوں پر غم سوار نہ کرو، اور نہ ہی اس ہزیمت اور مصیبت کے سبب غمزدہ ہو جو تمہیں پہنچی۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ یعنی اگر تم میرے وعدہ کی سچائی کے ساتھ ایمان رکھتے ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنۡ بمعنی اِذۡ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب احد کے دن شکست خوردہ ہوئے پس ہم ان کے درمیان اسی طرح تھے کہ اچانک خالد بن ولید مشرکین گھوڑسواروں کے ساتھ آ گیا، وہ چاہتا تھا کہ وہ ان پر پہاڑ کی جانب سے حملہ آور ہو اور غالب آئے، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی: ''اے اللہ! وہ ہم پر غالب نہ آئے اے اللہ! تیرے سوا ہماری کوئی قوت نہیں اے اللہ! اس جماعت کے سوا اس شہر میں کوئی تیری عبادت نہیں کرے گا۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور مسلمان تیر اندازوں کا ایک گروہ اکٹھا ہوا اور وہ پہاڑ پر چڑھ گئے اور انہوں نے مشرک گھوڑسواروں پر تیر برسائے یہاں تک کہ انہیں شکست سے دوچار کر دیا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (1) یعنی احد کے بعد تم ہی دشمن پر غالب رہو گے۔ پس اس کے بعد انہوں نے کوئی لشکر نہیں بھیجا مگر انہیں ہر اس جنگ میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوئی، اور ہر اس جنگ میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہوئی اور اس میں صحابہ کرام میں سے کوئی ایک بھی ہوا تو ظفر و فتح ان کا مقدر بنی، اور یہ تمام شہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے عہد میں ہی فتح ہوئے، پھر ان کے ختم ہو جانے کے بعد اس طرح کوئی شہر بھی فتح نہیں ہوا جس طرح وہ اس وقت میں فتح کرتے تھے۔ اس آیت میں اس امت کی فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ خطاب فرمایا ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو خطاب فرمایا ہے، کیونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا: اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰى ﴿۶۸﴾ (طٰہٰ) (یقیناً تم ہی غالب رہو گے) اور اس امت کو فرمایا: وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اور یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے اسم گرامی الاعلیٰ سے مشتق ہے پس اس کی ذات پاک اور بلند ہے، اور مومنین کے لئے فرمایا: وَ اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ۔

اِنۡ يَّمۡسَسۡكُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَ تِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ ۚ وَ لِيَعۡلَمَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ يَتَّخِذَ مِنۡكُمۡ شُهَدَآءَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83-82

الظّٰلِمِیْنَ ۝

"(احد میں) اگر لگی ہے تمہیں چوٹ تو (بدر میں) لگ چکی ہے (تمہاری دشمن) قوم کو بھی چوٹ ایسی ہی اور یہ (ہار جیت کے) دن ہم پھراتے رہتے ہیں انہیں لوگوں میں اور یہ اس لئے کہ دیکھ لے اللہ تعالیٰ ان کو جو ایمان لائے اور بنالے تم میں سے کچھ شہید اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا ظالموں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ، قرح کا معنی زخم، چوٹ ہے اس میں کسائی اور اخفش سے ضمہ اور فتحہ کے ساتھ دونوں لغتیں منقول ہیں (یعنی قَرْحٌ اور قُرْحٌ) مثلاً عَقْرٌ اور عُقْرٌ۔ اور فراء نے کہا ہے: فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم ہے اور ضمہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی زخم کا درد ہے۔ اور معنی یہ ہے کہ اگر احد کے دن تمہیں زخم لگا ہے تو بدر کے دن (تمہاری دشمن) قوم کو بھی اسی کی مثل زخم لگا ہے۔ اور محمد بن سمیقع نے مصدر کی بنا پر فا اور را کے فتحہ کے ساتھ قرح پڑھا ہے۔ وَ تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ۔ کہا گیا ہے: یہ جنگ میں ہوتا ہے، ایک بار مومنین کے لئے ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرمائے، اور ایک بار کافروں کے لئے ہوتی ہے جب مومنین نافرمانیاں کرنے لگیں تاکہ وہ انہیں آزمائش میں ڈالے اور ان کے گناہوں کو کم کرے، اور رہی یہ صورت کہ جب وہ نافرمانیاں نہ کریں تو پھر یقیناً اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ہم پھراتے رہتے ہیں لوگوں کے درمیان خوشی اور غم، صحت اور بیماری، اور خوشحالی اور تنگدستی کو اور الدُّوْلَةُ کا معنی ہے ایک بار۔

شاعر نے کہا ہے:

فیوم لنا و یوم علینا و یومٌ نُسَاءُ و یَوْمٌ نُسَرّ

پس ایک دن ہمارے حق میں ہوتا ہے اور ایک دن ہمارے خلاف اور کبھی ہمیں اذیت دی جاتی ہے اور کبھی ہمیں خوش کیا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اس کا معنی ہے: بلاشبہ یہ پھرنا اس لئے ہے تاکہ مومن کو منافق سے (جدا) دکھایا جائے اور ان میں سے بعض کو بعض سے ممتاز کیا جا سکے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِیَعْلَمَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَ لِیَعْلَمَ الَّذِیْنَ نَافَقُوْا (آل عمران) اور یہ بھی کہا گیا ہے تاکہ وہ مومنین کے صبر کو جان لے، (یعنی) ایسا علم جس پر جزا واقع ہوگی جیسا کہ انہیں مکلف بنانے سے پہلے اس کا غیبی علم ہے۔ یہ معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اس میں تین مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ یعنی وہ تمہیں شہادت کے ساتھ تکریم اور اعزاز عطا فرمائے، یعنی تاکہ ایک قوم (جماعت) قتل کی جائے اور وہ لوگوں پر اپنے اعمال کے سبب گواہ ہو جائیں۔ اور کہا گیا ہے کہ اسی وجہ سے اسے شہید کہا جاتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: اسے شہید اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ جنت اس کے لئے حاضر کر دی جاتی ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ اس کا نام شہید اس لئے ہے کیونکہ ان کی ارواح دار السلام میں حاضر ہیں، کیونکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں،

اوران کے سوا دوسروں کی ارواح جنت تک نہیں پہنچتی ہیں، پس شہید بمعنی شاہد ہے یعنی جنت کے لئے حاضر ہونے والا، آنے والے بیان کے مطابق یہی صحیح معنی ہے۔ اور شہادت کی فضیلت بہت عظیم ہے، اور تیرے لئے اس کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کافی ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ الآیہ (التوبہ: 111) (یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں ایمانداروں سے ان کی جانیں اوران کے مال اس عوض میں کہ ان کے لئے جنت ہے۔)

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (الصف) (اے ایمان والو! کیا میں آگاہ کروں تمہیں ایسی تجارت پر جو بچالے تمہیں دردناک عذاب سے (وہ تجارت یہ ہے کہ) تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے ...... یہی بڑی کامیابی ہے۔)

اور صحیح البستی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”شہید قتل سے اتنی ہی تکلیف پاتا ہے جتنی تم میں سے کوئی پھوڑے سے پاتا ہے (1)۔“ اور نسائی نے بیان کیا ہے کہ راشد بن سعد نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک آدمی سے روایت کیا ہے کہ کسی آدمی نے عرض کی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، مومنین کو کیا ہوا ہے کہ سوائے شہید کے انہیں اپنی قبروں میں آزمائش اور فتنہ میں ڈالا جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس کے سر پر تلواروں کی چمک فتنہ اور آزمائش کے لئے کافی ہے (2)“ اور بخاری میں ہے۔ ”مسلمانوں میں سے احد کے دن جو شہید کئے گئے“ ان میں سے حضرت حمزہ، یمان، نضر بن انس، مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہم ہیں، عمرو بن علی نے مجھے بیان کیا ہے کہ معاذ بن ہشام نے کہا: میرے باپ نے حضرت قتادہ سے مجھے بیان کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم قبائل عرب میں سے کوئی ایسا قبیلہ نہیں جانتے جس میں انصار سے بڑھ کر شہید ہوں اور قیامت کے دن وہ ان سے زیادہ عزت والا ہو۔

حضرت قتادہ نے بیان کیا ہے: اور ہمیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے کہ ان میں سے احد کے دن ستر آدمی شہید کئے گئے اور بئر معونہ کے دن ستر اور یمامہ کے دن بھی ستر (آدمی شہید کئے گئے)۔ فرمایا: بئر معونہ کا واقعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہوا، اور جنگ یمامہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسیلمہ کذاب سے لڑی گئی (3)۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو لایا گیا اور آپ کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے ساٹھ کے قریب زخم تھے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان پر دست مبارک پھیرنے لگے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے اس طرح جڑنے اور مندمل ہونے لگے گویا وہ تھے ہی نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَ يَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ اس میں اس پر دلیل موجود ہے کہ ارادہ امر کا غیر ہے۔ (یعنی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، صفحہ 206، اسلام آباد　2۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 289، اسلام آباد
3۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584، آرام باغ کراچی

دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔) جیسا کہ اہل السنہ یہی کہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو مومنین کے قتل سے منع کیا ہے، یعنی حضرت حمزہ اور آپ کے ساتھیوں کو رضی اللہ عنہم۔ اور ان کے قتل کا ارادہ فرمایا ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کھانے سے منع فرمایا اور کھانے کا ارادہ فرمایا پس آدم علیہ السلام اس میں واقع ہوئے۔ اور اس کے برعکس یہ ہے کہ ابلیس کو سجدہ کرنے کا حکم دیا اور اس کا ارادہ نہیں کیا پس وہ اس سے رک گیا، اور اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے قول حق کے ساتھ اشارہ بھی واقع ہے: وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ (التوبۃ:46) (لیکن ناپسند کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے کھڑا ہونے کو اس لئے پست ہمت کر دیا انہیں)۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمام کو جہاد کا حکم دیا ہے، لیکن سستی، کاہلی اور سفر سے رہ جانے والے اسباب بھی پیدا فرمادیئے پس وہ پیچھے بیٹھ رہتے ہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا: بدر کے دن حضرت جبرائیل امین علیہ السلام حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور آپ کو عرض کی: ''آپ قیدیوں کے بارے میں اپنے اصحاب کو اختیار دے دیجئے اگر وہ چاہیں تو قتل کر دیں اور اگر چاہیں تو اس شرط پر فدیہ لے لیں کہ آئندہ سال ان کے برابر ان میں سے قتل کئے جائیں گے تو انہوں نے کہا: ہم فدیہ لیں گے اور ہم میں سے قتل کئے جائیں گے۔'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے (1)۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ اپنے اولیاء کی شہادت کے ساتھ پورا کر دیا اس کے بعد کہ انہیں اختیار دیا تو انہوں نے قتل کو اختیار کیا۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ یعنی اللہ تعالیٰ مشرکین کو دوست نہیں رکھتا یعنی اگر وہ مومنین کی جانب سے کفار کو کچھ دے تو وہ انہیں پسند نہیں کرتا ہے اور اگر وہ مومنین کے سبب کچھ تکلیف پہنچائے تو بلاشبہ وہ مومنین کو دوست رکھتا ہے۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۴۱

''اور اس لئے کہ نکھارے اللہ تعالیٰ انہیں جو ایمان لائے اور مٹا دے کافروں کو۔''

اس میں تین اقوال ہیں: يُمَحِّصَ بمعنی يختبر (تاکہ وہ آزمائے) دوسرا ..... يطهر (تاکہ وہ انہیں گناہوں سے پاک کرے) اس صورت میں مضاف محذوف ہے۔ معنی یہ ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو ختم کر دے جو ایمان لائے، فراء نے یہی کہا ہے اور تیسرا .. يمحص بمعنی يخلص (تاکہ وہ انہیں نکھار دے اور صاف کر دے) یہ معنی زیادہ غریب ہے۔

خلیل نے کہا ہے: کہا جاتا ہے مَحِصَ الحبلُ يَمْحَصُ مَحْصًا جب رسی کی اون کٹ جائے، اور اسی سے ہے اللّٰهم محص عنا ذنوبنا اے اللہ! ہم سے ہمارے گناہوں کو صاف کر دے (ختم کر دے) یعنی ہمیں ان کی سزا سے نجات عطا فرما۔ اور ابو اسحاق الزجاج نے کہا ہے: میں نے محمد بن یزید عن خلیل یہ قرأت کی: التمحيص (بمعنی) التخليص ہے۔ کہا جاتا ہے: مَحَصَهُ [يمحصه] محصا جب وہ اسے نجات دلا دے، صاف کر دے، پس معنی ہوگا: اس پر ہے کہ وہ مومنین کو آزمائے تاکہ وہ انہیں ثواب عطا فرمائے اور انہیں ان کے گناہوں سے نجات دلائے۔ وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ یعنی وہ انہیں ہلاک

1۔ جامع ترمذی، کتاب السیر، جلد 1، صفحہ 190، اسلام آباد

کر کے تباہ و برباد کر دے۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾

''کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) داخل ہو جاؤ گے جنگ میں حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا تم میں سے اور دیکھا ہی نہیں (آزمائش میں) صبر کرنے والوں کو۔''

اَمۡ بمعنی بل ہے۔ اور کہا گیا ہے: میم زائدہ ہے اور معنی ہے: اے وہ جو احد کے دن شکست خوردہ ہوئے کیا تم گمان رکھتے ہو کہ تم اسی طرح جنت میں داخل ہو جاؤ گے جیسے وہ داخل ہوئے جو شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے زخم اور قتل کے درد پر صبر اختیار کیا اس کے بغیر کہ تم ان کے راستے پر چلو اور ان کے صبر کی طرح صبر کرو؟ نہیں، یہاں تک یَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ یعنی (تم میں سے جنہوں نے جہاد کیا اللہ تعالیٰ کے بارے) علم شہادت (حاصل کر لے) تاکہ اس پر جزا واقع ہو۔ اور معنی ہے: اور تم نے جہاد نہیں کیا کہ وہ تم سے اسے جان لے۔ اس میں لما بمعنی لم ہے اور سیبویہ نے لم اور لما کے درمیان فرق کیا ہے اور یہ گمان کیا ہے کہ لم یفعل، فعل کی نفی ہے، اور لما یفعل، قد فعل کی نفی ہے۔ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ یہ اَنۡ مضمرہ کے سبب منصوب ہے، یہ خلیل سے روایت ہے، اور حسن اور یحییٰ بن یعمر نے یَعۡلَمِ الصَّابِرِیۡنَ عطف نسق کی بنا پر جزم کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے قطع کی بنا پر رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی وھو یعلمُ۔ اور یہ قرأت عبدالوارث نے ابو عمرو سے روایت کی ہے۔ اور زجاج نے کہا ہے: یہاں واؤ بمعنی حتیٰ ہے، یعنی ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم حتی یعلم صبرھم کما تقدم آنفا۔

حالانکہ ابھی دیکھا ہی نہیں اللہ نے ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا یہاں تک کہ وہ ان کے صبر کو دیکھ لے جیسا کہ ابھی گزرا ہے۔

وَ لَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ ۪ فَقَدۡ رَاَیۡتُمُوۡهُ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۴۳﴾

''اور تم تو آرزو کرتے تھے موت کی اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ یعنی تم تو شہادت کی آرزو کرتے تھے اس سے پہلے کہ تم اس سے ملاقات کرو۔ اعمش نے مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُلَاقُوۡهُ پڑھا ہے یعنی قتل سے پہلے اور یہ کہا گیا ہے: اس سے پہلے کہ تم اسباب موت سے ملاقات کرو۔'' اور یہ اس لئے کہ ان میں سے بہت سے غزوہ بدر میں حاضر نہیں تھے تو وہ اس دن کی آرزو اور تمنا کر رہے تھے جس میں جنگ ہو گی، تو جب احد کا دن آیا تو وہ شکست کھا گئے، اور ان میں وہ بھی تھے جو مضبوط رہے اور ڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے، اور ان میں سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ کیونکہ جب مسلمان بکھرے تو انہوں نے کہا: اے اللہ! میں تیری طرف اس سے برأت کا اظہار کرتا ہوں جو کچھ انہوں نے کیا ہے، اور پھر (پوری قوت کے ساتھ) لڑنے

لگے اور کہا: بلاشبہ یہاں تو جنت کی خوشبو ہے! میں اسے پالوں گا، اور لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید کر دیئے گئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: ہم نے انہیں صرف انگلیوں کے پوروں سے پہچانا تھا اور ہم نے ان کے بدن پر اسی سے زائد زخم پائے۔ ان کے بارے میں اور ان جیسے دیگر افراد کے بارے میں یہ ارشاد نازل ہوا، رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (1) (الاحزاب: 23) (ایسے جوانمرد ہیں جنہوں نے سچا کر دکھایا جو وعدہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا) پس یہ آیت شکست خوردہ ہونے والوں کے حق میں عتاب ہے، اور بالخصوص ان کے لئے جنہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ طیبہ سے نکلنے پر ابھارا تھا، اور اس کا ذکر عنقریب آئے گا۔

اور موت کی تمنا مسلمانوں سے شہادت کی تمنا کی طرف راجع ہوتی ہے جس کا دارومدار (میدان) جہاد میں صبر و ثبات پر ہے، نہ کہ اس سے مراد کفار کا انہیں قتل کرنا ہے، کیونکہ یہ تو معصیت اور کفر ہے اور معصیت کا ارادہ کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اور اسی بنا پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے یہ التجا اور دعا کرنے پر برانگیختہ کیا جاتا ہے کہ وہ انہیں شہادت عطا فرمائے اور وہ جہاد میں صبر اختیار کرنے کی التجا کرتے ہیں اگرچہ وہ انہیں قتل تک ہی پہنچا دے۔

قولہ تعالیٰ: وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اخفش نے کہا: یہ تکریر بمعنی تاکید ہے اس قول: فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ کے لئے، جیسا کہ اس قول میں ہے ولا طائر یطیر بجناحیہ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کا معنی ہے اور تم آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے ہو تمہاری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں ہے، [جیسا کہ] تو کہتا ہے: قد رأیت کذا و کذا و لیس فی عینیک علة، (تو نے اس اس طرح دیکھ لیا ہے اور تیری آنکھوں میں کوئی بیماری نہیں۔) یعنی تو نے اسے حقیقتاً دیکھ لیا ہے، اور یہ معنی تو کید کی طرف راجع ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ اور تم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہے ہو۔ آیت میں اضمار ہے، تقدیر کلام یہ ہے۔ فقد رأیتموہ و انتم تنظرون فلم انہزمتم؟ (تحقیق تم نے اسے دیکھ لیا ہے اور تم (آنکھوں سے) مشاہدہ کر رہے ہو تو پھر تم نے شکست کیوں کھائی؟)

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

''اور نہیں محمد (مصطفیٰ) مگر (اللہ کے) رسول گزر چکے ہیں آپ سے پہلے کئی رسول۔ تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید کر دیئے جائیں پھر جاؤ گے تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) اور جو پھرتا ہے الٹے پاؤں تو نہیں بگاڑ سکے گا اللہ کا کچھ بھی اور جلدی اجر دے گا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو۔''

اس میں پانچ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ روایت ہے کہ یہ احد کے دن مسلمانوں کے شکست کھانے کے سبب نازل ہوئی اس وقت شیطان نے

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2595، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

چیخ کر کہا: قد قتل محمد۔ (تحقیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا۔) عطیہ العوفی نے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے: تحقیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موت دی گئی ہے پس تم انہیں اپنے ہاتھوں کے ساتھ دو کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں اور بعض نے کہا ہے: اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موت دی گئی ہے تو کیا تم اس حالت پر باقی نہیں رہو گے جس پر تمہارے انبیاء رہے یہاں تک کہ تم آپ سے جا ملو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں یہ ارشاد نازل فرمایا: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا (1)۔ اس میں ما نافیہ ہے اور اس کا ما بعد مبتدا اور خبر ہے، اور ما کا عمل باطل ہو گیا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح قرأت کی ہے: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهٖ رُسُلٌ یعنی بغیر الف لام کے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس پر آگاہ فرمایا ہے کہ رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات اپنی قوم میں ہمیشہ باقی رہنے والے نہیں ہیں، اور یہ کہ اس کو مضبوطی سے تھامنا واجب ہے جو رسل علیہم السلام لے کر آئے اگرچہ رسول موت یا قتل کے سبب مفقود ہو۔ اور اپنے نبی کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم فرمائی [آپ کے دو وصفوں) دو اسموں کے ساتھ جو دونوں آپ کے اسم سے مشتق ہیں محمد اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم عرب کہتے ہیں: رَجُلٌ محمود و محمد جب اس کے خصائل حمیدہ کثیر ہوں۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

الی الماجد القرمِ الجواد المحمّد

تحقیق یہ معنی سورۃ الفاتحہ میں گزر چکا ہے۔

اور عباس بن مرداس نے کہا ہے:

یا خاتم النُّبآءِ انك مُرسَل بالخَیرِ كلُّ هُدَى السَّبِیلِ هُدَاكا

اے خاتم الانبیاء! بلاشبہ آپ خیر و بھلائی کے ساتھ بھیجے گئے ہیں ہر راہ ہدایت آپ ہی کی ہدایت ہے۔

ان الالٰه بنَى علیك محبّة لی خلقِه و مُحمّدًا سَمّا كا

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں تجھ پر محبت کی بنیاد رکھی ہے اور تیرا نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکھا ہے۔

پس یہ آیت شکست کھانے والوں کے عتاب کا تتمہ ہے، یعنی ان کے لئے شکست کھانا نہیں ہے اگرچہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیئے جائیں، اور نبوت موت کو دور نہیں کر سکتی، اور ادیان انبیاء علیہم السلام کی موت سے زائل نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 2۔ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور آپ کی جرأت پر سب سے بڑھ کر دلیل ہے، کیونکہ

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

شجاعت اور جرأت کی تعریف اور حد مصائب و آلام آنے کے وقت دل کا ثابت رہنا ہے، اور حضور نبی مکرم ﷺ کی موت سے بڑی اور کوئی مصیبت نہیں۔ جیسا کہ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے، پس اسی وقت آپ کی شجاعت اور آپ کا علم ظاہر ہوا۔ لوگوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، ان میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی (معاملہ) مخفی رکھا، اور معاملہ مضطرب ہو گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے ساتھ اس حقیقت کو ظاہر کیا جب آپ اپنی رہائش گاہ سنخ سے آئے۔

بخاری میں اسی طرح ہے(1) اور سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنی زوجہ جو کہ خارجہ کی بیٹی تھی، کے ساتھ عوالی میں تھے، تو لوگ کہنے لگے: حضور نبی مکرم ﷺ فوت نہیں ہوئے بلکہ یہ انہیں حالات میں سے ایک حالت ہے جو وحی لیتے وقت آپ پر طاری ہوتی تھی۔ اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے آپ ﷺ کے چہرہ اقدس سے (کپڑا) اٹھایا اور آپ کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور دوبار کہا: انت اکرم علی اللہ من ان یُمیتك (آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں کہ وہ آپ کو موت دے)

قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ وصال فرما گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد کے ایک کونے میں کہہ رہے تھے: قسم بخدا! رسول اللہ ﷺ فوت نہیں ہوئے، اور نہ وہ فوت ہوں گے یہاں تک کہ منافقین میں سے بہت سے لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ پس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا: من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لم یمت، و من کان یعبد محمدا فان محمدا قد مات جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ تو زندہ ہے وہ فوت نہیں ہوا۔ اور جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو محمد ﷺ تو فوت ہو چکے ہیں، وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''گویا میں نے تو یہ آیت اس دن کے سوا پڑھی ہی نہیں(2)۔'' اور انہوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا جو پہلے انہوں نے کہا تھا۔ اسے وائلی ابونصر عبید اللہ نے اپنی کتاب ''الابانۃ'' میں ذکر کیا ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت سنا جب رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی گئی اور آپ رسول اللہ ﷺ کے منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پہلے شہادت دی اور کہا: امابعد! میں نے کل تمہیں ایک بات کہی تھی اور وہ اس طرح نہ تھی جیسے میں نے کہی تھی۔ اور قسم بخدا! میں نے وہ بات جو تمہیں کہی اسے اس کتاب میں نہیں پایا جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور نہ ہی اس عہد میں پایا جو عہد رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا، البتہ میں یہ امید کرتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ زندہ رہیں گے یہاں تک کہ آپ ہمارے بعد آئیں

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1165، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1615 ضیاء القرآن پبلی کیشنز

گے آپ کے کہنے کی مراد یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو موت آخر میں آئے گی ..... پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنی پسند کو تمہاری پسند پر ترجیح دی، اور یہ وہ کتاب ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی فرمائی پس تم اسے پکڑ لو تم ہدایت پا جاؤ گے اس کی طرف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راہنمائی فرمائی۔(1)

وائلی ابونصر نے کہا: وہ بات جو انہوں نے کہی پھر اس سے رجوع کر لیا وہ یہ ہے "کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فوت نہیں ہوئے اور وہ ہرگز فوت نہیں ہوں گے یہاں تک کہ لوگوں کے ہاتھ اور ان کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے اور انہوں نے یہ اس عظیم صدمہ کی وجہ سے کہا جو انہیں لاحق ہوا اور انہیں فتنہ اور منافقین کے ظہور کا خدشہ ہوا، اور جب انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قوت یقین کا مشاہدہ کیا، اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پڑھا: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اور اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ اور وہ جو انہوں نے اس دن کہا ..... تو یہ آگاہ ہوئے اور یہ بات (ان کے ذہن میں) راسخ ہوگئی۔ اور انہوں نے کہا: گویا میں نے یہ آیت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا کسی سے سنی ہی نہیں۔ اور لوگ یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے مدینہ طیبہ کی گلیوں میں نکل پڑے، گویا یہ آیت کبھی نازل نہیں ہوئی مگر اسی دن (2)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال بلا اختلاف پیر کے دن ہوا، اسی وقت میں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے جس وقت دھوپ خوب سخت ہو چکی تھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منگل کے دن دفن کیا گیا، اور یہ قول بھی ہے کہ بدھ کی رات کو (آپ کو دفن کیا گیا)(3)

صفیہ بنت عبدالمطلب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرثیہ کہتے ہوئے کہا:

ألا يا رسول الله كنت رجاءنا و كنت بنا برًّا و لم تك جافِيا

خبردار! یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہماری امید تھے اور آپ ہمارے محسن تھے اور کبھی اعراض نہ برتتے تھے۔

و كنت رحيما هاديا و مُعلِما لِيَبكِ عليك اليومَ من كان باكيا

اور بڑے مہربان، راہبر اور معلم تھے چاہیے کہ آج کے دن آپ پر ہر رونے والا روئے۔

لعمرك ما أبكی النبیَّ لفقده و لكن لما أخشى من الهرج آتيا

تیری عمر کی قسم میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مفقود ہونے کے سبب نہیں روؤں گی البتہ جب مجھے کسی حرج اور مصیبت آنے کا خدشہ ہوگا۔

كأن على قلبي لذِكرِ محمدٍ وما خِفت من بعد النبي المكاوِيا

گویا میرے دل پر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور مجھے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی گالیاں دینے والے کا کوئی خوف نہیں۔

أفاطم صلى الله رب محمدٍ على جَدَثٍ أمسى بيثرب ثاوِيا

میں چھوڑتی ہوں اللہ تعالیٰ پر جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب ہے کہ وہ اس قبر پر رحمتیں نازل فرمائے جو یثرب میں آباد ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث نمبر 6679، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث 1165، ایضاً
3۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1298، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فِدًى لرسولِ اللہ اُمّی و خالتی و عمی و آبائی و نفسی و مالیا

رسول اللہ ﷺ پر میری ماں، میری خالہ، میری پھوپھی، میری جان اور میرا مال بھی نثار ہوں۔

صدَقتَ و بلّغتَ الرسالۃ صادقا و مت صلیبَ العود اَبلَجَ صافِیا

آپ نے سچ بولا اور پیغام رسالت کو صداقت کے ساتھ پہنچایا اور آپ نے لکڑی کی صلیب کو ختم کردیا اور خوب صاف کردیا۔

فلو أن رب الناس أبقی نبینا سعِدنا، و لکن أمرہ کان ماضِیا

پس اگر رب العالمین ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باقی رکھتا تو ہماری سعادت مندی تھی لیکن اس کا امر فیصلہ کن ہے۔

علیك من اللہ السلام تحیۃً و أدخِلت جناتٍ من العَدْن راضِیا

آپ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے صلوٰۃ وسلام ہو اور آپ کو جنات عدن میں داخل کیا جائے اس حال میں کہ آپ راضی اور خوش ہوں۔

أری حسبنا أیتمتہ و ترکتَہ یُبَکّی و یدعو جدہ الیوم نائِیا

میں دیکھ رہی ہوں آپ نے ہی ہمارے حسب کو مکمل کیا ہے اور اسے رلاتے ہوئے چھوڑ دیا ہے اور آج یہ دور اپنے دادا کو پکار رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کی تدفین کو کیوں مؤخر کیا گیا حالانکہ آپ نے اہل بیت کو اپنی میتوں کی تدفین کو مؤخر کرنے پر کہا: ''اپنے مردوں کی تدفین میں جلدی کرو اور تم ان میں تاخیر نہ کرو'' (1)۔ تو اس کا جواب تین طرح سے دیا گیا ہے۔

(۱) ایک تو وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کے وصال فرمانے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین اتفاق نہ تھا۔

(۲) اس لئے کہ وہ اس مقام اور جگہ کو نہ جانتے تھے جہاں وہ آپ کو دفن کریں۔ پس ایک جماعت نے کہا: جنت البقیع میں دفن کیا جائے اور دوسرے گروہ نے کہا: مسجد میں، اور ایک قوم نے کہا: آپ کو روکا جائے گا یہاں تک کہ آپ کو اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی طرف اٹھا لیا جائے، یہاں تک کہ عالم اکبر (مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں) نے کہا: میں نے آپ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ما دفن نبیّ الاحیث یموت (کسی نبی کو دفن نہیں کیا جاتا مگر اسی جگہ جہاں اس کا وصال ہوتا ہے) اسے ابن ماجہ اور مؤطا وغیرہما نے بیان کیا ہے۔ (2)

(۳) وہ اس اختلاف میں مشغول ہو گئے جو مہاجرین وانصار کے درمیان بیعت کے بارے میں واقع ہوا، پس وہ اس میں غور و فکر کرتے رہے یہاں تک کہ معاملہ واضح ہو گیا اور کام منظم ہو گیا اور حالات پر سکون ہو گئے، اور خلافت اپنے نصاب میں پختہ ہو گئی پس انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی، پھر دوسرے دن ان میں سے ایک جماعت نے برضا و رغبت

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 108، کراچی۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1474، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجنائز، صفحہ 212، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

دوسری بیعت کی، پس الله تعالیٰ نے آپ کے سبب مرتدین کے فتنہ سے نجات دلائی اور آپ کے سبب دین کو تقویت حاصل ہوئی، والحمد لله رب العالمین۔ پھر اس کے بعد انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کیا اور آپ کے دفن کے بارے میں غور و فکر کی تب انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غسل دیا اور آپ کو کفن پہنایا۔ والله اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس میں اختلاف ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں، پس بعض نے کہا ہے: کسی نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی بلکہ ہر ایک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کھڑے ہو کر دعا مانگتا رہا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اس سے اشرف و اعلیٰ ہے کہ آپ پر نماز جنازہ پڑھی جائے۔ اور علامہ ابن عربی نے کہا ہے: یہ کلام ضعیف ہے، کیونکہ سنت یہی ہے کہ آپ پر نماز جنازہ میں کھڑے ہو کر درود پاک پڑھا جائے گا، جیسا کہ آپ پر دعا میں درود پاک پڑھا جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہے: اللّٰھم صلّ علی محمّد الی یوم القیامۃ (اے الله! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یوم قیامت تک رحمتیں نازل فرما۔) اور یہ ہمارے لئے بھی باعث نفع ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی، کیونکہ وہاں کوئی امام نہ تھا۔ اور یہ ضعیف ہے، کیونکہ وہ جو انہیں فرض نماز پڑھا رہا تھا وہی اس نماز میں ان کی امامت کراتا رہا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انفرادی طور پر نماز پڑھی، کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آخری عہد تھا، چنانچہ انہوں نے چاہا کہ ہر کوئی آپ کی مخصوص برکتیں حاصل کر لے نہ کہ وہ ان میں کسی غیر کے تابع ہو۔ والله اعلم بالصواب۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ابن ماجہ نے اسناد حسن بلکہ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے اور اس میں ہے: جب لوگ منگل کے دن آپ کی تجہیز سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے گھر میں چارپائی پر رکھا گیا، پھر لوگ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گروہ در گروہ داخل ہوئے اور آپ پر صلوٰۃ (درود) پڑھتے رہے، حتیٰ کہ جب وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے عورتوں کو وہاں حاضری کا موقع دیا، یہاں تک کہ جب وہ فارغ ہوئیں تو پھر بچوں کو حاضری کی اجازت دی گئی، اور کسی نے بھی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لوگوں کی امامت نہیں کرائی۔ اس حدیث کو انہوں نے نصر ابن علی جہضمی سے اس سند کے ساتھ بیان کیا ہے أنبانا وھب بن جریر حدثنا أبی عن محمد بن اسحاق قال حدثنی حسین ابن عبد الله عن عکرمۃ عن ابن عباس، الحدیث بطولہ۔ (1)

مسئلہ نمبر 5۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حالات کی تبدیلی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے بیان کیا: جس دن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو آپ کی آمد سے ہر شے منور و روشن ہو گئی، اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مدینہ طیبہ میں وصال ہوا تو وہاں کی ہر شے تاریک ہو گئی۔ اور ہم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہاتھ نہیں جھاڑے یہاں تک کہ ہم نے اپنے دلوں کا انکار کر دیا۔

ابن ماجہ نے روایت بیان کی ہے (2) اور کہا ہے: محمد بن بشار، عبد الرحمن بن مہدی، سفیان نے عبد الله بن دینار سے اور

1۔ ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 118۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1616، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1620، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنی عورتوں کے ساتھ کلام کرنے اور دل لگی کرنے سے بچتے تھے اس خوف سے کہ کہیں ہمارے بارے میں قرآن نہ نازل ہو جائے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو پھر ہم کلام کرنے لگے۔(1)

اور ام سلمہ بنت ابی امیہ زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسند روایت ہے (کہ انہوں نے کہا) لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کسی نمازی کی نظر اپنے قدموں سے تجاوز نہ کرتی تھی۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں میں سے جب کوئی نماز کے لئے کھڑا ہوتا تو ان میں سے کسی کی نظر پیشانی رکھنے کی جگہ سے تجاوز نہ کرتی، پھر جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وصال ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا (عہد) آیا تو لوگوں کی حالت یہ تھی کہ ان میں سے جب کوئی نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہوتا تو کسی کی نظر قبلہ کی سمت سے نہ پھرتی، پھر جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (کا عہد) آیا تو فتنے برپا ہو گئے اور لوگ نماز میں دائیں بائیں متوجہ ہونے لگے۔(2)

قولہ تعالیٰ: **اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ** اس میں **اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ** شرط ہے اور **اَوْ قُتِلَ** اس پر معطوف ہے اور **انْقَلَبْتُمْ** جواب شرط ہے اور حرف استفہام حرف جزا پر داخل ہے کیونکہ شرط اسی کے ساتھ منعقد ہے اور یہ ایک جملہ اور ایک خبر ہو گیا ہے اور معنی یہ ہے: أفتنقلبون علی اعقابکم ان مات أو قتل؟ (کیا تم الٹے پاؤں (دین اسلام سے) پھر جاؤ گے اگر آپ انتقال فرما جائیں یا آپ کو شہید کر دیا جائے) اور اسی طرح (حکم ہے) ہر استفہام کا جو حرف جزا پر داخل ہو، کیونکہ وہ اپنے محل میں نہیں ہوتا، اور اس کا محل یہ ہے کہ وہ جواب شرط سے پہلے ہو۔ اور قول باری تعالیٰ: **انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ** ایک تمثیل ہے، اور اس کا معنی ہے: تم اپنے ایمان کے بعد کفار کی طرف لوٹ جاؤ گے، حضرت قتادہ وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور یہ اس کے بارے کہا جاتا ہے جو اس حالت کی طرف لوٹ آئے جس پر وہ پہلے تھا انقلب علی عقبیبه۔ اور اسی معنی میں نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ بھی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں انقلاب (لوٹنے) سے مراد شکست کھانا ہے، اور یہ حقیقت ہے نہ کہ مجاز۔ اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم نے مرتدین کا فعل کیا ہے اگرچہ یہ ردۃ (مرتد ہونا) نہیں۔

قولہ تعالیٰ: **وَ مَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا** (اور جو الٹے پاؤں پھرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا) بلکہ اپنی ذات کا نقصان کرے گا اور مخالفت کے سبب اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کرے گا۔ اور اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اسے کوئی طاقت نفع نہیں دے سکتی اور نہ کوئی معصیت اسے کوئی نقصان اور ضرر پہنچا سکتی ہے۔

وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (اور اللہ تعالیٰ جلدی اجر دے گا شکر کرنے والوں کو) یعنی وہ جنہوں نے صبر کیا اور جہاد کیا اور شہید کر دیئے گئے۔ اور **وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ** قول باری تعالیٰ: **فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا** کے بعد آیا ہے اور یہ وعدہ کا وعید کے ساتھ اتصال ہے۔

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجنائز، صفحہ 119۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1621، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ابن ماجہ کتاب الجنائز، صفحہ 119، اسلام آباد۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1623، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِی الشّٰكِرِيْنَ ۝

''اور نہیں ممکن کہ کوئی شخص مرے بغیر اللہ کی اجازت کے۔ لکھا ہوا ہے (موت کا) مقررہ وقت اور جو شخص چاہتا ہے دنیا کا فائدہ، ہم دیتے ہیں اس کو اس سے اور جو شخص چاہتا ہے آخرت کا فائدہ ہم دیتے ہیں اسے اس میں سے اور ہم جلدی اجر دیں گے (اپنے) شکر گزار بندوں کو۔''

قولہ تعالیٰ: وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا یہ جہاد پر ابھارتا ہے اور اس پر آگاہ کرتا ہے کہ موت لازم اور ضروری ہے اور ہر انسان مقتول ہو یا غیر مقتول وہ مرنے والا ہے جب وہ اپنی (موت کی) لکھی ہوئی مقررہ مدت تک پہنچ جائے کیونکہ مُّؤَجَّلًا کا معنی اِلی أجل (مقررہ مدت تک) ہے۔ اور بِاِذْنِ اللّٰهِ کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کی قضا اور اس کی تقدیر سے۔ اور كِتٰبًا مصدر کی بنا پر منصوب ہے یعنی کتب الله كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا۔ (اللہ تعالیٰ نے موت کا مقررہ وقت لکھ دیا ہے۔) اور أجل الموت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ سبحانہ کے علم میں ہے، کہ زندہ کی روح اس کے جسم سے جدا ہوگی، اور جب بندہ قتل کیا جاتا ہے تو ہم جان لیتے ہیں کہ وہی اس کی موت کا مقررہ وقت ہے، اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے: اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو وہ زندہ رہتا۔ اور قول باری تعالیٰ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا پر دلیل فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (النحل) (پس جب آجاتی ہے ان کی (مقررہ) میعاد تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے ہو سکتے ہیں) اور فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (العنکبوت:5) (تو (وہ سن لے) کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا وقت ضرور آنے والا ہے) اور لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ (الرعد) (ہر میعاد کے لئے ایک نوشتہ ہے)

اور معتزلی کہتا ہے: موت کا وقت متقدم اور متاخر ہوتا رہتا ہے اور یہ کہ جسے قتل کر دیا جائے وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک ہو جاتا ہے اور اسی طرح ہر وہ حیوان جو ذبح کر دیا جائے تو وہ بھی اپنے مقرر وقت سے پہلے ہلاک ہو گیا، اسی لئے قاتل پر ضمان اور دیت واجب ہوتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ کوئی نفس اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہلاک نہیں ہوگا۔ اس کا مزید بیان سورہ الاعراف میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اور اس میں علم کے لکھنے اور اسے مدون کرنے پر دلیل موجود ہے اور اس کا بیان سورہ ''طٰہٰ'' میں اس قول کے تحت آئے گا۔ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا (ثواب الدنیا) سے مراد غنیمت ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے غنیمت کی طلب میں مرکز کو چھوڑ دیا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ ہر اس کے بارے میں عام ہے جس نے آخرت کی بجائے صرف دنیا کا ارادہ کیا، اور معنی یہ ہے: ہم اس میں سے اسے وہ دیں گے جو اس کے لئے حصہ مقرر کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں ہے: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء:18) (جو لوگ طلبگار ہیں صرف دنیا کے ہم جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جتنا چاہتے ہیں (ان میں سے) جسے چاہتے ہیں۔) وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ

الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا یعنی ہم اسے اس کے عمل کی جزا عطا فرمائیں گے، اسی طرز پر اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ جس کے لئے چاہے گا نیکیاں دوگناہ کردے گا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اور آپ کے وہ ساتھی ہیں جو مرکز پرڈٹے رہے یہاں تک کہ شہید کردیئے گئے۔

وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ یعنی ہم انہیں ابدی ثواب عطا فرمائیں گے جو ان کے لئے ترک انہزام پر جزا اور بدلہ ہوگا اور یہ سابقہ بیان کی تاکید ہے کہ آخرت میں انہیں مزید عطا کیا جائے گا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِیْنَ اور ہم انہیں دنیا میں رزق عطا کریں گے تاکہ یہ وہم نہ کیا جائے کہ شکر گزار اپنے مقسوم سے محروم کردیا جاتا ہے اس میں سے جسے کافر پالیتا ہے۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾

”اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں کہ جہاد کیا ان کے ہمراہ بہت سے اللہ والوں نے سو نہ ہمت ہاری انہوں نے بوجہ ان تکلیفوں کے جو پہنچی انہیں اللہ کی راہ میں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ انہوں نے ہار مانی اور اللہ تعالیٰ پیار کرتا ہے (تکلیفوں میں) صبر کرنے والوں سے۔ اور نہیں تھی ان کی گفتگو بغیر اس کے کہ کہا انہوں نے اے ہمارے رب! بخش دے ہمارے گناہ اور جو زیادتیاں کیں ہم نے اپنے کام میں اور ثابت قدم رکھ ہمیں اور فتح دے ہم کو قوم کفار پر۔“

قولہ تعالیٰ: وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ زہری نے بیان کیا ہے: غزوہ احد کے دن شیطان نے چیخ کر کہا: قتل محمد (محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کردیئے گئے) تو اس سے مسلمانوں کی ایک جماعت شکست خوردہ ہوگئی۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں پہلا آدمی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا، میں نے خود کے نیچے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کو چمکتے ہوئے دیکھا، تو میں نے اپنی بلند آواز کے ساتھ پکار کر کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ تو خاموش رہ۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ كَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ كَثِیْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا الآیہ۔ اور كَاَیِّنْ بمعنی کم ہے۔ خلیل اور سیبویہ نے کہا ہے: یہ ای ہے اس پر کاف تشبیہ داخل ہوا اور اس کے ساتھ اسے بنایا گیا۔ پس یہ کلام میں کم کے معنی میں ہے۔

اور اسے مصحف میں نون کے ساتھ لکھا گیا ہے، کیونکہ یہ ایک کلمہ ہے اسے اپنے اصل سے نقل کیا گیا ہے پس اس کے معنی کے تغیر کی وجہ سے اس کے لفظ کو بھی بدل دیا گیا ہے، پھر اس کا استعمال کثیر ہے اور عرب تو اس کے ساتھ کھیلتے رہے اور انہوں

نے اس میں قلب اور حذف کا تصرف کیا ہے۔ اور اس میں چار لغات ہیں جن کے ساتھ اسے پڑھا گیا ہے۔ ابن کثیر نے اسے وکائن، وکاعِن کی مثل فاعل کے وزن پر پڑھا ہے اور اس کی اصل کَیْءٍ ہے پھر یا کو الف سے بدل دیا گیا جیسا کہ یَیْأَس میں تبدیل کیا گیا اور کہا گیا ہے یاءَ سْ۔

شاعر نے کہا ہے:

وَ کَائِنْ بالأَباطِحِ من صَدِیقٍ   یَرَانِی لَوْ أُصِبْتُ هو المُصَابَا

اور ایک دوسرے شاعر نے کہا ہے:

وَ کَائِن رَدَدْنَا عنکم مِن مُدَجَّجٍ   یَجِیُٔ أمامَ الرَّکْبِ یَرْدِی مُقَنَّعَا

اور ایک اور نے کہا ہے:

وَ کَائِن فی المَعاشِرِ من أُنَاس   أخوهم فَوْقَهم وهُم کِرامُ

مذکورہ تمام اشعار میں وکائن فاعل کے وزن پر پڑھا گیا ہے۔

اور ابن محیصن نے وکَئِنْ پڑھا ہے یعنی مہموز مقصور ہے جیسا کہ وَکَعِن اور یہ کَائِنْ سے بنایا گیا ہے اور اس کے الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اور اس سے وَکَأَیِن بھی ہے جیسا کہ وکَعْیِنْ اور یہ کَیْءٍ مخفف کا مقلوب ہے۔ اور باقیوں نے وَکَأَیِن کَعَیِّنْ کی مثل تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور یہی اصل ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

کَعَایِّنْ مِنْ أُنَاسٍ لم یزالوا   أخوهم فوقهم وَ هُم کرامُ

اور ایک دوسرے نے کہا ہے:

کَأَیِّنْ أَبَدْنَا من عدوّ بِعِزِّنَا   و کَائِنْ أَجَرْنَا من ضَعِیف و خائِف

اور اسے دولغتوں کے درمیان جمع کر دیا گیا ہے: کَأَیِّنْ وَکَائِنْ، اور ایک پانچویں لغت ہے کَیْئِنْ جیسا کہ کَیْعِنْ گویا یہ کَیِّئٍ سے مخفف ہے اور کَأَیِّنْ کا مقلوب ہے۔ علامہ جوہری نے سوائے دولغتوں کے کوئی ذکر نہیں کی: کَائِنْ مثلاً کَاعِنْ، اور کَأَیِّنْ مثلاً کَعَیِّنْ، آپ کہتے ہیں کَأَیِّنْ رجلا لقیتُ، اس میں رجلاً تمیز کی بنا پر کَأَیِّنْ کے بعد منصوب ہے۔ اور آپ یہ بھی کہتے ہیں: کَأَیِّنْ مِنْ رجل لقیت، کَأَیِّنْ کے بعد مِنْ داخل کرنا نصب کی نسبت اکثر اور عمدہ ہے۔ اور بِکَأَیِّنْ تبیعُ هذا الثوب؟ بمعنی بکم تبیع ہے۔ (تم یہ کپڑا کتنے میں بیچو گے)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

و کَائِنْ ذَعَرْنَا من مَهَاةٍ وَرَامِحٍ   بِلَادُ العِدَا لَیْسَتْ له بِبِلَادِ

اس میں کَایِنْ بمعنی کم استعمال ہو رہا ہے۔

نحاس نے کہا ہے: ابو عمرو نے وقف کیا ہے اور وکَأَیْ بغیر نون کے پڑھا ہے، کیونکہ یہ تنوین ہے اور سورہ ابن مبارک نے

کسائی سے اسے روایت کیا ہے۔ اور باقیوں نے خط مصحف کی اتباع کرتے ہوئے نون کے ساتھ وقف کیا ہے۔ اور آیت کا معنی مومنوں کو تشجیع دلانا اور انبیاء علیہم السلام کے بہترین متبعین میں سے جو پہلے گزر چکے ہیں ان کی اقتداء اور پیروی کرنے کا حکم دینا ہے، یعنی کثیر انبیاء علیہم السلام ہیں جن کے ساتھ بہت سے اللہ والوں کو شہید کیا گیا یا انبیاء علیہم السلام میں سے کثیر شہید کردیئے گئے اور ان کی امتیں مرتد نہیں ہوئیں، یہ دو قول ہیں: پہلا حسن اور سعید بن جبیر کا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کوئی نبی کسی جنگ میں کبھی شہید نہیں کیا گیا(1)۔ اور ابن جبیر نے کہا ہے: ہم نے نہیں سنا کہ کوئی نبی علیہ السلام جنگ میں شہید کردیا گیا ہو(2)۔ اور دوسرا قول حضرت قتادہ اور عکرمہ سے منقول ہے۔ اس قول کی بنا پر قُتِلَ پر وقف کرنا جائز ہے، اور یہ قرأت (قُتِلَ) نافع، ابن جبیر، ابوعمرو اور یعقوب کی ہے۔ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت ہے اور ابوحاتم نے اسے ہی اختیار کیا ہے، اور اس میں دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ قُتِلَ صرف نبی پر واقع ہو رہا ہے، اور اس صورت میں قُتِلَ پر کلام کی تکمیل ہو جاتی ہے اور کلام میں اضمار ہوگا یعنی و معہ ربیون کثیر، جیسا کہ کہا جاتا ہے: قُتِلَ الامیرُ معہ جیش عظیم، یعنی و معہ جیش عظیم۔ اور خرجتُ معی تجارۃ، ای و معی۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قتل نبی علیہ السلام اور اس کے ساتھ اللہ والوں کو بھی شامل ہو، اور کلام کی توجیہ یہ ہوگی کہ ان میں سے بعض شہید کردیئے گئے جو اس (نبی علیہ السلام) کے ساتھ تھے، عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم و بنی سلیم، (یعنی) ان میں سے بعض قتل کردیئے ہیں۔ اور قول باری تعالیٰ: فَمَا وَهَنُوْا ان میں سے ماتقی کی طرف راجع ہوگا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ قول نزول آیت کے ساتھ زیادہ مشابہت اور زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم شہید نہیں کئے گئے، بلکہ آپ کے ساتھ آپ کے صحابہ کرام کی ایک جماعت شہید کی گئی۔ اور کوفیوں اور ابن عامر نے قٰتَلَ پڑھا ہے۔

اور یہی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے، اور اسے ابوعبید نے اختیار کیا ہے۔ اور کہا ہے: بے شک اللہ تعالیٰ نے جب ان کی مدح اور تعریف کی جنہوں نے جہاد کیا تو جو شہید کردیئے گئے وہ بھی اس میں داخل ہو گئے۔ اور جب مدح ان کی ہو جو شہید کردیئے گئے تو پھر ان کے ماسوا باقی اس میں داخل نہ ہوئے، پس قٰتَلَ اعم(3) اور زیادہ قابل مدح ہے، اور رِبِّيُّوْنَ را کے کسرہ کے ساتھ جمہور کی قرأت ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قرأت را کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے را کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، اس میں تین لغات ہیں۔ اور رِبِّيُّوْنَ سے مراد بہت سی جماعتیں ہیں، یہ حضرت مجاہد، قتادہ، ضحاک اور عکرمہ سے منقول ہے(4)، ان کا واحد رُبِّی را کے ضمہ اور اس کے کسرہ کے ساتھ ہے، یہ رُبَّۃ کی طرف منسوب ہے یہ را کے کسرہ کے ساتھ بھی ہے اور را کے ضمہ کے ساتھ بھی۔ اور اس کا معنی ہے جماعت، گروہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: الرِّبِّيُّوْنَ سے مراد الوف کثیرۃ (یعنی کئی ہزار) ہیں(5)۔ اور ابن زید نے کہا ہے: الربیون سے مراد اتباع و پیروی کرنے والے ہیں(6)۔ پہلا معنی لغت میں زیادہ معروف ہے، اور اسی معنی میں (کپڑے کا) وہ ٹکڑا ہے جس میں جوئے کے تیر جمع

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 562 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً

کئے جاتے ہیں اسے رَبَّۃٌ اور رُبَّۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور رِبَاب سے مراد وہ قبائل ہیں جو جمع ہوں۔ اور ابان بن ثعلب نے کہا ہے: الرِّبِّیّ دس ہزار ہیں۔ اور حسن نے کہا ہے: اس سے مراد صبر کرنے والے علماء ہیں (1)۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ربیع اور سدی نے کہا ہے: اس سے مراد الجمع الکثیر (بہت بڑا اجتماع) ہے۔

حسان نے کہا ہے:

وإذا مَعْشَرٌ تَجَافَوْا عن الحق　حَمَلْنَا علیهم رُبِّیا

جب لوگ حق سے دور ہو گئے تو ہم نے ان پر جمع کثیر کو مسلط کر دیا۔

اور زجاج نے کہا ہے: یہاں دو قرآتیں ہیں رُبِّیُّوْنَ را کے ضمہ کے ساتھ اور رِبِّیُّوْنَ را کے کسرہ کے ساتھ، رہا رُبِّیُّوْنَ تو اس کا معنی ہے جماعت کثیرہ اور کہا جاتا ہے: دس ہزار۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رَبِّیُّوْنَ را کے فتحہ کے ساتھ یہ رب کی طرف منسوب ہے۔ خلیل نے کہا ہے: الرِّبِّیُّ ان بندوں میں سے ایک جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ڈٹے رہے اور صبر کیا اور وہی ربانیون ہیں ان کی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی معرفت، عبادت اور الوہیت کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: **فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ**، **وَهَنُوْا** وہ کمزور ہو گئے، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ الوھن کا معنی ہے خوف کے سبب ہمت اور قوت کا ٹوٹ جانا۔ اور حسن اور ابو السمال نے وَهِنُوْا ھا کے کسرہ اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ابو زید سے منقول ہیں۔ وھن الشئ یَھِن وھنا۔ اور أو ھنتہ أنا و وَھَنْتُہٗ اس کا معنی ہے میں نے اسے کمزور کر دیا۔ اور الواھنۃ کا معنی ہے پسلیوں کا نیچے آنا اور ان کا چھوٹا ہونا اور الوھن من الابل سے مراد اونٹ کا بوجھل اور موٹا ہونا ہے اور الوھن سے مراد رات کی وہ ساعت بھی ہے جو گزر جاتی ہے، اور اسی طرح المَوْھن بھی ہے۔ اور أَوْهَنَّا یعنی ہم اس ساعت میں ہو گئے، مراد یہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبی کے شہید ہونے کی وجہ سے یا ان کے قتل کی وجہ سے جو ان میں شہید کر دیئے گئے ہمت نہ ہاری یعنی ان کے باقی رہنے والوں نے ہمت نہ ہاری، پس اس میں مضاف محذوف ہے۔ **وَمَا ضَعُفُوْا** اور وہ اپنے دشمن کی وجہ سے کمزور نہیں ہوئے۔ **وَمَا اسْتَكَانُوْا** یعنی (انہوں نے ہار نہ مانی) اس تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے جو انہیں جہاد میں پہنچی۔ اور الاستکانۃ کا معنی ذلت اور خضوع ہے (یعنی نہ وہ جھکے اور نہ عجز کا اظہار کیا) اور اس کی اصل واستَكَنُوْا، افتعلوا کے وزن پر ہے، پھر کاف کے فتحہ میں اشباع کیا گیا تو اس سے الف پیدا ہوا۔

اور جنہوں نے اسے کَوْن سے بنایا ہے تو پھر یہ استفعلوا کے وزن پر ہے۔ (یعنی باب استفعال ہے) اور پہلا آیت کے معنی سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اور فَمَا وَهْنُوْا وَ مَا ضَعْفُوْا ھا اور عین کے سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور کسائی نے ضَعَفُوْا عین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خبر دی اس کے بعد کہ ان میں سے کچھ شہید کر دیئے گئے یا ان کے نبی علیہ السلام کو شہید کر دیا گیا یہ کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ بھاگے نہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو موت پر

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 562

پیش کر دیا، اور انہوں نے مغفرت طلب کی تاکہ ان کی سوت گناہوں سے توبہ ہو جائے اگر انہیں شہادت عطا فرما دی جائے، اور انہوں نے ثابت قدم رہنے کی التجا کی یہاں تک کہ وہ شکست خوردہ نہ ہوئے، اور اپنے دشمنوں کے خلاف فتح و نصرت کی دعا مانگی۔ اور انہوں نے ثبات بالاقدام کو خاص کیا نہ کہ دیگر اعضائے بدن کو اس لئے کہ اعتماد اور انحصار انہی پر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اے اصحاب محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تم نے اس طرح کیوں کیا اور کہا؟ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور انہیں نصرت، فتح، دنیا میں مال غنیمت اور آخرت میں مغفرت عطا فرمائی جب وہ اس کی طرف چلے گئے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے مخلص، توبہ کرنے والے، سچ بولنے والے اور اپنے دین کی مدد و نصرت کرنے والے بندوں کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرتا ہے۔ جو اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے سچے وعدہ اور سچے قول کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ یعنی (اللہ تعالیٰ ان سے پیار اور محبت کرتا ہے) جو جہاد میں صبر اختیار کرتے ہیں اور بعض نے وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس میں قول کو كَانَ کا اسم بنایا گیا ہے، سو اس کا معنی ہوگا و ما کان قولهم الا قولهم (اور ان کی کوئی گفتگو نہ تھی سوائے اس قول کے) رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا (اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے) اس میں مراد صغیرہ گناہ ہیں۔ وَ اِسْرَافَنَا اور جو زیادتیاں ہم نے کی ہیں مراد کبیرہ گناہ ہیں۔ اور اسراف کا معنی ہے: الافراط فی الشئ و مجاوزة الحد یعنی کسی شے میں زیادتی کرنا اور حد سے تجاوز کرنا۔ اور صحیح مسلم میں ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگتے تھے اللهم اغفرلی خطیئتی و جهلی و اسرافی فی امری و ما انت أعلم به مِنّی(1) (اے اللہ! میری خطائیں، میری جہالت (میری عدم علم) میری اپنے معاملے میں زیادتی اور وہ جسے تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے میری مغفرت اور بخشش فرما) اور آگے حدیث ذکر کی (2)۔ چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اس دعا پر عمل کرے جو کتاب اللہ اور صحیح سنت میں ہے اور اس کے سوا کو چھوڑ دے اور یہ نہ کہے: میں اس طرح پسند کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام اور اپنے اولیاء کے لئے پسند فرمایا اور انہیں تعلیم دی کہ وہ کیسے دعا مانگیں۔

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

"تو دے دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب (یعنی کامیابی) اور عمدہ ثواب آخرت کا (یعنی نعیم جنت اور لذت وصل) اور اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے نیکوکاروں سے۔"

قولہ تعالیٰ: فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کر دیا ثَوَابَ الدُّنْيَا یعنی دشمنوں ... نصرت اور ان پر ... کامرانی وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ یعنی جنت اور جحدری نے فَاٰثَابَهُمُ اللّٰهُ پڑھا ہے یعنی ... الْمُحْسِنِيْنَ اس کا مفہوم پہلے گزر چکا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدعوت، باب قول النبی ... اللهم اغفرلی الخ، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن ...

2۔ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعوات والتعوذ باب فی الادعیة، جلد 2 صفحہ 349، اسلام آباد

ایضاً صحیح بخاری، کتاب الدعوات، حدیث نمبر 5919، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ النّٰصِرِیْنَ ﴿۱۵۰﴾

”اے ایمان والو! اگر پیروی کرو گے تم کافروں کی تو وہ پھیر دیں گے تمہیں الٹے پاؤں (کفر کی طرف) تو تم لوٹو گے نقصان اٹھاتے ہوئے۔ بلکہ الله حامی ہے تمہارا اور وہ سب سے بہتر مدد فرمانے والا ہے۔“

جب الله تعالیٰ نے ان کی اقتدا کا حکم دیا جو انبیاء علیہم السلام کے انصار و معاونین میں سے پہلے گزر چکے ہیں تو کافروں کی طاعت و پیروی سے ڈرایا، کافروں سے مراد مشرکین عرب یعنی ابوسفیان اور اس کے ساتھی ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہود ونصاریٰ ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مراد منافقین ہیں انہوں نے مومنین کو ہزیمت کے وقت یہ کہا: تم اپنے آباء و اجداد کے دین کی طرف لوٹ آؤ(1)۔ یَرُدُّوْكُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ یعنی وہ تمہیں کفر کی طرف پھیر دیں گے۔ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ تو تم لوٹو گے اس حال میں کہ تم خسارے اور نقصان میں ہو گے۔ پھر فرمایا: بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ یعنی الله تعالیٰ تمہارا مددگار اور تمہارا محافظ ہے اگر تم اس کی اطاعت کرو گے۔ اور بَلِ اللّٰهَ نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، تقدیر عبارت یہ ہے بل واطیعوا الله مولاکم۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾

”ابھی ہم ڈال دیں گے کافروں کے دلوں میں رعب اس لئے کہ انہوں نے شریک بنا لیا الله کے ساتھ اس کو جس کے لئے نہیں اتاری الله نے کوئی دلیل اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے اور بہت بری جگہ ہے ظالموں کی۔“

اسی کی مثل ہے وَ قَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ ابن عامر اور کسائی نے الرُّعُب عین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ اور الرُّعْب کا معنی خوف ہے، کہا جاتا ہے: رَعَبْتُهُ رُعْبًا و رُعُبًا، فهو مرعوب۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ الرعب مصدر ہو اور الرُّعْب اسم ہو۔ اور اس کی اصل الملاء سے ہے (بھرنا) کہا جاتا ہے: سَیْل راعب یملأ الوادی (یعنی ایسا سیلاب جو وادی کو بھر دے) اور رعبت الحوض کا معنی ہے میں نے حوض کو بھر دیا۔

اور آیت کا معنی ہوگا: ہم عنقریب مشرکین کے دلوں کو خوف اور گھبراہٹ سے بھر دیں گے۔ اور سختیانی نے سَیُلْقِیْ یاء کے ساتھ پڑھا ہے، اور باقیوں نے نون عظمت کے ساتھ پڑھا ہے۔

سدی وغیرہ نے کہا ہے: جب ابوسفیان اور مشرکین احد کے دن مکہ مکرمہ کی طرف متوجہ ہو کر چلے وہ چلتے رہے یہاں تک کہ جب وہ کچھ راستہ طے کر چکے تو نادم اور شرمندہ ہوئے اور کہنے لگے: ہم نے کہا ہے وہ کتنا برا ہے! ہم نے انہیں قتل کیا ہے یہاں تک کہ جب بکھرے ہوئے چند افراد کے سوا کوئی باقی نہیں رہا تو ہم نے انہیں چھوڑ دیا ہے، واپس چلو اور انہیں مکمل طور پر ہلاک کر دو۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 263

پس جب انہوں نے اس کا عزم وارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب اور خوف ڈال دیا یہاں تک کہ انہوں نے جو قصد کیا تھا اس سے رجوع کر لیا(1)۔ اور القاء درحقیقت اجسام میں استعمال کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ (اور اس نے تختیاں پھینکیں) فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ عِصِيَّهُمْ (الشعراء: 44) (تو انہوں نے پھینک دیں اپنی رسیاں اور اپنی لاٹھیاں میدان میں) فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ (پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا) شاعر نے کہا ہے:

فالقتْ عصاها واستقرّ بها النّوی

پس اس نے اپنا عصا پھینکا اور اس کے ساتھ گھر ساکن ہو گیا۔

پھر کبھی مجازی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے، اور اس ارشاد میں: وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ (طٰہٰ: 39) (اور (اے موسیٰ) میں نے پر تو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جانب سے) اور القی علیك مسألة (اور اس نے تجھ پر سوال کیا ہے۔)

قولہ تعالیٰ: بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ یہ علت بیان ہو رہی ہے، یعنی ان کے دلوں میں رعب ڈالنے کا سبب ان کا شرک کرنا ہے، اور یہ ما مصدریہ ہے اور کہا جاتا ہے: اَشْرَكَ بِهٖ یعنی اس نے اس کے غیر کو اس کے مساوی قرار دیا تا کہ وہ اسے شریک بنا لے۔

قولہ تعالیٰ: مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا سلطان سے مراد حجۃ اور بیان ہے، اور عذر اور برہان (دلیل) ہے، اسی وجہ سے والی کو سلطان کہا گیا ہے، کیونکہ وہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی حجت ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے: یہ سلیط سے ماخوذ ہے اور اس سے مراد وہ ہے جس سے چراغ روشن کئے جاتے ہیں، اور وہ تلوں کا تیل ہے۔

جیسا کہ امرؤالقیس نے کہا ہے:

أَمَالَ السَّلِيطَ بِالذُّبَالِ الْمُفَتَّلِ

پس سلطان (دلیل) کے ساتھ حق کے اظہار اور باطل کو مٹانے میں روشنی اور نور حاصل کیا جاتا ہے اور کہا گیا ہے: السمیط کا معنی حدید (لوہا) ہے اور السلاطة کا معنی الحدة (غضب) ہے اور السلاطة تسلیط سے ہے اور اس کا معنی قہر اور غلبہ ہے اور سلطان اسی سے ہے، اس میں نون زائدہ ہے۔ پس سلطان کا اصل معنی قوت ہے، کیونکہ قوت کے ساتھ اسی طرح غلبہ پایا جاتا ہے جس طرح دلیل کے ساتھ غلبہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اور السلیطة کا معنی ہے شور وشغب اور چیخ و پکار کرنے والی عورت۔ اور سلیط سے مراد فصیح اللسان آدمی ہے۔ اور اس کا معنی ہے کہ کسی دین میں بھی بتوں کی عبادت ثابت نہیں، اور اس کے جواز پر عقلی دلیل بھی کوئی نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے انجام اور ان کے لوٹنے کی جگہ کے بارے خبر دی اور فرمایا: وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ (اور ان کا ٹھکانا آتش (جہنم) ہے) پھر اس کی مذمت بیان کی اور فرمایا: وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ اور المثوی، مراد وہ جگہ ہے جس میں انہیں رکھا جائے گا، کہا جاتا ہے: ثوی یثوی ثواء اور الماوی: اس سے مراد ہر وہ جگہ ہے جس کی طرف کوئی شے رات یا دن کے وقت لوٹ کر آتی ہے۔

1۔ اسباب النزول، صفحہ 83

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۲﴾

''اور بے شک سچ کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جبکہ تم قتل کر رہے تھے کافروں کو اس کے حکم سے یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں اور نافرمانی کی تم نے اس کے بعد کہ اللہ نے دکھا دیا تھا تمہیں جو تم پسند کرتے تھے۔ بعض تم میں سے طلبگار ہیں دنیا کے اور بعض تم میں سے طلبگار ہیں آخرت کے پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ آزمائے تمہیں اور بے شک اس نے معاف فرما دیا تم کو اور اللہ تعالیٰ بہت فضل وکرم فرمانے والا ہے مومنوں پر۔''

محمد بن کعب قرظی نے بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ احد کے بعد مدینہ طیبہ کی طرف مراجعت فرما ہوئے اس حال میں کہ انہیں تکلیف اور اذیت پہنچی تھی تو بعض نے بعض کو کہا: کہاں سے یہ اذیت ہمیں پہنچی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ فتح ونصرت کا وعدہ فرمایا تھا! تب یہ آیت نازل ہوئی (1) اور یہ وہ ہے کہ انہوں نے مشرکوں کے علمبردار کو قتل کیا اور اس کے بعد علم پر ان میں سے سات افراد کو قتل کیا، اور ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی وکامرانی حاصل ہوئی مگر یہ کہ وہ مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور بعض تیر اندازوں نے بھی مال غنیمت کی طلب میں اپنا مرکز چھوڑ دیا اور وہی ناکامی کا سبب بن گیا۔ بخاری نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: جب احد کا دن تھا اور ہمارا مشرکین سے آمنا سامنا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیر اندازوں میں سے کچھ لوگوں کو (ایک درہ میں) بٹھایا اور ان پر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور آپ نے انہیں فرمایا: ''تم اپنی جگہ کو قطعاً نہ چھوڑنا [اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم ان پر غالب آ گئے ہیں تو تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا] اور اگر تم انہیں دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آ رہے ہیں تو پھر بھی تم ان کے خلاف ہماری مدد نہ کرنا۔'' راوی کا بیان ہے کہ جب جنگ ہوئی اور مسلمانوں نے انہیں شکست سے دوچار کر دیا حتیٰ کہ ہم نے عورتوں کی طرف دیکھا وہ بڑی تیزی سے پہاڑ کی طرف بھاگ رہی ہیں، اور انہوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑے اوپر اٹھائے ہوئے ہیں اور ان کے پازیب ظاہر دکھائی دے رہے ہیں تو وہ کہنے لگے: مال غنیمت لوٹ لو مال غنیمت لوٹ لو۔ تو حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: ٹھہر جاؤ، رک جاؤ! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے عہد نہیں لیا کہ تم اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا لیکن وہ چلے گئے پس جب وہ ان کی طرف آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو پھیر دیا (2) اور مسلمانوں میں سے ستر افراد شہید کر دیئے گئے۔ پھر ابو سفیان بن حرب ایک بلند جگہ سے

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 565۔ ایضاً، اسباب النزول، صفحہ 83

2۔ بخاری کتاب المغازی باب غزوہ احد، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ہمارے اوپر جھانکا اور اس نے کہا: کیا قوم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' یہاں تک کہ اس نے تین بار پکارا۔ پھر اس نے کہا: کیا قوم میں ابن ابی قحافہ ہیں؟ تین بار اس نے یہ پوچھ، تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' پھر اس نے کہا: کیا قوم میں عمر [بن خطاب] ہیں؟ اس نے یہ بھی تین بار پوچھا۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب نہ دینا'' پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: یہ سب لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے آپ پر ضبط نہ رکھ سکے اور کہا: اے اللہ تعالیٰ کے دشمن! تو نے جھوٹ بولا ہے! اللہ تعالیٰ نے تجھے باقی رکھا ہے تاکہ وہ اس طرح تجھے ذلیل و رسوا کرے، تو اس نے کہا: أعل هبل: اے ھبل تو بلند ہو گیا (غالب آ گیا) یہ جملہ اس نے دوبارہ کہا۔ تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب دو'' تو صحابہ کرام نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم کیا کہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم کہو اللہ اعلیٰ و اجل'' اللہ تعالیٰ بلند و برتر اور بزرگ ہے۔

ابوسفیان نے کہا: لنا عزی و لا عزی لکم (ہمارے لئے تو عزیٰ ہے اور تمہارے لئے کوئی عزیٰ نہیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اسے جواب دو'' صحابہ نے عرض کی: ہم کیا کہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ تو آپ نے فرمایا: تم کہو اللہُ مولانا و لا مولی لکم۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔ ابوسفیان نے کہا: آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے، اور جنگ تو ڈول کی مانند ہے (یعنی اس کا نتیجہ کبھی ایک فریق کے حق میں ہوتا ہے کبھی دوسرے فریق کے حق میں جس طرح ڈول میں پانی کبھی زیادہ ہوتا ہے اور کبھی کم) بلاشبہ تم قوم میں ایسے مقتول پاؤ گے جن کا مثلہ کر دیا گیا ہے میں نے اس کے بارے حکم نہیں دیا ہذا تم مجھے برا نہ کہنا(1)۔ اور بخاری اور مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے بیان کیا: میں نے احد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں جانب دو آدمی دیکھے وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے شدید ترین جنگ لڑ رہے تھے اور حضرت سعد سے ایک روایت میں ہے، ان دونوں پر سفید لباس تھا میں نے ان دونوں کو نہ اس سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ بعد میں۔ مراد حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام ہیں (2)۔ اور دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: یقاتلان عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اشد القتال ما رأیتهما قبل ذالک الیوم و لا بعده۔

اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: ملائکہ نے مسلمانوں کی معیت میں اس دن جنگ نہیں لڑی، اور نہ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد سوائے یوم بدر کے۔ علامہ بیہقی نے کہا ہے: حضرت مجاہدؒ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ ملائکہ نے احد کے دن اس قوم کی طرف سے جنگ نہیں لڑی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور وہ اس حکم پر قائم نہیں رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا۔

اور حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے صبر و تقویٰ کی شرط پر وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کی مدد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو نشان والے ہیں۔ اور وہ اس نے پورا کر دیا، اور جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکم عدولی کی

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوہ احد و قول اللہ تعالیٰ، جلد 2، صفحہ 579، قدیمی کتب خانہ کراچی
ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3737، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 252، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3748، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور انہوں نے اپنی صفوں کو چھوڑ دیا اور تیر اندازوں نے بھی اس عہد کو ترک کر دیا جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے لیا تھا کہ وہ اپنی جگہ کو ہرگز نہ چھوڑیں، اور انہوں نے دنیا کا ارادہ کیا تو ان سے ملائکہ کی مدد اٹھالی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ تو اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچ کر دیا اور انہیں فتح دکھا دی، اور جب انہوں نے نافرمانی کی تو اس کے بعد ان پر آزمائش اور بلا کو مسلط کر دیا۔

اور عمر بن اسحاق نے کہا ہے: جب احد کا دن تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے بکھر گئے اور حضرت سعد آپ کے سامنے تیر پھینک رہے تھے اور ایک نوجوان انہیں تیر پکڑا رہا تھا جب بھی کوئی تیر چلا جاتا تو وہ تیر انہیں دیتا۔ اور کہتا: اے ابا اسحاق! تیر چلاؤ۔ پس جب فارغ ہوئے انہوں نے دیکھا وہ جوان کون ہے؟ تو نہ انہوں نے اسے دیکھا اور نہ اسے پہچانا۔ محمد بن کعب نے کہا ہے: جب مشرکوں کا علمبردار قتل ہو گیا اور ان کا جھنڈا گر گیا، تو اسے عمرۃ بنت علقمہ حارثیہ نے اٹھایا تھا۔

اس بارے میں حضرت حسان کہتے ہیں:

فلولا لواءُ الحارثية أصبحوا يباعُون في الأسواق بيْعَ الجلائب

پس اگر عمرہ حارثیہ کا جھنڈا نہ ہوتا تو انہیں بازاروں میں سامان تجارت کی طرح فروخت کر دیا جاتا۔

اور تَحُسُّوْنَهُمْ کا معنی ہے تم انہیں قتل کر رہے تھے اور تم ان کا نام ونشان مٹا رہے تھے۔

شاعر نے کہا ہے:

حَسَسْناهم بالسّيف حَسًّا فأصبحت بقيَّتهم قد شُرِّدُوا او تبَدَّدُوْا

ہم نے تلوار کے ساتھ ان کا نام ونشان مٹا دیا ہے پس ان کے بقیہ رہنے والوں کو بھگا دیا گیا ہے یا وہ بکھر گئے ہیں۔

اور جریر نے کہا ہے:

تحُسُّهم السيوف كما تَسامَى حريق النار في الأجم الحصيد

اس میں بھی تَحُسُّهُمْ کلی طور پر ختم کر دینے اور نام ونشان مٹا دینے کے معنی میں ہے۔

ابو عبید نے کہا ہے: الحسّ کا معنی ہے قتل کے ساتھ ہلاک و برباد کر دینا(1)، کہا جاتا ہے: جراد محسوس جب سردی اسے قتل اور تباہ کر دے۔ اور البرد مَحَسَّةٌ للنبت یعنی سردی نباتات کو جلا کر ختم کر دینے والی ہے۔ اور سَنَةٌ حَسُوس یعنی خشک سالی ہر شے کو کھا جاتی ہے۔ رؤبہ نے کہا ہے:

اذا شكونا سَنَةً حَسُوسا تاكل بعد الأخضر اليَبِيسا

جب ہم شکوہ کرتے خشک سالی کا جو کہ سبزی کے بعد خشکی کو بھی کھا جاتی ہے اور اس کی اصل الحس سے ہے جس کا معنی ہے حاسہ کے ساتھ کسی شے کا ادراک کرنا۔ پس حَسَّهٗ کا معنی ہے اس نے اس کی حس کو قتل کے سبب ختم کر دیا۔ بِاِذْنِهٖ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم سے یا اس کی قضا اور امر سے۔ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلْتُمْ یعنی جب تم بزدل ہو گئے اور تم کمزور ہو گئے۔ کہا جاتا ہے: فَشِلَ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 566

یَفْشَلُ فھو فَشِلٌ و فَشَل۔ اور حَتّٰی کا جواب محذوف ہے ای حتّٰی اذا فشلتم امتُحِنتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے تو تم امتحان میں ڈال دیئے گئے) اور اس کی مثل جائز ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ (الانعام:35) فافعل۔ (تو اگر آپ سے ہو سکے تو تلاش کر لو کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں (تو اس پر چڑھ جاؤ)

اور فراء نے کہا ہے: حَتّٰی کا جواب وَ تَنَازَعْتُمْ ہے اور واؤ مقحمہ زائدہ ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَ نَادَيْنٰهُ ای نادیناہ (یعنی اس میں بھی واؤ مقحمہ زائدہ ہے) اور امرؤ القیس نے کہا ہے:

فلمّا أجزنا ساحةَ الحَيّ وانتحَی ای انتحَی

اس میں بھی واؤ زائدہ ہے۔ اور ان کے نزدیک وَ عَصَيْتُمْ میں بھی واؤ کو مقحمہ قرار دینا جائز ہے۔ یعنی حتی اذا فشلتم و تنازعتم عصیتم۔ (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے (رسول کے) حکم کے بارے میں تو تم نے نافرمانی کی۔) اور اس بنا پر اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی حتی اذا تنازعتم و عصیتم فشِلتم (یہاں تک کہ جب تم جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو تم بزدل ہو گئے۔)

اور ابو علی نے کہا ہے: یہ بھی جائز ہے کہ جواب صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ ہو، اور ثُمَّ زائدہ ہو، اور تقدیر کلام یہ ہو حتی اذا فشلتم و تنازعتم و عصیتم صرفکم عنھم (یہاں تک کہ جب تم بزدل ہو گئے اور جھگڑنے لگے اور تم نے نافرمانی کی تو اس نے تم کو ان سے پھیر دیا۔)

اور بعض نحویوں نے اس کے زائدہ ہونے میں شاعر کا قول بیان کیا ہے:

أرانِي اذا ما بِتُّ بِتُّ علی هَوًی فثُمَّ اذا أصبحتُ اصبحتُ عادیا

اور اخفش نے اس کے زائدہ ہونے کو جائز قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اس ارشاد میں ہے: حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَ ضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَ ظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ۚ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ (التوبۃ:118) (یہاں تک کہ جب تنگ ہو گئی ان پر زمین باوجود کشادگی کے اور بوجھ بن گئیں ان پر ان کی جانیں اور جان لیا انہوں نے کہ نہیں کوئی جائے پناہ اللہ سے مگر اسی کی ذات۔ تب اللہ تعالیٰ ان پر مائل بکرم ہوا۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حَتّٰی بمعنی الی ہے اور اس وقت اس کا کوئی جواب نہ ہوگا، یعنی صدقکم اللہُ وعدہ الی اَن فشلتم، (اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ اپنا وعدہ سچ کر دیا یہاں تک کہ تم بزدل ہو گئے) یعنی وہ وعدہ ثابت قدم رہنے کی شرط کے ساتھ تھا۔ اور تَنَازَعْتُمْ کا معنی ہے اختلفتم (تم اختلاف کرنے لگے) یعنی اس وقت تیر اندازوں میں سے بعض نے کہا: ہم غنائم کو جا ملیں گے (یعنی مال غنیمت جمع کریں گے) اور بعض نے کہا: بلکہ ہم تو اسی جگہ ثابت قدم رہیں گے جہاں ثابت رہنے کا حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے۔

مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ یعنی وہ غلبہ جو احد کے دن مسلمانوں کو ابتدائی مرحلہ میں ہی حاصل ہو گیا، اور یہ اس وقت

حاصل ہوا جبکہ مشرکین کا علمبردار پچھاڑ (قتل کر) دیا گیا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اور اسے جونہی قتل کیا گیا تو حضور نبی مکرم ﷺ اور آپ کے اصحاب منتشر ہو گئے اور وہ متفرق گروہوں میں بٹ گئے اور انہوں نے دشمن پر شدید حملے کئے یہاں تک کہ انہوں نے انہیں اپنے سازوسامان سے محروم کر دیا۔ اور مشرک گھوڑ سواروں نے مسلمانوں پر تین بار حملہ کیا ہر بار تیروں کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا گیا پس وہ مغلوب ہو کر واپس لوٹے اور مسلمانوں نے حملہ کیا اور انہوں نے ان کو خوب قتل کیا۔ پس جب پچاس تیر اندازوں نے یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بھائیوں کو فتح عطا فرمادی ہے تو انہوں نے کہا: قسم بخدا! ہم یہاں کسی کام کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے، تحقیق اللہ تعالیٰ نے دشمن کو ہلاک کر دیا ہے اور ہمارے بھائی مشرکوں کے لشکر میں ہیں۔ اور ان میں سے کچھ گروہوں نے کہا: ہم کیونکر ٹھہرے رہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا ہے؟ چنانچہ انہوں نے اپنے ان مقامات کو چھوڑ دیا جن کے بارے میں نبی مکرم ﷺ نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ انہیں قطعاً نہ چھوڑیں۔ اور وہ آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور بزدل ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی پس گھوڑ سوار تیز رفتاری کے ساتھ قتال کرتے ہوئے ان میں آپہنچے۔ آیت کے الفاظ ان کے لئے زجر و توبیخ کا تقاضا کرتے ہیں، اور ان کو جھڑکنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مدد و نصرت کی مبادی کو دیکھ لیا تھا، پس ان کے لئے یہ جاننا واجب تھا کہ فتح و نصرت کی تکمیل ثابت قدم رہنے میں ہے نہ کہ انہزام میں، پھر جھگڑے کا سبب بیان کیا اور فرمایا: **مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا** تم میں سے بعض دنیا یعنی مال غنیمت کے طلبگار ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: ہم نہیں جانتے تھے کہ حضور نبی مکرم ﷺ کے اصحاب میں سے کوئی دنیا اور اس کے سازوسامان کی خواہش رکھتا ہے یہاں تک کہ احد کا دن آگیا (تب ہمیں اس کا احساس ہوا) **وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ** اور تم میں سے بعض آخرت کے طلبگار ہیں (1) اور وہ وہ ہیں جو اپنے مرکز میں ثابت قدم رہے، اور انہوں نے اپنے نبی مکرم ﷺ کے حکم کے بارے میں اپنے امیر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کوئی مخالفت نہ کی، اور خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل نے ان پر حملہ کر دیا، اس وقت یہ دونوں کافر تھے اور انہوں نے آپ کو اپنے باقی ساتھیوں سمیت شہید کر دیا۔ رحمہم اللہ۔

اور یہ عتاب ان کے ساتھ ہے جنہوں نے اپنے مقام کو چھوڑا نہ کہ ان کے ساتھ جو ثابت قدم رہے کیونکہ جو ثابت رہے وہ تو ثواب کے ساتھ کامیاب و کامران تھے، اور یہ اسی طرح ہے جیسے جب کسی قوم پر عام عذاب نازل ہو تو نیکوکار اور بچے بھی ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن جو ان پر نازل ہوا وہ عذاب اور سزا نہیں ہوتی بلکہ ان کے لئے اجر و ثواب کا سبب ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: **ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ** (پھر پیچھے ہٹا دیا تمہیں ان کے تعاقب سے تاکہ تمہیں آزمائے) یعنی اس کے بعد کہ تم ان پر غلبہ حاصل کر چکے تھے تمہیں ان سے ناکامی کے ساتھ واپس لوٹا دیا اور یہ اس پر دلیل ہے کہ معصیت اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے اور معتزلہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے پھر تم واپس لوٹ آئے، انصرفتم، پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی اضافت کافروں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب اور خوف نکالنے کے اعتبار سے ہے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالنے کے لئے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ انہیں کوئی فائدہ نہیں دیتا، کیونکہ کافروں کے دلوں سے رعب اور خوف نکالنا یہاں تک کہ وہ مسلمانوں کو

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 566

حقیر سمجھنے لگیں قبیح اور برا ہے اور ان کے نزدیک بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبیح (فعل) واقع ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا کوئی معنی باقی نہ رہے گا۔ اور یہ قول بھی ہے: صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ کا معنی ہے اس نے تمہیں ان کی طلب اور تعاقب کا پابند نہیں بنایا۔

قولہ تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اس نے تمہیں معصیت اور مخالفت کے بعد ہلاک اور تباہ نہیں کیا۔ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب تمام کے لئے ہے۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ ان تیراندازوں کے لئے ہے جنہوں نے اس حکم کی مخالفت کی جو انہیں دیا گیا۔ اسے نحاس نے اختیار کیا ہے اور اکثر مفسرین نے کہا ہے: اس آیت کی نظیر یہ قول ہے: ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ (البقرہ: 52) (پھر بھی درگزر فرمایا ہم نے تم سے) وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ عفو و مغفرت کے ساتھ مومنوں پر فضل و کرم فرمانے والا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی جگہ ایسی مدد نہیں کی گئی جیسی احد کے دن مدد کی گئی، فرمایا: اور ہم نے اس کا انکار کیا، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے اور اس کے درمیان جس نے انکار کیا یہ کتاب اللہ ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ یوم احد کے بارے فرماتا ہے: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔ الحس سے مراد قتل کرنا ہے۔ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ وَعَصَیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ بلاشبہ اس سے مراد تیرانداز ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک جگہ میں کھڑا کیا پھر ارشاد فرمایا: "تم ہماری پشتوں کی حفاظت کرو پس اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم قتل کر رہے ہیں تو تم ہماری مدد نہ کرنا اور اگر تم ہمیں دیکھو کہ ہم مال غنیمت اکٹھا کر رہے ہیں تو تم ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا۔" پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہو گئے اور مشرکین کے لشکر کو مباح قرار دیا تو تمام تیرانداز واپس لوٹ آئے اور لشکر میں داخل ہو گئے اور مال غنیمت لوٹنے لگے، تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی صفیں جڑ گئیں، پس وہ اس طرح ہو گئے اور آپ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کا جال بنایا اور وہ آپس میں مل گئے (یعنی خلط ملط ہو گئے) پس جب تیراندازوں نے اس درہ کو خالی کر دیا جس میں وہ تھے تو گھوڑ سوار اسی راستے سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر داخل ہو گئے اور بعض نے بعض کو مارا اور آپس میں خلط ملط ہو گئے۔ اور مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ شہید ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے لئے ابھی دن کی ابتدا تھی یہاں تک کہ مشرکین کے سات یا نو علمبردار قتل کر دیئے گئے اور مسلمان پہاڑ کی طرف چلے گئے، اور وہ وہاں تک نہ پہنچے جسے لوگ الغار کہتے ہیں، بلاشبہ وہ مہراس (جبل احد کے ساتھ پانی کا چشمہ) کے نیچے رہے اور شیطان چیخ اٹھا: قتل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر دیا گیا) اور اس میں کوئی شک نہ کیا گیا کہ وہ حق اور سچ ہے۔ پس ہم اسی طرح رہے اور ہم آپ کے شہید ہونے کے بارے شک نہ کرتے تھے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو سعدوں (حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ) کے درمیان ہم پر ظاہر ہوئے جب آپ چلے تو ہم آپ

کو اپنے قدموں کی طرف جھکنے کے سبب پہچان گئے۔ تو ہم اتنا خوش ہوئے گویا ہمیں (اس میں سے) کوئی مصیبت پہنچی ہی نہیں جو مصیبت ہمیں آئی تھی۔ راوی نے بیان کیا: پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف چڑھے اور آپ فرما رہے تھے: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا شدید غضب ہو جنہوں نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا(1)"۔ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: مسلمانوں میں سے سب سے پہلے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا تھا، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی آنکھوں سے پہچانا تھا جو خود کے نیچے سے روشن اور ظاہر تھیں تو میں نے اپنی بلند آواز سے ندا لگائی: اے مسلمانوں کے گروہ! تمہیں بشارت ہو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ تشریف لا چکے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف اشارہ کیا کہ تو خاموش رہ۔

اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَ لَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّ الرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۵۳

"یاد کرو جب تم دور بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے کسی کو اور رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بلا رہے تھے تمہیں پیچھے سے پس اللہ نے پہنچایا تمہیں غم کے بدلے غم تاکہ تم نہ غمگین ہو اس چیز پر جو کھو گئی ہے تم سے اور نہ اس مصیبت پر جو پہنچی ہے تمہیں اور اللہ تعالیٰ خبردار ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔"

اِذْ قول باری تعالیٰ: وَ لَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ عام قرأت تُصْعِدُوْنَ تا کے ضمہ اور عین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔ اور ابو رجاء العطاردی، ابو عبدالرحمٰن سلمی، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے تا اور عین دونوں کو مفتوح پڑھا ہے(2) یعنی تَصْعَدُوْنَ الجبل (تم پہاڑ پر چڑھ رہے تھے)۔ ابن محیصن اور شبل نے اذ یصعدون ولا یلوون دونوں فعلوں کو یا کے ساتھ پڑھا ہے اور حسن نے تَلُوْن ایک واؤ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابوبکر بن عیاش نے عاصم سے وَلَا تُلْوُوْنَ تا کو ضمہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ لغت شاذہ ہے، اسے نحاس نے ذکر کیا ہے۔ اور ابو حاتم نے کہا ہے: اصعدت (کہا جائے گا) جب تو اپنے چہرے کو پھیرتے ہوئے گزر جائے، اور صعدت (کہا جاتا ہے) جب تو پہاڑ یا کسی اور پر چڑھے، بلند ہو(3)۔

پس الاصعاد کا معنی ہموار زمین میں اور وادیوں اور گھاٹیوں کے بطن میں چلنا ہے اور الصعود کا معنی پہاڑوں، چھتوں، سیڑھیوں اور راستوں پر چڑھنا اور بلند ہونا ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا پہاڑ پر چڑھنا وادی میں چلنے کے بعد ہو، پس تُصْعِدُوْنَ اور تَصْعَدُوْنَ دونوں قرأتوں کے مطابق معنی صحیح ہوگا۔

حضرت قتادہ اور حضرت ربیع نے بیان کیا ہے کہ وہ احد کے دن وادی میں چلے۔ اور حضرت ابی کی قرأت اِذْ تُصْعِدُوْنَ فِی الْوَادِی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ احد میں فرار ہو کر چڑھے۔ نتیجتاً دونوں قرأتیں صحیح ہیں، اس دن شکست کھانے والے چلنے اور چڑھنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔

مبرد اور قتبی نے کہا ہے: اصعد کا معنی ہے جب وہ جانے میں خوب دور ہو جائے(4)، پس اصعاد زمین میں خوب دور

1۔ المستدرک علی الصحیحین، کتاب تفسیر باب آل عمران، جلد 2، صفحہ 325-324، دار الکتب العلمیہ

2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

چلے جانے کو کہتے ہیں اور یہ بلندی کی جانب خوب چڑھنے کی طرح ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

ألا أیھذا السائلی أینَ أصعدت فإنَّ لھا من بطن یثرِبَ موعِدا

خبردار! اے مجھ سے سوال کرنے والے تو کہاں دور چلا گیا ہے کیونکہ اس کے لئے وادی یثرب جائے وعدہ ہے۔

اور فراء نے کہا ہے: اصعاد کا معنی سفر کو شروع کرنا اور اس کا آغاز کرنا ہے اور انحدار کا معنی سفر سے واپس لوٹنا ہے، کہا جاتا ہے: اصعدنا من بغداد الی مکۃ والی خراسان اور اسی کے مشابہ جبکہ ہم اس کی طرف نکلیں اور سفر شروع کر دیں۔ اور انحدرنا جب ہم واپس لوٹیں۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے:

قد کنتِ تبکین علی الاصعاد فالیوم سُرِّحتِ و صاح الحادی

اس میں اصعاد سفر شروع کرنے کے معنی میں ہے۔

اور مفضل نے کہا ہے: صعد، اصعد اور صعد تینوں کا معنی ایک ہے (1) اور تلوون کا معنی ہے تعرجون و تقیمون، یعنی تم میں سے بعض بعض کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بھاگتے ہوئے (یعنی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تک نہیں۔) کیونکہ کسی شے کی طرف متوجہ ہونے والا اس کی طرف اپنی گردن کو موڑتا ہے یا اپنی سواری کی لگام کو موڑتا ہے۔ عَلٰٓی اَحَدٍ مراد حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، کلبی نے یہی کہا ہے۔ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْٓ اُخْرٰىکُمْ ای فی اخرکم (اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں پیچھے سے بلا رہے تھے) کہا جاتا ہے: جاء فلان فی آخر الناس أُخرۃ الناس و أُخری الناس و أُخریات الناس (یعنی فلاں لوگوں کے آخر میں آیا، پیچھے آیا) اور بخاری میں ہے اُخْرٰىکُمْ آخرکم کی تانیث ہے: عمرو بن خالد، زہیر اور ابو اسحاق نے بیان کیا ہے: میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے سنا انہوں نے بیان فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کے دن کچھ لوگوں پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر کیا اور وہ بھاگ کر آ گئے جبکہ ان کے پیچھے رہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بلاتے رہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوائے بارہ افراد کے کوئی باقی نہ رہا (2)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پکار منکر (گناہ) کو تبدیل کرنے کے لئے تھی، کیونکہ یہ محال ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم منکر جو کہ بھاگنا ہے کو دیکھیں اور پھر اس سے منع نہ کریں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ اس بنا پر ہے کہ انہزام معصیت ہو اور اس طرح ہے نہیں، اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

قولہ تعالیٰ: فَاَثَابَکُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لغت میں غم کا معنی ہے التغطیۃ (ڈھانپنا) غممت الشیٔ کا معنی ہے میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ اور یوم غَمّ و لیلۃ غمۃ (کہا جاتا ہے) جبکہ دن اور رات دونوں تاریک ہوں اور اسی سے غم الھلال بھی ہے جب چاند دکھائی نہ دے، اور غمّنی الأمر یغمّنی (کام نے مجھے ڈھانپ لیا [یعنی مجھ پر غالب آ گیا])

حضرت مجاہد اور قتادہ وغیرہما نے کہا ہے: پہلا غم تو مقتول ہونا اور زخمی ہونا تھا، اور دوسرا غم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 567 2۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب قولہ تعالیٰ والرسول یدعوکم، جلد 2، صفحہ 655، اسلام آباد

کی خبر نے ان میں اضطراب پیدا کر دیا، جبکہ شیطان نے اس کے بارے چیخ کر کہا۔ اور بعض نے یہ کہا ہے: پہلا غم وہ ہے جو فتح وکامرانی اور مال غنیمت ان سے کھو گیا اور دوسرا وہ جو قتل اور ہزیمت کا انہیں سامنا ہوا۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ پہلا غم ہزیمت ہے، اور دوسرا ابوسفیان اور خالد بن ولید کا ان پر پہاڑ سے جھانکنا ہے۔ پس جب مسلمانوں نے ان کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں غمزدہ کر دیا، اور انہوں نے یہ گمان کیا کہ ان پر جھانک رہے ہیں اور وہ انہیں قتل کریں گے پس اس نے انہیں وہ کچھ بھلا دیا جو انہیں حاصل ہوا تھا، تو اس وقت حضور نبی مکرم ﷺ نے یہ دعا مانگی: اللھم لا یعلن علینا (اے اللہ! کوئی ہم پر غالب نہ آئے) جب کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس بنا پر بِغَمٍّ میں با بمعنی علیٰ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ اپنے باب (اصل معنی) پر ہے اور معنی یہ ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ کو اپنی مخالفت کے سبب غمزدہ کیا پس اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں غم پہنچایا اس غم کے بدلے جو ان کی طرف سے آپ ﷺ کو پہنچایا گیا۔ اور حسن نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّا پس اللہ تعالیٰ نے تمہیں احد کے دن غم پہنچایا بِغَمٍّ اس کے بدلے جو غم بدر کے دن مشرکین کو پہنچا۔ اور غم کو ثواب کا نام دیا گیا ہے جس طرح کہ گناہ کی جزا کو ذنب کا نام دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہ پر آگاہ کر دیا پس وہ اس کے سبب اس مصیبت میں مشغول ہو گئے جو انہیں پہنچی تھی۔ قولہ تعالیٰ: لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ اس میں لام قول باری تعالیٰ: وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ کے متعلق ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ کے متعلق ہے یعنی یہ غم اس غم کے بعد تھا تاکہ تم غمگین نہ ہو اس پر جو مال غنیمت تم سے کھو گیا، اور نہ اس مصیبت پر جو ہزیمت اور شکست کی صورت میں انہیں پہنچی۔

پہلا قول زیادہ اچھا ہے اور قول باری تعالیٰ: مَاۤ اَصَابَكُمْ میں مَا محل جر میں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لا صلہ ہے۔ یعنی لکی تحزنوا علی ما فاتکم و ما اصابکم عقوبۃ لکم علی مخالفتکم رسول اللہ ﷺ۔ (تاکہ تم اس پر غمگین نہ ہو جو تم سے (مال غنیمت) کھو گیا اور جو مصیبت تم کو پہنچی اس بنا پر کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی)

اور یہ اس قول کی مثل ہے: مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ (الاعراف: 12) ای ان تسجد (کس چیز نے روکا تجھے اس سے کہ تو سجدہ کرے جب میں نے حکم دیا تجھے) اور اس قول کی مثل ہے لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ (الحدید: 29) ای لیعلم (تم پر یہ خصوصی کرم اس لئے کیا تاکہ جان لیں اہل کتاب) یہ مفضل کا قول ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ سے مراد یہ ہے کہ تم پر لگاتار غم آئے تاکہ تم اس کے بعد غنائم کے بارے میں (کسی فکر میں) مشغول نہ ہو۔ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ اس میں تحذیر اور وعید کا معنی ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ

یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَ لِیَبْتَلِیَ اللّٰهُ مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

’’پھر اتاری اللہ تعالیٰ نے تم پر غم واندوہ کے بعد راحت (یعنی) غنودگی جو چھا رہی تھی ایک گروہ پر تم میں سے اور ایک جماعت ایسی تھی جسے فکر پڑا ہوا تھا (صرف) اپنی جانوں کا بدگمانی کر رہے تھے اللہ کے ساتھ بلاوجہ عہد جاہلیت کی بدگمانی، کہتے: کیا ہمارا بھی اس کام میں کچھ دخل ہے آپ فرمائیے: اختیار تو سارا اللہ کا ہے چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں جو ظاہر نہیں کرتے آپ پر۔ کہتے ہیں: (اپنے دلوں میں) اگر ہوتا ہمارا اس کام میں کچھ دخل تو نہ مارے جاتے ہم یہاں (اس بے دردی سے) آپ فرمائیے کہ اگر تم (بیٹھے) ہوتے اپنے گھروں میں تو ضرور نکل آتے۔ (وہاں سے) وہ لوگ، لکھا جا چکا ہے جن کا قتل ہونا اپنی قتل گاہوں کی طرف (یہ سارے مصائب اس لئے تھے) تاکہ آزمالے اللہ تعالیٰ جو کچھ تمہارے سینوں میں (چھپا) تھا اور صاف کر دے جو (میل کچیل) تمہارے دلوں میں تھا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے سینوں کے رازوں کا۔‘‘

قولہ تعالیٰ: ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا، اَمَنَةً اور اَمْنٌ دونوں مساوی اور ہم معنی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَمَنَةً (راحت) اسباب خوف کے ساتھ ہوتی ہے، اور امن خوف نہ ہونے کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور یہ (اَمَنَةً) منصوب ہے۔ اَنْزَلَ کے سبب، اور نُّعَاسًا اس (اَمَنَةً) سے بدل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے مفعول لہ کی بنا پر نصب دی گئی ہے، گویا کہ یہ کہا ہے: انزل علیکم للأمنة نعاسا، (پھر تم پر راحت کے لئے غنودگی اتاری)۔ ابن محیصن نے اَمْنَةً میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احد کے دن ان غموں کے بعد مومنین پر غنودگی کے ساتھ فضل و احسان فرمایا یہاں تک کہ ان میں سے اکثر سو گئے، بلاشبہ سوتا وہی ہے جو امن و سکون میں ہوتا ہے اور خوفزدہ آدمی سو نہیں سکتا۔ بخاری نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے اوپر غنودگی اور نیند طاری ہو گئی احد کے دن حالانکہ ہم اپنی صفوں میں تھے، انہوں نے بیان کیا: پس میری تلوار میرے ہاتھ سے گرنے لگتی تو میں اسے اٹھا لیتا اور کبھی وہ گر جاتی اور میں اسے اٹھا لیتا۔ (1)

یَّغْشٰی اسے تا اور یا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ اگر یا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع نعاس ہوگا، اور اگر تا کے ساتھ ہو تو ضمیر کا مرجع امنۃ ہوگا۔ اور الطائفۃ کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ مراد منافقین ہیں یعنی معتب بن قشیر اور اس کے ساتھی، وہ مال غنیمت کے طمع اور مومنین کے خوف میں نکلے تو نیند ان پر طاری نہ ہوئی اور وہ اپنی حاضری پر تاسف کرنے لگے، اور وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے اور وَ طَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ کا معنی ہے اس نے انہیں غم پر ابھارا

1۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ اَمَنَةً نُّعَاسًا، جلد 2، صفحہ 655

اور غم وہ ہے جس کا قصد کیا گیا، کہا جاتا ہے: أھمنی الشئ یعنی وہ میرا غم اور فکر ہے اور أمر مھمٌ: انتہائی سخت اور شدید معاملہ۔ اور اھمنی الأمر۔ أمر نے مجھے غم اور اضطراب میں ڈال دیا، اور ھَمَّنِی کا معنی ہے اذابنی اس نے مجھے پگھلا دیا۔ اور وَ طَآئِفَةٌ میں واؤ حالیہ ہے اور بمعنی اذ ہے۔ یعنی اذ طائفۃٌ یظنّون جبکہ ایک جماعت بدگمانی کرنے لگی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا امر باطل ہے اور یہ کہ ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ ظَنَّ الجاھلیۃ یعنی اہل جاہلیت کی بدگمانی۔ اور اس سے مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے۔

یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ اس میں لفظ استفہام ہے اور اس کا معنی انکار ہے، یعنی ما لنا شئ من الامر، (ہمارا اس کام میں کوئی دخل نہیں) یعنی خروج کے معاملہ میں، بلاشبہ ہمیں تو بالاکراہ نکالا گیا ہے، اور اس پر ان کی طرف سے بطور خبر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دلالت کرتا ہے: لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی سے) نہ مارے جاتے۔) حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس دن ہم پر نیند طاری کر دی گئی، اور میں معتب بن قشیر کا قول سن رہا تھا حالانکہ مجھ پر نیند غالب آرہی تھی وہ کہہ رہا تھا: اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا تو ہم یہاں (اس بے دردی کے ساتھ) نہ مارے جاتے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس کے قول کا معنی یہ ہے ہمیں اس کامیابی میں سے کچھ حاصل نہیں ہوا جس کا وعدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ابو عمرو اور یعقوب نے کُلُّہٗ رفع کے ساتھ پڑھا ہے اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور لِلّٰهِ اس کی خبر ہے۔ اور پھر پورا جملہ اس کی خبر ہے۔ اور یہ اس قول کی طرح ہے: وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تَرَى الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ (الزمر: 60) (اور روز قیامت آپ دیکھیں گے انہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اس حال میں کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے)

اور باقیوں نے اسے نصب کے ساتھ پڑھا ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: ان الأمر اجمع للہ، اور یہ تاکید ہے اور یہ احاطہ اور عموم میں اجمع کے معنی میں ہے، اور اجمع حرف توکید کے لئے ہی ہوتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ امر کی صفت ہے اور اخفش نے کہا ہے: یہ بدل ہے یعنی مدد و نصرت اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اس کی مدد کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے رسوا کر دیتا ہے، اور جو یبر نے ضحاک سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس سے مراد تقدیر کو جھٹلانا ہے (2) اور یہ اس لئے کہ انہوں نے اس بارے میں کلام کیا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ یعنی اچھی اور بری تقدیر سب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یُخْفُوْنَ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ یعنی وہ چھپائے ہوئے ہیں اپنے دلوں میں شرک، کفر اور تکذیب۔ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ وہ جو تمہارے لئے ظاہر نہیں کرتے۔ یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا یعنی (اگر ہمارا اس کام میں کچھ دخل ہوتا) تو ہماری جماعت قتل نہ کی جاتی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: منافقین کہتے اگر ہماری عقل ہوتی تو ہم اہل مکہ کے ساتھ جنگ کے لئے نہ نکلتے، اور نہ ہمارے سردار قتل کئے جاتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ جواب لوٹایا اور کہا: قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِكُمْ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 568　2۔ ایضاً، صفحہ 569

لَبَرَزَ آپ فرمایئے: اگر تم اپنے گھروں میں (بیٹھے) ہوتے تو (وہاں سے) ضرور نکل آتے (وہ لوگ) الَّذِیۡنَ کُتِبَ جن کے بارے لکھا جا چکا ہے (یعنی جن کا مقدر بنا دیا گیا ہے) علیھم القتل، قتل یعنی لوح محفوظ میں۔ الی مضاجعھم یعنی اپنی قتل گاہوں کی طرف۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کتب علیھم القتل یعنی ان پر قتال (جنگ) فرض کیا گیا ہے پس اسے قتل سے تعبیر کیا گیا ہے، کیونکہ اسے اس کی طرف پھیر دیا گیا ہے۔

ابو حیوہ نے لَبُرِّزَ با کے ضمہ اور را کی شد کے ساتھ پڑھا ہے بمعنی یُجعل یخرج (انہیں نکال لیا جائے گا) اور یہ بھی کہا گیا ہے: اے منافقین! اگر تم پیچھے رہ جاتے تو تم اس کے علاوہ کسی دوسرے میدان جنگ کی طرف نکل پڑتے اس میں تم قتل کر دیئے جاؤ گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ آزمالے گا جو کچھ سینوں میں چھپا ہوا ہے اور اسے مومنین کے لئے ظاہر کر دے گا۔

اور قول باری تعالیٰ وَ لِیَبۡتَلِیَ میں واؤ مقحمہ ہے جیسا کہ اس قول میں ہے: وَ لِیَکُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ یعنی لیکون۔ اور اس فعل کو حذف کر دیا گیا ہے جو لام کَیۡ کے ساتھ ہے۔ اور تقدیر عبارت ہے وَ لِیَبۡتَلِیَ اللّٰہُ مَا فِیۡ صُدُوۡرِکُمۡ وَ لِیُمَحِّصَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ اللہ تعالیٰ نے تم پر قتال اور جنگ مقدر کر دی ہے اور احد کے دن اس نے تمہاری مدد نہیں کی تاکہ وہ تمہارے صبر کو آزمائے۔ اور تم سے تمہارے گناہ معاف کر دے اگر تم توبہ کر دو اور مخلص ہو جاؤ۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لِیَبۡتَلِیَ کا معنی ہے تاکہ وہ تمہارے ساتھ مختبر کا معاملہ کرے۔ اور بعض نے کہا ہے: تاکہ تم سے مشاہدہ واقع ہو جس کا اسے غیبا علم ہے۔ اور کہا گیا ہے: یہ مضاف کے حذف کی بنا پر ہے ورتقدیر عبارت ہے لِیَبۡتَلِیَ اولیاء اللہ تعالی۔ تاکہ وہ اولیاء اللہ کو آزمالے۔ اور تمحیص کا معنی پہلے گزر چکا ہے۔ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ یعنی سینوں میں سے جو ہے (اللہ اسے جانتا ہے) اور یہ قول بھی ہے: کہ ذات الصدور سے مراد سینے ہی ہیں، کیونکہ ذات الشئ سے مراد اس کی اپنی ذات ہی ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا ۚ وَ لَقَدۡ عَفَا اللّٰہُ عَنۡہُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۱۵۵﴾

''بے شک وہ لوگ جو پیٹھ پھیر گئے تھے تم سے اس روز جب مقابلہ میں نکلے تھے دونوں لشکر تو پھسلا دیا تھا انہیں شیطان نے بوجہ ان کے کسی عمل کے اور بے شک (اب) معاف فرما دیا ہے اللہ تعالیٰ نے انہیں یقیناً اللہ بہت بخشنے والا نہایت حلم والا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: اِنَّمَا اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا یہ جملہ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا کی خبر ہے۔ اور مراد وہ ہیں جو مشرکین سے احد کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سے یہی منقول ہے۔ حضرت سدی نے کہا ہے: مراد وہ لوگ ہیں جو ہزیمت کے وقت مدینہ طیبہ کی طرف بھاگ گئے نہ کہ وہ جو پہاڑ پر چڑھ گئے۔ اور بعض نے کہا ہے: یہ اس قوم کے ان معین افراد کے بارے ہے جو اپنی ہزیمت کے وقت میں تین دن تک حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے اور پھر لوٹ گئے۔ اور اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ کا معنی ہے شیطان نے ان کے پھسلنے کا تقاضا کیا اس طرح کہ انہیں ان کی گزشتہ خطائیں یاد دلائیں، تو وہ ثابت رہنے پر مجبور ہو گئے تاکہ وہ قتل نہ کر دیئے جائیں۔ اور بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا کا یہی معنی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: اَسْتَزَلَّهُمُ کا معنی ہے۔ اس نے انہیں پھسلاہٹ پر ابھارا، یہ باب استفعال ہے اور الزلۃ سے ماخوذ ہے۔ اور اس کا معنی خطا اور گناہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زَلَّ اور آزَلَّ دونوں کا معنی ایک ہے۔ پھر کہا گیا: انہیں اخلاص کے ساتھ توبہ کرنے سے پہلے قتال (جنگ) پر مجبور کیا گیا تو اسی وجہ سے وہ پیٹھ پھیر گئے۔ یہ پہلے قول کی بنا پر ہے۔ اور دوسرے قول کے مطابق یہ ہے کہ انہوں نے مرکز کو چھوڑ کر اور مال غنیمت کی طرف مائل ہو کر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی۔

اور حسن نے کہا ہے: مَا كَسَبُوْا (یعنی اس کے عوض) جو انہوں نے ابلیس کا قول قبول کیا جو اس نے ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا۔ اور کلبی نے کہا ہے: شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال آراستہ اور مزین کئے اور یہ قول بھی ہے کہ انہزام معصیۃ نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے مدینہ منورہ میں قلعہ بند ہونے کا ارادہ کیا، پس دشمن نے ان میں اپنا طمع اور حرص ختم کر دی جب انہوں نے یہ سن لیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ کہا جانا بھی جائز ہے کہ انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پکار کو اس خوف کی وجہ سے سنا ہی نہیں جس خوف اور ڈر میں وہ مبتلا تھے۔ اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ دشمن کی تعداد کئی گناہ زیادہ تھی۔ کیونکہ وہ سات سو تھے اور دشمن کی تعداد تین ہزار تھی۔ اور ایسی حالت میں بھاگنا جائز ہوتا ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھاگنا خطا اور گناہ ہے جو جائز نہیں ہے۔ اور شاید انہیں یہ وہم بھی ہو گیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہاڑ کی طرف چلے گئے۔ ان میں سے پہلا قول احسن ہے۔ المختصر اگر معاملہ کو ثابت شدہ گناہ پر محمول کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما دیا ہے۔ اور اگر اسے انہزام جائز پر محمول کیا جائے تو آیت ان کے بارے میں ہے جو ہزیمت سے بہت دور ہیں اور اتنی مقدار پر زائد ہے جو جائز قرار دی گئی ہے۔ ابو اللیث سمرقندی نصر بن محمد بن ابراہیم نے کہا ہے: خلیل بن احمد، سراج، قتیبہ، ابو بکر بن غیلان نے جریر سے نقل کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مابین گفتگو ہوئی، تو حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے انہیں کہا: کیا تم مجھے برا بھلا کہتے ہو حالانکہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، اور میں نے درخت کے نیچے بیعت کی تھی (یعنی بیعت رضوان میں میں حاضر تھا۔) اور تم نے بیعت نہیں کی۔ اور احد کے دن تم نے بھی پیٹھ پھیرنے والوں کے ساتھ پیٹھ پھیر لی تھی۔ تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انہیں جواب دیتے ہوئے فرمایا: جہاں تک تمہارا یہ قول ہے کہ میں بدر میں حاضر تھا اور تم حاضر نہ تھے، تو میں کسی ایسے کام سے غائب نہیں ہوا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضر ہوئے ہوں، مگر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی بیمار تھی اور میں ان کے پاس ان کی تیمارداری کے لئے رہا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مسلمانوں کے حصص کے ساتھ برابر کا حصہ دیا اور رہا بیعت الشجرہ کا مسئلہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے مشرکین مکہ کے پاس بطور سفیر بھیجا تھا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر مارا اور فرمایا ھذہ لعثمان یہ عثمان کے لئے ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دایاں اور آپ کا بایاں میرے دائیں اور بائیں سے میرے لئے انتہائی بہتر ہے اور رہا یوم الجمع (احد کا دن) تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ تو میں بھی ان میں شامل ہو گیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا۔ نتیجتاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دلیل سے غالب آ گئے۔ (1)

1۔ صحیح بخاری، کتاب فضائل صحابہ، باب مناقب عثمان بن عفان، جلد 1 صفحہ 523، اسلام آباد

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ معنی صحیح ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے انہوں نے بیان کیا: عبدان، ابوحمزہ نے عثمان بن موہب سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: ایک آدمی آیا اور اس نے بیت اللہ شریف کا حج کیا تو اس نے ایک قوم کو وہاں بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس نے پوچھا: یہ بیٹھنے والے لوگ کون ہیں؟ تو لوگوں نے بتایا: یہ قریش ہیں۔ اس نے پوچھا: شیخ کون ہے؟ انہوں نے بتایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، پس وہ ان کے پاس آیا اور کہا: میں ایک شے کے بارے تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا مجھے بتاؤ گے؟ اس نے کہا: میں تجھے اس گھر کی حرمت کی قسم دیتا ہوں، کیا تم یہ جانتے ہو کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ احد کے دن فرار ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ پھر اس نے کہا: کیا آپ ان کے بارے یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بدر کے دن بھی میدان سے غائب تھے وہ اس میں حاضر نہیں ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

پھر اس نے پوچھا: کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ بیعت رضوان سے بھی پیچھے رہ گئے اور اس میں حاضر نہ ہوئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ راوی نے کہا: پس اس آدمی نے نعرہ تکبیر بلند کیا، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آؤ میں تجھے بتاؤں اور جن امور کے بارے تو نے مجھ سے سوال کیا ہے میں تیرے لئے اس کی وضاحت کردوں، جہاں تک احد کے دن آپ کے فرار کا تعلق ہے تو میں یہ شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرما دیا ہے اور رہا بدر سے ان کے غائب ہونے کا معاملہ! تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھی اور وہ بیمار تھیں تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا: اِنَّ لک اَجرَ رجل ممن شَھِدَ بدرا و سھمہ (بلاشبہ تمہارے لئے اس آدمی کے برابر اجر اور (مال غنیمت سے) حصہ ہے جو غزوہ بدر میں حاضر ہوئے۔) اور جہاں تک بیعت رضوان سے غائب ہونے کا تعلق ہے (تو اس کی وجہ یہ ہے) کہ اگر بطن مکہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے زیادہ عزت والا کوئی موجود ہوتا تو یقینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی جگہ اسے بھیجتے، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ مکرمہ کی طرف جانے کے بعد بیعت رضوان ہوئی، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں ہاتھ کے بارے میں فرمایا ھذہ ید عثمان یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے دوسرے ہاتھ پر مارا اور فرمایا: ھذہ لعثمان یہ بیعت عثمان کے لئے ہے۔ اب اسے تو اپنے ساتھ لے جا۔ (1)

میں (مفسر) کہتا ہوں: اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول کرنا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے فحج آدم موسیٰ۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام دلیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل کھانے کے سبب اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جنت سے نکالنے پر زجر و توبیخ اور ملامت کریں، تو حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں فرمایا: کیا تم مجھے ایسے کام پر ملامت کرتے ہو جسے اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس سال پہلے میرا مقدر بنا دیا تھا (2) اور اللہ تعالیٰ نے میری توبہ قبول فرمائی ہے اور جس

1۔ صحیح بخاری کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 581، اسلام آباد

2۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلم اللہ موسیٰ تکلیما، جلد 2، صفحہ 119، اسلام آباد۔ مسلم کتاب القدر، باب تحاج آدم موسیٰ، جلد 2، صفحہ 335، کراچی

ایضاً صحیح بخاری، کتاب القدر، حدیث نمبر 6124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کی توبہ قبول ہو جائے تو اس کا کوئی گناہ نہیں ہوتا اور جس کا کوئی گناہ نہ ہو تو اسے ملامت نہیں کی جا سکتی، اور اسی طرح وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ معاف فرما دے اور بلاشبہ وہ یہ ہے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور اس کی خبر سچی ہے۔ اور ان دو کے سوا توبہ کرنے والے گنہگار اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے بھی ہیں، پس وہ اس پریشانی اور خوف میں ہوتے ہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ کی جائے، اور اگر قبول کر لی جائے تو بھی خوف ان پر غالب ہوتا ہے کیونکہ انہیں اس کے بارے علم نہیں ہوتا۔ فاعلم۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١٥٦﴾

''اے ایمان والو! نہ ہو جاؤ ان لوگوں کی طرح جنہوں نے کفر اختیار کیا اور جو کہتے تھے اپنے بھائیوں کو جب وہ سفر کرتے کسی علاقہ میں یا ہوتے تھے جہاد کرنے والے کہ اگر وہ ہوتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے تاکہ بنائے اللہ تعالیٰ اس (خیال باطل) کو حسرت (کا باعث) ان کے دلوں میں اور (درحقیقت) اللہ ہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو دیکھ رہا ہے۔''

قولہ تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا امراد منافقین ہیں۔

وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ یعنی جو نفاق میں یا نسب میں (ان کے بھائی تھے) اور ان سرایا میں گئے جنہیں حضور نبی مکرم ﷺ نے بئر معونہ کی طرف بھیجا (انہیں کہتے تھے) لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا (اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے) تو اس میں مسلمانوں کو ان کی مثل قول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد إِذَا ضَرَبُوا یہ زمانہ ماضی کے لئے ہے، یعنی اذ ضربوا، (جب انہوں نے سفر کیا) کیونکہ کلام میں شرط کا معنی ہے اس حیثیت سے کہ الَّذِينَ مبہم غیر موقت ہے، پس إِذَا، إِذْ کے محل میں واقع ہے۔ جیسا کہ ماضی جزا میں مستقبل کے محل میں واقع ہوتی ہے۔ اور ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ کا معنی ہے انہوں نے زمین میں سفر کیا اور تجارت یا دیگر کاموں کے لئے چلے اور مر گئے۔ أَوْ كَانُوا غُزًّى یا وہ جہاد میں گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ اور الغزّی جمع منقوص ہے اس کا لفظ حالت رفعی اور جری میں تبدیل نہیں ہوتا، اور ان کا واحد غاز ہے، جیسا کہ راکع کی جمع رُكَّع، صائم کی جمع صُوَّم، نائم کی جمع نُوَّم، شاہد کی جمع شُهَّد، اور غائب کی جمع غُيَّب ہے۔ اور جمع میں غُزَاةٌ بھی جائز ہے جیسا کہ قُضَاةٌ اور غُزَّاء مد کے ساتھ بھی مثلاً ضُرَّاب اور صوام اور کہا جاتا ہے: غَزِيٌّ، الغزاۃ کی جمع ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

قل للقوافل والغزِيّ اذا غزوا

اس میں الغزِيّ الغزاۃ کی جمع کے طور پر مذکور ہے۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے غُزًى تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور اَلْمُغْزِيَةُ ایسی عورت جس کا خاوند جہاد پر ہو۔

اور اَتَانٌ مُغْزِيَةٌ یعنی ایسی گدھی جس کا بچہ مؤخر ہو جائے (پیچھے ہو جائے) اور پھر اسے نکالا جائے۔ اور اَغْزَتِ النَّاقَةُ جب اس کی جان تنگ ہو جائے۔ اور اَلْغَزْوُ کا معنی ہے کسی شے کا قصد و ارادہ کرنا۔ اور المَغْزٰی سے مراد مقصد ہے۔ اور غزو کی طرف نسبت کی وجہ سے غَزَوِیٌّ کہا جاتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ یعنی ان کے گمان اور ان کے قول کو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں باعث حسرت بنا دے۔ اور لام قول باری تعالیٰ قَالُوْا کے متعلق ہے۔ یعنی تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے گمان کو بنا دے کہ اگر وہ نہ نکلتے تو قتل نہ کیے جاتے حَسْرَةً اس کا معنی ندامت ہے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ اور حسرت کا مفہوم ہے کھو جانے والی شے پر اظہار افسوس کرنا جس تک پہنچنا مقدر نہ ہو۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فواحسرتی لم اقض منها لُبانتی و لم اتمتّع بالجوار و بالقُرْب

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ محذوف سے متعلق ہے اور معنی ہے تم ان کی مثل نہ ہو جاؤ۔

تاکہ اللہ تعالیٰ بنائے اس قول کو ان کے دلوں میں (باعث) حسرت کیونکہ ان کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے اور یہ قول بھی ہے اس کا معنی ہے تم ان کی تصدیق نہ کرو اور نہ تم ان کی طرف متوجہ ہو، پس یہی ان کے دلوں میں حسرت ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: ''تاکہ اللہ تعالیٰ اسے ان کے دلوں میں حسرت بنائے قیامت کے دن کیونکہ اس دن وہ رسوائی اور ندامت میں ہوں گے اور اس دن مسلمان نعمتوں اور کرامت میں ہوں گے۔ قولہ تعالیٰ: وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ یعنی اللہ تعالیٰ ہی اس پر قدرت رکھتا ہے کہ وہ اسے زندہ رکھے جو جنگ کے لئے نکلتا ہے اور اسے مار دے جو اپنے اہل خانہ میں مقیم اور ٹھہرا ہوا ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اسے یا اور تا دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہو جانا اور اس میں مر جانا تمام دنیا سے بہتر ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

''اور واقعی اگر تم قتل کیے جاؤ راہ خدا میں یا تم مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت (جو تمہیں نصیب ہوگی) بہت بہتر ہے اس سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو اللہ کے حضور جمع کیے جاؤ گے۔''

جواب الجزاء محذوف ہے، اور یہ جواب قسم کے سبب اس سے مستغنی ہے اور جواب قسم اس قول میں ہے: لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ اور جواب قسم کے سبب مستغنی ہونا اولیٰ اور بہتر ہے، کیونکہ اس کے لئے صدر کلام (ضروری) ہے، اور اس کا معنی ہے۔ لِيَغْفِرَنَّ لكم وہ ضرور بہ ضرور تمہاری مغفرت فرما دے گا۔

اور اہل حجاز کہتے ہیں: مِتُّمْ میم کے کسرہ کے ساتھ جیسا کہ نِمْتُمْ ہے۔ یہ مَاتَ يَمَاتُ سے ماخوذ ہے جیسا کہ خفتُ يَخَافُ ہے۔ اور سُفلی مُضَر کہتے ہیں: مُتُّمْ، یہ میم کے ضمہ کے ساتھ ہے جیسا کہ صُمْتُمْ اور یہ مات یموت سے ماخوذ ہے۔ جیسا کہ

تیرا قول: کان یکون اور قال، یقول۔ یہ کوفیوں کا قول ہے۔ اور یہ اچھا ہے۔ اور قولہ تعالیٰ: لَاِ۟لَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ یہ وعظ و نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قول کے ساتھ نصیحت کی ہے، یعنی تم جنگ سے بھاگو نہیں اور نہ اس سے جس کے بارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے، بلکہ تم اس کی سزا اور اس کے دردناک عذاب سے بھاگو، کیونکہ تمہیں اس کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے سوا کوئی بھی تمہارے لئے نہ نقصان اور ضرر کا مالک ہے اور نہ ہی نفع کا۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾

''پس (صرف) اللہ کی رحمت سے آپ نرم ہو گئے ہیں ان کے لئے اور اگر ہوتے آپ تندمزاج سخت دل تو یہ لوگ منتشر ہو جاتے آپ کے آس پاس سے تو آپ درگزر فرمایئے ان سے اور بخشش طلب کیجئے ان کے لئے اور صلاح مشورہ کیجئے ان سے اس کام میں اور جب آپ ارادہ کرلیں (کسی بات کا) تو پھر توکل کرو اللہ پر بے شک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے توکل کرنے والوں سے۔''

ما صلہ ہے اس میں تاکید کا معنی ہے، ای فبرحمة، جیسا کہ اس قول میں ہے: عَمَّا قَلِيْلٍ۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ۔ اور یہ علی الاطلاق زائدہ نہیں ہے، بلکہ اس پر زائدہ ہونے کا اطلاق سیبویہ نے کیا ہے اس حیثیت سے کہ اس کا عمل زائل ہو چکا ہے۔ ابن کیسان نے کہا ہے: ما نکرہ ہے اور با کے سبب محل جر میں ہے وَرَحْمَةٍ اس سے بدل ہے۔ اور آیت کا معنی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب احد کے دن پیٹھ پھیرنے والوں سے نرمی کی اور ان سے کوئی سختی نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ آپ نے یہ رویہ اللہ تعالیٰ کی خاص عطا کردہ توفیق کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مَا استفہامیہ ہے اور معنی یہ ہے: پس کتنی رحمت ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کہ آپ ان کے لئے نرم ہو گئے ہیں، تو یہ بطور تعجب ہے۔ اور اس میں حقیقت سے دوری ہے، کیونکہ اگر اس طرح ہوتا تو یہ فَبِمَ بغیر الف کے ہوتا۔ لِنْتَ یہ لَانَ يَلِيْنُ لِيْنًا وَلَيَانًا فتحہ کے ساتھ سے ماخوذ ہے۔ اور الْفَظُّ الْغَلِيْظُ کا معنی ہے خشک مزاج۔ فَظِظْتَ تَفَظُّ فَظَاظَةً و فِظَاظًا فانت فَظٌّ۔ (تو تندخو ہے) اس کی مونث فَظَّةٌ ہے اور جمع اَفْظَاظٌ ہے۔ اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں سے یہ ہیں کہ نہ آپ تندخو ہیں، نہ سخت دل اور نہ ہی بازاروں میں ساتھیوں کے ہمراہ بیٹھنے والے ہیں۔ (1)

مفضل نے اشعار کہے ہیں جن سے فظ کے مذکر ہونے کا ثبوت ملتا ہے:

و ليس بفَظٍّ في الأدانى والأولى	يؤمُّونَ جدْوَاهُ ولكنه سَهْلُ
و فَظٌّ على أعدائه يَحْذَرُوْنَهُ	فَسَطْوَتُهُ حَتْفٌ وَ نَائِلُه جَزْلُ

1۔ صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث نمبر 1981، ایضاً، کتاب التفسیر، حدیث نمبر 4461، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں لفظ فظٌّ دونوں جگہ مذکر ذکر ہوا ہے۔

اور ایک دوسرے شاعر نے اس کے مونث ہونے کے بارے کہا ہے:

أموت من الضُّرِ فی منزلی و غیری یموت من الکِظَّة

و دُنْیا اتجودُ علی الجاهلین و هی علی ذِی النُّهی فَظَّه

اس میں لفظ فظّہ مونث ذکر کیا گیا ہے۔

اور غِلَظُ القلب سے مراد چہرے پر تیوری چڑھانا ہے (اور کرخت چہرے کے ساتھ کسی کی طرف متوجہ ہونا ہے) رغائب سے بہت کم متاثر ہونا اور شفقت و رحمت کا بہت کم ہونا ہے۔

اور اسی کے بارے شاعر کا قول ہے:

یُبْکَی عَلَیْنَا ولا نَبْکِی علی أحَدٍ لنحن أغْلَظُ اکبادًا من الابل

ہم پر رویا جائے گا اور ہم کسی پر نہیں روئیں گے یقیناً ہم اونٹ سے زیادہ سخت دل ہیں۔

اور لَا نْفَضُّوْا کا معنی ہے لتفرقوا، (تو وہ بکھر جاتے) فضضتهم فانفضوا، یعنی میں نے انہیں منتشر کیا پس وہ منتشر ہو گئے، اور اسی بارے میں ابوالنجم کا قول ہے۔

وہ اونٹ کا وصف بیان کرتا ہے:

مستعجلات القیض غیر جُرد ینفَضُّ عنهن الحَصَی بالصُّمْد

الفض کا اصل معنی توڑنا ہے، اور اسی سے ان کا یہ قول ہے: لا یَفْضُضِ الله فَاكَ۔

(اللہ تیرے منہ کو سلامت رکھے "یعنی نہ توڑے") اور اس کا معنی ہے: اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ کی نرمی نہ ہوتی تو حیا (خجالت) اور خوف انہیں تمہارے قریب آنے سے روکتا اس کے بعد کہ وہ پیٹھ پھیر چکے تھے۔

قولہ تعالیٰ: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ علماء نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کاموں کا حکم فرمایا ہے جو انتہائی تدریج کے ساتھ اور آہستہ آہستہ ہیں۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم فرمایا کہ آپ انہیں معاف فرما دیں جو خاص کر آپ کو تبعین کی طرف سے اذیت پہنچی ہے، پس جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اس فعل کے بارے مغفرت طلب کریں جو تبعین سے صادر ہوا، جب وہ اس درجہ میں ہو گئے تو وہ اس اہل ہو گئے کہ امور میں ان سے مشورہ لیا جائے، اہل لغت نے کہا ہے: الاستشارۃ عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے: شُرتُ الدابة و شوّرتها جب تو اس کے بارے دوڑنے وغیرہ کی خبر جان لے۔ اور وہ جگہ جس میں گھوڑے دوڑتے ہیں اسے مشوار کہا جاتا ہے۔ اور کبھی ان کے اس قول سے ہوتا ہے: شُرت العسل واشتَرْتُه فهو مَشُور و مُشْتار جیسا تو اسے اپنی جگہ سے لے لے، عدی بن زید نے کہا ہے:

فی سَمَاعٍ یَأذَنُ الشَّیخُ لہ　　وحدیثٍ مثلِ مَا ذِیّ مُشَار

اس میں مشار مذکور معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: شوریٰ (مشاورت) قواعد شریعت اور پختگی احکام میں سے ہے، جو اہل علم اور اہل دین سے مشاورت نہیں کرتا تو اس کا معزول ہونا واجب ہے۔ یہ ایسا حکم ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد سے مومنین کی مدح اور تعریف کی ہے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ۔

اعرابی نے کہا ہے: ما غُبِنْتُ قَطُّ حتی یُغْبَنَ قومی، (مجھ سے کبھی غبن اور دھوکہ نہیں کیا گیا مگر یہ کہ میری قوم سے دھوکہ کیا جائے۔) کہا گیا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو اس نے کہا: میں کوئی کام بھی نہیں کرتا یہاں تک کہ میں ان سے مشاورت کر لوں۔ اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: حکمرانوں پر علماء سے ان معاملات میں مشورہ کرنا واجب ہے جنہیں وہ نہیں جانتے اور امور دین میں سے جن میں انہیں مشکل درپیش ہو اور فوجی ماہرین سے ان امور میں جو جنگ سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگوں کے سرداروں سے ان امور میں سے جو مصالح سے تعلق رکھتے ہیں اور کتاب، وزراء اور عمال کے سربراہوں سے ان امور میں جو شہروں کے مصالح، منافع اور ان کی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے: ماندم من استشار (جس نے مشاورت کی وہ نادم اور شرمندہ نہیں ہوا) اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جو اپنی رائے پر اترایا وہ گمراہ ہو گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ یہ آیت کاموں میں اجتہاد اور امکان وحی کے ساتھ ظنوں کو لینے کے جواز پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں اجازت عطا فرمائی ہے اور اہل تاویل نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ وہ اس میں اپنے اصحاب سے مشاورت کریں، پس ایک گروہ نے کہا ہے: یہ جنگوں کی تدبیر کے بارے میں ہے، دشمن کے ساتھ آمنا سامنا ہونے کے وقت کے بارے ہے اور اپنے نفوس کو مطمئن اور پاکیزہ رکھنے کے لئے اور اپنی اقدار کو بلند کرنے کے لئے اور اپنے دین پر جمع کرنے کے لئے (مشاورت ہے) اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ساتھ آپ کو ان کی رائے سے غنی کر دیا ہے۔ یہ حضرت قتادہ، ربیع، ابن اسحاق، اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم سے مروی ہے۔ امام شافعی نے کہا ہے: یہ اس قول کی طرح ہے والبکر تُستامَرُ (باکرہ عورت سے اس کے دل کی پاکیزگی کے لئے اجازت لی جائے گی)۔ (مشاورت کی جائے گی۔) یہ اس لئے نہیں کہ یہ واجب ہے۔ اور مقاتل، قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: عربوں کے سرداروں سے جب کسی معاملہ میں مشاورت نہ کی جاتی تو وہ ان پر شاق اور گراں گزرتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے معاملات میں مشاورت کریں، کیونکہ یہ ان کے لئے انتہائی مہربانی اور کرم ہے اور ان کے حسد و کینہ کو بہت دور کرنے والا ہے (1) اور ان کے دلوں کو پاک کرنے والا ہے۔ پس جب آپ ان سے مشاورت کریں گے تو وہ اپنے لئے آپ کی عزت و تکریم کو پہچان جائیں گے۔ اور دوسروں نے کہا ہے: یہ اس بارے میں ہے جس میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو۔ حضرت حسن بصری اور ضحاک رضی اللہ عنہما سے یہی

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی المشورۃ، جلد 2، صفحہ 343، اسلام آباد

مروی ہے، ان دونوں نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاورت کا حکم اس لئے نہیں دیا کہ آپ کو ان کی رائے کی حاجت اور ضرورت ہے (1)، بلکہ مراد یہ ہے کہ آپ انہیں مشاورت کی فضیلت سے آگاہ فرمائیں اور تا کہ آپ کے بعد آپ کی امت اس کی اقتدا اور پیروی کرے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ہے: وَ شَاوِرْهُمْ فِی بعض الأمر (اور آپ بعض معاملات میں ان سے مشاورت کریں۔)

اور کسی کہنے والے نے کتنا اچھا کہا ہے:

شاوِر صدیقک فی الخفیّ المشکل واقبلْ نصیحۃَ ناصحٍ متفضلِ

مشکل اور مخفی کاموں میں اپنے دوست سے مشورہ کر اور مہربان نصیحت کرنے والے کی نصیحت کو قبول کر۔

فاللہ قد اوصَی بذاکَ نبیّہ فی قولہٖ شَاوِرْھُمْ وَ توکّل

پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیحت فرمائی ہے اپنے اس ارشاد میں کہ آپ ان سے مشاورت کریں، اور توکل اختیار کریں۔

مسئلہ نمبر 4۔ مصنف ابی داؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المستشار مؤتمنٌ (2) جس سے مشورہ لیا جائے اسے اس پر امین بنایا جاتا ہے۔ علماء نے کہا ہے: مستشار کی تعریف یہ ہے کہ اگر مشورہ احکام کے بارے میں ہو تو وہ عالم اور دیندار ہو اور سوائے عاقل کے ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ حسن نے کہا ہے: کسی آدمی کا دین مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کی عقل مکمل نہ ہو۔ اور جب اس سے مشورہ لیا جائے تو اس صفت سے متصف ہو اور وہ اصلاح کی پوری کوشش کرے اور وہ اپنی جدوجہد اور صلاحیت صرف کرے اور پھر اشارۃً خطا واقع ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔ خطابی وغیرہ نے یہی کہا ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ دنیوی امور میں مستشار کی تعریف یہ ہے کہ وہ عاقل ہو، تجربہ کار ہو اور مشورہ طلب کرنے والے سے محبت کرنے والا ہو۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

شاور صدیقَک فی الخفِی المُشْکل

(تو مشکل اور مخفی کام میں اپنے دوست سے مشورہ کر۔) اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

اور دوسرے نے کہا ہے:

و اِنْ بَابٌ اَمرٍ علیکَ التویٰ فَشَاوِرْ لبیبًا و تعصِہٖ

اور اگر کسی کام کا دروازہ تجھ پر بند ہو جائے تو کسی دانا اور عقلمند سے مشورہ کر لے اور تو اس کی نافرمانی نہ کر۔

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 572، دار فکر بیروت

2۔ جامع ترمذی، کتاب الاستیذان والآداب، باب ان المستشار مؤتمن، حدیث 2747، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

اور مشاورت برکت ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما ندم من استشار ولا خاب من استخار (وہ نادم نہ ہو گا جس نے مشورہ کیا اور وہ خائب و خاسر نہ ہوگا جس نے استخارہ کیا۔) اور حضرت سہل بن سعد الساعدی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے: ''کوئی بندہ کبھی مشورہ کے سبب شقی اور بدبخت نہیں ہوا اور کوئی رائے کے استغنا کے ساتھ سعید اور خوش بخت نہیں ہوا۔'' اور بعض نے کہا ہے: اس سے مشاورت کر جو امور کا تجربہ رکھتا ہو، کیونکہ وہ تجھے اپنی ایسی رائے دے گا جو اس پر انتہائی مہنگی واقع ہوگی اور تو اسے مفت حاصل کرلے گا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کے لئے مجلس شوریٰ مقرر فرمائی، حالانکہ یہ بہت بڑا اور اہم مسئلہ تھا۔ امام بخاری نے بیان کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ائمہ کرام اہل علم امناء سے امور مباحہ میں مشاورت کرتے تھے تاکہ آسانی اور سہولت کے ساتھ وہ ان پر عمل پیرا ہو سکیں (1)۔ حضرت سفیان ثوری نے بیان کیا ہے: چاہیے کہ تمہارے مشیر متقی اور امانتدار ہوں اور ایسے ہوں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں۔ اور حسن نے کہا ہے: قسم بخدا! جو قوم آپس میں مشورہ کرتی ہے تو جو وہاں حاضر ہوتے ہیں وہ ان کی راہنمائی افضل کی طرف کر دیتے ہیں۔ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کوئی قوم نہیں جن کا مشورہ ہو اور ان کے ساتھ احمد یا محمد نامی آدمی بھی حاضر ہو اور وہ اسے اپنے مشورہ میں شامل کریں مگر اسے ان کے لئے پسند کر لیا جائے گا۔''

مسئلہ نمبر 6۔ شوریٰ کی بنیاد اختلاف آراء پر ہے اور مشورہ لینے والا اس اختلاف میں غور و فکر کرتا ہے اور ایسے قول کو دیکھتا ہے جو کتاب و سنت کے زیادہ قریب ہو اگر اس کے لئے ممکن ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ اس میں سے جہاں تک چاہے راہنمائی فرما دے تو وہ اس پر پختہ ہو جائے اور اسے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے نافذ کر دے، کیونکہ مطلوب تک پہنچنے کی یہی انتہائی کوشش ہے اور اس آیت میں اسی کے بارے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے۔

مسئلہ نمبر 7۔ قولہ تعالیٰ: فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ارشاد فرمایا کہ جب آپ کسی کام کا ارادہ کریں تو اس میں لگ جائیں اور اللہ تعالیٰ پر توکل کریں، نہ کہ آپ ان کی مشاورت کا ارادہ کریں۔ اور عزم سے مراد ایسا امر ہے جس میں خوب غور و فکر کی گئی ہو اور اسے مہذب بنا دیا گیا ہو، وہ بغیر نظر و فکر کے صرف رائے سے عزم نہیں بن سکتا، مگر عرب کے بہادروں کے بارے طویل قصائد کے قطعہ میں۔

جیسا کہ کسی نے کہا:

اذا هم القى بين عينيه عزمه و نكب من ذكر العواقب جانبا

جب وہ قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے اور ہم انجام کے ذکر کو ایک جانب ڈال دیتے ہیں۔

و لم يستشر فى رأيه غير نفسه و لم يرض الا قائم السيف صاحبا

اور وہ اپنی رائے میں اپنے سوا کسی سے مشورہ نہیں کرتا اور تلوار اٹھانے والے کے سوا کسی ساتھی سے راضی نہیں ہوتا۔

اور نقاش نے کہا ہے: العزم اور الحزم دونوں کا معنی ایک ہے، حاء کو عین سے بدلا گیا ہے۔

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنہ، جلد 2، صفحہ 1095، اسلام آباد

ابن عطیہ نے کہا ہے: یہ خطا ہے، اور حزم سے مراد کسی کام میں عمدہ اور گہری غور و فکر کرنا اور اس کی کانٹ چھانٹ کرنا (یعنی مہذب بنانا) ہے اور اس میں خطا سے بچنا اور احتیاط کرنا ہے۔

اور العزم سے مراد کام کرنے کا قصد کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ پس مشاورت اور جو اس کے معنی میں ہے وہ حزم ہے اور عرب کہتے ہیں: قد أَحْزِمُ لو أَعْزِمُ (میں احتیاط برتوں گا اگر میں قصد کروں گا) اور امام جعفر الصادق اور جابر بن عبداللہ نے فَإِذَا عَزَمْتُ تا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عزم کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ذات کی طرف کی ہے کیونکہ وہی اس کی ہدایت اور توفیق عطا فرمانے والا ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے: وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ (الانفال: 17) (اور اے محبوب!) نہیں پھینکی آپ نے (وہ مشت خاک) جب آپ نے پھینکی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔)

اور کلام کا معنی ہے یعنی میں نے آپ کا قصد کیا ہے اور میں نے آپ کو توفیق دی ہے اور میں نے آپ کی راہنمائی کی ہے فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (سو آپ اللہ تعالیٰ پر توکل کیجئے) اور باقیوں نے تا کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ مہلب نے کہا ہے: اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کے حکم سے اس کی پیروی کی ہے اور فرمایا ہے: ''کسی نبی کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اپنے ہتھیار پہننے کے بعد پھر انہیں اتارے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ فرما دے (1)'' یعنی اس کے لئے مناسب نہیں کہ جب وہ عزم کر لے تو پھر اس سے پھر جائے، کیونکہ اس سے اس توکل کو توڑنا لازم آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزیمت کے ساتھ شرط قرار دیا ہے۔

پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہتھیار پہننے کا اشارہ احد کے دن نکلنے کی طرف ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کے ساتھ مشرف و مکرم فرمایا اور وہ مومنین صلحاء تھے جو غزوہ بدر میں حاضر نہ ہو سکے تھے: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ ہمارے دشمن کی طرف نکلئے، یہ عزیمت پر دال ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قعود (مدینہ منورہ میں ہی رہنے) کا اشارہ کیا اور اسی طرح عبداللہ بن ابی نے بھی اسی کا اشارہ دیا اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہیں مقیم رہئے اور لوگوں کے ساتھ ان کی طرف نہ نکلئے، پس اگر وہ ٹھہر گئے تو وہ بری مجلس کے ساتھ ٹھہریں گے اور اگر وہ ہماری طرف مدینہ طیبہ میں آئے تو ہم فناؤں اور گلیوں کے دھانوں پر ان سے جنگ لڑیں گے اور عورتیں اور بچے ٹیلوں پر چڑھ کر ان پر پتھر پھینکیں گے، قسم بخدا! اس شہر میں دشمن نے کبھی بھی ہمارے ساتھ جنگ نہیں لڑی مگر ہم اس پر غالب آئے اور جب بھی ہم اس سے نکل کر دشمن کی طرف گئے تو وہ ہم پر غالب آئے۔ جن کا ذکر ہم نے کیا ہے انہوں نے اس رائے کا انکار کر دیا اور انہوں نے لوگوں کو تشجیع دلائی اور جنگ کی طرف دعوت دی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جمعہ پڑھائی اور نماز کے بعد اپنے کاشانۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور اپنے ہتھیار پہنے۔ نتیجتاً وہ قوم نادم ہوئی اور انہوں نے کہا: ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مجبور کیا ہے، پس جب آپ ہتھیار پہن کر ان کی طرف تشریف لائے تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، اگر آپ کی خواہش ہے تو یہیں ٹھہر جائیں کیونکہ ہم آپ کو مجبور کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی نبی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ جب وہ

1۔ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، جلد 2، صفحہ 1095

اپنے ہتھیار پہن لے تو پھر انہیں قتال کرنے سے پہلے اتار دے۔"(1)

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ توکل کا معنی عجز کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا ہے اور اس کا اسم التکلان ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: اتکلت علیہ فی امری (میں نے اپنے کام میں اس پر اعتماد کیا ہے) اور اس کی اصل اِوْتکلت ہے واؤ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یا سے بدلا گیا ہے، پھر یا کو تا سے بدل دیا گیا اور پھر اسے تا افتعال میں مدغم کر دیا گیا۔ اور کہا جاتا ہے: وَکَلْتُه بامری توکیلاً (میں نے اسے اپنے کام کا وکیل بنایا) اس کا اسم وَکالۃ ہے واؤ مکسور بھی ہے اور مفتوح بھی۔

علماء نے توکل کے بارے میں اختلاف کیا ہے، متصوفہ میں سے ایک گروہ نے کہا ہے: اس کا مستحق صرف وہ ہوتا ہے جس کے دل میں غیر اللہ یعنی درندے یا کسی اور شے کا خوف نہ ہو، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ضمان کی وجہ سے رزق کی تلاش میں سعی اور جدوجہد کرنا چھوڑ دے۔ اور عام فقہاء نے کہا ہے: وہ جس کا ذکر قول باری تعالیٰ: وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ کے تحت ہو چکا ہے۔ اور وہی صحیح ہے جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، حالانکہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام خوفزدہ ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے اپنے اس قول میں خبر دی ہے لَا تَخَافَا اور فرمایا ہے: فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ۝ قُلْنَا لَا تَخَفْ (طٰہ) (موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔ ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو۔) اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس قول سے خبر دی ہے: فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ قَالُوْا لَا تَخَفْ (ھود: 70) (پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں بڑھ رہے کھانے کی طرف تو اجنبی خیال کیا انہیں اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے۔ فرشتوں نے کہا ڈریئے نہیں) پس جب حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام خوفزدہ ہوئے۔ تو یہ دونوں مثالیں تیرے لئے کافی ہیں..... تو ان دونوں کے سوا کا ڈرنا تو بدرجہ اولیٰ ہے۔ اور اس معنی کا بیان آگے آئے گا۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

"اگر مدد فرمائے تمہاری اللہ تعالیٰ تو کوئی غالب نہیں آ سکتا تم پر اور اگر وہ (ساتھ) چھوڑ دے تمہارا تو کون ہے جو مدد کرے گا تمہاری اس کے بعد۔ اور صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔"

قولہ تعالیٰ: اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ یعنی تم اسی پر توکل کرو کیونکہ اگر وہ تمہاری مدد فرمائے اور تمہارے دشمن سے تمہاری حفاظت کرے تو تم ہرگز مغلوب نہ ہو گے۔ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور اگر وہ اپنا تعاون تمہارے ساتھ چھوڑ دے۔ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ یعنی اس کے بعد کوئی بھی تمہاری مدد نہ کرے گا، یعنی اس کے تمہیں چھوڑنے کے بعد، کیونکہ اس نے فرمایا ہے: وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ اور الخِذلان کا معنی ہے مدد اور تعاون چھوڑ دینا۔ اور المخذول: جسے چھوڑ دیا گیا ہو، جس کی پرواہ نہ

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 540

کی جائے۔ اور خذلت الوحشیۃ یعنی وحشی جانور چراگاہ میں اپنے بچے کے پاس ٹھہر گیا اور اس نے اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا، پس وہی خذول ہے۔

طرفہ نے کہا ہے:

خذول تُراعی رَبْرَبًا بِخَمیلۃ تناولُ اطراف البَرِیرِ و تَرتَدِی

اور یہ بھی کہا ہے:

نظرت الیك بعین جاریۃ خَذَلت صواحبها علی طِفلِ

اس نے تیری طرف جاری آنکھ کے ساتھ دیکھا اور اس نے بچے کے سبب اپنے ساتھ والے جانوروں کو چھوڑ دیا۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ مقلوب میں سے ہے، کیونکہ جب اسے چھوڑ دیا جائے تو یہ مخذولہ ہوتی ہے، اور تخاذلت رجلاہ (یہ تب کہا جاتا ہے) جب وہ دونوں (ٹانگیں) کمزور ہو چکی ہوں۔ اور کسی نے کہا: و خَذولِ الرِّجل مِن غیرِ کَسَح (آدمی کی کمزوری جو بغیر عاجزی کے ہو) اور رجل خُذَلۃ ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جو ہمیشہ ساتھ چھوڑتا رہتا ہو۔ واللہ اعلم۔

وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝١٦١

"اور نہیں ہے کسی نبی کی یہ شان کہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو لے آئے گا (اپنے ہمراہ) خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا ہر نفس کو جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"

اس میں گیارہ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب احد کے دن تیر اندازوں نے اپنے مرکز کو خالی کیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس خوف سے کہ مسلمان مال غنیمت کے والی بن جائیں گے اور انہیں کوئی شے بھی نہیں دی جائے گی، تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے بیان فرمایا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم میں زیادتی نہیں کریں گے، پس تمہارا کوئی حق نہیں ہے کہ تم انہیں متہم کرو۔ اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض غزوات میں لشکر بھیجے پھر ان کے آنے سے پہلے مال غنیمت حاصل کر لیا، پس اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا اور لشکریوں کے لئے تقسیم نہ کیا۔ (یعنی انہیں کوئی حصہ نہ دیا) تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر بطور عتاب یہ آیت نازل فرمائی: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ یعنی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ بعض کو حصہ دے اور بعض کو چھوڑ دے۔ اور اس قول کی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اور حضرت ابن عباس نے بھی، عکرمہ، ابن جبیر وغیرہم نے کہا ہے کہ یہ آیت ایک سرخ کپڑے کے سبب نازل ہوئی جو بدر کے دن مال غنیمت میں سے گم ہوا (1)، تو وہ لوگ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ان میں سے بعض نے کہا: شاید حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لے لیا ہو، پس یہ آیت نازل ہوئی اسے ابوداؤد اور ترمذی نے نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ (2)

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 574

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الحروف والقراءات، حدیث 3457، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابن عطیہ نے کہا ہے: کہا گیا ہے یہ قول مومنین کی جانب سے تھا انہوں نے یہ گمان نہیں کیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ قول منافقین کی جانب سے تھا اور یہ روایت بھی ہے کہ گم ہونے والی شے تلوار تھی۔ یہ اقوال بیان کئے جاسکتے ہیں اس بنا پر کہ قرأت یَغُلَّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہو۔

ابوصخر نے محمد بن کعب سے روایت کیا ہے وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ فرمایا: یہ آیت کہہ رہی ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ میں سے کوئی شے چھپائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں لام منقول ہے، یعنی وما کان نبیٌ لیغُل، جیسا کہ یہ ارشاد ہے: مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ ای ما کان اللہ لیتخذ ولدا (یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کہ وہ کسی کو بیٹا بنا لے۔) (تو اس میں بھی لام منقولہ ہے۔) اور یُغَلَّ یعنی یاء کے ضمہ اور غین کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ اور ابن اسکیت نے کہا ہے: [ہم نے غنیمت کے بارے میں نہیں سنا مگر غَلَّ غُلولا، اور اسی طرح بھی پڑھا گیا ہے] وما کَانَ لِنَبِيٍّ اَن يَغُلَّ وَ يُغَلَّ۔ فرمایا: يَغُلَّ کا معنی ہے یخون خیانت کرنا اور يُغَلَّ کا معنی ہے يُخَوَّنُ اور یہ لفظ دونوں معنوں کا احتمال رکھتا ہے ان میں سے ایک يُخَانُ ہے، یعنی وہ شے جو مال غنیمت سے لی جاتی ہے اور دوسرا يُخَوَّنَ ہے۔ یعنی جسے غلول کی طرف منسوب کیا جاتا ہے: پھر کہا جاتا ہے ہر وہ جس نے کوئی شے چھپ کر لے لی تو اس نے غَلَّ يَغُلُّ غُلُوْلًا کا ارتکاب کیا۔ ابن عرفہ نے کہا ہے اس کا نام غلول اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ اس سے ہاتھوں کو باندھ دیا گیا ہے، یعنی روک دیا گیا ہے۔

اور ابوعبید نے کہا ہے: الغُلُول (خیانت) مال غنیمت کے ساتھ ہی خاص ہے اور ہم اسے نہ خیانت گمان کرتے ہیں اور نہ ہی کینہ اور حقد۔ اور جو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ اسے خیانت کہا جائے وہ اَغَلَّ يُغِلُّ ہے اور اسے حقد کہا جائے اس کے لئے غَلَّ يَغِلُّ کسرہ کے ساتھ ہے، اور اسے غلول کہا جائے وہ غَلَّ يَغُلُّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور غَلَّ البَعِيْرُ بھی ہے۔ [يَغَلُّ غَلَّةً] بھی ہے جب وہ اپنا کثیر پانی پورا نہ کرے۔ اور اغل الرجل کا معنی ہے آدمی نے خیانت کی۔ النمر نے کہا ہے:

جزی اللہ عنا حَمزةَ ابنةَ نوفل جزاءَ مُغِلٍّ بالأمانة كَاذِبِ

اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے حمزہ بنت نوفل کو جزا دے (جیسا کہ) امانت میں خیانت کرنے والے جھوٹے کی جزا۔

اور حدیث طیبہ میں ہے: لا إغلالَ ولا اسلالَ(1) یعنی نہ کوئی خیانت ہے اور نہ کوئی سرقہ (چوری) ہے(2) اور کہا جاتا ہے: لا رشوۃ (اور نہ ہی کوئی رشوت ہے۔)

اور شریح نے کہا ہے: خیانت کرنے والے کے سوا کسی مستعیر (ادھار لینے والا) پر ضمان نہیں ہے۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تین (چیزیں) ہیں جن پر مومن کا دل حقد و کینہ نہیں کرتا(3)۔'' جس نے اسے فتحہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کا معنی حقد اور کینہ ہے۔ اور غَلَّ [بمعنی دخل] کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا کہا جاتا ہے:

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2385، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ احکام القرآن، جلد 1، صفحہ 300

3۔ سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک باب الخطبۃ یوم النحر، صفحہ 226، وزارت تعلیم، اسلام آباد

ایضاً، ابن ماجہ، کتاب فضائل اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم باب من بلغ علما، حدیث 225، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

غَلَّ فلان المفاوز، یعنی فلاں جنگل میں داخل ہوا اور اس کے وسط تک پہنچا۔ اور غَلَّ من المغنم غلولا، یعنی اس نے مال غنیمت میں خیانت کی۔ اور غل الماء بین الأشجار (تب کہا جاتا ہے) جب پانی درختوں میں داخل ہو جائے (جاری ہو جائے)، ان تمام میں یَغُلّ غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: الغُلُول کا لغوی معنی یہ ہے کہ وہ مال غنیمت سے کوئی شے لے لے اور اسے اپنے ساتھیوں سے چھپا لے اور اسی سے تغلغل الماء فی الشجر بھی ہے جبکہ پانی اس میں داخل ہو جائے اور الغلل کا معنی درخت کی جڑوں میں جاری پانی ہے، کیونکہ وہ درختوں کو چھپانے اور ڈھانپنے والا ہوتا ہے۔

جیسا کہ کسی نے کہا ہے:

لعب السُّيُول به فأصبح ماؤه　　غَلَلاً يُقطِّع فی اصول الخِروع

اور اس سے غِلالہ اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کے نیچے پہنا جاتا ہے اور الغالّ، اس سے مراد درختوں والی ہموار زمین ہے۔ اور سلم اور طلح کے درخت اگنے کی جگہ کو غال کہا جاتا ہے اور غال بھی ایک بوٹی ہے۔ اور اس کی جمع غُلّان غین کے ضمہ کے ساتھ ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا ہے: یُغَلّ کا معنی ہے یوجد غالاً۔ (اسے غال پایا جاتا ہے)، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: احمدت الرجل وجدتہ محمودا یعنی میں نے فلاں آدمی کی تعریف کی (تو) میں نے اسے محمود پایا) اس تاویل کی بنا پر یہ قرأت یَغُلّ یا کے فتحہ اور غین کے ضمہ کے ساتھ ہی کی طرف راجع ہوتی ہے اور یُغلّ کا معنی جمہور اہل علم کے نزدیک اس طرح ہے لیس لأحد أن یَغُلّہ یعنی کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت کرے۔

پس آیت میں مقصود لوگوں کو مال غنیمت میں خیانت کرنے سے روکنا اور منع کرنا ہے۔ اور اس پر وعید سنانا ہے۔ اور جس طرح یہ جائز نہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت کی جائے اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ آپ کے سوا کسی اور سے خیانت کی جائے، لیکن ذکر خاص طور پر آپ کا کیا گیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیانت کرنا از روئے وقوع کے زیادہ شدید اور سخت ہے اور از روئے بوجھ اور ثقل کے بہت بڑی اور بھاری ہے، کیونکہ آپ کی موجودگی میں معصیت کا ارتکاب کرنا بہت بڑا جرم ہے کیونکہ آپ کی عزت و توقیر کرنا لازم ہے اور ایسے والی جو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ہوں تو ان کے لئے بھی عزت و توقیر میں سے حصہ ہے۔ اور کہا گیا ہے: یَغُلّ کا معنی ہے نبی علیہ السلام نے کبھی بھی خیانت نہیں کی اور مقصود نہی نہیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ یعنی وہ اس (خیانت کی ہوئی شے) کے ساتھ آئے گا درآنحالیکہ وہ اسے اپنی پیٹھ اور گردن پر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ اور وہ اسے اٹھانے اور اس کے بوجھ کے سبب کبڑا ہوگا اور اس کی آواز سے خوفزدہ ہوگا اور تمام کے سامنے اس کی خیانت کا اظہار کر کے اسے زجر و توبیخ کی جائے گی، جیسا کہ آگے آئے گا۔

اور یہی وہ رسوائی ہے جس میں اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والے کو واقع کرے گا اور یہ اس رسوائی اور ذلت کی مثل ہے جس میں وہ دھوکہ دینے اور عہد توڑنے والے کو واقع کرے گا، اس طرح کہ اس کی سرین (بیٹھنے کی جگہ) کے پاس اس کے غدر اور خیانت کی مقدار جھنڈا نصب کیا جائے گا (1) اور اللہ تعالیٰ نے یہ سزائیں مقرر کی ہیں ان کے بارے جن کا انسان اس سے عہد

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجزیہ، حدیث نمبر 2950، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کرتا ہے اور وہ اسے سمجھتے ہیں۔

کیا آپ شاعر کے اس قول کی طرف نہیں دیکھتے:

أَسُمَیَّ وَیْحَكِ هل سَمِعتِ بغَدْرَةٍ رُفِعَ اللِّوَاءُ لنا بها فی الْمَجْمَعِ

اے سُمَیّ تیری ہلاکت ہو کیا تو نے غدر اور خیانت کے بارے سنا ہے کہ ہمارے لئے اس کے سبب جمع ہونے کی جگہ (میدان حشر) میں جھنڈا کھڑا کیا جائے گا۔

عرب لوگ معاہدہ توڑنے والے کے لئے جھنڈا بلند کرتے تھے اور اسی طرح جرم کرنے والے کو اس کی جنایت سمیت پھرایا جاتا تھا۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور غلول (خیانت) کا ذکر کیا اور اسے بہت بڑا (جرم) قرار دیا اور اس کے امر کو عظیم اور شدید قرار دیا پھر فرمایا: ''میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر اونٹ اپنی آواز نکال رہا ہوگا وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر گھوڑا اپنی آواز نکال رہا ہوگا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اس کی گردن پر بکری اپنی آواز نکال رہی ہوگی تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر ایک آدمی چیخ و پکار کر رہا ہوگا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں۔ تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر لکھے ہوئے کاغذ حرکت کر رہے ہوں گے (مراد وہ کاغذ ہیں جن پر اس کے ذمے واجب الاداء حقوق لکھے ہوں گے) اور وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھ تک (پیغام) پہنچا دیا۔ میں تم میں سے کسی کو پاؤں گا وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی گردن پر سونا چاندی ہوگا تو وہ کہے گا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میری مدد فرمایئے تو میں کہوں گا میں تیرے لئے کسی شے کا مالک نہیں ہوں تحقیق میں نے تجھے (پیغام) پہنچا دیا۔ (1)'' اور ابو داؤد نے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مال غنیمت پاتے تھے تو آپ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے تو وہ لوگوں میں اعلان کر دیتے اور وہ اپنے غنائم لے کر آ جاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا خمس نکالتے تھے اور اسے تقسیم کر دیتے، پس ایک دن اعلان کے بعد ایک آدمی بالوں کی رسی لے کر آیا اور اس نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ اس مال میں سے تھی جو ہم نے غنیمت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ تو آپ

1۔ مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123-122، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، حدیث نمبر 2844، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تو نے بلال کو سنا ہے وہ تین بار اعلان کرتا ہے؟'' اس نے عرض کی: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ''تجھے کس نے روکا ہے کہ تو اسے لے کر آئے؟'' تو اس نے معذرت پیش کی۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خبردار! تو قیامت کے دن اس کے ساتھ آئے گا اور میں اسے تجھ سے قبول نہ کروں گا۔'' (1)

بعض علماء نے کہا ہے: مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن اس بوجھ کا عوض پورا پورا دیا جائے گا جیسا کہ دوسری آیت میں کہا ہے: وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ (الانعام) (اور وہ اٹھائے ہوئے ہیں اپنے بوجھ اپنی پشتوں پر ارے کتنا برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے: خبر امر کے مشہور ہونے پر محمول ہے، یعنی وہ قیامت کے دن آئے گا اس حال میں کہ اللہ تعالیٰ اس کے امر کی تشہیر کرے گا جیسا کہ تشہیر کی جاتی ہے اگر اس نے اونٹ کو اٹھایا اس کی آواز ہوگی یا گھوڑا اٹھایا (تو) اس کی آواز ہوگی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ حقیقت سے مجاز اور تشبیہ کی طرف عدول ہے اور جب کلام حقیقت اور مجاز کے درمیان دائر ہو تو حقیقت اصل ہے جیسا کہ کتب اصول میں ہے۔ تحقیق نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حقیقت کے بارے خبر دی ہے ''شادی کے بعد عطر نہیں ہے''۔ اور کہا جاتا ہے: بے شک جس نے دنیا میں کسی شے کی خیانت کی قیامت کے دن جہنم میں اس کی تمثیل بنائی جائے گی پھر اسے کہا جائے گا: اس کی طرف اترو اور اسے پکڑ لو، پھر وہ اس کی طرف اترے گا۔

پس جب وہ اس تک پہنچے تو اسے اٹھالے گا، یہاں تک کہ جب دروازے تک پہنچے گا تو اس سے جہنم کے نچلے حصے کی طرف گر جائے گا، پھر وہ اس کی طرف لوٹ آئے گا اور اسے پکڑ لے گا، جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسی طرح ہوتا رہے گا اور کہا جاتا ہے: ''وہ اس کے ساتھ آئے گا جس کی اس نے خیانت کی'' یعنی قیامت کے دن وہ خیانت اور غلول اس پر شہادت دیں گے۔

مسئلہ نمبر 3۔ علماء نے بیان کیا ہے: غلول (خیانت کرنا) کبائر میں سے ایک کبیرہ گناہ ہے اور اس پر دلیل یہ آیت اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے ذکر کی ہے کہ وہ اسے اپنی گردن پر اٹھائے گا۔ تحقیق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدعم کے بارے میں فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے بے شک وہ چادر جو خیبر کے دن اس نے مال غنیمت سے اٹھائی اور وہ تقسیم میں شامل نہ ہوئی یقیناً وہ اس پر آگ بھڑکائے گی، فرمایا: پس جب لوگوں نے یہ سنا تو ایک آدمی ایک یا دو تسمے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک یا دو تسمے بھی آگ میں سے ہیں'' اسے مؤطا نے نقل کیا ہے (2)۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: والذی نفسی بیدہ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیانت کرنے والے پر نماز (جنازہ) پڑھنے سے انکار کرنا غلول (خیانت) کے بہت بڑا ہونے اور اس میں بہت بڑا گناہ ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ کبائر میں سے ہے، اور یہ آدمیوں کے حقوق میں سے ہے اور اس میں نیکیوں اور بدیوں کے بارے میں قصاص ضروری ہے، پھر اس کے مالک کی مرضی ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: شِرَاكٌ اَوْ شِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی مثل ہے: اَدُّوا

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد

2۔ موطا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 475، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث 3908، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

الخیاط والمخیط (1) (دھاگہ اور سوئی ادا کرو) اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ غزوہ میں تقسیم سے پہلے تھوڑا اور زیادہ مال لینا حلال نہیں ہے، مگر وہ جس پر تمام کا اجماع ہو جائے مثلاً جنگ کی زمین میں کھانے کی اشیاء، ایندھن کی لکڑیاں اور شکار وغیرہ۔

اور زہری سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: دشمن کی زمین میں امام کی اجازت کے بغیر کھانے کی کوئی شے نہیں لی جائے گی۔ اور اس کی کوئی اصل نہیں ہے، کیونکہ آثار اس کے خلاف ہیں جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ حسن نے کہا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جب کوئی شہر یا قلعہ فتح کرتے تھے تو ستو، آٹا، گھی اور شہد کھا لیا کرتے تھے۔ اور ابراہیم نے کہا ہے: وہ دار الحرب میں دشمن کی زمین سے خمس نکالنے سے پہلے کھانے کی اشیاء اور جانوروں کا چارہ وغیرہ لے لیا کرتے تھے۔ اور عطا نے کہا ہے: لشکری سریہ میں ہوتے تھے اور وہ گھی کے مشکیزے، شہد اور طعام پاتے تھے اور انہیں کھاتے تھے اور جو کچھ باقی رہ جاتا وہ اسے اپنے امام کے پاس لوٹا دیتے تھے اور جماعت علماء کا نظریہ یہی ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ اس حدیث میں اس پر دلیل ہے کہ غلول کرنے والے کا سامان جلایا نہیں جائے گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کا سامان نہیں جلایا جس نے چادر اٹھائی تھی اور نہ ہی آپ نے اس موتیوں والے کا سامان جلایا تھا جس پر آپ نے نماز جنازہ چھوڑ دی تھی، اگر اس (خیانت کرنے والے) کا سامان جلانا واجب ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اس پر عمل کرتے، اور اگر آپ ایسا کرتے تو یقیناً وہ حدیث میں نقل کیا جاتا (2)۔ اور رہی وہ روایت جو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم کسی آدمی کو پاؤ اس حال میں کہ اس نے (مال غنیمت میں) خیانت کی ہو تو تم اس کا ساز و سامان جلا دو اور اسے مارو (3)''۔ تو اسے ابوداؤد اور ترمذی نے صالح بن محمد بن زائدہ کی حدیث سے روایت کیا ہے اور یہ ضعیف راوی ہے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ترمذی نے کہا ہے: میں نے اس حدیث کے بارے محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اسے صرف صالح بن محمد نے روایت کیا ہے اور وہ ابو واقد اللیثی ہے اور وہ منکر الحدیث ہے اور ابوداؤد نے بھی اس سے روایت کیا ہے اس نے کہا ہے: ہم نے ولید بن ہشام کی معیت میں جنگ لڑی اور ہمارے ساتھ سالم بن عبداللہ بن عمر اور عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم بھی تھے۔ پس ایک آدمی نے سامان (غنیمت) میں خیانت کی۔ پس ولید نے اس کے سامان کے بارے حکم دیا اور اسے جلا دیا، اور اسے پھرایا گیا اور اسے اس کا حصہ بھی نہ دیا۔ ابوداؤد نے کہا ہے: یہ دونوں حدیثوں میں سے زیادہ صحیح ہے۔ اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی حدیث سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا سامان جلا دیا اور انہوں نے اسے مارا (4)۔

1۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2319، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث 2335، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث 2837، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ ابی داؤد، کتاب الجہاد باب فی عقوبۃ الغال، جلد 2، صفحہ 15، اسلام آباد۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2338، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2340، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابوداؤد نے کہا ہے: اوراس میں علی بن بحر نے ولید سے یہ زیادہ کیا ہے ولم اسمعه منه (اور میں نے اسے اس سے نہیں سنا) و منعوه سهمه (اورانہوں نے اسے اپنے حصہ سے روک دیا) ابو عمر نے بیان کیا ہے: اس حدیث کے بعض راویوں نے کہا ہے: اورتم اس کی گردن ماردو اوراس کا سازوسامان جلادو۔ اور یہ حدیث صالح بن محمد کے اردگرد گھومتی ہے اور یہ راوی ان میں سے نہیں ہے جنہیں حجت بنایا جاسکتا ہے۔

اور تحقیق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہوتا مگر تین میں سے کسی ایک کے ساتھ (1)۔'' اور یہ روایت غلول کی صورت میں قتل کی نفی کرتی ہے۔ اور ابن جریج نے ابوالزبیر سے، انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے اورانہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خیانت کرنے والے، چھیننے والے اوراچک کرلے جانے والے پر قطع (ید) نہیں ہے (2)۔'' اور غال (مال غنیمت سے مال اٹھانے والا) لغت میں خائن (خیانت کرنے والا) ہی ہے اور شریعت نے اس سے جب قطع ید کی نفی کردی ہے تو پھر قتل کی نفی بدرجہ اولیٰ ہوگی۔

اور امام طحاوی نے کہا ہے: اگر صالح کی مذکورہ حدیث صحیح ہوتو پھر یہ احتمال ہے کہ اس وقت یہ مالوں میں سزا ہو، جیسے کہ زکوٰۃ کا انکار کرنے والے کے بارے میں فرمایا: ''بے شک ہم زکوٰۃ اوراس کے مال کا نصف حصہ لیں گے، (کیونکہ) یہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اورواجبات میں سے ایک حق اور واجب ہے (3)۔'' اوراسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے چھپائے ہوئے اونٹ کے گم ہونے کی صورت میں کہا ہے: اس میں اس (اونٹ) کا تاوان بھی ہے اوراس کے ساتھ اس کی مثل (اونٹ) بھی ہے (4)۔ اوراسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے لٹکے ہوئے پھل کے بارے میں روایت کیا ہے کہ اس میں اس کی دو مثل تاوان ہے اور سزا کے کوڑے بھی ہیں (5)۔ یہ سب روایات منسوخ ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 5۔ جب کسی آدمی نے مال غنیمت سے خیانۃً کچھ لے لیا اور پھر وہ پایا گیا تو وہ اس سے لے لیا جائے، اور اسے ادب سکھایا جائے اور تعزیری سزا دی جائے۔ اور امام مالک، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ اوران کے اصحاب اور امام لیث رحمہم اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اس کا سامان نہیں جلایا جائے گا۔ اور امام شافعی، لیث اور داؤد نے کہا ہے: اگر وہ نہی کو جانتا ہو (یعنی اگر اسے یہ معلوم ہو کہ ایسا کرنا ممنوع ہے) تو اسے سزا دی جائے گی۔ اور امام اوزاعی نے کہا ہے: (مال غنیمت میں) خیانت کرنے والے کا تمام سامان جلادیا جائے گا سوائے اس کے ہتھیار اوران کپڑوں کے جو وہ پہنے ہوئے ہو اوراس کی زین کے، اور اس کی سواری اس سے نہیں چھینی جائے گی، اور نہ ہی وہ شے جلائی جائے گی جو خیانۃً اٹھائی گئی اور امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ کا قول

1۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، جلد 2، صفحہ 1016، اسلام آباد۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 6370، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الحدود، جلد 1، صفحہ 175، اسلام آباد۔ ایضاً، ابی داود، حدیث نمبر 3817، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2580، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الزکوۃ باب فی زکوۃ السائمۃ، جلد 1، صفحہ 221، اسلام آباد

4۔ سنن ابی داؤد، کتاب اللقطۃ، حدیث نمبر 1460، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ ابی داؤد، ایضاً، حدیث نمبر 1455، ایضاً

ہے، اور حسن نے یہی کہا ہے، مگر یہ کہ وہ حیوان یا مصحف ہو (تو پھر یہ سزا نہیں دی جائے گی۔) اور ابن خویز منداد نے کہا ہے: روایت بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما دونوں نے غلول کرنے والے کو مارا اور اس کا سامان جلا دیا۔ ابن عبدالبر نے بیان کیا ہے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ غلول کرنے والے کا کجاوہ اور اس کا سامان سب جلا دیا جائے گا ان میں سے مکحول اور سعید بن عبدالعزیز ہیں۔ اور جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے ان کی دلیل صالح مذکور کی حدیث ہے۔ اور ہمارے نزدیک وہ ایسی حدیث ہے جس کے ساتھ تیراکشی حرمت کو ختم کرنا ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی حکم کو نافذ کرنا (ثابت ہوتا ہے) کیونکہ اس کے معارض ایسے آثار ہیں جو اس کی نسبت زیادہ قوی ہیں۔ اور جو موقف امام مالک اور آپ کے متبعین نے اس مسئلے میں اختیار کیا ہے وہ نظر و فکر اور اثر کے صحیح ہونے کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 6۔ بدنی سزا میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب مختلف نہیں ہے، اور رہی مالی سزا تو انہوں نے اس ذمی کے بارے میں کہا ہے جو شراب کسی مسلمان کو فروخت کرتا ہے کہ مسلمان کے پاس شراب کو بہا دیا جائے گا، اور ذمی سے بطور سزا ثمن چھین لئے جائیں گے تاکہ وہ مسلمانوں کو شراب کی فروخت نہ کرے تو اس بنا پر یہ کہنا جائز ہے کہ مال میں سزا دینا جائز ہوتا ہے۔ تحقیق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ دودھ بہا دیا جس میں پانی ملایا گیا تھا۔

مسئلہ نمبر 7۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ (مال غنیمت سے) خیانۃً مال لینے والے کے لئے لازم ہے کہ وہ تمام مال جو بطور خیانت اس نے اٹھایا اسے لوگوں کے منتشر ہونے سے پہلے تقسیم کرنے والے کے پاس لوٹا دے اگر وہ اس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ پالے، اور بلاشبہ جب اس نے ایسا کر لیا تو یہی اس کی توبہ ہوگی اور گناہ سے بچ نکلنے کا ذریعہ ہوگا۔ اور جب اہل لشکر منتشر ہو جائیں اور وہ اس تک نہ پہنچ سکے تو جو کچھ اس کے ساتھ کیا جائے گا اس میں اختلاف ہے، علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے: وہ اس کا خمس امام کو دے دے اور باقی صدقہ کر دے گا۔ یہ امام زہری، مالک، اوزاعی، لیث اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم کا مذہب ہے، اور حضرات عبادہ بن صامت، معاویہ اور حسن بصری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے اور یہ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے مذہب سے مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ یہ دونوں یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ مال صدقہ کر دیا جائے جس کے مالک کا علم نہ ہو، اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے: اس کے لئے غیر کا مال صدقہ کرنا درست نہیں۔ ابوعمر نے کہا ہے: میرے نزدیک یہ ایسی صورت میں ہے جب اس کے مالک کو پانا، اس تک پہنچنا یا اس کے ورثا تک پہنچنا ممکن ہو، اور اگر ان میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو اس صورت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی صدقہ کرنے کو مکروہ نہیں قرار دیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تمام نے اس پر اجماع کیا ہے کہ لقطہ (گری ہوئی چیز جو مل جائے) کو صدقہ کرنا جائز ہے جبکہ پہلے اس کی تشہیر کی جائے اور اس کے مالک کا علم نہ ہو سکے، اور پھر اس کے بارے یہ حکم لگایا ہے کہ اگر وہ (مالک) آ جائے تو اسے اجرت اور ضمان کے درمیان اختیار دیا جائے گا، اور اسی طرح غصب کی ہوئی شے کا حکم بھی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

اور غلول کے علیحدہ ذکر میں اس پر دلیل ہے کہ مال غنیمت میں تمام غانمین (لشکری) شریک ہیں، پس کسی کے لئے یہ

حلال نہیں کہ وہ اس میں سے کوئی شے دوسرے (کی اجازت) کے بغیر لے، پس جس نے بھی اس میں سے کوئی شے غصب کی تو بالاتفاق اسے تادیبی سزا دی جائے گی، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 8۔ اگر کسی نے کسی لونڈی کے ساتھ وطی کی یا نصاب کے برابر (دس درہم) مال چوری کیا تو اس پر حد قائم کرنے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے اور ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس پر قطع ید نہ ہوگی۔

مسئلہ نمبر 9۔ عمال کے ہدایا اور تحائف بھی غلول میں سے ہیں، اور آخرت میں ذلت و رسوائی کے اعتبار سے اس کا حکم غلول کرنے والے کے حکم کی طرح ہے۔ ابو داؤد نے اپنی سنن میں (1) اور مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابو حمید الساعدی سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک آدمی کو صدقہ وصول کرنے پر عامل مقرر کیا اسے ابن اللتبیہ کہا جاتا تھا [ابن سرح نے ابن الاتبیہ کہا ہے]، پس وہ آیا اور اس نے کہا: یہ تمہارے لئے ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے تو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور پھر فرمایا: ”عامل کو کیا ہو گیا ہے جسے ہم بھیجتے ہیں اور وہ آکر یہ کہتا ہے یہ تمہارے لئے ہے اور یہ (مال) مجھے بطور ہدیہ دیا گیا ہے خبردار سنو! وہ اپنی ماں یا اپنے باپ کے گھر بیٹھا رہے اور پھر دیکھے کیا اسے کوئی ہدیہ دیا جاتا ہے یا نہیں، تم میں سے کوئی بھی ان میں سے جو شے بھی لائے گا قیامت کے دن وہ اس کے ساتھ آئے گا اگر وہ اونٹ ہوا تو اس کی آواز ہوگی، اور اگر وہ گائے ہوئی تو اس کی آواز ہوگی اور اگر وہ بکری ہوئی تو وہ اس کی آواز نکالے گا۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ بلند فرمائے یہاں تک کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی دیکھ لی۔ پھر آپ نے کہا: اللّٰھم ھل بَلّغتُ اللّٰھم ھل بلغت (2) (اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے اے اللہ! کیا میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ہے؟)

اور ابو داؤد نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے آپ نے فرمایا: ”جسے ہم کسی عمل پر عامل مقرر کرتے ہیں تو ہم اس کے لئے مناسب وظیفہ مقرر کر دیتے ہیں پس اس کے بعد اس نے جو کچھ لیا تو وہ غلول (خیانت) ہوگا۔“ (3)

اور انہوں نے حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساعی (عامل) بنا کر بھیجا۔ اور پھر فرمایا: ابا مسعود! تو جا اور میں تجھے قیامت کے دن اس حال میں نہ پاؤں کہ تیری پشت پر صدقہ کے اونٹوں میں سے کوئی اونٹ آئے اور وہ اپنی آواز نکال رہا ہو کہ تو نے اسے بطور خیانت حاصل کیا تھا“ انہوں نے عرض کی: تب میں نہیں جاؤں گا، آپ نے فرمایا: ”سو میں تجھے مجبور نہ کروں گا (4)۔“ جو روایت ابو داؤد نے ہی مستورد بن شداد سے نقل کی ہے اس نے ان احادیث کو مقید کر دیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ”جو ہمارا عامل ہو اسے چاہیے کہ وہ بیوی حاصل کرلے (یعنی نکاح کرلے) اور اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو وہ خادم حاصل کرلے اور اگر اس

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، حدیث 2557، ضیاء القرآن پبلی کیشنز۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الاحکام، حدیث 6639، ایضاً

2۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 123، قدیمی کتب خانہ کراچی۔ ایضاً سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، جلد 2، صفحہ 53، اسلام آباد

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، جلد 2، صفحہ 52، اسلام آباد 4۔ ایضاً صفحہ 53، اسلام آباد

کے پاس مسکن (رہنے کے لئے گھر) نہ ہو تو رہائش گاہ بنالے(1)"۔ فرمایا پس ابوبکر نے بیان کیا ہے: مجھے خبر دی گئی ہے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: "جس نے اس کے سوا کچھ لیا تو وہ غلول کرنے والا اور سارق (چوری کرنے والا) ہے۔" واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 10۔ کتب کو ان کے مالکوں سے روک کر رکھنا بھی غلول میں سے ہے، اور ان کے علاوہ دیگر چیزیں بھی ان کے معنی میں داخل ہیں۔ زہری نے کہا ہے: کتب کی خیانت سے بچ، پرہیز کر۔ تو انہیں کہا گیا: کتب کا غلول کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: انہیں ان کے اصحاب سے روک کر رکھنا۔ تحقیق اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تاویل میں کہا گیا ہے: وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ یعنی نبی کی شان نہیں ہے کہ وہ بطور رغبت یا رہبت یا مداہنت کے وحی میں سے کوئی شے چھپالے۔ اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم میں ان کے دین کے عیب بیان کئے گئے ہیں اور ان کے معبودان باطلہ کو جو برا کہا گیا ہے وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ تو انہوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ اسے لپیٹ دیں، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، محمد بن بشار نے اسے بیان کیا ہے اور ہم نے اس کے بارے جو ابتدا میں بیان کیا ہے وہ جمہور کا قول ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اس کے بارے کلام پہلے گزر چکی ہے۔

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَأْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٦٢﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٦٣﴾

"تو کیا جس نے پیروی کی رضائے الٰہی کی اس کی طرح ہو سکتا ہے جو حقدار بن گیا ہے اللہ کی ناراضگی کا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بہت بری پلٹنے کی جگہ ہے۔ لوگ درجہ بدرجہ ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے جو وہ کرتے ہیں۔"

قولہ تعالیٰ: أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ یعنی جو غلول کو ترک کرنے کا اور جہاد پر صبر کرنے (ڈٹے رہنے) کا ارادہ کرتا ہے۔ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ (اس کی طرح ہو سکتا ہے) جو کفر یا غلول یا جنگ میں حضور نبی مکرم ﷺ سے پیٹھ پھیرنے کا ارادہ کرتا ہے وَمَأْوٰىهُ جَهَنَّمُ یعنی اس کا ٹھکانا جہنم ہے، یعنی اگر اس نے توبہ نہ کی یا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف نہ کیا۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ یعنی لوٹنے کی جگہ بہت بری ہے۔ اور رِضْوَانٌ کو را کے کسرہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے جیسا کہ عُدْوان اور عِدْوان۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کی پیروی اور اتباع کی وہ اس کی طرح نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا ہے۔ کہا گیا ہے: هُمْ دَرَجٰتٌ متفاوتةٌ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کے درجات اور منازل مختلف ہیں، پس جس نے رضائے الٰہی کی پیروی کی اس کے لئے عزت و کرامت اور ثواب عظیم ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا حقدار بن گیا اس کے لئے ذلت، رسوائی اور دردناک عذاب ہے اور هُمْ دَرَجٰتٌ کا معنی ہے ذوو درجات (وہ صاحب درجات ہیں) یا علی درجات (وہ درجات پر ہیں) اولی درجات (یا وہ درجات میں ہیں) یا لهم درجات (یا ان کے لئے درجات ہیں) اور اہل نار بھی درجات والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: و جدته فی غمرات من النار

3۔ سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیئ، جلد 2، صفحہ 53-52، اسلام آباد

فاخرجته الی ضَحْضَاحٍ(1) (میں نے اسے آگ کی تکالیف میں پایا تو میں نے اسے تھوڑے سے پانی کی طرف نکال دیا۔)

پس مومن اور کافر درجہ میں برابر اور مساوی نہیں ہوں گے، پھر مومنین بھی مختلف ہوں گے، پس ان میں سے بعض بعض سے بلند رتبہ پر ہوں گے اور اسی طرح کفار بھی۔ اور درجہ کا معنی رتبہ ہے اور اسی سے الدَّرَجہ ہے (لکھا جانے والا کاغذ) کیونکہ اسے درجہ بدرجہ لپیٹا جاتا ہے۔ اور جہنم کے مراتب میں مشہور درکات ہیں۔

جیسا کہ فرمایا: اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: 145) (بے شک منافقین جہنم کے نیچے والے درکہ (گڑھے) میں ہوں گے) پس جس نے غلول نہیں کیا اس کے لئے جنت میں درجات ہوں گے اور جس نے غلول کیا اس کے لئے جہنم میں درکات ہوں گے۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے: جہنم کی کئی منازل ہیں اور ان میں سے ہر منزل کو درک اور درک کہا جاتا ہے اور درک نیچے کی طرف ہوتا ہے اور درج اوپر، بلندی کی جانب ہوتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

"یقیناً بڑا احسان فرمایا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر جب اس نے بھیجا ان میں سے ایک رسول انہیں میں سے پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں اور پاک کرتا ہے انہیں اور سکھاتا ہے انہیں قرآن و سنت۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے۔"

اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر ان پر اپنے احسان عظیم کو بیان فرمایا ہے اور اس میں احسان کرنے کے معنی میں کئی اقوال ہیں: ان میں ایک یہ ہے کہ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہو بَشَرٌ مثلهم۔ یعنی آپ ان کی مثل بشر ہیں۔ پس جب دلائل واضح ہیں کہ آپ ان کی مثل بشر ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ای منهم۔ یعنی آپ ان میں سے ہیں۔

پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مشرف و مکرم ہوئے ہیں پس یہ بھی ایک احسان ہے اور یہ قول بھی ہے: مِّنْ اَنْفُسِهِمْ تاکہ وہ آپ کی حالت کو پہچان سکیں اور ان پر آپ کا طریقہ اور سنت مخفی نہ رہے۔ اور جب ان میں آپ کا مقام یہ ہے تو وہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قتال اور جنگ کریں اور قطعاً آپ سے دور نہ بھاگیں۔ اور قرأت شاذہ میں مِّنْ اَنْفُسِهِمْ فا کے فتحہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ یعنی آپ ان میں اشرف واعلیٰ (خاندان) میں سے ہیں، کیونکہ آپ بنی ہاشم میں سے ہیں اور بنو ہاشم قریش سے افضل ہیں اور قریش بقیہ عربوں سے افضل ہیں اور عرب غیر عربوں سے افضل واعلیٰ ہیں۔

لفظ مومنین عام ہے اور اس کا معنی عرب میں خاص ہے، کیونکہ عرب قبائل میں سے کوئی قبیلہ نہیں ہے مگر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنم دیا ہے اور ان کی آپ کے ساتھ نسبت موجود ہے، سوائے بنی تغلب کے کیونکہ وہ نصاریٰ تھے اور اللہ تعالیٰ نے نصرانیت کی میل سے آپ کو پاک صاف رکھا اور اس تاویل کا بیان اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 115، اسلام آباد

(الجمعہ:2) (وہی (اللہ) جس نے مبعوث فرمایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے)

اور ابومحمد عبدالغنی نے بیان کیا ہے کہ ابو احمد البصری، احمد بن علی بن سعید القاضی، ابوبکر المروزی، یحییٰ بن معین، ہشام بن یوسف نے عبداللہ بن سلیمان نوفلی سے انہوں نے زہری سے، انہوں نے عروہ سے اور انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یہ آیت لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ صرف عرب والوں کے لئے ہے (1) اور دوسروں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے تمام کے تمام مومنین مراد لئے ہیں (2)۔ اور مِّنْ اَنْفُسِهِمْ کا معنی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے ایک ہیں اور انہیں کی مثل بشر ہیں اور بلاشبہ آپ وحی کے سبب ان سے ممتاز ہیں اور یہی معنی اس ارشاد کا ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ:128) (بے شک تشریف لایا ہے تمہارے پاس ایک برگزیدہ رسول تم میں سے)۔ اور مومنین کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا ہے کیونکہ وہی آپ سے نفع اٹھانے والے ہیں، پس ان پر احسان عظیم تر ہوا۔

اور قول باری تعالیٰ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ میں يَتْلُوْا۔ رَسُوْلًا کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور اس کا معنی ہے يقرءُ (وہ پڑھتا ہے) اور تلاوت بمعنی قراءت ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ اور وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ کا معنی ہے: لقد كانوا من قبل محمد تحقیق وہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے، اور یہ بھی کہا ہے کہ اِنْ بمعنی مَا ہے اور خبر میں لام بمعنی الا ہے یعنی وَ مَا كانوا من قبلُ الاّ فی ضلالٍ مُبِيْنٍ (وہ اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور اسی کی مثل یہ آیت بھی ہے وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ یعنی وما كنتم من قبله الا من الضالين (اور تم اس سے پہلے نہ تھے مگر کھلی گمراہی میں) اور یہ کوفیوں کا مذہب ہے اور اس آیت کا معنی سورۃ بقرہ میں گزر چکا ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾

"کیا جب پہنچی تمہیں کچھ مصیبت حالانکہ تم پہنچا چکے ہو (دشمن کو) اس سے دگنی تو تم کہہ اٹھے کہاں سے آپڑی یہ مصیبت؟ فرمائیے! یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اس میں الف استفہام کے لئے ہے اور واؤ عطف کے لئے۔ مُّصِيْبَةٌ اس سے مراد غلبہ ہے قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا یعنی بدر کے دن تم اس سے دگنی پہنچا چکے ہو، اس طرح کہ تم نے ان میں سے ستر افراد قتل کئے اور ستر کو تم نے قیدی بنایا۔ اور قیدی مقتول کے حکم میں ہوتا ہے، کیونکہ قید کرنے والا اگر چاہے تو اپنے قیدی کو قتل کر سکتا ہے، یعنی تم نے انہیں بدر کے دن اور احد کے دن بھی ابتدا میں شکست سے دو چار کیا اور اس میں تم نے تقریباً بیس افراد قتل کئے، (گویا) تم نے ان میں سے دونوں دنوں میں افراد قتل کئے اور انہوں نے تم سے احد کے دن (کچھ افراد) شہید کئے۔

قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا یہ شکست اور قتل (کی مصیبت) ہمیں کہاں سے آپہنچی ہے، حالانکہ ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑ رہے ہیں اور ہم

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577 2۔ ایضاً

مسلمان ہیں اور ہم میں نبی مکرم ﷺ بھی ہیں اور وحی بھی ہیں اور وہ مشرک ہیں۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ (فرمایئے یہ تمہاری طرف سے ہی آئی ہے) یعنی تیر اندازوں کی مخالفت کے سبب اور کوئی قوم نہیں ہے جس نے اپنے نبی علیہ السلام کی جنگ میں اطاعت وفرمانبرداری کی مگر ان کی مدد کی گئی، کیونکہ جب وہ اطاعت کرتے ہیں تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے اور حضرت قتادہ اور ربیع بن انس نے کہا ہے: مراد ان کا حضور نبی کریم ﷺ سے مدینہ طیبہ سے (دشمن کے مقابلے کے لئے) باہر نکلنے کا سوال کرنا ہے اس کے بعد کہ آپ ﷺ وہاں مقیم رہنے کا ارادہ فرما چکے تھے اور آپ ﷺ نے یہ تاویل اس خواب کی فرمائی تھی جس میں آپ نے اسے محفوظ قلعہ دیکھا تھا۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: اس سے مراد ان کا بدر کے دن (قیدیوں کے) قتل پر فدیہ لینے کو اختیار کرنا ہے(1)، حالانکہ انہیں کہا گیا تھا اگر تم نے قیدیوں کے بدلے فدیہ لیا تو ان کی تعداد کے برابر تم سے لوگ شہید کئے جائیں گے۔ اور بیہقی نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: حضور نبی مکرم ﷺ نے بدر کے دن قیدیوں کے بارے میں فرمایا: ''اگر تم چاہو تو انہیں قتل کر دو اور اگر تم چاہو تو ان کا فدیہ لے لو اور تم نے فدیہ سے مفاد حاصل کیا اور تم میں سے ان کی تعداد کے برابر شہید کر دیئے گئے۔'' اور سترھویں نمبر پر آخر میں شہید ہونے والے صحابی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ تھے انہیں جنگ یمامہ میں شہید کیا گیا۔ پس مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ کا معنی پہلے دو قولوں کے مطابق بذنوبکم (یعنی تم اپنے گناہوں کے سبب اس مصیبت میں مبتلا ہوئے ہو) اور آخری قول کے مطابق باختیارکم (یعنی یہ مصیبت تمہارے اپنے اختیار کے سبب آئی ہے۔)

وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚۖ وَ قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

''اور وہ مصیبت جو پہنچی تھی تمہیں اس روز جب مقابلہ کو نکلے تھے دونوں لشکر تو وہ اللہ کے حکم سے پہنچی تھی اور (مقصد یہ تھا کہ) دیکھ لے اللہ تعالیٰ مومنوں کو۔ اور دیکھ لے جو نفاق کرتے تھے اور کہا گیا ان سے آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا بچاؤ کرو (اپنے شہر کا) بولے اگر ہم جانتے کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہاری پیروی کرتے وہ کفر سے اس روز زیادہ قریب تھے بہ نسبت ایمان کے کہتے ہیں اپنے منہ سے (ایسی باتیں) جو نہیں ہیں ان کے دلوں میں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔''

یعنی (وہ مصیبت) جو احد کے دن قتل، زخم اور ہزیمت کی صورت میں پہنچی۔ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی۔ اور یہ بھی کہا ہے: وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر کے ساتھ پہنچی۔ قفال نے کہا ہے: پس وہ اللہ تعالیٰ کے تمہارے اور ان کے درمیان

1۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 577

معاملہ آزاد چھوڑنے کے سبب پہنچی، نہ کہ اس نے اس کا ارادہ کیا اور یہ معتزلہ کی تاویل ہے۔ اور فَبِاِذۡنِ اللّٰہِ میں فا داخل ہے کیونکہ مَا بمعنی الذی ہے۔ یعنی وہ مصیبت جو تمہیں اس دن پہنچی جب دونوں لشکر مقابلے کے لئے نکلے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور قضا سے پہنچی۔ پس کلام شرط کے معنی کے مشابہ ہو گیا، جیسا کہ سیبویہ نے کہا ہے: الذی قام فلہ درھم (جو کھڑا ہوا تو اس کے لئے ایک درہم ہے) وَلِيَعۡلَمَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعۡلَمَ الَّذِيۡنَ نَافَقُوۡا یعنی تاکہ وہ (مومنین اور منافقین کو) الگ الگ کر دے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تاکہ مومنین کا ایمان جنگ میں ان کے ثابت قدم رہنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے اور تاکہ منافقین کا کفران کے (مصیبت پر) خوشی کا اظہار کرنے کے ساتھ ظاہر ہو جائے پس وہ اسے جان لیں گے۔ اور قول باری تعالیٰ نَافَقُوۡا ۚ وَقِيۡلَ لَهُمۡ سے اشارہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کی طرف ہے جو اس کی معیت میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد و نصرت سے واپس لوٹ گئے تھے اور وہ تین سو تھے اور ان کے پیچھے عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری اور ابو جابر بن عبداللہ بھی چلے، تو آپ نے انہیں فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے نبی کو نہ چھوڑو اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتال کرو یا بچاؤ کرو اور اسی طرح کی بات کہی۔ ابن ابی نے آپ کو کہا: میں نہیں جانتا تھا کہ جنگ ہو گی اور اگر ہم جانتے کہ جنگ ہو گی تو یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہوتے۔ پس جب عبداللہ ان سے مایوس ہو گیا تو اس نے کہا: (اے) اللہ کے دشمنو! تم جاؤ پس اللہ تعالیٰ اپنے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سے مستغنی کر دے گا۔ اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا گیا اور شہید کر دیا گیا رضی اللہ عنہ۔ (1)

قول باری تعالیٰ: اَوِ ادۡفَعُوۡا کے معنی میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے پس سدی اور ابن جریج وغیرہما نے کہا ہے: تم ہماری تعداد میں اضافہ کرو اگرچہ تم ہمارے ساتھ مل کر جنگ نہ کرو۔ تو یہ دشمن کو روکنے اور اسے دور ہٹانے کا (سبب بن) جائے گا (2)، کیونکہ تعداد جب بڑھ جائے تو دشمن کو دور ہٹانے اور دفاع کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے: میں نے جنگ قادسیہ کے دن حضرت عبداللہ بن ام مکتوم الاعمی کو دیکھا وہ زرہ پہنے ہوئے ہیں اور اس کی اطراف کھینچ رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا جھنڈا ہے، تو ان کو کہا گیا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو معذور نہیں قرار دیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! لیکن میں اپنی ذات کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر رہا ہوں۔ اور انہی سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی راہ میں میرا وجود کیسا ہے؟ (3)

اور ابو عون انصاری نے کہا ہے: اَوِ ادۡفَعُوۡا کا معنی ہے رابطوا (سرحد کے پاس دشمن کے مقابلے میں پڑاؤ ڈالو) اور یہ معنی پہلے سے قریب ہے اور یہ یقینی بات ہے کہ مقابلے میں پڑاؤ ڈالنے والا دفاع کرنے والا ہی ہوتا ہے، کیونکہ اگر سرحد پر پڑاؤ ڈالنے والوں کی جگہ نہ ہو تو یقیناً وہاں تک دشمن آ جائے۔ اور مفسرین کی ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اَوِ ادۡفَعُوۡا یہ جنگ کی طرف دعوت ہے از روئے حمیت کے، کیونکہ آپ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کرنے کی دعوت دی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ ہی بلند ہو گا۔

پس جب آپ نے دیکھا کہ وہ اس پر نہیں آ رہے ہیں تو آپ نے ان پر ایک ایسی وجہ پیش کی جو انہیں غضب دلائے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539-538 2۔ معالم التنزیل، جلد، صفحہ 578 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 539

اور خودداری کو ابھارے۔ یعنی یا سرحدوں کا دفاع کرتے ہوئے قتال کرو۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ قزمان نے کہا ہے: قسم بخدا! میں نے قتال نہیں کیا مگر اپنی قوم کی عزوشرف اور محاسن ومفاخر کی وجہ سے۔ اور کیا آپ جانتے نہیں ہیں کہ انصار میں سے کسی نے کہا احد کے دن جب اس نے قریش کو دیکھا: تحقیق میں نے سواری کو وادیٔ قناۃ کی کھیتیوں میں چھوڑ دیا، کیا بنی قیلہ کی کھیتیاں چرالی جائیں گی۔ اور ہم باہم نہیں لڑیں گے؟ اور معنی یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں نہیں لڑتے تو اپنی جانوں اور عزت کو بچانے کے لئے لڑو۔

قولہ تعالیٰ: هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ یعنی انہوں نے اپنا حال بیان کر دیا اور اپنے پردے چاک کر دیئے اور اپنے نفاق کو ظاہر کر دیا ہر اس کے لئے جو یہ گمان رکھتا تھا کہ وہ مسلمان ہیں، پس وہ ظاہر حال میں کفر کے زیادہ قریب ہو گئے، اگرچہ وہ فی الحقیقت کافر تھے اور قولہ تعالیٰ: يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ یعنی انہوں نے ایمان ظاہر کیا اور کفر کو چھپا کر رکھا۔ اور افواہ (مونہوں) کا ذکر بطور تاکید ہے، جیسا کہ یہ قول ہے يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

"جنہوں نے کہا اپنے بھائیوں کے بارے میں حالانکہ وہ خود (گھر) بیٹھے تھے کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو نہ مارے جاتے آپ فرمایئے ذرا دور تو کر دکھاؤ اپنے آپ سے موت کو اگر تم سچے ہو۔"

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اس کا معنی ہے لاجل اخوانھم یعنی اپنے بھائیوں کے واسطے اور یہ وہ شہداء تھے جو قبیلہ خزرج میں سے قتل کئے گئے تھے اور وہ نسب اور مجاورت کے اعتبار سے بھائی تھے نہ کہ دین کے اعتبار سے۔ یعنی انہوں نے ان شہداء کے بارے میں کہا: اگر وہ بیٹھے رہتے مدینہ طیبہ میں تو نہ مارے جاتے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا، یعنی یہ منافقین کی جانب سے ان کے بارے یہ اشکال اور اشتباہ ہے، وہ لوگ جو شہید کر دیئے گئے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے، تو وہ نہ قتل کئے جاتے۔

اور قول باری تعالیٰ: لَوْ اَطَاعُوْنَا اس سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ قریش کی طرف نہ نکلتے۔

اور قولہ تعالیٰ: وَ قَعَدُوْا یعنی انہوں نے یہ قول کیا اس حال میں کہ وہ خود جہاد سے رک کر (گھروں میں) بیٹھے ہوئے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد کے ساتھ ان کا رد کیا: قُلْ فَادْرَءُوْا یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ انہیں فرما دیجئے: اگر تم سچے ہو تو اپنے آپ سے موت کو دور کر دکھاؤ۔ اور الدرء کا معنی الدفع (دور کرنا) ہے اس سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ احتیاط اور ڈر تقدیر سے نہیں بچا سکتے۔ اور یہ کہ مقتول اپنی اجل کے ساتھ ہی مارا جاتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور جس کے بارے اس نے خبر دی ہے وہ بالیقین ہو کر رہنے والا ہے۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ جس دن یہ کہا گیا اس دن ستر منافقین فوت ہوئے۔ اور ابولیث سمرقندی نے کہا ہے: میں نے سمرقند کے بعض مفسرین کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے جب یہ آیت قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ نازل ہوئی تو اس دن منافقین میں سے ستر افراد مرے۔

وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ یُرۡزَقُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۙ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾

''اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ وہ جو قتل کیے گئے ہیں اللہ کی راہ میں وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس (اور) رزق دیے جاتے ہیں۔ شاد ہیں ان (نعمتوں) سے جو عنایت فرمائی ہیں انہیں اللہ نے اپنے فضل و کرم سے اور خوش ہو رہے ہیں بسبب ان لوگوں کے جو ابھی تک نہیں آملے ان سے ان کے پیچھے رہ جانے والوں سے کہ نہیں ہے کوئی خوف ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس میں آٹھ مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ جو کچھ احد کے دن ہوا وہ امتحان تھا جو منافقین کو صادق (سچ بولنے والے) سے ممتاز اور الگ کرتا ہے، تو پھر اس نے یہ بیان فرمایا کہ جو شکست خوردہ نہیں ہوئے اور شہید کر دیے گئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ معزز اور زندہ ہیں۔ اور یہ آیت شہداء احد کے بارے میں ہے اور یہ قول بھی ہے کہ یہ بئر معونہ کے شہداء کے بارے نازل ہوئی ہے (1)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: بلکہ یہ تمام شہداء کے بارے میں عام ہے۔ اور مصنف ابی داؤد میں اسناد صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب میدان احد میں تمہارے بھائی شہید کئے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز پرندوں کے پیٹوں میں رکھ دیا جو جنت کی نہروں پر آتے ہیں ان کے پھلوں میں سے کھاتے ہیں اور سونے کی ان قندیلوں میں رہتے ہیں جو عرش کے سائے میں معلق ہیں پس جب انہوں نے اپنا کھانا، پینا اور آرام کی جگہ کو اچھا پایا تو انہوں نے کہا: کون ہماری جانب سے ہمارے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں اور ہم رزق دیے جا رہے ہیں تاکہ وہ جہاد سے کنارہ کشی اختیار نہ کریں اور نہ وہ جنگ کے وقت بزدل بنیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا میں تمہاری جانب سے انہیں یہ پیغام پہنچا دوں گا۔''...... آپ نے فرمایا...... پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتًا (2)... الی آخر الآیات۔

اور بقی بن مخلد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے ملے اور فرمایا: ''اے جابر! کیا ہے مجھے کہ میں تجھے ٹیڑھا ہونے والا اور مغموم دیکھ رہا ہوں؟ میں نے عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے والد محترم شہید کر دیئے گئے اور انہوں نے پیچھے اہل و عیال بھی چھوڑے اور ان پر قرض بھی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تجھے اس (حالت) کے بارے بشارت نہ دوں جس میں اللہ عزوجل نے تیرے باپ سے ملاقات کی ہے؟'' میں نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللہ احیا اباک و کلمہ کفاحاً و ما کلم احد قط الامن

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 399۔ ایضاً، صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث نمبر 3781، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 341۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2158، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وراء حجاب فقال له یا عبدی تمن اعطك قال یا رب فردنی الی الدنیا فاقتل فیك ثانیة فقال الرب تبارك و تعالیٰ انه قد سبق منی انهم (الیها) لا یرجعون قال یا رب فأبلغ من ورائی (اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کیا اور اسے بلا حجاب شرف کلام عطا فرمایا اور کسی نے بھی کبھی بلا حجاب کلام نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا اے میرے بندے! تو اپنی آرزو اور تمنا پیش کر میں تجھے وہ عطا کروں گا تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو مجھے دنیا کی طرف لوٹا دے تاکہ میں تیری راہ میں دوبارہ قتل کیا جاؤں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا یہ تو پہلے ہو چکا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کی طرف نہیں لوٹائے جائیں گے تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار! تو ان تک یہ خبر پہنچا دے جو میرے پیچھے ہیں) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الآیہ(1)۔ اسے ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے جامع میں نقل کیا ہے اور ترمذی نے کہا ہے: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

اور وکیع نے سالم بن افطس سے اور انہوں نے حضرت سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ فرمایا: جب حضرت حمزہ بن عبدالمطلب اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما شہید ہوئے اور انہوں نے وہ دیکھا جو خیر میں سے انہیں عطا کیا گیا تو انہوں نے کہا: کاش ہمارے بھائی اس خیر (اور انعام) کو جانتے جو ہمیں پہنچا ہے تاکہ جہاد میں ان کی رغبت (اور شوق) بڑھ جاتا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہاری طرف سے ان تک اسے پہنچا دوں گا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اور ابوالضحیٰ نے کہا ہے: یہ آیت خاص(2) اہل احد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور پہلی حدیث اس قول کے صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے: یہ شہداء بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ چودہ افراد تھے آٹھ انصار میں سے تھے اور چھ مہاجرین میں سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بئر معونہ کے شہداء کے بارے میں نازل ہوئی ہے(3) اور ان کا قصہ مشہور ہے اسے محمد بن اسحاق وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: بے شک شہداء کے اولیاء (ورثاء) کو جب خیر و برکت اور فرحت و سرور حاصل ہوتا تو وہ افسوس کرتے اور کہتے: ہم تو نعمتوں اور خوشیوں میں ہیں اور ہمارے باپ، ہمارے بیٹے اور ہمارے بھائی قبروں میں ہیں(4)، تو اللہ تعالیٰ نے ان سے غم اور کرب کو دور کرنے کے لئے اور انہیں اپنے شہداء کے حال کی خبر دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: المختصر اگرچہ یہ احتمال ہے کہ نزول مجموعی سبب کے ساتھ ہو اللہ تعالیٰ نے اس میں شہداء کے بارے خبر دی ہے کہ وہ زندہ ہیں جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور لامحالہ وہ مر چکے ہیں اور ان کے اجسام مٹی میں ہیں اور ان کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 206۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 185، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 399، دار الکتب العلمیہ بیروت　3۔ ایضاً　4۔ ایضاً

ارواح زندہ ہیں جیسا کہ تمام مومنین کی ارواح اور انہیں قتل کے وقت سے جنت میں رزق دیئے جانے کے ساتھ فضیلت دی گئی ہے یہاں تک کہ گویا ان کے لئے دنیوی حیات دائمی ہوگی۔

تحقیق علماء نے اس معنی میں اختلاف کیا ہے اور وہ معنی جس پر عظیم علماء ہیں وہ وہی ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے اور وہ یہ کہ شہداء کی حیات محقق اور ثابت شدہ ہے پھر ان میں سے کچھ کہتے ہیں: ارواح ان کی طرف ان کی قبروں میں لوٹائی جاتی ہیں اور وہ نعمتوں سے شادکام ہوتے ہیں، جیسا کہ کفار کو ان کی قبروں میں زندہ کیا جاتا ہے اور انہیں عذاب دیا جاتا ہے اور حضرت مجاہد نے کہا ہے: انہیں جنت کے پھلوں سے رزق دیا جاتا ہے، یعنی وہ اس کی ہوا پاتے ہیں حالانکہ وہ اس میں نہیں ہوتے (1)۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ یہ مجاز ہے اور معنی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جنت میں راحت و سکون اور نعمتوں کے مستحق ہیں۔ اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے: ماما ت فلان (فلاں نہیں مرا) یعنی زندہ اسے یاد کرتا رہا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے:

موتُ التقی حیاۃٌ لافناءَ لہا قدمات قوم وھم فی الناس احیاء

متقی کی موت ایسی حیات ہے جس کے لئے فنا نہیں تحقیق قوم مر چکی ہے حالانکہ وہ لوگوں میں زندہ ہیں۔

پس معنی یہ ہے کہ انہیں اچھی تعریف کے ساتھ نوازا جاتا ہے اور دوسروں نے کہا ہے: ان کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں اور وہ جنت میں رزق دیئے جاتے ہیں اور وہ کھاتے ہیں اور انتہائی آسودہ اور عمدہ حالت میں رہتے ہیں۔ اقوال میں سے یہی صحیح ہے، کیونکہ دلیل نقلی کے مطابق جو صحیح ہے وہی واقع ہونے والا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اختلاف کو اٹھا رہی ہے اور اسی طرح حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے اسے مسلم نے بیان کیا ہے اور ہم نے اس بارے میں واضح اور تفصیلی ذکر کتاب التذکرۃ بأحوال الموتی و امور الآخرۃ میں کیا ہے۔ والحمد للہ۔

تحقیق ہم نے وہاں ذکر کیا ہے کہ شہداء کتنے ہیں اور یہ کہ ان کا حال مختلف ہے اور رہے وہ جنہوں نے شہداء کے بارے میں یہ تاویل کی ہے کہ وہ زندہ ہیں اس معنی میں کہ وہ عنقریب زندہ کئے جائیں گے تو یہ انتہائی بعید از حقیقت ہے اور قرآن و سنت اس کا رد کرتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد: بَلْ اَحْيَآءٌ ان کی حیات پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں اور رزق نہیں دیا جاتا مگر زندہ کو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کے لئے ہر سال میں غزوہ کا ثواب لکھا جاتا ہے اور وہ ہر جہاد کے ثواب میں شریک ہوں گے جو بھی ان کے بعد یوم قیامت تک ہوگا کیونکہ وہ حکم جہاد پر عمل پیرا ہوئے (اور یہ سنت قائم کی) اس کی نظیر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا (المائدہ: 32) (اسی وجہ سے (حکم) لکھ دیا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جس نے قتل کیا کسی انسان کو۔) اس کا بیان وہاں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کیونکہ ان کی ارواح یوم قیامت تک عرش کے نیچے رکوع و سجود کرتی رہیں گی ان زندہ مومنین کی ارواح کی طرح جو وضو کی حالت پر رات گزارتے ہیں۔

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 400، دار الکتب العلمیہ بیروت

اور یہ قول بھی ہے کیونکہ شہید قبر میں بوسیدہ نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے زمین کھا سکتی ہے۔ اور ہم نے اس کا ذکر بھی التذکرہ میں کیا ہے۔ اور یہ کہ زمین انبیاء علیہم السلام، شہداء، علماء، نیکوکار اور مخلص موذن اور حفاظ قرآن کو نہیں کھا سکتی۔

مسئلہ نمبر 2۔ جب شہید حکماً زندہ ہے تو اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے، جیسا کہ وہ زندہ جس میں قوت حس موجود ہو (اس پر نماز نہیں پڑھی جاتی۔ علماء نے شہداء کے غسل اور ان پر نماز جنازہ پڑھنے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، پس حضرت امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہم نے یہ کہا ہے کہ تمام شہداء کو غسل دیا جائے اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھی جائے، سوائے اس کے جو خالصۃً دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے میدان جنگ میں قتل ہو جائے، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم انہیں ان کے خون سمیت دفن کر دو'' مراد احد کا دن ہے۔ اور آپ نے انہیں غسل بھی نہ دلایا، اسے امام بخاری نے روایت کیا ہے(1)۔

ابوداؤد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء احد کے بارے حکم ارشاد فرمایا کہ ان سے ہتھیار اور زرہیں اتار لی جائیں اور انہیں خون اور ان کے کپڑوں سمیت دفن کر دیا جائے (2) اور اسی کے مطابق امام احمد، اسحاق، اوزاعی، داؤد بن علی، فقہاء امصار کی جماعت، اہل حدیث اور ابن علیہ نے کہا ہے۔ اور حضرت سعید بن مسیب اور حسن نے کہا ہے: انہیں غسل دیا جائے گا۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا ہے: شہداء احد کو ان کی کثرت کی وجہ سے غسل نہیں دیا گیا اور (اسی زیادتی نے) اس سے مشغول رکھا۔ ابوعمر نے کہا ہے: حضرت سعید اور حسن کے اس قول کے مطابق عبید اللہ بن حسن عنبری کے سوا فقہاء امصار میں سے کسی نے بھی قول نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے شہداء احد کو غسل نہ دینے کی یہ علت ذکر کی ہے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا ولی اور وارث تھا جو اس کے ساتھ مشغول ہو کر اس کے معاملات کو سرانجام دے سکتا تھا۔ اس میں علت ۔۔۔ واللہ اعلم ۔۔۔ وہ ہے جو لی دماتھم والی حدیث میں ہے۔ ''کہ وہ (خون) قیامت کے دن کستوری کی خوشبو کی طرح ہوگا (3)۔'' تو اس سے ظاہر ہوا کہ (غسل نہ دینے کی) علت شغل نہیں ہے جیسا کہ اس نے کہا ہے جس نے اس بارے میں کہا اور نہ ہی اس مسئلہ کا قیاس اور نظر و فکر میں کوئی دخل ہے، بلکہ یہ تو خالصۃً اس اثر کی اتباع اور پیروی کا مسئلہ ہے جسے تمام نے شہداء احد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہیں غسل نہیں دیا گیا۔ بعض متاخرین نے جنہوں نے حسن کا مذہب اختیار کیا ہے انہوں نے شہداء احد کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: انا شھید علی ھولاء یوم القیامۃ میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا) فرمایا (4): یہ ان کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے اور یہ کہ اس میں ان کے سوا کوئی اور شریک نہ ہوگا۔ ابوعمر نے کہا ہے: یہ شذوذ سے مشابہت رکھتا ہے اور ان کے غسل کو ترک کرنے کے بارے قول زیادہ اولیٰ ہے،

1۔ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، جلد 1، صفحہ 179۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابن ماجہ، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1503، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 393۔ ایضاً، صحیح بخاری، حدیث نمبر 2593، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

کیونکہ وہ شہداء احد اور ان کے علاوہ دوسروں کے بارے میں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ اور ابوداؤد نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بیان کیا: ایک آدمی کو اس کے سینہ یا اس کے حلق میں تیر مارا گیا اور وہ فوت ہو گیا تو وہ جیسے تھا اسی طرح اسے کپڑے میں لپیٹ دیا گیا۔ فرمایا: اور ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ (1)

مسئلہ نمبر 3۔ رہی شہداء پر نماز جنازہ! تو اس کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔

حضرت امام مالک، لیث، امام شافعی، امام احمد اور داؤد رحمۃ اللہ علیہم اس طرف گئے ہیں کہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے انہوں نے بیان کیا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہداء احد میں سے دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر آپ فرماتے: ''ان میں سے قرآن کریم زیادہ جمع کرنے والا کون ہے؟'' پس جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ان میں سے ایک کی طرف اشارہ کر دیا جاتا تو آپ اسے لحد میں آگے رکھتے اور آپ نے فرمایا میں قیامت کے دن ان پر شہادت دوں گا۔''

اور آپ نے انہیں ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا اور انہیں غسل نہ دیا گیا اور نہ ان پر نماز جنازہ پڑھی گئی (2)۔ اور کوفہ، بصرہ اور شام کے فقہاء نے کہا ہے: ان پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور انہوں نے بہت سے آثار روایت کئے ہیں ان میں سے اکثر روایات مرسل ہیں کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور تمام شہداء احد پر نماز جنازہ پڑھی۔ (3)

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے اس پر اجماع کیا ہے کہ شہید کو جب زندہ اٹھا لیا جائے اور وہ میدان جنگ میں نہ مرے اور کچھ دیر زندہ رہے اور کچھ کھائے تو اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا۔

اور علماء نے اس بارے اختلاف کیا ہے جسے ظلماً قتل کیا گیا جیسا کہ وہ جسے خارجیوں اور ڈاکوؤں وغیرہ نے قتل کر دیا ہو، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اور ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: ہر وہ جسے ظلماً قتل کیا گیا اسے غسل نہ دیا جائے لیکن اس پر اور ہر شہید پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور یہی قول تمام اہل عراق کا ہے۔ اور انہوں نے بہت سے صحیح طرق سے زید بن صوحان سے روایت کیا ہے اور یہ جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔ تم مجھ سے کپڑے نہ اتارنا اور نہ ہی مجھ سے خون کو دھونا۔ اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے بھی ثابت ہے کہ انہوں نے زید بن صوحان کے قول کی مثل ہی کہا ہے اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں شہید کئے گئے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں غسل نہیں دیا۔ اور امام شافعی کے دو قول ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے (شہید کو) دیگر تمام مردوں کی طرح غسل دیا جائے گا سوائے اس کے جسے اہل حرب نے قتل کیا ہو اور یہی امام مالک کا قول ہے۔ امام مالک نے کہا ہے: اسے غسل نہیں دیا جائے گا جسے کفار نے قتل کیا اور وہ میدان جنگ میں ہی فوت ہو گیا۔ اور ہر وہ مقتول جو میدان جنگ میں قتل نہ کیا گیا ہو لیکن اسے کفار نے قتل کیا ہو ...... تو اسے غسل دیا جائے گا اور اس پر نماز جنازہ

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، جلد 2، صفحہ 91۔ ایضاً، ابی داؤد، حدیث نمبر 2726، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً، صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1257، ایضاً

3۔ صحیح بخاری، باب الصلوٰۃ علی الشہید، حدیث نمبر 1258، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

پڑھی جائے گی اور یہی امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور امام شافعی کا دوسرا قول یہ ہے کہ باغیوں کے مقتول کو غسل نہیں دیا جائے گا اور امام مالک کا قول زیادہ صحیح ہے، بلاشبہ مردوں کو غسل دینا اجماع اور تمام کے نقل کرنے سے ثابت ہے۔ پس ہر میت کو غسل دینا واجب ہے سوائے اس کے جسے اجماع یا سنت ثابتہ نے (اس حکم سے) خارج کیا ہو۔ و باللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 5۔ دشمن جب صبح کے وقت کسی قوم پر ان کے گھروں میں حملہ کردے اور انہیں اس کے بارے علم نہ ہو اور وہ ان میں سے بعض کو قتل کردے تو کیا ان کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والوں کے حکم کی طرح ہوگا یا عام مردوں کے حکم کی مثل، یہ مسئلہ ہمیں قرطبہ میں پیش آیا (اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ ہمارے پاس لائے) دشمن اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے۔ نے تین رمضان المعظم ۶۲۷ھ کی صبح کو حملہ کیا لوگ اپنے گھروں میں ابھی غفلت میں تھے، تو اس نے بعض کو قتل کر دیا اور بعض کو قید کرلیا، ان افراد میں سے جنہیں شہید کیا گیا میرے والد رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، تو میں نے اپنے شیخ المقری الاستاذ ابو جعفر احمد المعروف بابی حجۃ سے (یہ مسئلہ) پوچھا تو انہوں نے فرمایا، انہیں غسل بھی دو اور ان پر نماز جنازہ بھی پڑھو، کیونکہ تمہارے والد میدان جنگ میں دو لشکروں کی صفوں کے درمیان شہید نہیں کئے گئے۔ پھر میں نے اپنے شیخ ربیع بن عبدالرحمن بن احمد بن ربیع بن ابی سے پوچھا تو انہوں نے کہا: بلاشبہ اس کا حکم میدان جنگ میں قتل ہونے والے کا ہی حکم ہے، پھر میں نے قاضی الجماعۃ ابا الحسن علی بن قطرال سے پوچھا اور ان کے پاس فقہاء کی ایک جماعت موجود تھی تو انہوں نے جواب دیا: اسے غسل دو اور کفن پہناؤ اور اس پر نماز جنازہ پڑھو، میں نے اسی طرح کیا۔ پھر اس کے بعد "البقرہ" وغیرہا میں اس مسئلہ پر (صحیح طرح) واقف ہوا جو کہ ابوالحسن اللخمی کی کتاب ہے اور اگر میں اس سے پہلے اس پر واقف ہو جاتا تو میں انہیں غسل نہ دیتا اور میں انہیں خون سمیت انہی کپڑوں میں دفن کر دیتا۔

مسئلہ نمبر 6۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونے اور اس میں شہادت پانے کا ثواب عظیم اور بہت زیادہ ہونے پر دلالت کرتی ہے یہاں تک کہ یہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہونا ہر شے کو مٹا دیتا ہے سوائے قرض کے اسی طرح مجھے جبریل امین علیہ السلام نے ابھی بتایا ہے(1)۔ ہمارے علماء نے کہا ہے کہ دین (قرض) کا ذکر اس پر تنبیہ ہے کہ وہ حقوق بھی اسی کے معنی میں ہیں جو ذمت سے متعلق ہیں۔ مثلاً غصب، باطل طریقے سے مال لینا، عمداً کسی کو قتل کرنا اور زخمی کرنا اور دیگر ایسے امور جو ان کے تابع ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک قرض کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے کہ اسے جہاد کے سبب نہ بخشا جائے کیونکہ وہ زیادہ شدید اور سخت ہے اور ان تمام میں قصاص نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ ہے جیسا کہ اس بارے میں سنت ثابتہ وارد ہیں۔

عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "اللہ تعالیٰ بندوں کو یا فرمایا لوگوں کو اٹھائے گا، ہمام کو شک ہے (کہ آپ نے لفظ العباد کہا یا الناس کہا) اور اپنے دست مبارک کے ساتھ شام کی طرف اشارہ کیا ننگے بدن، غیر مختون اور بہم۔ ہم نے عرض کی: بہم کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ان کیساتھ کوئی شے نہ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 135

ہوگی۔ پس انہیں ایسی آواز کے ساتھ ندا دی جائے گی جسے ہر قرب و بعد والا سنے گا میں بادشاہ ہوں، میں حاکم (اور) حساب لینے والا ہوں اہل جنت میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جنت میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل نار میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو اور اہل نار میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ وہ جہنم میں داخل ہو درآنحالیکہ اہل جنت میں سے کوئی اسے ظلم کے عوض طلب کر رہا ہو حتیٰ کہ ایک تھپڑ ہی ہو۔ راوی نے کہا ہم نے عرض کی: کیسے ممکن ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آئیں گے ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون۔

آپ نے فرمایا: ''نیکیوں اور برائیوں کے ساتھ (1)'' اسے حارثہ بن ابی اسامہ نے نقل کیا ہے۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ہی ساز و سامان۔ تو آپ نے فرمایا: ''بلاشبہ میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نمازیں، روزے اور زکوٰۃ وغیرہ (نیک اعمال) ساتھ لے کر آئے گا اور پھر ایک (آدمی) آئے گا (اور کہے گا) اس نے گالیاں دی ہیں (دوسرا آئے گا اور کہے گا) اس نے تہمت لگائی ہے (ایک اور آئے گا اور کہے گا) اس نے اس کا مال کھایا ہے، (ایک اور آکر کہے گا) اس نے اس کا خون بہایا ہے۔ (ایک اور آکر کہے گا) اس نے اسے مارا ہے۔ پس اسے اس کی نیکیوں میں سے دی جائیں گی اور دوسرے کو بھی اس کی نیکیاں دی جائیں گی پس اگر اس کی نیکیاں جو کچھ اس کے ذمہ ہے وہ پورا ہونے سے پہلے ختم ہوگئیں تو پھر ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے جائیں گے پھر اسے آتش جہنم میں پھینک دیا جائے گا (2)۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے دست قدرت میں میری جان ہے اگر کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیا جائے پھر اسے زندہ کیا جائے، پھر اسے قتل کیا جائے، پھر اسے زندہ کیا جائے پھر اسے قتل کیا جائے درآنحالیکہ اس پر قرض ہو تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ اس کی طرف سے ادا کر دیا جائے۔ (3)'' اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بندہ مؤمن کا نفس اس کے ساتھ معلق ہے جو اس پر قرض ہے۔ (4)'' اور احمد بن زہیر نے کہا ہے کہ انہوں نے حضرت یحییٰ بن معین سے اس حدیث کے بارے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: یہ صحیح ہے۔ اور اگر کہا جائے یہ تو اس پر دلالت کرتا ہے کہ بعض شہداء قتل کے وقت سے جنت میں داخل نہ ہوں گے اور نہ ان کی ارواح پرندے کے پیٹ میں ہوں گی جیسا کہ تم نے ذکر کیا ہے اور نہ ہی وہ اپنی قبور میں ہوں گے، تو پھر وہ کہاں ہوں گے؟ تو ہم نے کہا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث موجود ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شہداء کی ارواح جنت کے دروازے کے ساتھ ایک نہر پر ہوں گی اسے بارق کہا جاتا ہے۔ ان پر ان کا رزق صبح و شام جنت سے نکالا جاتا ہے (5)۔''

1۔ المستدرک، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 475، حدیث نمبر 3638
2۔ صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ، جلد 2، صفحہ 320،
3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 53
4۔ شعب الایمان، فی قبض الیدین الأموال المعرفة، جلد 4، صفحہ 401، حدیث نمبر 5543
5۔ مسند احمد بن حنبل، مسند عبد اللہ بن عباس، جلد 1، صفحہ 266

شاید یہ وہی ہوں۔ واللہ اعلم۔ اسی وجہ سے امام ابو محمد بن عطیہ نے کہا ہے: یہ طبقات اور مختلف احوال ہیں جن کا مجموعہ یہ ہے کہ وہ رزق دیئے جاتے ہیں۔

اور امام ابو عبداللہ بن محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی نے اپنی سنن میں حضرت سلیم بن عامر سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "سمندر کا ایک شہید خشکی کے دو شہیدوں کی مثل ہے اور سمندر میں (دو آدمی جس کا) سر چکرا رہا ہو وہ خشکی میں اس کی طرح ہے جو اپنے خون میں لت پت ہو اور جو دو موجوں کے درمیان ہو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں دنیا سے منقطع ہونے والے کی طرح ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ارواح کو قبض کرنے کے لئے ملک الموت کو مقرر فرمایا ہے سوائے سمندر میں شہید ہونے والوں کے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی ارواح کو خود قبض کرتا ہے اور خشکی کے شہید کے تمام گناہوں کی مغفرت فرما دیتا ہے سوائے قرض کے اور سمندر میں شہید ہونے والے کے تمام گناہ اور قرض بھی بخش دیتا ہے (1)۔"

مسئلہ نمبر 7۔ وہ قرض جس کے سبب مقروض کو جنت سے روک دیا جائے گا۔ واللہ اعلم وہ وہ ہے جس کو پورا کرنے کے لئے اس نے مال چھوڑا اور اس کے بارے وصیت نہ کی ہو یا وہ ادائیگی پر قادر ہو لیکن اس نے ادا نہ کیا اس نے اسراف یا بیوقوفی کی بنا پر قرض لیا اور مر گیا اور اسے ادا نہ کیا۔ اور رہا وہ آدمی جس نے واجب حق کو پورا کرنے کے لئے فاقہ کشی اور تنگ دستی کی وجہ سے قرض لیا اور مر گیا اور اس نے اسے ادا کرنے کے لئے کچھ نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت سے نہیں روکے گا ان شاء اللہ تعالیٰ، کیونکہ سلطان وقت پر فرض ہے کہ وہ اس کی طرف سے اس کا قرض ادا کرے، چاہے تو جملہ صدقات میں سے یا غارمین کے حصہ سے یا اس مال فئی سے جو مسلمانوں کو (صلح کے ساتھ) کہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرض یا عیال (محتاج) چھوڑی تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے ورثاء کے لئے ہے (2)۔" ہم نے اس باب کی مزید وضاحت کتاب "التذکرہ" میں کی ہے۔ والحمدللہ۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ اس میں مضاف محذوف ہے تقدیر عبارت ہے عند کرامۃ ربھم۔ اور یہاں عِنْدَ غایت قرب کا تقاضا کرتا ہے، پس یہ "لدی" کی طرح ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تصغیر نہیں بنائی گئی کہ کہا جائے! عُنَید، یہ سیبویہ نے کہا ہے۔ تو یہ غایت قرب (عندیہ) کرامت کے اعتبار سے ہے نہ کہ مسافت اور قرب کے اعتبار سے۔ اور يُرْزَقُوْنَ سے مراد وہ رزق ہے جو عرف میں معروف ہے اور جس نے کہا ہے: اس سے مراد حیات الذکر ہے اس نے کہا ہے کہ انہیں ثنا جمیل (اچھی تعریف) کا رزق دیا جاتا ہے۔

اور پہلا معنی حقیقت ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ارواح جس حالت میں جنت کی ہواؤں، خوشبوؤں، نعمتوں اور اس کی

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 204۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 2767، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الصدقات، جلد 1، صفحہ 176

ایضاً صحیح بخاری، باب من تکفل عن میت دینا فلیس لہ ان یرجع، حدیث 2133، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

فرحت وانبساط میں چلتی ہیں تو وہ ان چیزوں کا ادراک رکھتی ہیں جو ارواح کے لائق اور مناسب ہوتی ہیں، ان میں سے جن میں نفع اٹھایا جاسکتا ہے اور ان کے سبب زندہ اور بلند رہا جاسکتا ہے۔ اور رہیں لذات جسمانیہ تو ان ارواح کو جب ان کے اجساد کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ ان تمام نعمتوں سے پوری ہو جائیں گی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں۔ اور یہ اچھا قول ہے، اگرچہ اس میں مجاز کی نوع بھی ہے، اور یہ اس کے موافق ہے جو موقف ہم نے اختیار کیا ہے۔ والموفق الا لہ اور فَرِحِيْنَ۔ يُرْزَقُوْنَ کی ضمیر سے حال ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے۔ اور کلام میں أحیاء کی صفت ہونے کی بنا پر ''فرحون'' بھی جائز ہے اور یہ فرح بمعنی سرور سے ماخوذ ہے۔ اور اس آیت میں فضل سے مراد وہی مذکورہ نعمتیں ہیں۔ اور ابن السمیقع نے فَارِحِين کو الف کے ساتھ پڑھا ہے اور یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ الفرِہ اور الفارِہ، الحَذِر اور الحاذِر، الطَمِع اور الطَامِع اور البَخِلُ اور الباخِل۔ نحاس نے کہا ہے: غیر قرآن میں اس کا رفع پڑھنا جائز ہے، کیونکہ یہ احیاءؐ کی صفت ہو سکتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اس کا معنی ہے جو فضل میں ان سے نہیں آملے، اگرچہ ان کے لئے فضل (اور مرتبہ) ہے۔ اور (يَسْتَبْشِرُوْنَ) کی اصل البشرۃ سے ہے، کیونکہ انسان جب فرحت وانبساط میں ہوتا ہے تو خوشی اور سرور کا اثر اس کے چہرے میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور سدی نے کہا ہے: شہید کے پاس ایک کتاب لائی جاتی ہے جس میں اس کے بھائیوں میں سے اس کے پاس آنے والوں کا ذکر ہوتا ہے، تو وہ خوش ہو جاتا ہے جیسا کہ اہل غائب دنیا میں اس کے آنے کے ساتھ خوش ہوتا ہے (1)۔

اور حضرت قتادہ، ابن جریج اور ربیع وغیرہ نے کہا ہے: ان کا خوش ہونا یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارے وہ بھائی جنہیں ہم نے دنیا میں اپنے پیچھے چھوڑا وہ اپنے نبی کی معیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتال کر رہے ہیں اور شہید ہو رہے ہیں پس وہ بھی ہماری طرح کی عزت وکرامت پا رہے ہیں، پس وہ اسی کے سبب مسرور اور خوش ہو رہے ہیں (2)۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ لوگ ابھی پیچھے سے انہیں نہیں ملے ان کے لئے خوشی کے اظہار سے اشارہ تمام مومنین کی طرف ہے اگرچہ وہ قتل نہ کئے جائیں، کیونکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر وثواب کو دیکھتے ہیں تو انہیں یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ دین اسلام ہی وہ حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ اجر وثواب عطا فرمائے گا، پس وہ اپنے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل واحسان پر خوش ہوتے ہیں جو اس نے انہیں عطا فرمایا ہے اور وہ مومنین کے لئے بھی خوش ہوتے ہیں کہ نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اس معنی کو زجاج اور ابن فورک نے اختیار کیا ہے (3)۔

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

''خوش ہو رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل پر اور (اس پر) کہ اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرتا اجر ایمان والوں کا۔''

یعنی وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے جنت پر۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مغفرت (کے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 219　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 541، دار الکتب العلمیہ　3۔ ایضاً

حصول) پر (خوش ہو رہے ہیں) وَ فَضْلٍ یہ بیان کی زیادتی کے لئے ہے اور فضل بھی نعمت میں داخل ہے، اور اس میں اس (نعمت) کے وسیع ہونے پر دلیل ہے اور یہ کہ وہ نعمت دنیا کی نعمتوں کی طرح نہیں ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نعمت کے بعد فضل کا ذکر بطور تاکید ہوا ہے، ترمذی نے حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہید کی چھ خصلتیں ہیں، اسی طرح ترمذی میں ہے اور ابن ماجہ میں ''ست'' (چھ) ہیں اور یہ تعداد میں سات ہیں۔ اس کی پہلی ہی بار (خون کا قطرہ زمین پر گرتے وقت) مغفرت کر دی جاتی ہے اور وہ جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھ لیتا ہے اور اسے عذاب قبر سے بچا لیا جاتا ہے اور وہ بڑی گھبراہٹ سے محفوظ رہتا ہے اور اس کے سر پر یاقوت سے بنا ہوا وقار کا تاج رکھا جائے گا جو دنیا اور اس کی جملہ نعمتوں سے بہتر (اور ذی قدر) ہوگا اور حورعین میں سے بہتر کے ساتھ اس کی شادی کی جائے گی اور اس کے ستر رشتہ داروں کے حق میں اس کی شفاعت قبول کی جائے گی۔'' فرمایا یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے (1) اور یہی نعمت اور فضل کی تفسیر ہے۔

اور اس معنی میں آثار بہت زیادہ ہیں اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: تلواریں جنت کی چابیاں ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے شہداء کو پانچ کرامات کے ساتھ عزت و شرف عطا فرمایا ہے، اس نے ان کے ساتھ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو مشرف نہیں فرمایا اور نہ ہی مجھے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی ارواح ملک الموت نے قبض کی ہیں اور وہی عنقریب میری روح بھی قبض کرے گا اور رہے شہداء تو ان کی ارواح اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ قبض کرتا ہے جیسے چاہتا ہے اور ان کی ارواح پر ملک الموت علیہ السلام کو مسلط نہیں کرتا اور دوسری یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو وصال کے بعد غسل دیا گیا ہے اور مجھے بھی وصال کے بعد غسل دیا جائے گا لیکن شہداء کو غسل نہیں دیا جاتا اور نہ انہیں دنیوی پانی کی حاجت اور ضرورت ہے اور تیسری یہ کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو کفن دیئے گئے ہیں اور مجھے بھی کفن دیا جائے گا اور شہداء کو کفن نہیں دیا جائے گا بلکہ انہیں انہی کے کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے اور چوتھی یہ کہ انبیاء علیہم السلام جب فوت ہوئے تو انہیں اموات کا نام دیا گیا اور جب میرا وصال ہوگا تو کہا جائے گا قدمات (آپ فوت ہو گئے ہیں) لیکن شہداء کو موتی کا نام نہیں دیا جاتا اور پانچویں یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قیامت کے دن شفاعت کا اختیار دیا جائے گا اور میری شفاعت بھی قیامت کے دن ہوگی لیکن شہداء ہر روز ان کے بارے میں شفاعت کرتے ہیں جن کی وہ شفاعت کر سکتے ہیں۔

قولہ تعالیٰ: وَ اَنَّ اللّٰهَ کسائی نے اسے الف کے کسرہ کے ساتھ اِنَّ پڑھا ہے اور باقیوں نے نصب کے ساتھ، (2) پس جنہوں نے نصب کے ساتھ پڑھا ہے (تو اس کے مطابق) اس کا معنی یہ ہے یستبشرون بنعمة من الله ویستبشرون بأن الله لا یضیع أجر المؤمنین (وہ خوش ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اور اس پر وہ خوش ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مومنین کا

1۔ جامع ترمذی، فضائل الجہاد، جلد 1 صفحہ 200-199۔ ایضاً، ابن ماجہ، باب فضل الشہادۃ فی سبیل اللہ، حدیث 2788، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 401

اجر ضائع نہیں کرتا) اور جنہوں نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے تو وہ ابتدائے کلام میں آنے کی بنا پر ہے اور اس کی دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے وَاللّٰهُ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۲﴾

''جنہوں نے لبیک کہا اللہ اور رسول کی دعوت پر اس کے بعد کہ لگ چکا تھا انہیں (گہرا) زخم ان کے لئے جنہوں نے نیکی کی ان میں سے اور تقویٰ اختیار کیا اجر عظیم ہے۔''

اَلَّذِیْنَ مبتدا ہونے کی بنا پر محل رفع میں ہے، اور اس کی خبر مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ہے۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ محل جر میں ہو، اس صورت میں یہ الْمُؤْمِنِیْنَ سے یا بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا سے بدل ہوگا۔ اسْتَجَابُوْا یعنی اَجَابُوْا ہے اور اس میں سین اور تا دونوں زائدہ ہیں۔ اور اسی معنی میں یہ قول بھی ہے۔

فلم يستجبه عند ذاك مُجِيبُ

(پس اس وقت جواب دینے والے نے جواب نہ دیا)

اور صحیحین میں حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انہوں نے کہا: مجھے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا: تیرا باپ ان میں سے تھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا یہ مسلم کے الفاظ ہیں (1)۔

اور انہی کی وساطت سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: اے میرے بھانجے! تیرے دونوں باپ...... یعنی حضرت زبیر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما ...... ان میں سے تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہی اس کے بعد کہ انہیں گہرا زخم لگ چکا تھا اور انہوں نے فرمایا: جب مشرک میدان احد سے واپس لوٹے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو وہ مصیبت اور اذیت پہنچی جو انہیں پہنچی تو آپ کو خوف لاحق ہوا کہ (ممکن ہے) وہ واپس پلٹ آئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کون ان کے مقابلہ کی دعوت پر لبیک کہے گا تا کہ یہ جان لیں کہ ہمارے پاس قوت ہے؟'' پس حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما ان ستر افراد میں تھے جو اس کے لئے تیار ہوئے، چنانچہ یہ اس قوم کے پیچھے نکلے اور انہیں اپنی آواز پہنچائی اور اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس لوٹے۔ اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو غزوہ حمراء الاسد میں پیش آیا۔ اور یہ مدینہ طیبہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اور وہ اس طرح ہوا کہ جب اتوار کا دن تھا اور یہ غزوہ احد کا دوسرا دن تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں میں مشرکین کا پیچھا کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا: ''ہمارے ساتھ صرف وہی نکلے گا جو کل اس میں حاضر تھا۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مومنین میں سے دو سو آدمی اٹھے۔ بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''کون ان کے پیچھے جائے گا؟'' تو ان میں سے ستر آدمی تیار ہوئے۔ فرمایا:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، جلد 2، صفحہ 282۔ ایضاً صحیح بخاری، باب الذین استجابوا للہ والرسول، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ان میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے (1)، یہاں تک کہ آپ حمراء الاسد پہنچ گئے، دشمن کو ڈرانے اور خوفزدہ کرنے کے لئے، ان میں ایسا بھی تھا جو زخم لگنے کے سبب شدید تکلیف میں تھا وہ چلنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا اور وہ کوئی سواری بھی نہ پاتا تھا اور کبھی گھوڑے پر سوار ہوتا تھا اور یہ تمام کے تمام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی پیروی اور جہاد کی رغبت میں تھے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت بنی عبد الاشہل کے دو آدمیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ دونوں زخم لگنے کے سبب انتہائی کمزور اور نحیف تھے، ان میں سے ایک اپنے دوسرے ساتھی پر ٹیک اور سہارا لگا کر چلتا تھا اور یہ دونوں حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، پس جب حمراء الاسد پہنچے، تو نعیم بن مسعود ان سے ملا اور اس نے انہیں یہ خبر دی کہ ابو سفیان ابن حرب اور جو قریش کے افراد اس کے ساتھ ہیں وہ لشکر جرار کی صورت میں اکٹھے ہیں اور انہوں نے اپنی رائے کو اس پر پختہ کر لیا ہے کہ وہ مدینہ طیبہ کی طرف لوٹ کر آئیں اور وہاں کے باسیوں کو ہلاک و برباد کر دیں، تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے بارے خبر نہیں دی ہے: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ اور اسی اثنا میں کہ قریش اس رائے پر جمع ہو چکے تھے کہ اچانک ان کے پاس معبد الخزاعی آ گیا اور قبیلہ خزاعہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیف اور آپ کی نصیحتوں کا رازداں تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا حال اور جس کیفیت پر وہ تھے اسے دیکھ چکا تھا اور جب اس نے قریش کے واپس پلٹنے کے عزم کو دیکھا تا کہ وہ اہل مدینہ کو تباہ و برباد کر دے تو اسے اس کا خوف لاحق ہو گیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور آپ کے اصحاب کے لئے اس کے اخلاص نیت نے اسے اس سے برانگیختہ کیا کہ وہ قریش کو ڈرائے چنانچہ اس نے انہیں کہا: میں نے ابھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حمراء الاسد کے مقام پر بہت بڑے لشکر کی صورت میں چھوڑا ہے اور جو کوئی ان سے پیچھے رہ گیا تھا وہ بھی ان کے ساتھ جمع ہو چکا ہے اور وہ تم پر (غصہ سے) جلے ہوئے ہیں، پس تم بچ جاؤ بچ جاؤ! پس میں تجھے اس سے روک رہا ہوں، قسم بخدا! جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس نے مجھے اس پر ابھارا ہے کہ میں اس کے بارے کچھ اشعار لکھوں۔

اس (ابوسفیان) نے پوچھا: تو نے کیا کہا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے کہا ہے:

كَادَتْ تُهَدُّ مِنَ الْاَصْوَاتِ رَاحِلَتِيْ اِذْ سَالَتِ الْاَرْضُ بِالْجُرْدِ الْاَبَابِيْلِ

قریب تھا کہ میری سواری کا جانور لشکروں کے شور و غل کی ہولناکی کی وجہ سے گر پڑتا جب زمین پر جوق در جوق کم مو گھوڑوں کا سیلاب آ گیا۔

تُرْدِي بِاُسْدٍ كِرَامٍ لَا تَنَابِلَةٍ عند اللِّقَاءِ ولا مِيلٍ مَعَازيل

جو ایسے ذی شان شیروں کو اٹھائے دوڑ رہے تھے جو مقابلہ کے وقت نہ سست اور بزدل ہوں گے اور نہ ہتھیاروں سے خالی ہوں گے۔

فَظَلْتُ عَدْوًا اَظُنُّ الْاَرْضَ مَائِلَةً لَمَّا سَمَوْا بِرَئِيس غير مَخْذُول

1۔ صحیح بخاری، کتاب المغازی، جلد 2، صفحہ 584۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 3769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جب وہ گھوڑے ایک ایسے سردار کے ساتھ بلند ہوئے جو بے یارومددگار نہیں چھوڑا گیا تھا۔

تو میں تیز دوڑنے لگا، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جھکی جارہی ہے۔

فقلتُ وَیلَ ابنِ حرب مِنْ لَقَائِکُمْ اِذَا تَغَطْمَطَتِ الْبَطْحَاءُ بالخیل

میں نے کہا تمہاری ملاقات سے ابوسفیان بن حرب کے لئے ہلاکت ہے جب وادی بطحاء گھوڑوں سے تھرتھرا اٹھے گی۔

انی نَذِیْرٌ لأهل البَسْلِ ضَاحِیَةً لِکُلِّ ذی اِرْبَۃٍ منهم و معقولِ

بے شک میں سورج کی دھوپ میں چمکنے والی سرزمین کے رہنے والوں (یعنی قریش مکہ) میں سے ہر صاحب عقل و دانش کو ڈرانے والا ہوں۔

مِنْ جَیْشِ اَحْمَدَ لا وخش قَنَابِلُهُ و لَیْسَ یُوْصَفُ ما اَنْذَرْتُ بِالْقِیلِ (1)

(سیدنا) احمد (مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم) کے لشکر سے جو ست اور کوتاہ قد نہیں ہیں اور جس بات سے میں نے ڈرایا ہے اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

پس اس طرح اس نے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو واپس لوٹا دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور وہ ڈرتے ہوئے تیزی کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ آئے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ہمراہ اس حال میں مدینہ منورہ کی طرف لوٹے کہ آپ کی مدد و نصرت فرمائی گئی تھی۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ اس میں سوء سے مراد قتال اور رعب ہے (آل عمران: 174) ("ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ" واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے) اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی معیت میں نکلنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت عطا فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ اس واپس پلٹنے کے ساتھ انہیں اجر عظیم حاصل ہوا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ یہ غزوہ ہے۔"

یہی جمہور نے اس آیت کی تفسیر کی ہے اور حضرت مجاہد اور عکرمہ رحمۃ اللہ علیہما کا قول شاذ ہے ان دونوں نے کہا ہے: بے شک یہ آیت اس قول میں سے ہے: اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ...... تا قولہ...... عَظِیْمٍ۞ یہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر صغریٰ کی جانب خروج کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نکلے ابوسفیان کے اس وعدہ کے مطابق جو اس نے میدان احد میں کیا تھا، کیونکہ اس نے کہا تھا: آنے والے سال ہمارا مقابلہ میدان بدر میں ہوگا، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم جواباً کہو: ہاں (ہمیں منظور ہے۔) پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں بہت بڑی منڈی لگی ہوئی تھی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو دراہم عطا فرمائے۔" اور آپ بدر کے قریب جا پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نعیم بن مسعود اشجعی آیا اور اس نے آپ کو خبر دی کہ قریش جمع ہو چکے ہیں اور آپ کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے آئے

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 224

ہوئے ہیں وہ اور جوان کی طرف منسوب ہیں، پس اس وجہ سے مسلمان خوفزدہ ہو گئے، لیکن انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ پس وہ چلتے رہے یہاں تک کہ بدر میں پہنچ گئے۔ اور وہاں کسی ایک کو بھی نہ پایا۔ اور انہوں نے منڈی اور بازار لگا ہوا پایا پس انہوں نے اپنے دراہم کے ساتھ کچھ چمڑہ اور سامان تجارت خریدا اور واپس لوٹ گئے۔ اور انہوں نے کوئی جنگ اور مکر نہ پایا اور اپنی تجارت میں نفع کمایا، پس اسی لئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ یعنی ان تجارات میں فضل و احسان کے ساتھ واپس لوٹے (1)۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کہا انہیں لوگوں نے کہ بلاشبہ کافروں نے جمع کر رکھا ہے تمہارے لئے (بڑا سامان اور لشکر) سو ڈرو ان سے (اس دھمکی نے) بڑھا دیا ان کے (جوش) ایمان کو اور انہوں نے کہا: کافی ہے ہمیں اللہ تعالیٰ اور وہ بہترین کارساز ہے۔"

اس قول باری تعالیٰ: اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ میں اختلاف کیا گیا ہے۔ پس حضرت مجاہد، مقاتل، عکرمہ اور کلبی رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: وہ (کہنے والا) نعیم بن مسعود اشجعی تھا (2)۔ یہ لفظ عام ہے اور اس کا معنی خاص ہے، جیسا کہ یہ ارشاد گرامی ہے: اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ یعنی (الناس سے مراد) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سدی نے کہا: وہ ایک اعرابی تھا جس کے لئے اس کام پر اجرت مقرر کی گئی تھی۔ اور ابن اسحاق اور ایک جماعت نے کہا ہے: الناس سے مراد عبدالقیس کے سواروں کا قافلہ ہے، وہ ابوسفیان کے پاس سے گزرے تو اس نے انہیں مسلمانوں کی طرف ایک سازش کے تحت بھیجا تا کہ وہ انہیں اس سے باز رکھیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں الناس سے مراد منافقین ہیں۔ سدی نے کہا ہے: جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ابوسفیان کی مقرر کردہ میعاد کے مطابق بدر الصغریٰ کی طرف چلنے کے لئے تیار ہوئے تو ان کے پاس منافقین آئے اور انہوں نے کہا: ہم تمہارے وہی ساتھی ہیں جنہوں نے تمہیں ان کی طرف نکلنے سے منع کیا تھا اور تم نے ہماری تجویز نہ مانی تھی اور پھر انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں میں آ کر قتل کیا اور وہ کامیاب ہوئے اور اگر تم ان کے پاس ان کے گھروں میں گئے تو تم میں سے کوئی ایک بھی واپس لوٹ کر نہیں آئے گا۔ تو انہوں نے کہا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (ہمیں اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) اور ابو معشر نے کہا ہے: اہل تہامہ میں سے قبیلہ ہذیل کے کچھ لوگ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے ابوسفیان کے بارے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا: قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ تحقیق کافروں نے تمہارے لئے بہت بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے۔ فَاخْشَوْهُمْ پس تم ان سے ڈرو اور تم ان سے بچو، کیونکہ تمہارے پاس ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔ اس باب میں ان اقوال کی بنا پر ہی الناس جمع ہے۔ واللہ اعلم۔

قولہ تعالیٰ: فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا یعنی لوگوں کے قول نے از روئے ایمان کے ان میں اضافہ کر دیا، یعنی اپنے دین کے بارے

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 543، دار الکتب العلمیہ	2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 402

میں تصدیق اور یقین، اپنی مدد و نصرت پر پختہ وثوق اور قوت و جرأت اور استعداد کے اعتبار سے ان میں اضافہ ہو گیا۔ پس ان معنی کی بنا پر ایمان میں زیادتی سے مراد اعمال میں زیادتی ہے۔ علماء کا ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اور اس بارے میں کئی اقوال ہیں اور اس بارے میں عقیدہ یہ ہے کہ نفس ایمان جو کہ ایک تاج ہے اور کسی بھی شے کی ایک تصدیق ہے بلاشبہ یہ مفرد معنی ہے جب یہ حاصل ہو جائے تو اس میں کوئی زیادتی اور اضافہ داخل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس میں سے کوئی شے باقی رہ جاتی ہے جب یہ زائل ہو جائے۔ پس کچھ باقی نہ رہا سوائے اس کے کہ زیادتی اور کمی ایمان کے متعلقات میں ہوتی ہے نہ کہ اس کی ذات میں۔ پس علماء کی ایک جماعت نے یہ موقف اپنایا ہے کہ ایمان ان اعمال کے اعتبار سے زیادہ یا کم ہوتا ہے جو اس سے صادر ہوتے ہیں، بالخصوص بہت سے علماء اسم ایمان کا اطلاق طاعات پر کرتے ہیں، اس وجہ سے کہ حضور نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ایمان کے ستر سے کچھ زائد باب ہیں ان میں سے اعلیٰ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنا ہے اور ان میں سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا ہے(1)'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور مسلم نے یہ اضافہ بھی ذکر کیا ہے: ''اور حیاء ایمان کا ایک شعبہ ہے(2)''۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے: ایمان دل میں ایک سفید نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جب بھی ایمان میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے اور آپ کا قول لُمَظَة اس کے بارے اصمعی نے کہا ہے: نقطہ اور اس کی طرح کی سفیدی ہے اور اسی سے کہا گیا ہے: فرس المظ جب گھوڑے کے ہونٹ میں سفیدی ہو اور محدثین کہتے ہیں لَمظة فتحہ کے ساتھ۔ البتہ کلام عرب میں یہ ضمہ کے ساتھ ہے، مثلاً شُبهة، دهمة اور خُمرة۔ اور اس میں ان کے خلاف حجت اور دلیل ہے جو ایمان کے زیادہ اور کم ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ کیا آپ انہیں دیکھ نہیں رہے وہ کہتے ہیں جب بھی ایمان بڑھتا ہے تو وہ نقطہ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سفید ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح نفاق دل میں ایک سیاہ نقطہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب بھی نفاق بڑھتا ہے تو دل سیاہ ہوتا ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ان میں سے جنہوں نے یہ کہا ہے کہ ایمان عرض ہے اور یہ دو زمانوں میں ثابت نہیں رہتا اور یہ حضور نبی کریم ﷺ اور صلحاء کے لئے یکے بعد دیگرے قائم رہتا ہے، پس مومن کے دل میں اس کی امثال کے لگاتار اور تسلسل کے ساتھ قائم رہنے کے اعتبار سے اور بالدوام اس کے موجود رہنے کے اعتبار سے یہ بڑھتا ہے۔ اور مومن کے دل پر لگاتار اور مسلسل غفلتیں پڑنے کے سبب یہ کم ہو جاتا ہے، اس کی طرف ابو المعالی نے اشارہ کیا ہے۔

اور یہ معنی حدیث شفاعت میں موجود ہے، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اسے مسلم نے نقل کیا ہے(3)۔ اس میں ہے: ''پس مومنین عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہمارے بھائی روزے رکھتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے اور حج کرتے تھے تو انہیں کہا جائے گا جنہیں پہچانتے ہو نکال لاؤ پس ان کی صورتیں آتش جہنم پر حرام کر دی جائیں گی اور خلق کثیر نکال لی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الایمان، جلد 2، صفحہ 86۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث 2539، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 47

3۔ صحیح بخاری، کتاب التوحید، حدیث نمبر 6886، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائے گی درآنحالیکہ اسے آگ نصف پنڈلی اور اس کے گھٹنے تک پکڑے ہوئے تھی پھر وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ان میں سے کوئی باقی نہیں رہا ہے تو رب کریم فرمائے گا لوٹ کر جاؤ اور جس کے دل میں تم ایک دینار برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ چنانچہ وہ بہت سی مخلوق کو نکالیں گے پھر وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے ان میں سے کوئی ایک بھی اس میں نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا ہے پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ کر جاؤ اور تم جس کے دل میں نصف دینار کے برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے نکال لو چنانچہ وہ خلق کثیر کو نکالیں گے پھر عرض کریں گے اے ہمارے رب! ہم نے اس میں ان میں سے کوئی بھی نہیں چھوڑا جن کے بارے تو نے ہمیں حکم دیا، پھر رب کریم فرمائے گا: تم لوٹ جاؤ اور جس کے دل میں تم ذرہ برابر خیر اور نیکی پاؤ تو اسے بھی نکال لاؤ (1)۔'' اور آگے پوری حدیث ذکر کی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس حدیث میں ایمان سے مراد دلوں کے اعمال ہیں، مثلاً نیت، اخلاص، خوف اور نصیحت اور ان کے مشابہ اعمال۔ اور ان کا نام ایمان رکھا ہے کیونکہ یہ محل ایمان میں ہیں یا ایمان سے مراد عادت عرب کے مطابق تسمیۃ الشئی باسم الشئی ہے جبکہ یہ اس کے مشابہ اور مجاور ہو یا یہ اس کے سبب ہو۔ اس تاویل کی دلیل شفاعت کرنے والوں کا وہ قول ہے جو انہوں نے ان لوگوں کو نکالنے کے بعد کہا جن کے دلوں میں ذرہ برابر بھی خیر اور نیکی ہوگی: لم نذر فیھا خیرا (ہم نے اس میں کوئی خیر نہیں چھوڑی) باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان میں سے جمع کثیر کو نکالے گا جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں اور وہ قطعاً یقیناً مومن ہیں اور اگر وہ مومن نہ ہوتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ انہیں نہ نکالتا۔

پھر اگر وہ وجود اول معدوم ہو جائے جس پر اس کی مثل مرتب ہوتا ہے تو یہ نہ زیادتی ہے اور نہ نقصان۔ اور اس کا اندازہ حرکت میں لگایا گیا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے علم مفرد پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کی معلومات پیدا کیں تو اس کا علم زیادہ ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ امثال کو معدوم کر دے تو وہ کم ہو گیا، یعنی زیادتی زائل ہو گئی اور اسی طرح جب اس نے حرکت کو پیدا کیا اور اس کے ساتھ اس کی مثل یا امثال کو پیدا کیا۔

اور علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ ایمان کی زیادتی اور کمی یہ ادلہ کے اعتبار سے ہے، پس ایک کے پاس دلائل زیادہ ہوتے ہیں تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: یہ ایمان میں زیادتی ہے، اس کے معنی کے مطابق .... کئی اقوال پر انبیاء علیہم السلام کو دوسری مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے، کیونکہ وہ اسے وجوہ کثیرہ سے جانتے ہیں اور وہ ان وجوہ سے کہیں زیادہ ہیں جن کے سبب مخلوق اسے جانتی ہے اور یہ قول آیت کے مقتضیٰ سے خارج ہے، کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں زیادتی ادلہ کے اعتبار سے ہو۔

اور ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ ایمان میں زیادتی حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فرائض واخبار کے نزول کے اعتبار سے ہے اور گزرے ہوئے زمانے میں جہالت کے بعد ان کی معرفت کے اعتبار سے ہے اور بلاشبہ یہی ایمان کی زیادتی ہے، پس اس بارے میں یہ قول کہ ایمان زیادہ ہوتا ہے یہ قول مجازی ہے اور اس تعریف پر اس میں کمی کا تصور نہیں کیا جا سکتا،

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 103

بلکہ معلوم کی طرف اضافت کے اعتبار سے اس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ فاعلم۔

قولہ تعالیٰ: وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ۝ یعنی انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور حسب یہ احساب سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی کفایت ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

فتملأ بیتنا إقطا و سمنا و حسبك من غنى شِبَعٌ و رِيٌّ

اس میں حَسْبُكَ کا معنی ہے تیرے لئے کافی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قول باری تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖۗ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ۝ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے یہ اس وقت کہا جب انہیں آگ میں پھینکا گیا اور حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اس وقت کہا جب انہیں لوگوں نے کہا: بے شک کافر تمہارے لئے بہت سے لوگوں کو (لشکر جرار کو) جمع کیے ہوئے ہیں (1)۔ واللہ اعلم۔

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ۝

''(ان کے عزم و توکل کا نتیجہ یہ نکلا کہ) واپس آئے یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ نہ چھوا ان کو کسی برائی نے اور پیروی کرتے رہے رضائے الٰہی کی اور اللہ تعالیٰ صاحب فضل عظیم ہے۔''

ہمارے علماء نے کہا ہے: جب انہوں نے اپنے امور کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا اور اپنے دلوں سے اس پر اعتماد کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں چار طرح کی جزا عطا فرمائی: (یعنی) نعمت، فضل، برائی کو ان سے پھیر دینا اور رضا کی پیروی کرنا۔ پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رضا عطا فرمائی اور وہ ان سے راضی ہو گیا۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۝

''یہ تو شیطان ہے جو ڈراتا ہے (تمہیں) اپنے دوستوں سے پس نہ ڈرو ان سے بلکہ مجھ سے ہی ڈرا کرو اگر تم مومن ہو۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے: اس کا معنی ہے یخوفکم اولیاءہ یعنی وہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے دوستوں کے ساتھ یا اپنے دوستوں سے (2)، اس سے حرف جر (با یا من) حذف کر دیا گیا ہے اور فعل کو اسم کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور اسے (اسم کو) نصب دی گئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لِیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا، ای لِیُنْذِرَكُمْ بِبَاْسٍ شَدِیْدٍ (تاکہ وہ تمہیں ڈرائے شدید قوت کے ساتھ) یعنی وہ مومن کو کافر سے ڈراتا ہے۔ اور حسن اور سدی نے کہا ہے: اس کا معنی ہے وہ اپنے منافق دوستوں کو ڈراتا ہے، تاکہ وہ مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے سے بیٹھ جائیں (3) اور رہے اللہ تعالیٰ کے دوست تو وہ اس سے نہیں ڈرتے جب وہ انہیں ڈرائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ جو تمہیں کفار کے اجتماع سے ڈرا رہا ہے وہ انسانی

1۔ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، جلد 2، صفحہ 655 2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 403 3۔ ایضاً، جلد 1-2، صفحہ 404

شیطانوں میں سے ایک شیطان ہے، چاہے وہ نعیم بن مسعود ہو یا کوئی اور، اس اختلاف کی بنا پر جو پہلے گزر چکا ہے۔ فَلَا تَخَافُوْهُمْ یعنی تم ان کافروں سے نہ ڈرو جن کا ذکر اس قول میں کیا گیا ہے: اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ یا (هم ضمیر) اولیاء کی طرف لوٹ رہی ہے اگر تو کہے کہ معنی یہ ہے وہ تمہیں اپنے دوستوں کے ساتھ ڈراتا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ خَافُوْنِ یعنی میرا حکم چھوڑنے میں تم مجھ سے ڈرو اگر تم میرے وعدہ کی تصدیق کرتے ہو اور کلام عرب میں خوف سے مراد گھبراہٹ ہے۔ اور خَاوَفَنِي فلان فَخُفْتُه (ڈرنے میں فلاں نے مجھ سے مقابلہ کیا تو میں اس پر ڈرنے میں غالب آ گیا) یعنی میں اس کی نسبت زیادہ ڈرا۔ اور الخوفاء ایسا جنگل جس میں پانی نہ ہو۔ اور کہا جاتا ہے: ناقةٌ خَوفاء یعنی ایسی اونٹنی جس کا دودھ خشک ہو جائے اور الخافةُ سے مراد چمڑے کا وہ تھیلا ہے جس میں شہد حاصل کیا جاتا ہے۔ (یا چمڑے کا وہ لباس جو شہد اتارتے وقت پہنا جاتا ہے)

حضرت سہل بن عبد اللہ نے بیان کیا ہے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس بعض صدیقین جمع ہوئے اور پوچھا: خوف کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا: تو امن و سکون نہ پائے یہاں تک کہ تو امن والی جگہ پر پہنچ جائے۔ حضرت سہل نے کہا ہے: حضرت ربیع بن خثیم جب لوہار کی بھٹی کے پاس سے گزرتے تو اس کو ڈھانپ دیا جاتا تھا، تو حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اس بارے بتایا گیا تو آپ نے فرمایا: جب وہ وہاں پہنچیں تو مجھے آگاہ کرنا۔ پس وہ وہاں پہنچے تو لوگوں نے آپ کو اطلاع دی، چنانچہ آپ وہاں آئے اور اپنا ہاتھ ان کی قمیص میں داخل کیا تو آپ نے ان کی (دل کی) حرکت کو بڑا تیز اور بلند پایا تو فرمایا: میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ تمہارے اہل زمانہ سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا وہ ہے کہ وہ اس سے ڈرے کہ اللہ تعالیٰ اسے سزا دے گا چاہے دنیا میں یا آخرت میں اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے: ڈرنے والا وہ نہیں ہے جو رو رہا ہو اور اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہو بلکہ ڈرنے والا وہ ہے جو اسے چھوڑ دے جس کے بارے وہ خوف رکھتا ہو کہ اس سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں پر فرض کر دیا ہے کہ وہ اس سے ڈریں چنانچہ ارشاد فرمایا: وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اور فرمایا وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ۝ (البقرہ) (اور صرف مجھی سے ڈرا کرو) اور مومنین کی خوف کے سبب مدح کرتے ہوئے فرمایا: يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ (النحل:50) (ڈرتے ہیں اپنے رب کی قدرت سے) اور ارباب اشارات کی خوف کے بارے میں کئی عبارات ہیں جن کا مرجع وہ ہے جو ہم نے ذکر کر دیا ہے۔

الاستاذ ابو علی الدقاق نے کہا ہے: میں ابو بکر بن فورک رحمۃ اللہ علیہ کی عیادت کرنے کے لیے گیا، پس جب انہوں نے مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، تو میں نے ان سے کہا: بلاشبہ اللہ تعالیٰ آپ کو عافیت اور شفا عطا فرمائے گا، تو انہوں نے مجھے کہا: کیا تو یہ گمان کر رہا ہے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں؟ بلاشبہ میں تو موت کے بعد والی کیفیت سے ڈر رہا ہوں۔ اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں تم نہیں دیکھ سکتے اور میں جو سن رہا ہوں وہ تم نہیں سن سکتے۔ آسمان چرچرا رہا ہے اور اس کے لئے لازم کیا گیا ہے کہ وہ چرچرائے اس میں چار انگلیاں رکھنے کے برابر بھی کوئی جگہ نہیں ہے مگر اس میں فرشتے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہوئے اپنی

پیشانی رکھے ہوئے ہیں قسم بخدا! اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں تو یقیناً تم بہت تھوڑا ہنسو اور تم بہت زیادہ رو۔ اور تم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو اور یقیناً تم دشوار گزار گھاٹیوں کی جانب نکل جاؤ جہاں تم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع اور عاجزی کرتے ہوئے دعا مانگو قسم بخدا! میں تو یہ پسند کرتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا ہے (1)۔'' اسے ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے: حدیث حسن غریب (یہ حدیث حسن غریب ہے) اور اس سند کے علاوہ اور سے روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: لوددتُ أن كنت شجرة تُعضَدُ، (2) واللہ اعلم۔

وَ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْـًٔا ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۷۶﴾

''اور (اے جان عالم) نہ غمزدہ کریں آپ کو جو جلدی سے کفر میں داخل ہوئے ہیں بے شک یہ لوگ نہیں نقصان پہنچا سکتے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کہ نہ رکھے ان کے لئے ذرا حصہ آخرت (کی نعمتوں) سے اور ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔''

قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ یہ ایک قوم تھی جو اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے مشرکین کے خوف سے، تو حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم مغموم ہو گئے، پس اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ اور کلبی نے کہا ہے: اس سے مراد منافقین اور یہود کے سردار ہیں، انہوں نے کتاب میں موجود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کو چھپا لیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے: جب اہل کتاب ایمان نہ لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ شاق گزرا، کیونکہ لوگ ان کی طرف دیکھتے اور یہ کہتے: بلاشبہ یہ اہل کتاب ہیں، پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول حق ہوتا تو یقیناً یہ آپ کی اتباع اور پیروی کرتے، پس یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَا یَحْزُنْكَ حضرت نافع کی قرأت میں یاء مضموم اور زا مکسور ہے، جہاں بھی واقع ہو سوائے (سورۃ) انبیاء کے لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ۔ کیونکہ اس میں یا مفتوح اور زا مضموم ہے (3)۔ اور ابو جعفر نے اس کا برعکس کیا ہے۔ ابن محیصن نے تمام جگہوں پر یا کو ضمہ کے ساتھ اور زا کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی تمام نے یا کو فتحہ اور زا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور یہ دونوں لغتیں ہیں۔ حَزَنَنِی الأمر یَحْزُنُنِیْ اور اَحْزَنَنِیْ بھی ہے اور یہ قلیل لغت ہے اور دونوں میں سے پہلی افصح ہے، نحاس نے یہی کہا ہے۔

اور شاعر نے اُحزن کے بارے کہا ہے:

مَضَى صَحْبِی وَأَحْزَنَنِی الدِّيَارُ

(میرے ساتھی چلے گئے اور گھروں نے مجھے غمزدہ کر دیا)

1۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزہد، جلد 1، صفحہ 319۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 4179، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 55

3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 404،

اور عام قرأت یُسَارِعُوْنَ ہے اور طلحہ نے یُسْرِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ پڑھا ہے۔

حضرت ضحاک نے کہا ہے: مراد کفار قریش ہیں (1)۔ اور ان کے سوانے کہا ہے: وہ منافق ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے: وہ وہی ہیں جن کا ذکر ہم نے پہلے کر دیا ہے۔ اور یہ قول بھی ہے: یہ تمام کفار کے لئے عام ہے۔ اور ان کا تیزی کے ساتھ کفر میں جانا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مظاہرہ کرنا ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: کافر کے کفر پر غمزدہ ہونا طاعت ہے، لیکن حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے کفر پر بہت زیادہ غمزدہ ہوتے تھے، تبھی آپ کو اس سے منع کر دیا گیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: **فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ** (فاطر: 8) (پس نہ گھلے آپ کی جان ان کے لئے فرط غم سے) اور فرمایا: **فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا** (الکہف) (تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے۔)

اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ملک اور اس کی سلطنت اور اقتدار میں سے کسی شے کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یعنی ان کے کفر کے سبب کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے اور انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان روایات میں نقل کی ہے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے روایت کیا ہے (یعنی حدیث قدسی ہے) کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اے میرے بندو! بلاشبہ میں نے ظلم اپنی ذات پر حرام قرار دیا ہے اور میں نے اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے پس تم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام گمراہ ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے ہدایت دی پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمہیں ہدایت عطا فرماؤں گا۔ اے میرے بندو! تم تمام کے تمام بھوکے ہو سوائے اس کے جسے میں نے کھانا کھلایا پس تم مجھ سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا (یعنی رزق عطا فرماؤں گا) اے میرے بندو! تم تمام کے تمام ننگے ہو سوائے ان کے جنہیں میں نے لباس پہنایا پس تم مجھ سے لباس کا مطالبہ کیا کرو تا کہ میں تمہیں لباس پہناؤں۔

اے میرے بندو! بلاشبہ تم رات دن گناہ اور خطائیں کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخش دیتا ہوں پس تم مجھ سے مغفرت طلب کرو میں تمہاری مغفرت فرما دوں گا۔ اے میرے بندو! بلاشبہ تم میرے نقصان تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ اور تم میرے نفع تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے کوئی نفع پہنچاؤ۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول، تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن تمام تم میں سے ایک انتہائی متقی دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو اس طرح وہ میرے ملک میں کسی شے کا کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن سارے کے سارے ایک فاجر ترین دل رکھنے والے آدمی کی کیفیت پر ہوں تو وہ میرے ملک اور اقتدار میں کسی قسم کی کمی اور نقصان نہیں کر سکتے۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور تمہارے آخر، تمہارے انسان اور تمہارے جن ایک ہی سرزمین میں کھڑے ہو جائیں اور وہ مجھ سے سوال کریں اور میں ہر انسان کو اس کی طلب اور حاجت کے مطابق عطا کروں تو جو کچھ

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405

میرے پاس ہے اس میں کمی واقع نہ ہوگی مگر اسی طرح جیسے سوئی کمی کرتی ہے جب اسے سمندر میں داخل کیا جائے۔ اے میرے بندو! بلاشبہ یہ تمہارے اعمال ہیں میں انہیں تمہارے لئے شمار کرتا رہتا ہوں پھر میں تمہیں ان کا پورا پورا اجر دوں گا پس جو کوئی خیر اور نیکی پائے تو اسے چاہئے کہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے اور جو کوئی اس کے سوا پائے تو وہ اپنے نفس کے سوا کسی کو ملامت نہ کرے (1)۔" اسے مسلم نے اپنی صحیح میں اور ترمذی وغیرہما نے روایت کیا ہے اور یہ عظیم حدیث ہے اس میں طوالت ہے تمام کی تمام لکھی جاتی ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا کا معنی ہے یعنی وہ اولیاء اللہ کو نقصان نہیں پہنچا سکتے جب وہ ان کی مدد ترک کر دیں جبکہ اللہ تعالیٰ ان کا ناصر اور مددگار ہے (2)۔

قولہ تعالیٰ: يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ حظا کا معنی حصہ ہے اور الحظ کا معنی النصیب والجدّ (حصہ) ہے۔ کہا جاتا ہے: فلان احظ من فلان، وھو محظوظ۔ فلاں فلاں کی نسبت حصہ کا زیادہ حق رکھتا ہے اور اسے حصہ دیا گیا ہے اور حظ کی جمع خلاف قیاس أحاظٍ آتی ہے۔ ابوزید نے کہا ہے: کہا جاتا ہے جل حظیظ ای جدید جب وہ رزق میں حصہ دار ہو۔ اور حَظِظْتُ فی الأمر أحَظ۔ میں نے کام میں خوب حصہ لیا۔ بسا اوقات حظ کی جمع أحُظّا بھی آتی ہے۔ (معنی یہ ہے) اللہ تعالیٰ جنت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں رکھے گا، اور یہ اس بارے میں نص ہے کہ خیر اور شر اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

"بے شک جنہوں نے خرید لیا کفر کو ایمان کے عوض میں ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے اللہ تعالیٰ کو کچھ بھی اور ان کے لئے درد ناک عذاب ہے۔"

قولہ تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا اسے تاکید کے لئے مکرر لایا گیا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یعنی ایمان کو کفر کے ساتھ تبدیل کرنا اور اس کے عوض اسے بیچنا یہ اس کی بری تدبیر میں سے ہے، (اور اس کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) پس اسے اس کی اطاعت نہ کرنے کا کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی اس کی تدبیر کا کوئی خوف ہے اور شَيْـًٔا دونوں آیتوں میں مصدر کی جگہ واقع ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، گویا کہ یہ فرمایا: لن یضروا اللہ ضررا قلیلا و لا کثیرا (وہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز تھوڑا یا زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے) اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ باکو حذف کرنے کی تقدیر پر منصوب ہو، گویا کہ فرمایا: لن یضروا اللہ بشئ۔

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۚ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ

1۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2، صفحہ 319۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب ما جاء فی صفۃ اوانی الحوض، حدیث 2419، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405

لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

''اور نہ خیال کریں جو کفر کر رہے ہیں کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے صرف اس لئے ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ اور زیادہ کر لیں گناہ اور ان کے لئے عذاب ہے ذلیل وخوار کرنے والا۔''

قولہ تعالیٰ: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ املاء سے مراد عمر کا طویل ہونا اور زندگی کا کشادہ اور خوشحال ہونا ہے اور معنی یہ ہے: وہ لوگ خیال نہ کریں جو مسلمانوں کو خوفزدہ کر رہے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے اور بلاشبہ وہ انہیں طویل عمریں عطا کر رہا ہے تاکہ وہ معاصی اور گناہ کے اعمال کریں اس لئے نہیں کہ وہ ان کے لئے باعث خیر ونفع ہے اور کہا جاتا ہے: اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ سے مراد وہ فتح اور کامیابی ہے جو انہوں نے غزوہ احد میں حاصل کی وہ ان کے نفسوں کے لئے باعث خیر ونفع نہیں، بلکہ وہ اس لئے ہے تاکہ وہ سزا میں اور اضافہ کر لیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: کوئی نیکوکار اور فاجر نہیں ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے، کیونکہ اگر وہ نیکوکار ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ۔

اور اگر وہ فاجر ہو تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (1) (ہم تو انہیں مہلت دے رہے ہیں کہ وہ گناہ اور زیادہ کر لیں) ابن عامر اور عاصم نے لَا يَحْسَبَنَّ یا کے ساتھ اور سین کے نصب کے ساتھ قرأت کی ہے (2)۔ اور حمزہ نے تا کے ساتھ اور سین کو منصوب پڑھا ہے (3) (یعنی لا تَحْسَبَنَّ) اور باقیوں نے یا کے ساتھ اور سین کو مکسور پڑھا ہے، پس جنہوں نے یا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس کے مطابق الذین فاعل ہے۔ یعنی کفار خیال نہ کریں۔ اور اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور ما بمعنی الذی ہے، اور ضمیر عائد محذوف ہے، اور خیر، أن کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ ما مقدر ہو اور فعل مصدر ہو، اور تقدیر کلام اس طرح ہو ولا یحسبن الذین کفروا أن املاءنا لهم خیر لانفسهم۔ (اور کافر لوگ خیال نہ کریں کہ ہمارا ان کو مہلت دینا ان کے لئے بہتر ہے) اور جنہوں نے تا کے ساتھ پڑھا ہے تو اس میں فاعل ضمیر خطاب ہے، اور (مخاطب) حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور الذین کو تحسب کا مفعول اول ہونے کی بنا پر نصب دی گئی ہے اور أنّ اور اس کا مابعد الذین سے بدل ہے، اور یہ قائم مقام دو مفعولوں کے ہو جائے گا جیسا کہ یہ بدل نہ ہونے کی صورت میں قائم مقام ہے۔ اور ان اور اس کا مابعد تحسب کا مفعول ثانی بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس باب میں مفعول ثانی ہی معنی میں اول ہوتا ہے، کیونکہ حسب اور اس کے اخوات مبتدا اور خبر پر داخل ہوتے ہیں۔ پس تقدیر کلام ہو گی: ولا تحسبن أنما نملی لهم خیر۔ یہ زجاج کا قول ہے اور ابوعلی کا قول ہے: اگر یہ صحیح ہوتا تو کہتا خیراً یعنی نصب کے ساتھ، کیونکہ أنّ، الذین کفروا سے بدل ہو جائے گا، تو گویا یہ کہا: لا تحسبن املاء الذین کفروا خیرا (یعنی تم کافروں کی مہلت کو بہتر اور خیر خیال نہ کرو) تو اس میں قولہ خیرا حسب کے لئے مفعول ثانی ہے۔ تب یہ جائز نہیں ہے کہ لا تحسبن تا کے ساتھ پڑھا جائے مگر اس صورت میں کہ أنّما میں إنّ کو کسرہ دیں اور خیرا کو نصب دیں (4)، اور حمزہ سے یہ مروی نہیں ہے اور حمزہ کی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 545

قرأت تا کے ساتھ ہے، نتیجتاً یہ قرأت صحیح نہ ہوگی۔

اور فراء اور کسائی نے کہا ہے: حمزہ کی قرأت تکریر کی بنا پر جائز ہے، اس کی تقدیر عبارت ہے ولا تحسبن الذین کفروا، ولا تحسبن أنما نملی لھم خیر، پس اس میں أن دوسرے تحسب کے لئے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے، اور یہ اور جس نے عمل کیا ہے (مراد عامل تحسب ہے) وہ پہلے تحسب کا مفعول ثانی ہے۔ علامہ قشیری نے کہا ہے: یہ اس کے زیادہ قریب ہے جو زجاج نے بدل کے دعویٰ میں ذکر کیا ہے، اور قرأت صحیح ہے، جبکہ ابو علی کا مقصود زجاج کو غلط قرار دینا ہے۔ نحاس نے کہا ہے اور ابو حاتم نے گمان کیا ہے کہ یہاں حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ ہے، اور ان کا قول: ولا یحسبن الذین یبخلون لحن (غلطی) ہے جائز نہیں ہے۔ اور اس پر ان کی اتباع ایک جماعت نے کی ہے۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ کوئی شے نہیں ہے، جیسا کہ اس کا ترکیبی بیان پہلے گزر چکا ہے اور نقلاً قرأت کا صحیح ہونا اور اس کا ثابت ہونا بھی گزر چکا ہے اور یحییٰ بن وثاب نے اَنَّمَا نُمۡلِیۡ لَھُمۡ یعنی دونوں جگہ پر ان کو کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو جعفر نے کہا ہے: یحیی کی قرأت اچھی ہے، جیسا کہ آپ کہتے ہیں: حسبت عمرا ابوہ خالد (اس میں عمرا مفعول اول اور ابوہ خالد مفعول ثانی ہے۔) ابو حاتم نے کہا ہے: میں نے اخفش سے سنا ہے وہ ان کو مکسور ذکر کرتے ہیں اور اس سے قدریہ کے لئے استدلال کرتے ہیں، کیونکہ وہ ان میں سے تھے اور وہ تقدیم و تاخیر پر معمول کرتے ہیں ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم لیزدادوا اثما انما نملی لھم خیر لانفسھم۔

بیان کیا: میں نے جامع مسجد میں ایک مصحف میں دیکھا انہوں نے اس میں ایک حرف زائد کیا تھا تو وہ اس طرح ہو گیا انما نملی لھم ایمانا پس اس کی طرف یعقوب القاری نے دیکھا تو غلطی واضح ہو گئی چنانچہ انہوں نے اسے مٹا دیا۔ اور یہ آیت قدریہ مذہب کے بطلان میں نص ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ وہ ان کی عمروں کو طویل کرتا ہے تا کہ وہ معاصی کا عمل کر کے کفر میں اضافہ کریں، اور اس کی امثال لگاتار دل پر مرتب ہوتی ہیں، جیسا کہ اس کی ضد جو کہ ایمان ہے اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: کوئی نیکو کار نہیں اور نہ ہی کوئی فاجر ہے مگر موت اس کے لئے بہتر اور باعث خیر ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّمَا نُمۡلِیۡ لَھُمۡ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِثۡمًا اور یہ آیت پڑھی۔ وما عند اللہ خیر للابرار (1) اسے رزین نے روایت کیا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ عَلٰى مَاۤ اَنۡتُمۡ عَلَيۡهِ حَتّٰى يَمِيۡزَ الۡخَبِيۡثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ ۖ
فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنۡ تُؤۡمِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَلَكُمۡ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۷۹﴾

"نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ چھوڑے رکھے مومنوں کو اس حال پر جس پر تم اب ہو جب تک الگ الگ نہ کر

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 233

دے پلید کو پاک سے اور نہیں ہے اللہ (کی شان) کہ آگاہ کرے تمہیں غیب پر البتہ اللہ (غیب کے علم کے لئے) چن لیتا ہے اپنے رسولوں سے جسے چاہتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم ہے۔"

ابوالعالیہ نے کہا ہے: مومنین نے عرض کی کہ انہیں ایسی علامت اور نشانی عطا کی جائے جس کے ساتھ وہ مومن اور منافق کے درمیان فرق کر سکیں، تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ الآیہ (1)۔ اس آیت کا مخاطب کون ہیں؟ اس بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ضحاک، مقاتل، کلبی اور اکثر مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: اس میں خطاب کفار اور منافقین کو ہے (2)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ مومنوں کو اس حال پر چھوڑے رکھے جس حال پر کفر، نفاق اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں سے تم اب ہو۔ کلبی نے کہا ہے: اہل مکہ میں سے قریش نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ہم میں سے ایک آدمی کے بارے میں آپ گمان کرتے ہیں کہ وہ آتش جہنم میں ہے، اور یہ کہ جب اس نے ہمارا دین چھوڑ دیا اور تمہارے دین کی اتباع و پیروی کر لی تو تم نے کہا یہ اہل جنت میں سے ہے! پس اس کے بارے ہمیں بتلائیے یہ کہاں سے ہوا؟ اور اس کی بھی خبر دیجئے ہم میں سے کون تمہارے پاس آئے گا؟ اور کون تمہارے پاس نہیں آیا؟ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ یعنی کفر اور نفاق میں سے جس حال پر تم ہو۔ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (یہاں تک کہ وہ پلید کو پاک سے الگ الگ کر دے) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے اور قول باری تعالیٰ: لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ میں مومنین سے مراد وہ ہیں جو ابھی صلبوں اور رحموں میں ہیں ان میں سے جو ایمان لائیں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہاری اس اولاد کو جن کے لئے ایمان کا حکم ہے اس حال پر چھوڑ دے جس حال پر شرک میں سے اب تم ہو، یہاں تک کہ وہ تمہارے اور ان کے درمیان تفریق کر دے گا، اور اس بنا پر وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ نیا کلام ہوگا۔ اور یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب مومنین کو ہے (3)، یعنی اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ دے اے گروہ مومنین! اس حال پر جس پر تم اب ہو کہ مومن اور منافق باہم مخلوط اور ملے جلے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ تمہارے درمیان آزمائش اور (احکام کا) پابند بنا کر تفریق ڈال دے کہ تم پلید منافق اور پاک مومن کو پہچان لو۔ اور اللہ تعالیٰ نے دونوں فریقوں کو احد کے دن الگ الگ کر دیا۔ یہ قول اکثر اہل معانی کا ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ (اور نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ تمہیں غیب پر مطلع کرے) اے گروہ مومنین! یعنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ تمہارے لئے منافقین کو معین کر دے تاکہ تم انہیں پہچان لو، البتہ وہ انہیں تمہارے لئے احکام کا پابند بنا کر اور آزمائش میں ڈال کر ظاہر کر دے گا، اور پھر وہ احد کے دن ظاہر ہو گئے، کیونکہ منافقین پیچھے رہ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کی تکلیف اور اذیت پر خوشی کا اظہار کیا، پس تم اس سے پہلے اس غیب کو نہ جانتے تھے، پس اب اللہ تعالیٰ نے حضور نبی مکرم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 405 2۔ ایضاً، جلد 1-2، صفحہ 407 3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ

اور آپ کے اصحاب کو اس پر آگاہ فرما دیا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ لِيُطْلِعَكُمْ کا معنی ہے یعنی اور الله تعالیٰ کی شان نہیں ہے کہ وہ تمہیں اس سے آگاہ کرے جو ان سے ہوگا۔ پس قول باری تعالیٰ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ اس قول کے مطابق (سابقہ کلام سے) متصل ہے، اور پہلے دونوں قولوں کی بنا پر منقطع ہے اور وہ یہ کہ کفار نے جب کہا: ہماری طرف وحی کیوں نہیں کی گئی؟ تو الله تعالیٰ نے فرمایا: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ یعنی اس پر جو نبوت کا مستحق ہوتا ہے کہ وحی تمہارے اختیار (اور پسند) کے مطابق ہو (1)۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ البتہ الله تعالیٰ چن لیتا ہے یعنی منتخب فرما لیتا ہے مِنْ رُّسُلِهٖ اپنے رسولوں میں سے اپنے غیب پر اطلاع اور آگاہی کے لئے مَنْ يَّشَآءُ جسے چاہتا ہے۔ کہا جاتا ہے طلعت علی کذا اور اطلعت علیہ (میں اس پر آگاہ ہوا) اور اطلعت علیہ غیری (میں نے اس پر اپنے سوا دوسرے کو آگاہ کیا) پس یہ لازم اور متعدی (دونوں طرح استعمال ہوتا ہے) اور حَتّٰى يَمِيْزَ مَيَّزَ سے تشدید کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اور اسی طرح سورۃ الانفال میں ہے۔ اور یہی حمزہ کی قرأت ہے۔ اور باقیوں نے يَمِيْزَ تخفیف کے ساتھ مازیمیز سے پڑھا ہے۔ کہا جاتا ہے: مزت الشی بعضہ من بعض امیزہ میزا، اور میزتہ تمییزا (میں نے ایک شے کے بعض کو بعض سے الگ الگ کر دیا)

ابو معاذ نے کہا ہے: مزت الشیٔ امیزہ میزا (کہا جاتا ہے) جب تو دو چیزوں کو الگ الگ کرے، اور اگر اشیاء زیادہ ہوں تو تو کہے گا: فرقت بینہما، یعنی یہ تخفیف کے ساتھ ہوگا، اور اسی سے فرق الشعر (بالوں کی مانگ) بھی ہے اور اگر ایک شے کو دو سے زیادہ حصوں میں تقسیم کرے تو کہے گا: فرقتہ تفریقا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: کہ اسی سے امتاز القوم ہے، یعنی ان کے بعض بعض سے جدا ہو گئے الگ ہو گئے، اور یکاد یتمیز کا معنی ہے یتقطع (قریب ہے کہ وہ کٹ جائے) اور اسی کے ساتھ اس قول باری تعالیٰ کی تفسیر بیان کی گئی ہے: تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ (الملک: 8) (ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مارے غضب کے پھٹا چاہتی ہے) اور حدیث میں ہے: من ماز اذی من الطریق فھولہ صدقۃ (جس نے راستے سے تکلیف دہ چیز دور کی تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔)

قولہ تعالیٰ: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ کہا جاتا ہے کہ کفار نے جب رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ انہیں ان کے بارے بتائیں جو ان میں سے ایمان لائیں گے تو الله تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا: فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ یعنی تم ایسے کاموں میں مشغول نہ ہو جو تمہارا مقصود نہیں ہیں، بلکہ تم ایسے کام میں مشغول ہو جو تمہارا مقصود ہے (اور تمہارے لئے نفع بخش ہے) اور وہ ایمان لانا ہے۔ فَاٰمِنُوْا یعنی تم تصدیق کرو۔ یعنی تم پر تصدیق کرنا واجب اور لازم ہے نہ کہ اطلاع غیب کی طرف جھانکنا (2) (اور اس سے آراستہ ہونا لازم ہے) وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمہارے لئے اجر عظیم یعنی جنت ہے اور ذکر کیا جاتا ہے کہ ایک آدمی حجاج بن یوسف ثقفی کے پاس نجومی تھا، پس حجاج نے اپنے ہاتھ میں چند کنکریاں لیں اور ان کی تعداد معلوم کر لی اور پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور نجومی اس تعداد تک پہنچ گیا، پھر حجاج نے اسے غافل رکھا اور کچھ کنکریاں ہاتھ میں لیں اور انہیں گنا نہیں اور

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 546، دار الکتب العلمیہ　2۔ ایضاً

پھر نجومی کو کہا: میرے ہاتھ میں کتنی ہیں؟ پس اس نے حساب لگایا اور اس میں غلطی اور خطا کی، پھر اس نے حساب لگایا اور پھر غلطی کی۔ پس اس نے کہا: اے امیر! میرا خیال ہے کہ جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کی تعداد کو نہیں جانتا؟ اس نے کہا (ہاں) نہیں جانتا۔ تو اس نے پوچھا: ان دونوں کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس نے جواب دیا: اگر تو نے اسے گنا ہوتا تو یہ غیب کی تعریف سے نکل جاتا، اور میں حساب لگاتا تو اس تک پہنچ جاتا اور چونکہ تجھے اس کی تعداد معلوم نہیں اس لئے یہ غیب ہے، اور غیب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باب سورۃ الانعام میں عنقریب آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۸۰﴾

"اور ہرگز نہ گمان کریں جو بخل کرتے ہیں اس میں، جو دے رکھا ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے کہ یہ بخل بہتر ہے ان کے لئے، بلکہ یہ بخل بہت برا ہے ان کے لئے طوق پہنایا جائے گا انہیں وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا قیامت کے دن، اور اللہ کے لئے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے خبردار ہے۔"

اس میں چار مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ اس میں الَّذِیْنَ محل رفع میں ہے اور مفعول اول محذوف ہے۔ خلیل، سیبویہ اور فراء نے کہا ہے: اس کا معنی ہے البخل خیرا لھم، یعنی بخل کرنے والے یہ گمان نہ کریں (کہ) بخل ان کے لئے بہتر ہے(1) اور چونکہ یبخلون بخل پر دلالت کر رہا ہے اس وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: من صدق کان خیرا لہ ای کان الصدق خیرا لہ (جس نے سچ بولا وہ سچ اس کے لئے بہتر ہے۔)

اور اسی سے شاعر کا قول ہے:

اذا نُهِیَ السَّفِیه جرٰی الیه　　وخالَفَ والسَّفِیهُ الی خِلافِ

پس معنی ہے: جری الی السفہ، پس سفیہ سفہ پر دلالت کرتا ہے۔

(جب سفیہ (احمق) کو منع کیا گیا تو وہ اسی کی طرف چلا اور اس نے مخالفت کی اور سفیہ خلاف کی طرف گیا۔)

اور رہی حمزہ کی قرأت تا کے ساتھ تو وہ (حقیقت سے) بہت دور ہے، نحاس نے یہی کہا ہے اور اس کا جواز اس صورت میں ہے کہ تقدیر عبارت یہ ہو: لا تحسبن بخل الذین یبخلون ھو خیراً لھم(2)۔ (تو ان لوگوں کے بخل کے بارے جو بخل کرتے ہیں گمان بھی نہ کر کہ وہ ان کے لئے بہتر ہے۔)

زجاج نے کہا ہے: یہ وَاسْاَلِ الْقَرْیَةَ کی مثل ہے(3) (یعنی مضاف محذوف ہے) اور قول باری تعالیٰ: هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ میں

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236　2۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 236　3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547

هُوَ بصریوں کے نزدیک ضمیر فاصلہ ہے اور کوفیوں کے نزدیک یہی ضمیر عماد ہے۔ نحاس نے کہا ہے: عربی میں مبتدا خبر ہونے کی حیثیت سے هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ بھی جائز ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ یہ مبتدا اور خبر ہیں۔ یعنی البخل شرلهم (بخل ان کے لئے بہت برا ہے) اور سَيُطَوَّقُوْنَ میں سین وعید کی سین ہے، یعنی سوف يطوقون (انہیں طوق پہنایا جائے گا)، مبرد نے یہی کہا ہے۔ یہ آیت مال، انفاق فی سبیل اللہ، اور فرض زکوٰۃ کی ادائیگی میں بخل کرنے کے بارے نازل ہوئی ہے(1) اور یہ اس ارشاد کی طرح ہے: وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الآیہ (التوبہ: 34)

تاویل کرنے والوں کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے ان میں سے حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، ابو وائل، ابو مالک، سدی اور شعبی رحمہم اللہ ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ کا معنی وہ ہے جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں موجود ہے(2) کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی قیامت کے دن وہ اس کے لئے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا اس کی آنکھوں پر دو سیاہ نشان ہوں گے قیامت کے دن اسے اس کا طوق پہنایا جائے گا پھر وہ اسے اپنے دونوں جبڑوں کے ساتھ پکڑ لے گا اور پھر کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ (کنز) ہوں ... پھر یہ آیت تلاوت فرمائی...... وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ الآیۃ۔(3)

اسے نسائی نے روایت کیا ہے۔ اور ابن ماجہ نے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، آپ نے فرمایا: ''کوئی بھی جو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، قیامت کے دن اس کے لئے اسے ایک زہریلے اژدھا کی شکل بنا دیا جائے گا یہاں تک کہ اس کی گردن میں اس کے ساتھ طوق پہنایا جائے گا'' پھر حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم پر کتاب اللہ میں سے اس کا مصداق یہ آیت پڑھی وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ الآیہ(4)۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کوئی ذی رحم (رشتہ دار) نہیں ہے جو اپنے ذی رحم کے پاس آتا ہے اور اس سے اس فضل واحسان (مراد مال) میں سے کچھ مانگتا ہے جو اس کے پاس ہے پس وہ اس کے بارے اس پر بخل کرتا ہے، مگر قیامت کے دن اس کے لئے جہنم سے ایک اژدھا نکالا جائے گا جو زبان (باہر نکال کر) ادھر ادھر پھیر رہا ہوگا تاکہ اسے اس کا طوق پہنائے(5)'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے: بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب اور ان کے بخل کے بارے میں اس کے بیان سے جو کچھ وہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جانتے تھے نازل ہوئی(6)۔ اور حضرت مجاہد، اور اہل علم کی ایک جماعت نے یہی کہا ہے۔ اور اس تاویل پر سَيُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے عنقریب وہ اس کی سزا برداشت کریں

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً

3۔ سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 343۔ ایضاً صحیح بخاری، باب اثم مانع الزکاۃ، حدیث 1315، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزکوٰۃ، جلد 1، صفحہ 129۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1773، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

5۔ المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 2، صفحہ 322، حدیث نمبر 2343 6۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 547، دار الکتب العلمیہ

گے جو انہوں نے آپ کے ساتھ بخل کیا اور یہ طاقتہ سے ماخوذ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ (البقرہ:184) (اور جو لوگ اسے مشکل سے ادا کر سکیں) اور یہ تطویق سے ماخوذ نہیں ہے(1)۔ اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: سَيُطَوَّقُوْنَ کا معنی ہے کہ ان کے لئے قیامت کے دن آگ کا طوق بنایا جائے گا(2) اور یہ پہلی تاویل کے ساتھ یعنی سدی کے قول کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے: ان کے اعمال کو ان کے ساتھ چمٹا دیا جائے گا جیسا کہ طوق گردن کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، کہا جاتا ہے: طُوِّقَ فلان عملَه طوقَ الحمامة، فلاں کو اس کے عمل کا طوق پہنایا گیا کبوتری کے طوق کی طرح، یعنی اسے اس کا عمل چمٹا دیا گیا۔ اور تحقیق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ (الاسراء:13) (اور ہر انسان کی (قسمت کا) نوشتہ اس کے گلے میں ہم نے لٹکا رکھا ہے۔)

اور اسی معنی میں ابو سفیان کے لئے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے:

أبلِغْ　أبا　سفيان　عن　أمرٍ　عواقبُه　ندامه

تو ابو سفیان کو اس امر کا پیغام پہنچا دے جس کا انجام ندامت اور شرمندگی ہے۔

دار　ابن　عمك　بعتها　تقضى　بها　عنك　العرامه

تو نے اپنے چچا کے بیٹے کا گھر بیچ دیا ہے اس کے عوض تجھ سے تاوان لیا جائے گا۔

و　حليفكم　بالله　رب　الناس　مجتهد　القسامة

اور قسم ہے اللہ کی جو لوگوں کا رب ہے تمہارا حلیف قسامہ کی کوشش کر رہا ہے۔

اذهب　بها　اذهب　بها　طُوِّقْتَهَا　طَوْقَ　الحمامه

تو اسے لے جا تو اسے لے جا تجھے کبوتری کے طوق کی طرح اس کا طوق پہنایا جائے گا۔

اور یہ دوسری تاویل کے مطابق جاری ہوتا ہے۔ بُخْل اور بَخَل کا لغت میں معنی یہ ہے کہ انسان کا اس حق کو (ادا کرنے) سے باز رہنا جو (حق) اس پر واجب ہو۔

پس جو کوئی اس سے باز رہا جو اس پر واجب نہیں ہوتا تو وہ بخیل نہیں ہے، کیونکہ اس پر مذمت نہیں کی جاتی ہے۔ اور اہل حجاز کہتے ہیں: يَبْخلون وقد بَخلوا، (وہ بخل کرتے ہیں اور تحقیق انہوں نے بخل کیا۔ اور تمام عرب کہتے ہیں: بَخِلُوْا يَبْخَلُوْنَ۔

اسے نحاس نے بیان کیا ہے۔ اور بَخِلَ يَبْخَلُ بُخْلًا وَبَخَلًا، یہ ابن فارس سے منقول ہے۔

مسئلہ نمبر 3۔ تیسرا مسئلہ بخل کے ثمرہ اور اس کے فائدہ کے بارے میں ہے۔ اور اس کے بارے روایت کیا گیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو فرمایا: تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے عرض کی جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اور کون سی بیماری (عیب) ہے جو بخل سے بڑھ کر ہو" (یعنی جو بخل سے زیادہ قبیح ہو) انہوں نے عرض کی: وہ کیسے یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم؟ آپ نے فرمایا: "ایک قوم ساحل سمندر کے قریب اتری پس وہ اپنے بخل کے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 409　2۔ ایضاً

سبب اپنے پاس مہمانوں کے آنے سے تنگ اور مجبور ہو گئے تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ ہم میں سے مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں سے دور فاصلے پر رہیں تا کہ مرد عورتوں کے دور ہونے کے سبب مہمانوں کے سامنے معذرت کریں، اور عورتیں مردوں کے دور ہونے کے سبب ان سے معذرت کریں، پس انہوں نے ایسا کر لیا اور اسی طرح ان پر طویل وقت گزر گیا نتیجتاً مرد مردوں کے ساتھ اور عورتیں عورتوں کے ساتھ (استمتاع کے لئے) مشغول ہو گئے (1)۔'' اسے الماوردی نے کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں ذکر کیا ہے۔

مسئلہ نمبر 4۔ بخل اور شح میں اختلاف ہے، کیا یہ دونوں ایک معنی میں ہیں یا دو معنوں میں۔ چنانچہ کہا گیا ہے: البخل الامتناع من اخراج ما حصل عندك (بخل سے مراد اس شے کو دینے اور نکالنے سے باز رہنا ہے جو تیرے پاس موجود ہو) اور الشح! الحرص علی تحصیل ما لیس عندك (شح سے مراد اس شے کو حاصل کرنے کی حرص رکھنا ہے جو تیرے پاس موجود نہیں۔)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شح سے مراد وہ بخل ہے جس کے ساتھ حرص بھی ہو۔ اور یہی صحیح ہے اس روایت کے مطابق جسے مسلم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن اندھیرے اور تاریکیاں ہے اور شح (بخل) سے بچو کیونکہ اس نے انہیں تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے اس نے انہیں اس پر ابھارا ہے کہ وہ اپنے خون بہائیں اور اپنی محارم کو حلال سمجھیں (2)'' اور یہ ارشاد ان کے قول کی تردید کرتا ہے جنہوں نے کہا کہ بخل واجب کو روکنا (اور اسے ادا نہ کرنا) ہے اور شح مستحب کو روکنا ہے۔ کیونکہ اگر شح مستحب کو روکنا ہوتا تو وہ اس عظیم اور شدید وعید کے تحت داخل نہ ہوتا، اور شدید مذمت وہی ہے جس میں دنیا اور آخرت کی ہلاکت ہو۔

اور اس معنی کی تائید وہ روایت بھی کرتی ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں اڑنے والا غبار اور جہنم کا دھواں ایک مسلمان آدمی کے نتھنوں میں ہمیشہ کے لئے جمع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی شح (بخل) اور ایمان ایک مسلمان آدمی کے دل میں ہمیشہ جمع رہ سکتے ہیں (3)۔'' اور یہ اس پر دلیل ہے کہ شح مذمت میں بخل سے زیادہ شدید ہے، مگر بلاشبہ ایسی روایات بھی موجود ہیں جو ان دونوں کے مساوی اور برابر ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ قول ہے...... آپ سے پوچھا گیا: أیکون المؤمن بخیلاً؟ کیا مومن بخیل ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: لا نہیں۔

اور الماوردی نے کتاب ''ادب الدنیا والدین'' میں ذکر کیا ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار کو کہا: ''تمہارا سردار کون ہے؟'' انہوں نے عرض کی: جد بن قیس اس بنا پر کہ اس میں بخل ہے، الحدیث۔ اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

قولہ تعالیٰ: وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے باقی رہنے اور اپنی بادشاہی کے دائمی ہونے

1۔ المستدرک، معرفۃ الصحابۃ، جلد 3، صفحہ 242، حدیث نمبر 4965　　2۔ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، جلد 2

3۔ سنن نسائی، کتاب الجہاد، جلد 2، صفحہ 55

کی خبر دی ہے اور یہ کہ وہ ابد میں اسی طرح ہے جیسے وہ ازل میں تھا اور وہ العالمین سے غنی (اور بے نیاز) ہے، پس وہ زمین کا وارث ہوگا اپنی مخلوق کے فنا ہونے کے بعد اور ان کی املاک زائل اور ختم ہونے کے بعد، پس املاک اور اموال باقی رہیں گے لیکن ان کا دعویٰ کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ تو یہ مخلوق کی عادت اور عرف کے مطابق وراثت کے جاری ہونے کی طرح ہی یہ (حکم) جاری ہوگیا، حالانکہ حقیقت میں یہ میراث نہیں ہے، کیونکہ حقیقت میں وارث وہ ہے جو کسی (ایسی) شے کا وارث بنتا ہے جس کا وہ اس سے قبل مالک نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ تو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک ہے، تمام آسمان اور جو کچھ ان میں ہے، اور زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب اسی کا ہے، اور اموال اپنے مالکوں کے پاس عاریۃً (ادھار) ہیں، پس جب وہ مرتے ہیں تو عاریہ کو اس کے اس مالک کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جس کا وہ اصل میں ہوتا ہے اور اس آیت کی نظیر اللہ تعالیٰ یہ ارشاد ہے: اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَ مَنْ عَلَيْهَا الآیہ (مریم: 40) (یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔)

اور دونوں آیتوں میں معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم ارشاد فرمایا ہے کہ وہ خرچ کریں اور وہ بخل نہ کریں اس سے قبل کہ وہ مر جائیں اور وہ اسے بطور میراث اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑ جائیں، اور انہیں کوئی نفع نہ دے گا سوائے اس کے جو انہوں نے خرچ کر دیا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

"بے شک سنا اللہ نے قول ان (گستاخوں) کا جنہوں نے کہا اللہ مفلس ہے حالانکہ ہم غنی ہیں ہم لکھ لیں گے جو انہوں نے کہا نیز قتل کرنا ان کا انبیاء کو ناحق (بھی لکھ لیا جائے گا) اور ہم کہیں گے کہ (اب) چکھو آگ کے عذاب (کا مزہ) یہ بدلہ ہے اس کا جو آگے بھیجا ہے تمہارے ہاتھوں نے اور یقیناً اللہ تعالیٰ نہیں ظلم کرنے والا اپنے بندوں پر۔"

قولہ تعالیٰ: لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ اللہ تعالیٰ نے کفار بالخصوص یہود کے قول کی قباحت (اور برائی) ذکر فرمائی۔ اور اہل تفسیر نے کہا ہے: جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (البقرہ: 245) (کون ہے جو دے اللہ تعالیٰ کو قرض حسن) تو یہودیوں میں سے ایک گروہ نے کہا ان میں سے حیی بن اخطب تھا، یہ حسن کے قول کے مطابق ہے اور حضرت عکرمہ وغیرہ نے کہا ہے: وہ فنحاص بن عازوراء تھا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ (1) (بے شک اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم غنی (اور دولت مند) ہیں وہ ہم سے قرض مانگ رہا ہے۔ بلاشبہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 548، دار الکتب العلمیہ

انہوں نے اپنے ضعفاء اور کمزوروں پر اظہار برتری کے طور پر سنانے کے لئے یہ کہا، نہ کہ وہ اس کا اعتقاد رکھتے تھے، کیونکہ وہ اہل کتاب تھا۔ لیکن انہوں نے اس قول کے ساتھ کفر کیا، کیونکہ انہوں نے اس سے اپنے ضعفاء کو اور مومنین میں سے کمزور لوگوں کو شک میں ڈالنے اور حضور نبی مکرم ﷺ کی تکذیب کا ارادہ کیا۔ یعنی یہ کہ وہ محمد ﷺ کے قول کے مطابق فقیر اور مفلس ہے، کیونکہ اس نے ہم سے قرض کا مطالبہ کیا ہے۔ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا یعنی ہم انہیں اس پر جزا اور بدلہ دیں گے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم انہیں ان کے اعمال ناموں میں لکھ لیں گے، یعنی ہم کراماً کاتبین کو ان کا قول لکھ لینے اور ثابت رکھنے کا حکم دیں گے تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے انہیں اعمال ناموں میں اسے پڑھیں جو انہیں دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ یہ ان کے خلاف حجت کو اور پختہ اور مؤکد کرنے والا ہو جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: وَ اِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۝ (الانبیاء) (اور ہم اس کے لئے (اس کے عملوں کو) لکھنے والے ہیں) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لکھنے سے مقصود محفوظ رکھنا ہے، یعنی ہم اسے محفوظ رکھیں گے جو انہوں نے کہا تاکہ ہم انہیں بدلہ اور جزا دیں، اور مَا قَالُوْا میں مَا، سَنَكْتُبُ کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔

اور اعمش اور حمزہ نے سیُکتب پڑھا ہے۔ یعنی یا کے ساتھ تو اس صورت میں ما، اسم ما لم یُسم فاعلہ (نائب الفاعل) ہوگا۔ اور حمزہ نے اس میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت کا اعتبار کیا ہے: وَ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۔

قولہ تعالیٰ: وَ قَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ یعنی ہم ان کے انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنے کے عمل کو لکھ لیں گے، یعنی ان کے قتل کے ساتھ رضامند ہونے کو۔ اور ان سے مراد ان کے اسلاف کا انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا ہے، لیکن جب وہ اس پر راضی اور خوش ہیں تو اس کی اضافت ان کی طرف کرنا صحیح ہے۔ ایک آدمی نے حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا اقدام قرار دیا تو حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے کہا: تو بھی ان کے خون میں شریک ہے، پس آپ نے رضا بالقتل کو قتل ہی قرار دیا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: یہ بہت بڑا مسئلہ ہے، اس حیثیت سے کہ رضا بالمعصیت معصیت ہوتی ہے۔ ابوداؤد نے عرس بن عمیرہ الکندی سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جب تو نے زمین میں خطا اور گناہ کا عمل کیا تو جو وہاں حاضر تھا اس نے اسے ناپسند کیا..... اور ایک بار فرمایا پس اس نے اس کا انکار کیا..... تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود نہ تھا اور جو وہاں سے غائب تھا لیکن اس نے اسے پسند کیا تو وہ اس کی طرح ہے جو وہاں موجود اور حاضر تھا(1)۔'' اور یہ نص ہے۔ قولہ تعالیٰ: بِغَیْرِ حَقٍّ اسکا معنی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ یعنی جہنم میں ان کو کہا جائے گا یا موت کے وقت یا حساب کے وقت یہ کہا جائے گا۔ پھر یہ قول یا تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوگا یا فرشتوں کی جانب سے، دونوں قول ہیں۔ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ویقال ہے۔ اور الحریق شعلہ نکالنے والی آگ کا اسم ہے، اور النار کا لفظ شعلہ نکالنے والی اور شعلہ نہ نکالنے والی آگ دونوں کو شامل ہے۔

قولہ تعالیٰ: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ یعنی وہ عذاب ان گناہوں کے عوض ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور الایدی کو ذکر کے ساتھ اس لئے خاص کیا گیا ہے تاکہ وہ فعل کے بذات خود کرنے پر دلالت کرے، کیونکہ کبھی فعل کی نسبت انسان کی طرف

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الملاحم، جلد 2، صفحہ 241

کردی جاتی ہے اس معنی میں کہ اس نے وہ کام کرنے کا حکم دیا ہے، جیسا کہ یہ ارشاد ہے یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ اور اَيْدِيَكُمْ اصل میں اَيْدِيْكُمْ تھا ضمہ کو یا پر ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَیْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ وَ الْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ ﴿۱۸۴﴾

”یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ تحقیق اللہ (تعالیٰ) نے اقرار لیا ہے ہم سے کہ ہم نہ ایمان لائیں کسی رسول پر یہاں تک کہ وہ لائے ہمارے پاس ایک قربانی کھالے اس کو آگ آپ فرمایئے آ چکے تمہارے پاس رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ بھی جو تم کہہ رہے ہو تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو۔ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) بے شک جھٹلائے گئے رسول آپ سے پہلے جو لائے تھے معجزات اور صحیفے اور روشن کتاب۔“

قولہ تعالیٰ: اَلَّذِیْنَ محل جر میں ہے اور یہ اس الَّذِیْنَ سے بدل ہے جو اس قول باری تعالیٰ میں ہے لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا یا یہ لِلْعَبِیْدِ کی صفت ہے یا مبتدا کی خبر ہے، یعنی ھم الذین قالوا۔ اور کلبی وغیرہ نے کہا ہے: یہ آیت کعب بن اشرف، مالک بن صیف، وہب بن یہوذا، فنحاص بن عازوراء اور ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے کہا: کیا آپ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، حالانکہ اس نے ہم پر کتاب نازل کی ہے اور اس میں ہم سے عہد کیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جو گمان کرتا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس قربانی لائے جسے آگ کھالے، پس اگر تم ہمارے لئے وہ (دلیل) لے آئے تو ہم آپ کی تصدیق کریں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ تورات میں ہے، لیکن مکمل کلام یہ ہے۔ یہاں تک کہ تمہارے پاس حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم آجائیں پس جب وہ دونوں تمہارے پاس آئیں تو ان دونوں کے ساتھ بغیر قربانی کے ایمان لاؤ۔

اور یہ قول بھی ہے: قربانی دینے والوں کا امر ثابت اور قائم تھا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی زبان پر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ ان میں سے نبی علیہ السلام قربانی ذبح کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے تو پھر سفید سی آگ نازل ہوتی، اس کی آواز ہوتی اور وہ گھیر لیتی، اس کا دھواں نہ ہوتا، اور وہ قربانی کو کھا جاتی۔ پس یہ قول یہود کی طرف سے دعویٰ ہے، اور جب وہاں استثنا ہوئی یا نسخ تو انہوں نے اسے چھپا دیا، اور وہ اس سے اپنے استدلال میں سرکشی اور تکبر کرنے والے تھے اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ان کے دعویٰ کو باطل کرنے میں دلیل قاطع ہیں، اور اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بھی۔

اور جس کا صدق ثابت ہو اس کی تصدیق بھی ثابت ہوتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت قائم کرتے ہوئے فرمایا: قُلْ اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ فرما دیجئے: قَدْ جَآءَكُمْ اے گروہ یہود! آچکے تمہارے پاس رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ (رسول مجھ سے پہلے بھی دلیلوں کے ساتھ اور اس (معجزہ) کے ساتھ جو تم کہہ رہے ہو) یعنی قربانی فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (تو کیوں قتل کیا تھا تم نے انہیں اگر تم سچے ہو) یعنی حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت شعیا علیہم السلام اور وہ تمام انبیاء علیہم السلام جو قتل کر دیئے گئے اور تم ان کے ساتھ ایمان نہ لائے۔ اس سے مراد ان کے اسلاف ہیں (1)۔ اور یہی وہ آیت ہے جسے عامر الشعبی رحمۃ اللہ علیہ نے تلاوت کیا، اور اس کے ساتھ اس پر حجت قائم کی جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کو اچھا قرار دیا جیسا کہ ہم نے اسے بیان کر دیا ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو قاتل کا نام دیا ہے اس لئے کہ وہ اپنے اسلاف کے اس فعل پر راضی تھے، اگرچہ ان کے درمیان تقریباً سات سو برس کا فاصلہ اور فرق تھا۔ اور القربان سے مراد قربانی، صدقہ، اور عمل صالح میں سے وہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ فعلان کے وزن پر ہے اور القربۃ سے ماخوذ ہے۔ اور یہ اسم اور مصدر ہو سکتا ہے، پس اسم کی مثال سلطان اور برہان ہے۔ اور مصدر کی مثال عدوان اور خسران ہے اور عیسیٰ بن عمر بِقُرُبَانٍ قاف کے ضمہ کی اتباع میں راکو ضمہ کے ساتھ پڑھتے تھے (2)، جیسا کہ ظلمۃ کی جمع میں ظُلُمَات اور حُجرۃ کی جمع میں حُجُرَات کہا گیا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے اور آپ کی غمخواری کرتے ہوئے فرمایا: فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ اگر یہ جھٹلاتے ہیں آپ کو (تو یہ کوئی نئی بات نہیں) تحقیق آپ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے جو دلائل کے ساتھ آئے تھے۔ وَالزُّبُرِ یعنی اور لکھی ہوئی کتابیں۔ اور زُبُر یہ زبور کی جمع ہے اور یہ کتاب ہے۔ اور اس کی اصل زبرت ای کتبت سے ہے یعنی میں نے لکھا۔ اور ہر زبور پس وہ کتاب ہے۔

امرؤ القیس نے کہا ہے:

لِمَنْ طَلَلٌ ابصرتُه فشجانِی كخط زبور فی عسيبِ يمانی

اس میں بھی زبور سے مراد کتاب ہے۔

اور انا أعرف تَزْبِرَتِي ای کتابتی۔ یعنی میں اپنی کتابت (لکھائی) کو پہچانتا ہوں۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ زبور زبر بمعنی زجر (جھڑکنا) سے ماخوذ ہے (3)۔ اور زبرتُ الرجل کا معنی ہے میں نے آدمی کو جھڑکا (ڈانٹ پلائی) اور زبرت البئر کا معنی ہے میں نے کنوئیں کو پتھروں سے بنایا۔ اور ابن عامر نے بالزُّبُرِ وَ بِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ دونوں کلموں کو با کی زیادتی کے ساتھ پڑھا ہے (4) اور اسی طرح اہل شام کے مصاحف میں ہے۔

وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ یعنی واضح اور روشن کتاب لے کر آئے، یہ تیرے اس قول سے ہے: أنرت الشئ أنيره، یعنی میں نے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 441 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ

3۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 411 4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 549، دار الکتب العلمیہ

اسے واضح اور روشن کر دیا۔ کہا جاتا ہے: نار الشئ و أنارہ و تورہ و استنارہ یہ ہم معنی ہیں، اور ان دونوں میں سے ہر ایک لازم اور متعدی ہے۔ اور زبر اور کتاب کو جمع کیا ۔۔ حالانکہ یہ دونوں بھی ہم معنی ہیں اس لئے کہ ان دونوں کے الفاظ مختلف ہیں اور ان کی اصل وہی ہے جیسے ہم نے ذکر کردی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

"ہر نفس چکھنے والا ہے موت کو اور پوری مل کر رہے گی تمہیں تمہاری مزدوری قیامت کے دن پس جو شخص بچ لیا گیا آتش (دوزخ) سے اور داخل کیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا اور نہیں یہ دنیوی زندگی مگر ساز و سامان دھوکہ میں ڈالنے والا۔"

اس میں سات مسائل ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ جب اللہ تعالیٰ نے بخل کرنے والوں اور ان کے کفر کے بارے ان کے اس قول میں خبر دی: اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ اور مومنین کو ان کی اذیت پر صبر کرنے کے بارے اپنے اس قول میں حکم ارشاد فرمایا لَتُبْلَوُنَّ الآیہ (تو پھر) بیان کیا کہ وہ ختم ہو جانے والی چیزوں میں سے ہے اور وہ ہمیشہ نہیں رہے گا، کیونکہ دنیا کی انتہا اور اختتام قریب ہے اور قیامت کا دن یوم جزا (بدلے کا دن) ہے۔ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ یہ ذوق سے ماخوذ ہے اور یہ (موت) ایسی شے ہے جس سے انسان کو پناہ نہیں، اور نہ ہی اس سے کوئی حیوان الگ اور جدا ہے (یعنی ہر ذی روح کو موت آنا یقینی ہے۔)

امیہ بن ابی الصلت نے کہا:

من لم یمت عبطة یمت ھرمًا   للموت كأس والمرء ذائقھا

جو عین عالم شباب میں نہیں مرتا اسے بڑھاپے میں موت آ جاتی ہے موت تو (شراب سے بھرا ہوا) ایک جام ہے اور آدمی اس کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے:

الموت باب و کل الناس داخلہ   فلیت شعری بعد الباب ماالدار

موت ایک دروازہ ہے اور تمام لوگ اس سے داخل ہونے والے ہیں اے کاش مجھے علم ہوتا اس دروازے کے بعد گھر کون سا ہے۔

مسئلہ نمبر 2۔ عام قرأت ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اضافت کے ساتھ ہے اور اعمش، یحییٰ اور ابن ابی اسحاق نے ذائقة الموت یعنی ذائقةٌ کو تنوین کے ساتھ اور الموت کو نصب کے ساتھ پڑھا ہے (1)۔ انہوں نے کہا ہے: کیونکہ موت کے بعد تو کوئی ذائقہ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ اسم فاعل کی دو قسمیں ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ بمعنی ماضی ہو۔ اور دوسری یہ کہ وہ بمعنی استقبال ہو، پس اگر تو پہلا معنی مراد لے گا تو اس میں تو صرف مابعد کی طرف اضافت ہی ہے، جیسے تیرا یہ قول ہے: ھذا ضَارِبُ زیدٍ امس اور قَاتِلُ بکرٍ امس، کیونکہ اسے اسم جامد کے قائم مقام رکھا جاتا ہے اور وہ علم ہے، جیسے غلامُ زیدٍ اور صاحب بکرٍ۔

شاعر نے کہا ہے:

الحافِظُو عورةِ العشيرة لايَأ تِيهِم من وَرَائِهِم وَكَفُ

(اس میں الحافظو اسم مابعد کی طرف مضاف ہو کر استعمال ہو رہا ہے۔)

اور اگر دوسرا معنی مراد لیں تو جر جائز ہے اور نصب اور تنوین کی بھی یہی صورت ہے اور یہی اصل ہے، کیونکہ یہ (اسم فاعل) قائم مقام فعل مضارع کے ہوتا ہے اور اگر فعل غیر متعدی ہو، تو پھر یہ متعدی نہیں ہوتا جیسے قائم زید اور اگر وہ متعدی ہو تو اسے متعدی بنائے اور اس کے ساتھ نصب دے اور یہ کہے: زیدٌ ضَاربٌ عمروا بمعنی یضرب عمروا۔ اور تخفیف کے لئے تنوین کا حذف اور اضافت جائز ہوتی ہے۔

جیسا کہ المراز نے کہا ہے:

سَلِّ الهمومَ بكل مُعطِي رأسه فاج مُخالِطِ صُهبةٍ مُتَعَيِّسِ

مُغتَالِ أحبُلِه مبينٍ عُنقُه في مَنكِبٍ زَبَنَ المُطِيَّ عَمَندَسِ

تنوین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے اور اصل میں: معط رأسه تنوین اور نصب کے ساتھ ہے، اور اس کی مثل قرآن کریم میں بھی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: هَلْ هُنَّ كَاشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اور یہ اس کی مثل نہیں۔

مسئلہ نمبر 3۔ پھر تو جان کہ موت کے کچھ اسباب اور اس کی کچھ علامات ہیں، پس بندۂ مومن کی موت کی علامات میں سے پیشانی پر پسینہ کا آنا ہے۔ اسے نسائی نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''بندۂ مومن پیشانی کے عرق آلود ہونے کے ساتھ فوت ہوتا ہے (1)۔'' اور ہم نے اسے ''التذکرہ'' میں بیان کیا ہے اور جب وہ قریب المرگ ہو تو اسے شہادت کی تلقین کی جائے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لقنوا موتاکم لا الہ الا اللہ (2) (اپنے مرنے والوں کو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تلقین کرو) تاکہ یہ اس کا آخری کلام ہو اور اس کی زندگی کا اختتام کلمہ شہادت کے ساتھ ہو، اور اس پر بار بار اس کا اعادہ نہ کیا جائے تاکہ وہ پریشان اور تنگ نہ ہو جائے۔

اور اس وقت سورۂ یٰسین پڑھنا مستحب ہوتا ہے، کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے: اقرؤا یٰس علی موتاکم (3) (اپنے مرنے والوں پر یٰسین پڑھو۔) اسے ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔ اور علامہ الآجری نے کتاب النصیحہ میں حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من میت یقرء عندہ سورۃ یٰس الاھون

1۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 259
2۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 300
3۔ سنن ابی داؤد، الجنائز، جلد 2، صفحہ 89

علیہ الموت (1) (جس مرنے والے کے پاس سورہ یٰسین پڑھی جاتی ہے اس پر موت آسان کر دی جاتی ہے) پس جب روح قبض کی جاتی ہے اور نگاہ روح کی اتباع اور پیچھا کرتی ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے اور یہ صحیح مسلم میں ہے اور عبادات اٹھ جاتی ہیں اور پابندی (تکلیف) ختم ہو جاتی ہے، تو زندوں پر کچھ احکام لازم ہوتے ہیں، ان میں سے اس کی آنکھیں بند کرنا، اور اس کے نیک اور صالح بھائیوں دوستوں کو اس کی موت کی خبر دینا ہے، اور ایک قوم نے اسے مکروہ کہا ہے اور کہا ہے یہ موت کی خبر اور اعلان ہے، اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے، ہم نے اسے کسی دوسرے مقام پر بیان کیا ہے اور ان احکام میں سے غسل و دفن کے ساتھ اس کی تیاری کرنا بھی ہے تا کہ اس میں تغیر اور تبدیلی نہ آجائے، حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قوم سے کہا جنہوں نے اپنی میتوں کو دفن کرنے میں تاخیر کی: عجلوا بدفن جیفتکم اپنے مردوں کو دفن کرنے میں جلدی کرو) اور مزید فرمایا: اسرعوا بالجنازۃ الحدیث (جنازہ لے جانے میں جلدی کرو) اس کا بیان آگے آئے گا۔

مسئلہ نمبر 4۔ اور رہا میت کے غسل کا مسئلہ تو یہ سوائے شہید کے تمام مسلمانوں کے لئے سنت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میت کو غسل دینا واجب ہے۔ قاضی عبدالوہاب نے یہی کہا ہے۔ اور پہلا کتاب کا مذہب ہے، اور ان دونوں قولوں پر علماء کا عمل ہے اور اختلاف کا سبب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے جو آپ نے ام عطیہ کو اپنی بیٹی زینب کو غسل دینے کے بارے میں فرمایا، جیسا کہ وہ مسلم میں موجود ہے۔ اور بعض نے کہا ہے: وہ حضرت ام کلثوم تھیں، جیسا کہ ابو داؤد کی کتاب میں موجود ہے: ''تم انہیں تین یا پانچ یا اس سے زیادہ بار غسل دینا اگر تم اسے دیکھو (2)'' الحدیث۔ یہ حدیث علماء کے نزدیک میت کو غسل دینے کے بارے میں اصل ہے۔ پس کہا گیا ہے کہ اس امر سے مراد غسل کا حکم بیان کرنا ہے کہ وہ واجب ہے اور بعض نے کہا ہے: اس سے مقصود غسل کی کیفیت کی تعلیم ہے لہٰذا اس میں کوئی ایسی شے نہیں ہے جو غسل کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ان رایتنّ ذالك دلالت کرتا ہے اور یہ امر کے ظاہر کو وجوب سے نکالنے کا تقاضا کرتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ان کی نظر و فکر کے سپرد کر دیا۔

ان کو کہا گیا: اس میں یہ بعد اور دوری ہے، کیونکہ تمہارا اِنْ رَایتُنَّ کو امر کی طرف لوٹانا، یہ فہم میں جلدی آنے والا نہیں ہے بلکہ یہ بالفور اس شرط کو مذکورہ (مفہوم کے) اقرب کی طرف لوٹانے کا ذریعہ ہے، اور وہ ''اس سے اکثر اور زیادہ ہے'' یا پھر اعداد میں تخییر کی طرف لوٹاتا ہے۔

المختصر اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ میت کو غسل دینا مشروع ہے شریعت میں اس پر عمل کیا گیا ہے اسے (کبھی) نہیں چھوڑا جائے گا اور اس کا طریقہ غسل جنابت کے طریقہ کی طرح ہے جیسا کہ معروف ہے۔ اور بالاجماع ایک میت کو غسل دینے میں سات بار غسل سے تجاوز نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ اسے ابو عمر نے بیان کیا ہے۔ اگر ساتویں بار غسل دینے کے بعد اس سے کوئی شے خارج ہو تو صرف اس مخصوص جگہ کو دھو ڈالا جائے گا، اور اس کا حکم جنبی کے حکم کی طرح ہے جبکہ اسے غسل کے بعد

1۔ الفردوس بماثور الخطاب، جلد 4، صفحہ 32

2۔ سنن ابی داؤد، الجنائز، جلد 2، صفحہ 92۔ ایضاً صحیح بخاری، باب غسل المیت و وضوئه بالماء والسدر، حدیث نمبر 1175، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

حدث لاحق ہو جائے، جب میت کے غسل سے فارغ ہو جائے تو اسے اس کے کپڑوں میں کفن دو اور وہ یہ ہیں۔
عام علماء کے نزدیک کفن دینا واجب ہے، پس اگر اس کا مال ہو تو پھر عام علماء کے نزدیک اس کے رأس المال سے کفن دیا جائے گا، مگر طاؤس نے یہ کہا ہے کہ اس کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس کے تیسرے حصہ سے ہی کفن دیا جائے گا۔
اور اگر میت ان میں سے ہو کہ اس کا نفقہ اس کی زندگی میں ہی کسی اور کے ذمہ لازم ہو مثلاً آقا کے ذمہ اگر وہ غلام ہو یا باپ یا خاوند یا بیٹے کے ذمہ، تو بالاتفاق (کفن) ان پر ہی ہوگا، پھر بیت المال پر یا مسلمانوں کی جماعت پر کفن کفایہ ہو گا اور وہ شے جو اس میں سے تعیین فرض کے ساتھ متعین ہو جاتی ہے وہ ستر عورت (شرمگاہ کو ڈھانپنا) ہے اور اگر اس میں فالتو اور اضافی کپڑا ہو لیکن وہ سارے بدن کو نہ ڈھانپ سکتا ہو تو پھر اس کے چہرہ کی تکریم میں اس کے سر اور چہرہ کو ڈھانپا جائے گا اور اس کے محاسن کی تبدیلی میں سے جو ظاہر ہوا سے ڈھانپ دیا جائے اور اس میں اصل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے، کیونکہ انہوں نے احد کے دن ایک کمبل چھوڑا جب آپ کے سر کو ڈھانپا جاتا تو آپ کے پاؤں اس سے نکل جاتے، اور جب آپ کے پاؤں کو ڈھانپا جاتا تو آپ کا سر باہر نکل جاتا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اسے ان کے سر پر ڈال دو اور ان کے پاؤں پر اذخر (گھاس) رکھ دو (1)۔'' اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔
اور تمام علماء کے نزدیک کفن میں کپڑوں کا طاق (وتر) ہونا مستحب ہے، اور تمام کا اس پر اجماع ہے کہ اس میں کوئی مخصوص حد نہیں ہے اور پھر کپڑوں کا سفید ہونا مستحب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: البسوا من ثیابکم البیاض فانها من خیر ثیابکم و کفنوا فیها موتاکم (2) (تم اپنے سفید کپڑے پہنو کیونکہ یہ لباس تمہارے کپڑوں میں سے بہترین ہے اور اسی میں تم اپنے مردوں کو کفن دو) اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سحول کے بنے ہوئے روئی کے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا اور کسی اور رنگ کے کپڑے میں بھی کفن دینا جائز ہے مگر یہ کہ وہ خالص ریشم یا اون ملا ریشمی کپڑا نہ ہو۔ اور اگر ورثاء کفن میں بخل سے کام لیں تو پھر ان پر جمعہ اور عیدین کے دنوں میں پہنے جانے والے لباس کی مثل کپڑا لازم کر دیا جائے گا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اذا کفن احد کم اخاہ فلیحسن کفنہ (3) (جب تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کفن دے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اچھے کپڑے میں کفن دے) اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ مگر یہ کہ وہ اس سے کم کے بارے وصیت کرے۔ اور اگر اس نے اسراف (فضول خرچی) کی وصیت کی تو کہا گیا ہے: (ضرورت سے) زائد میں (اس کی وصیت) باطل ہوگی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ثلث میں نافذ ہوگی۔ (لیکن) پہلا قول زیادہ صحیح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے وَلَا تُسْرِفُوْا (اور تم فضول خرچی نہ کرو) اور ابوبکر نے کہا ہے: بے شک یہ میت کے بدن سے نکلنے والی پیپ کے لئے ہے۔ اور جب وہ اس کے غسل اور اسے کفن پہنانے سے فارغ ہو جائے اور اسے چارپائی پر رکھ دیا جائے اور اسے آدمی اپنے کندھوں پر اٹھائیں تو اس کا حکم یہ ہے۔

مسئلہ نمبر 5۔ اس کے لئے حکم تیز چلنے کا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسرعوا بالجنازۃ فان تک

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 305۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب الجنائز، حدیث نمبر 1197، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
2۔ سنن ابی داؤد، الطب، جلد 2، صفحہ 185
3۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 306

صالحۃ فخیر تقدمونھا الیہ وان تکن غیر ذالک فشر تضعونہ عن رقابکم (1) (تم میت کو لے کر تیز چلو پس اگر وہ نیک اور صالح ہے تو اچھا اور بہتر ہے تم اسے اس تک جلدی پہنچا دو گے اور اگر وہ اس کے سوا ہے تو وہ برا ہے تم اسے جلدی اپنی گردنوں سے اتار دو گے) (2) اس طرح نہیں ہے جیسا کہ آج جاہل لوگ آہستہ آہستہ لے کر چلتے ہیں، اور بار بار راستے میں ٹھہرتے ہیں، اور ایسی سر اور آواز کے ساتھ قرآن کریم کی قرآت کرتے ہیں جو حلال نہیں ہے اور وہ بھی جائز نہیں ہے جو مصری شہروں کے لوگ اپنے مردوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ نسائی نے روایت کیا ہے کہ محمد بن عبدالاعلی نے ہمیں خبر دی ہے انہوں نے کہا کہ خالد نے اور اسے عیینہ بن عبدالرحمن نے خبر دی ہے اور کہا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا ہے کہ میں حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں حاضر ہوا اور زیاد نکل کر چار پائی کے آگے آگے چلنے لگا اور عبدالرحمن کے خاندان کے لوگ اور ان کے موالی چار پائی اٹھا کر اپنی ایڑیوں پر چل رہے تھے اور کہتے تھے: آہستہ آہستہ، اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے: پس وہ رینگ رینگ کر چل رہے تھے (یعنی انتہائی آہستہ رفتار سے) یہاں تک کہ جب ہم مربد کا کچھ راستہ طے کر چکے تو ہمیں پیچھے سے خچر پر حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ آ کر ملے۔ پس جب آپ نے انہیں وہ کرتے ہوئے دیکھا تو ان پر اپنے خچر سے حملہ کر دیا اور ان پر کوڑا برسایا اور فرمایا: تم چھوڑ دو! قسم ہے سب سے مکرم و محترم ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کی ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے اور ہم میت کو لے کر دوڑتے چلے جاتے تھے تو اس سے قوم خوش ہو گئی (3)۔

اور ابو ماجدہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہم نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کے ساتھ چلنے کے بارے پوچھا: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ دڑکی چال سے ذرا کم ہو اگر وہ میت نیک اور صالح ہوئی تو بہتر ہے اسے اس تک جلدی پہنچا دیا جائے گا اور اگر وہ اس کے سوا ہوئی تو پھر اہل نار سے دور رہو (4)۔'' الحدیث۔ ابو عمر نے کہا ہے: اس مسئلہ میں جس پر علماء کی جماعت ہے (وہ یہ ہے) کہ عام عادت سے چال تھوڑی تیز ہو، اور تیزی ان کے نزدیک آہستہ چال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور ایسی تیزی جو ان کمزور اور ضعیف لوگوں کے لئے باعث مشقت ہو جو جنازہ کے پیچھے چل رہے ہیں وہ مکروہ ہے اور حضرت ابراہیم نخعی نے کہا ہے: میت کو لے کر تھوڑا آہستہ چلو (لیکن) یہود و نصاریٰ کی طرح رینگ رینگ کر نہ چلو۔ اور ایک قوم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں الاسراع کی تاویل یہ کی ہے کہ اس سے مراد دفن میں جلدی کرنا ہے نہ کہ چلنے میں، اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اس وجہ سے جو ہم نے ذکر کر دی ہے۔ وباللہ التوفیق۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور رہی میت پر نماز جنازہ تو یہ جہاد کی طرح واجب (فرض) علی الکفایہ ہے۔ یہی علماء کا مشہور مذہب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کا بھی، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے بارے میں فرمایا: قوموا فصلوا علیہ (تم اٹھو اور اس پر نماز پڑھو) اور اصبغ نے کہا ہے: نماز جنازہ سنت ہے اور انہوں نے امام مالک سے روایت کیا ہے، اس بارے میں مزید بیان سورۃ براۃ میں آئے گا۔

1۔ صحیح مسلم، الجنائز، جلد 1، صفحہ 307-306
2۔ صحیح بخاری، باب السرعۃ بالجنازہ، حدیث 1231، ضیاء القرآن پبلی کیشنز
3۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 271
4۔ ابوداؤد، باب الاسراع بالجنازہ، حدیث 2769، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

مسئلہ نمبر 7۔ میت کو مٹی میں دفن کرنا، اس میں چھپانا اور اسے مٹی کے ساتھ ڈھانپ دینا یہ واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ (المائدہ:31) (پس بھیجا اللہ نے ایک کوا کھودتا تھا زمین کو تاکہ دکھائے اسے کہ کس طرح چھپائے لاش اپنے بھائی کی)

اس آیت کے تحت قبر بنانے کا حکم اور جو کچھ اس میں سے مستحب ہوتا ہے اور اس میں میت کو رکھنے کی کیفیت ذکر کی جائے گی اور اس پر مسجد بنانے کا حکم سورۃ ''الکہف'' میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پس یہ مردوں سے متعلقہ احکام ہیں اور وہ جو زندوں پر ان کے لئے واجب ہوتے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''مردوں کو گالیاں نہ دو کیونکہ وہ اس تک پہنچ چکے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے(1)۔'' اسے مسلم نے روایت کیا ہے، اور سنن نسائی میں آپ ہی سے روایت ہے کہ ام المومنین نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مرنے والے کا ذکر برائی کے ساتھ کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اپنے ہلاک ہونے والوں کا ذکر نہ کرو مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ(2)۔''

قولہ تعالیٰ: وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ پس مومن کا اجر ثواب ہے، اور کافر کا اجر عقاب (سزا) ہے دنیا میں نعمتوں اور آزمائش و مصائب کو اجر اور جزا میں شمار نہیں کیا گیا، کیونکہ یہ فنا ہونے والی ہیں۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ پس جسے آتش جہنم سے دور رکھا گیا۔ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ اور اسے جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ اس کے ساتھ کامیاب ہو گیا جس کی وہ آرزو اور تمنا رکھتا ہے اور اس سے وہ نجات پا گیا جس سے وہ ڈرتا ہے۔ اور اعمش نے زید بن وہب سے، انہوں نے عبدالرحمن بن عبد رب الکعبہ سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من سرہ ان یزحزح عن النار وان یدخل الجنۃ فلتأتہ منیتہ وھو یشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ ویأتی الی الناس الذی یحب ان یؤتی الیہ(3) (جسے یہ بات خوش کرتی ہے کہ اسے آتش جہنم سے دور رکھا جائے اور اسے جنت میں داخل کیا جائے تو چاہئے کہ اس کی موت اسے اس حال میں آئے کہ وہ شہادت دیتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ اور وہ لوگوں کے پاس وہ (شے) لے کر آئے جسے وہ پسند کرتا ہے کہ وہ اس کے پاس لائی جائے۔) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جنت میں کوڑے (برابر) جگہ دنیا اور اس میں موجود تمام چیزوں کی نسبت بہتر ہے اگر تم چاہو تو یہ پڑھ لو فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ۔(4)

وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ یعنی دنیا مومن کے ساتھ مکر کرتی ہے اور اسے دھوکہ دیتی ہے اور وہ اس کے طویل

1۔ سنن نسائی، الجنائز، جلد 1، صفحہ 274۔ ایضاً صحیح بخاری، باب ماینھی من سب الاموات، حدیث 1306، ضیاء القرآن پبلی کیشنز 2۔ ایضاً

3۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، البر والصلۃ، جلد 8، صفحہ 340، حدیث نمبر 13669

4۔ المستدرک التفسیر، جلد 2، صفحہ 327، حدیث نمبر 3170۔ جامع ترمذی، کتاب تفسیر القرآن من رسول اللہ، حدیث 2939، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عرصہ تک باقی رہنے کا گمان کرنے لگتا ہے حالانکہ دنیا فانی ہے۔ اور متاع سے مراد ہر وہ شے ہے جس سے لطف اندوز ہوا جائے اور اس سے نفع اٹھایا جائے، جیسا کہ کلہاڑا، ہانڈی اور پیالہ پھر یہ زائل اور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔

حسن نے کہا ہے: جیسا کہ سرسبز و شاداب نباتات اور بچیوں سے دل بہلانا اس کا کوئی حاصل اور نتیجہ نہیں۔ اور حضرت قتادہ بن‌تنہ نے کہا: یہ چھوڑا ہوا ساز و سامان ہے ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سمیت برباد اور تباہ ہو جائے، لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اس سامان سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے اتنا لے لے جتنی وہ استطاعت رکھتا ہے۔

تحقیق کسی نے کتنا خوب اور اچھا کہا ہے:

هي الدار دار الأذى والقذى　　و دار الفناء و دار الغِيَرْ

یہ (دنیا) اذیتوں اور تکلیفوں کا گھر ہے اور یہ فنا ہونے والا اور تکبر و نخوت کا گھر ہے۔

فلو نِلتَها بحذافيرها　　لَمُتَّ ولم تقض منها الوَطَرْ

پس اگر تو اسے مکمل طور پر بھی پالے تو یقیناً تجھے موت آئے گی اور تیرا مطلوب حاصل نہ ہوا ہوگا۔

أيامن يؤمّل طول الخلود　　و طُولُ الخلود عليه ضَرَرْ

اے وہ جو اس سے طویل آرزوئیں وابستہ رکھتا ہے اس پر ہمیشہ کی آرزو رکھنا باعث ضرر ہے۔

اذا انت شِبْت و بان الشباب　　ولا خير في العيش بعد الكِبَرْ

جب تو بوڑھا ہو جائے گا اور جوانی ڈھل جائے گی تو پھر بڑھاپے کے بعد زندگی میں کوئی مزہ اور خیر نہیں۔

اور الْغُرُوْرِ (عین کے فتحہ کے ساتھ) اس کا معنی شیطان ہے، وہ لوگوں کو جھوٹے وعدوں اور تمناؤں کے ساتھ دھوکہ دیتا ہے، ابن عرفہ نے کہا ہے: غرور سے مراد وہ شے ہے جسے تو ظاہراً دیکھے تو تو اسے پسند کرے، اور اس کا باطن مکروہ (ناپسندیدہ) یا مجہول ہو۔ اور شیطان کمزور ہے، کیونکہ وہ نفس کی محبت پر ابھارتا ہے اور جو اس کے سوا ہے وہ برا ہوتا ہے۔ فرمایا: اس سے بیع الغَرَر بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بیع کا ظاہر اسے دھوکہ دیتا ہے اور باطن مجہول ہوتا ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۗ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝۱۸۶

''یقیناً تم آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور یقیناً تم سنو گے ان سے جنہیں دی گئی کتاب تم سے پہلے اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا اذیت دینے والی بہت باتیں اور اگر تم (ان دل آزاریوں پر) صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔''

یہ خطاب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو ہے اور معنی یہ ہے: تم آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تمہارا امتحان لیا جائے

گا اپنے مالوں میں مصائب کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی تکلیف کے ساتھ اور تمام شرعی پابندیاں لگانے کے ساتھ۔ اور جانوں میں آزمائش موت، امراض میں مبتلا کرنے اور دوست احباب کے فوت ہونے کے ساتھ ہوتی ہے چونکہ مالوں کے سبب مصائب زیادہ ہوتے ہیں اس لئے پہلے ذکر اموال کا فرمایا وَلَتَسْمَعُنَّ اگر کہا جائے: لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کیوں ثابت رہی اور وَلَتَسْمَعُنَّ سے کیوں حذف کر دی گئی، تو جواب یہ ہے کہ لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کا ماقبل مفتوح ہے پس اسے التقاء ساکنین کی وجہ سے حرکت دے دی گئی، اور حرکت بھی ضمہ دی گئی اس لئے کہ یہ واؤ جمع ہے، اور اس کا حذف کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت نہیں کرتی، اور وَلَتَسْمَعُنَّ میں واؤ کو حذف کر دیا گیا کیونکہ اس کے ماقبل کی حرکت اس پر دلالت کر رہی ہے۔ (اور وہ حرکت ماقبل کا ضمہ ہے) اور لَتُبْلَوُنَّ میں واؤ کو ہمزہ سے بدلنا جائز نہیں ہے کیونکہ اس کی حرکت عارضی ہے، نحاس وغیرہ نے یہی کہا ہے۔ اور واحد مذکر کے لئے کہا جائے گا: لَتُبْلَيَنَّ يَا رَجُلُ اور تثنیہ کے لئے: لَتُبْلَيَانِّ يا رجلان اور جمع مذکر کے لئے لَتُبْلَوُنَّ کہا جائے گا، اور اس کا سبب نزول یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ (1) اس نے یہ کلمات قرآن کریم کا رد کرتے ہوئے اور اس کو حقیر سمجھتے ہوئے اس وقت کہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا تو آپ رضی اللہ عنہ نے اسے تھپڑ دے مارا، اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آپ کی شکایت کی تب یہ آیت نازل ہوئی۔ کہا گیا ہے کہ وہ کہنے والا فنحاص یہودی تھا، یہ عکرمہ سے مروی ہے۔

اور زہری نے کہا ہے: وہ کعب بن اشرف تھا اس کے سبب یہ آیت نازل ہوئی، وہ شاعر تھا اور وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ہجو کرتا تھا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کفار قریش کو جمع کرتا تھا، اور مسلمان عورتوں کے ذکر سے اپنے قصیدہ کو مزین کرتا تھا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں کو بھیجا اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔ کتب سیر اور صحیح اخبار میں اس کا قتل مشہور ہے، اور اس کے سوا بھی اقوال ہیں (2)۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو وہاں یہودی اور مشرک تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام بہت زیادہ اذیت ناک باتیں سنتے تھے۔ اور صحیحین میں ہے (3) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابن ابی کے پاس سے گزرے اس حال میں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گدھے پر سوار تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی تو ابن ابی نے کہا: جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اگر وہ سچ ہے تو آپ اس کے ساتھ ہماری مجالس میں ہمیں تکلیف اور اذیت نہ دیں! آپ اپنی سواری کی طرف لوٹ جائیں پس جو آپ کے پاس آئے تو اس پر اسے بیان کیجئے اور اس نے اپنی ناک پکڑ لی تا کہ گدھے کا غبار اس تک نہ پہنچے، تو ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آپ ہماری مجالس میں تشریف لائیے کیونکہ ہم اسے پسند کرتے ہیں۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 550، دار الکتب العلمیہ

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دار الکتب العلمیہ۔ ایضاً صحیح بخاری، باب قتل کعب بن الاشرف، حدیث نمبر 3731، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4200، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ مشرک جو ابن ابی کے پاس موجود تھے وہ اور مسلمان باہم گالی گلوچ کرنے لگے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل انہیں خاموش کراتے رہے یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے گئے وہ بیمار تھے اور فرمایا: ''کیا تم نے وہ سنا ہے جو فلاں نے کہا ہے؟'' تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: آپ اسے معاف فرما دیجئے اور اس سے درگزر کیجئے، قسم ہے اس کی جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی ہے بالیقین اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس حق کے ساتھ بھیجا ہے جو (آپ پر) نازل ہوا ہے، حالانکہ اس شہر کے باسیوں نے اس بات پر اتفاق کر لیا تھا کہ وہ اسے تاج پہنائیں اور اسے سردار بنالیں، تو جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس حق کے ساتھ رد کر دیا ہے جو آپ کو اس نے عطا فرمایا ہے تو اس کے سبب وہ تنگ اور پریشان ہے، اسی لئے اس نے وہ کیا ہے جو آپ نے دیکھا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے درگزر فرمائی، اور پھر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ بھی کہا گیا ہے: یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے صبر اور تقویٰ کو مستحب قرار دیا اور یہ خبر دی کہ یہ عزم الامور (ہمت کے کاموں) میں سے ہے اور اسی طرح بخاری میں (1) سیاق حدیث میں ہے کہ یہ آیت قتال کے نازل ہونے سے پہلے ہوا، اور اظہر یہ ہے کہ یہ منسوخ نہیں، کیونکہ احسن انداز میں اور نرمی کے ساتھ جھگڑنا، مجادلہ کرنا ہمیشہ مستحب رہا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس کے کہ آپ پر قتال کا حکم نازل ہو چکا تھا آپ یہود کے ساتھ صلح کرتے تھے اور ان سے نرمی برتتے تھے، اور منافقین سے درگزر فرماتے تھے، اور یہ بالکل بین اور ظاہر ہے اور عزم الامور کا معنی کاموں کا مضبوط اور پختہ اور سخت ہونا ہے۔ اس پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ٘ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝۱۸۷

''اور یاد کرو جب لیا اللہ تعالیٰ نے پختہ وعدہ ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی کہ تم ضرور کھول کر بیان کرنا اسے لوگوں سے اور نہ چھپانا اس کو تو (الٹا) انہوں نے پھینک دیا اس وعدہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے اور انہوں نے خرید لی اس کے عوض تھوڑی سی قیمت سو بہت بری ہے وہ چیز جو وہ خرید رہے ہیں۔''

اس میں دو مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یہ یہود کے ذکر کے ساتھ متصل ہے، کیونکہ انہیں حضور نبی رحمت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے اور آپ کی شان کے بیان اور وضاحت کرنے کا حکم دیا گیا، تو انہوں نے آپ کی نعت اور تعریف کو چھپا لیا۔ پس یہ آیت ان کے لئے زجر و توبیخ ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ان کے لئے اور دوسروں کے لئے عام خبر ہے۔ حضرت حسن اور حضرت قتادہ نے کہا ہے: یہ آیت ہر اس کے بارے میں ہے جسے کتاب میں سے کسی شے کا علم دیا گیا پس جو کسی شے کا عالم ہو تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی تعلیم دے، اور تم علم چھپانے سے بچو کیونکہ یہ

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 2، صفحہ 256-255

ہلاکت ہے(1) اور حضرت محمد بن کعب نے کہا ہے: کسی عالم کے لئے یہ حلال نہیں ہوتا کہ وہ اپنے علم پر خاموش رہے اور نہ کسی جاہل کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جہالت پر خاموش رہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ الآیہ۔ اور ارشاد فرمایا: فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (النحل) (پس دریافت کرلو اہل علم سے اگر تم خود نہیں جانتے۔)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ نے کتاب کا علم رکھنے والوں سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں تمہیں کوئی شے نہ بتاتا، پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔(2)

اور حضرت حسن بن عمارہ نے کہا ہے: میں حضرت زہری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اس کے بعد کہ انہوں نے حدیث بیان کرنا ترک کر دیا تھا، تو میں نے انہیں اپنے دروازے پر پالیا، میں نے عرض کی: اگر آپ مناسب خیال کرتے ہیں تو مجھے حدیث بیان فرمایئے۔

تو انہوں نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں نے حدیث بیان کرنی چھوڑ دی ہے؟ میں نے عرض کی: یا آپ مجھے حدیث بیان کریں اور یا میں تم سے حدیث بیان کروں گا۔ انہوں نے فرمایا: تم مجھے بیان کرو۔ تو میں نے کہا: مجھے حکم ابن عتیبہ نے یحییٰ بن جزار سے بیان کیا ہے انہوں نے کہا: میں نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: اللہ تعالیٰ نے جاہلوں سے وعدہ نہیں لیا کہ وہ تعلیم حاصل کریں بلکہ اس نے علماء سے وعدہ لیا ہے کہ وہ علم سکھائیں۔ انہوں نے فرمایا: پھر انہوں نے مجھے چالیس احادیث بیان فرمائیں۔

مسئلہ نمبر 2۔ قولہ تعالیٰ: لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ میں ھا ضمیر حضور نبی رحمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ رہی ہے اگرچہ آپ کا ذکر جاری نہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (ضمیر) کتاب کی طرف لوٹ رہی ہے، اور اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کا بیان داخل ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ کتاب میں ہے۔ اور فرمایا: وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ یہاں تکتمنہ نہیں فرمایا کیونکہ یہ حال کے معنی میں ہے۔ یعنی تم اسے بغیر چھپائے کھول کر بیان کرتے ہو۔ اور ابوعمرو اور عاصم نے ابوبکر اور اہل مکہ کی ایک روایت میں لَتُبَيِّنُنَّهٗ خطاب کی حکایت کے طور پر تا کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقیوں نے یا کے ساتھ کیونکہ وہ غائب تھے(3)۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے واذ اخذ الله ميثاق النبيين ليبيننه پڑھا ہے اور قولہ تعالیٰ: فَنَبَذُوْهُ ان لوگوں کی طرف لوٹتے ہوئے آرہا ہے جن کو انبیاء علیہم السلام نے کھول کر بیان کر دیا ہے اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں لَيُبَيِّنُوْنَهٗ بغیر نون تاکید ثقیلہ کے ہے اور النبذ کا معنی پھینکنا ہے اور اس کا بیان سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ یہ پھینکنے میں اظہار مبالغہ ہے، اور اسی سے وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ہے۔ اور اس کا بیان بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے۔

اور قول باری تعالیٰ: وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا کا معنی و مفہوم بھی سورۃ البقرہ میں گزر چکا ہے لہٰذا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ بھی پہلے گزر چکا ہے۔ والحمد للہ۔

1۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 252 2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 551، دارالکتب العلمیہ 3۔ ایضاً

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

''ہرگز آپ یہ خیال نہ کریں کہ جولوگ خوش ہوتے ہیں اپنی کارستانیوں پر اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے کئے ہی نہیں تو ان کے متعلق یہ گمان نہ کرو کہ وہ امن میں ہیں عذاب سے ان کے لئے ہی تو دردناک عذاب ہے۔''

یعنی (وہ عذاب سے امن میں نہیں ہیں) اس فعل کے سبب جو انہوں نے غزوہ سے پیچھے رہ جانے اور گھر میں ہی بیٹھے رہنے کا کیا اور انہوں نے اس کے بارے عذر پیش کر دیئے۔ صحیحین میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں منافقین میں سے کچھ لوگ تھے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ کے لئے تشریف لے جاتے تو وہ آپ سے پیچھے رہ جاتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے بیٹھے رہنے پر خوش ہوتے، اور جب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لاتے تو آپ کے پاس عذر پیش کرتے اور حلف دے دیتے، اور یہ چاہتے اور پسند کرتے کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں سے جو انہوں نے نہیں کئے، تو یہ آیت نازل ہوئی: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا الآیہ (1)۔

اور صحیحین میں یہ بھی ہے (2) کہ مروان نے اپنے دربان کو کہا: اے رافع! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جا اور انہیں یہ کہہ کہ اگر ہم میں سے ہر آدمی اس سے خوش ہو جو کچھ اسے عطا کیا گیا ہے اور یہ پسند کرے کہ اس کی اس کام کے عوض تعریف کی جائے جو اس نے نہیں کیا (اور اس پر) وہ عذاب دیا جائے تو یقیناً ہم تمام عذاب دیئے جائیں گے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تمہیں کیا ہے اس آیت کے ہوتے ہوئے بلاشبہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل کی گئی ہے۔ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ اور لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3) اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کسی شے کے بارے پوچھا تو انہوں نے اسے چھپا لیا، اور انہوں نے آپ کو کسی اور شے کے بارے بتایا اور نکل گئے حالانکہ انہوں نے آپ کے سامنے ظاہر یہ کیا کہ انہوں نے آپ کو اسی کے بارے خبر دی ہے کہ جس کے بارے آپ نے ان سے پوچھا ہے اور اس پر انہوں نے آپ سے تعریف کی بھی خواہش کی، اور اس پر وہ بہت خوش ہوئے جو انہوں نے آپ سے اس شے کو چھپانے کا فعل کیا، اور جس کے بارے آپ نے ان سے پوچھا (4)۔

اور محمد بن کعب قرظی نے کہا ہے: یہ آیت بنی اسرائیل کے ان علماء کے بارے نازل ہوئی ہے جنہوں نے حق کو چھپایا، اور

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 6، صفحہ 656۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 4201، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ آل عمران، حدیث نمبر 4202، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 552، دار الکتب العلمیہ

4۔ ایضاً

وہ اپنے بادشاہوں کے پاس ایسی چیزوں کا علم لے کر آتے تھے جو ان کے ساتھ ان کے باطل نظریات میں موافقت کرتا تھا، وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا (اور انہوں نے اس کے عوض تھوڑی سی قیمت خرید لی) یعنی اس کے عوض انہوں نے وہ دنیا خرید لی جو بادشاہوں نے انہیں عطا کی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۞ پس اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس کے بدلے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بندوں میں دین کے بارے فساد برپا کیا اور ضحاک نے کہا ہے: یہود بادشاہوں کو کہتے تھے بلاشبہ ہم اپنی کتاب میں پاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخری زمانہ میں ایک نبی مبعوث فرمائے گا اور اس کے ساتھ (سلسلۂ) نبوت ختم ہو جائے گا، پس جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تو بادشاہوں نے ان سے پوچھا: کیا یہی وہ نبی ہے جس کا ذکر تم اپنی کتاب میں پاتے ہو؟ تو یہودیوں نے بادشاہوں کے اموال میں حرص اور لالچ رکھنے کی بنا پر کہا: وہ اس کے سوا ہے، (یعنی یہ وہ نہیں ہے) تو بادشاہوں نے انہیں خزانے عطا کر دیئے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا یعنی وہ خوش ہوتے ہیں اس جھوٹ سے جو انہوں نے بادشاہوں کے سامنے بولا یہاں تک کہ انہوں نے دنیوی ساز و سامان حاصل کر لیا (1)۔ پہلی حدیث دوسری حدیث کے مقتضیٰ کے خلاف ہے اور یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آیت کا نزول دونوں سببوں کی بنا پر ہو کیونکہ وہ دونوں ایک ہی زمانہ میں جمع تھے اور یہ دونوں فریقوں کا جواب ہو۔ واللہ اعلم۔

اور آپ کا قول: واستحمدوا بذالك اليه کا معنی ہے انہوں نے آپ سے مطالبہ اور خواہش کی کہ ان کی تعریف کی جائے اور مروان کا قول: لئن کان کل امرئ منا الخ اس پر دلیل ہے کہ عموم کے لئے مخصوص صیغے ہیں، اور یہ کہ الَّذِيْنَ ان میں سے ہے (2)۔ اور یہ یقینی اور قطعی بات ہے جس نے اسے قرآن و سنت سے سمجھا۔

اور قولہ تعالیٰ: وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے نہ کہ پیچھے رہنے والے منافقین کے بارے میں، کیونکہ وہ کہتے تھے: ہم دین ابراہیم پر ہیں حالانکہ وہ آپ کے دین پر نہ تھے، اور وہ کہتے تھے: ہم نماز، روزے اور کتاب والے ہیں، وہ اس سے ارادہ رکھتے تھے کہ اس کے سبب ان کی تعریف کی جائے، اور الذین، یحسبن بایاء سے فاعل ہے۔ اور یہی نافع، ابن عامر، ابن کثیر اور ابوعمرو کی قرأت ہے، یعنی خوش ہونے والے یہ گمان نہ کریں کہ ان کی خوشی انہیں عذاب سے نجات دلانے والی ہے، اور کہا گیا ہے کہ پہلا مفعول محذوف ہے اور وہ انفسھم ہے۔ اور دوسرا بِمَفَازَةٍ ہے۔ اور کوفیوں نے تَحْسَبَنَّ تا کے ساتھ پڑھا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یعنی اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپ گمان نہ کریں کہ خوش ہونے والے عذاب سے امن میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ تا اور با کے فتحہ کے ساتھ ہے، اور یہ تاکید کے لئے دوبارہ مذکور ہے۔ اس کا پہلا مفعول ھُمْ ضمیر ہے، اور دوسرا مفعول محذوف ہے، اور وہ کذالک ہے، اور فا عاطفہ ہے یا زائدہ ہے اس بنا پر کہ دوسرا فعل پہلے سے بدل ہے۔ ضحاک اور عیسیٰ بن عمر نے تا کے ساتھ اور با

3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 256

4۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 258

کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یعنی فَلَا تَحْسَبُنَّهُمْ اور مراد حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو خطاب ہے۔ اور مجاہد، ابن کثیر، ابوعمرو اور یحییٰ بن یعمر نے یا کے ساتھ اور با کو ضمہ (1) کے ساتھ فارحین سے خبر بناتے ہوئے پڑھا ہے۔ یعنی فلا یَحْسَبُنَّ انفسهم، (اور وہ اپنے آپ کو گمان نہ کریں)، بِمَفَازَةٍ یہ مفعول ثانی ہے۔ اور فَلَا یحسبنم تاکید ہوگا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ الذین، یَحْسَبَنَّ سے فاعل ہے۔ اور اس کے دونوں مفعول محذوف ہیں کیونکہ یحسبنهم اس پر دال ہے۔

جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

بأیّ کتاب أم بأیّة آیة ترى حبّهم عارًا علیّ و تحسبُ

اس میں ایک مفعول کے ذکر کے سبب دوسرے مفعول کے ذکر کی ضرورت نہ رہی، اور بمفازۃ مفعول ثانی ہے، اور یہ پہلے فعل سے بدل ہے اور اس نے اس سے بدل ہونے کے سبب اس کے دونوں مفعولوں کے ذکر سے غنی کر دیا ہے، اور فا زائدہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کبھی یہ افعال ملغیٰ آتے ہیں جملہ مفیدہ کے حکم میں نہیں ہوتے۔ جیسے شاعر کا قول ہے:

و ما خِلْت أبقى بیننا من مودّة عِراض المَذَاکِی المُسْنِفاتِ القلائِصا

المَذَاکی سے مراد وہ گھوڑا ہے جس پر اس کے دانت نکلنے کے بعد ایک سال یا دو سال گزر جائیں اس کا واحد مُذَکٍّ ہے، جیسا کہ اونٹوں میں سے مُخْلِف ہوتا ہے، اور مثال میں یہ جری المذکیات غلاب (یعنی طاقتور گھوڑے غالب آتے ہیں) اور المسنفات اسم مفعول ہے۔ کہا جاتا ہے: سنفت البعیر أسنفه سَنْفًا جب تو اونٹ کا اسی کی رسی کے ساتھ تنگ کس لے اور تو اس پر سوار ہو۔

اور أسنف البعیرَ لغة سنفه کی مثل ہے، اور اسنف البعیر بنفسه جب اونٹ چلنے کے لئے اپنا سر اوپر اٹھائے، یہ کبھی متعدی ہوتا ہے اور کبھی متعدی نہیں ہوتا۔ اور عرب اونٹ پر سوار ہوتے تھے اور گھوڑے سے اجتناب کرتے تھے، اور وہ کہتے تھے: الحرب لا تُبقی مودۃ (جنگ محبت کو باقی نہیں رکھتی۔)

اور کعب بن ابی سلمی نے کہا ہے:

أرجو و آمل أن تدنو مَوَدَّتُها وما اخالُ لَدَیْنَا منكِ تنویلُ

میں امید اور آرزو رکھتا ہوں کہ اس کی محبت قریب ہو اور میں یہ خیال نہیں کرتا کہ تیری طرف سے ہمارے پاس کوئی بخشش اور عطا ہو۔

جمہور قراء سبعہ وغیرہم نے أَتَوْا الف مقصورہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی اس کے عوض جو وہ جھوٹ اور کتمان (چھپانا) میں سے لائے۔ اور مروان بن حکم، اعمش اور ابراہیم نخعی نے آتوا مد کے ساتھ پڑھا ہے، اور یہ بمعنی اعطوا ہے۔ (یعنی جو انہوں نے دیا (مراد جو انہوں نے برتاؤ کیا)

اور سعید ابن جبیر نے أُوتُوا صیغہ مجہول کی صورت میں قرأت کی ہے، بمعنی أعطوا اور المفازة بمعنی المنجاة (جائے

1۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 417

نجات) ہے، یہ مفعلۃ کے وزن پر فاز یفوز سے ہے جب کوئی نجات پا جائے، یعنی وہ نجات پانے والے نہیں۔ اور خوف اور ڈر کی جگہ کو اچھی فال لینے کے طور پر مفازۃ کا نام دیا گیا ہے، اصمعی نے یہی کہا ہے(1)۔
اور یہ بھی کہا گیا ہے: کیونکہ یہ موت کی جگہ ہے اور ہلاکت کا ظن غالب ہے، عرب کہتے ہیں فوّز الرجل جب آدمی مر جائے۔ ثعلب نے کہا ہے: میں نے ابن اعرابی کے سامنے اصمعی کا قول بیان کیا تو اس نے کہا: انہوں نے خطا کی ہے۔ مجھے ابوالمکارم نے کہا ہے: اسے مفازۃ کا نام دیا گیا ہے کیونکہ جس نے اسے طے کر لیا وہ کامیاب ہو گیا(2)، نجات پا گیا اور اصمعی نے کہا ہے: لدیغ (جس کو ڈس لیا جائے) کو بطور اچھی فال کے سلیم کا نام دیا گیا ہے(3)۔ ابن اعرابی نے کہا ہے: کیونکہ وہ اس تکلیف اور مصیبت سے بچ نکلنے والا ہے جو اسے پہنچی ہے(4) اور یہ بھی کہا گیا ہے آپ انہیں عذاب سے کہیں دور جگہ میں گمان نہ کریں، کیونکہ فوز (کامیابی اور نجات) مکروہ (عذاب اور تکلیف) سے دور ہونا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

''اور اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔''

یہ ان کے خلاف استدلال اور حجت ہے جنہوں نے یہ کہا ہے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِیْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِیَآءُ اور ان کی تکذیب ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا معنی ہے آپ خوش ہونے والوں کے بارے یہ گمان نہ کریں کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے، کیونکہ ہر شے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے، اور وہ قدرت رکھنے والے رب کے قبضہ میں ہیں، پس یہ پہلے کلام پر معطوف ہے، یعنی بلاشبہ وہ اس کے عذاب سے نجات نہیں پا سکتے، وہ انہیں پکڑ لے گا جب چاہے گا۔ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے، اس پر بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾
الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ
مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا
مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا
سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ
الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ
مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 553، دار الکتب العلمیہ 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

دِيَارِهِمْ وَأُوذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾
لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ
بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ
يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٢٠٠﴾

"بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں (بڑی) نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔ وہ عقل مند جو یاد کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور تسلیم کرتے ہیں) اے ہمارے مالک! نہیں پیدا فرمایا تو نے یہ (کارخانہ حیات) بے کار۔ پاک ہے تو (ہر عیب سے) بچا لے ہمیں آگ کے عذاب سے۔ اے ہمارے رب! بے شک تو نے جسے داخل کر دیا آگ میں تو رسوا کر دیا تو نے اسے اور نہیں ہے ظالموں کا کوئی مددگار۔ اے ہمارے رب! سنا ہم نے منادی کرنے والے کو کہ بلند آواز سے بلاتا تھا ایمان کی طرف (اور کہتا تھا) کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر تو ہم ایمان لے آئے، اے ہمارے مالک! پس بخش دے ہمارے گناہ اور مٹا دے ہم سے ہماری برائیاں اور (اپنے کرم سے) موت دے ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ۔ اے ہمارے رب! عطا فرما ہمیں جو وعدہ کیا تو نے ہمارے ساتھ اپنے رسولوں کے ذریعے اور نہ رسوا کر ہمیں قیامت کے دن۔ بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ تو قبول فرمائی ان کی التجا ان کے پروردگار نے (اور فرمایا) کہ میں ضائع نہیں کرتا عمل کسی عمل کرنے والے کا تم سے خواہ مرد ہو یا عورت بعض تمہارا جز ہے بعض کی تو وہ جنہوں نے ہجرت کی اور نکالے گئے اپنے وطن سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور (دین کے لئے) لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں مٹا دوں گا ان (کے نامہ عمل) سے ان کے گناہ اور ضرور داخل کروں گا انہیں باغوں میں بہتی ہیں جن کے نیچے نہریں۔ (یہ) جزا ہے (ان کے اعمال حسنہ کی) اللہ کے ہاں اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔ (اے سننے والے!) نہ دھوکہ میں ڈالے تجھے چلنا پھرنا ان کا جنہوں نے کفر کیا ملکوں میں۔ یہ لطف اندوزی تھوڑی مدت کے لئے ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ بہت بری ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ لیکن وہ جو ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہوں گے رواں ہوں گی ان کے نیچے ندیاں (وہ متقی) ہمیشہ رہیں گے ان میں یہ

تو مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو (ابدی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ بہت بہتر ہیں نیکوں کے لیے۔ اور بے شک بعض اہل کتاب ایسے ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس پر جو اتارا گیا تمہاری طرف اور جو اتارا گیا ان کی طرف عاجزی (اور نیاز مندی) کرنے والے ہیں اللہ کے لئے نہیں سودا کرتے اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر۔ یہ وہ ہیں جن کا ثواب ان کے رب کے پاس ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ اے ایمان والو! صبر کرو اور ثابت قدم رہو (دشمن کے مقابلہ میں) اور کمر بستہ رہو (خدمت دین کے لئے) اور (ہمیشہ) اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ (اپنے مقصد میں) کامیاب ہو جاؤ۔"

اس میں پچیس مسئلے ہیں:

مسئلہ نمبر 1۔ قولہ تعالیٰ: اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کا معنی سورۃ البقرہ میں کئی مقامات پر گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ان آیات میں نظر و استدلال کے حکم کے ساتھ کیا، کیونکہ یہ پیدا نہیں ہو سکتے مگر اسی کی جانب سے جو حیی و قیوم ہے قدرت والا ہے، پاک ہے، سلامت و محفوظ ہے (ہر عیب اور کمزوری سے) اور کل جہاں سے بے نیاز اور غنی ہے، تا کہ ان کا ایمان یقین کے ساتھ مستند ہو جائے نہ کہ فقط تقلید (پر اس کا انحصار ہو)۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ یعنی ان کے لئے نشانیاں ہیں جو اپنی عقلوں کو دلائل میں غور و فکر کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انہوں نے ارشاد فرمایا: جب یہ آیت حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی آپ اٹھے نماز پڑھنے لگے، تو اتنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے وہ آپ کو نماز کے بارے (مراد جماعت کے لئے) عرض کرنے لگے، تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روتے ہوئے دیکھا تو عرض کی: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ رو رہے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ بخش دیئے ہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے بلال! کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ تحقیق اللہ تعالیٰ نے مجھ پر آج کی رات یہ آیت نازل فرمائی ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ پھر آپ نے فرمایا: اس کے لئے ہلاکت ہے جس نے اسے پڑھا اور اس میں غور و فکر نہ کیا(1)۔"

مسئلہ نمبر 2۔ علماء نے بیان کیا ہے، نیند سے بیدار ہونے والے کے لئے مستحب ہے کہ وہ اپنے چہرے پر (ہاتھ) پھیرے، اور حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرتے ہوئے ان دس آیات کی قرأت سے اپنے قیام کا آغاز کرے، یہ صحیحین اور دیگر کتب میں ثابت ہے اور اس کا بیان آگے آئے گا۔ پھر وہ نماز ادا کرے جو اس کے ذمہ فرض ہے، تو اس طرح وہ تفکر اور عمل دونوں کو جمع کر لے گا، اور یہی افضل عمل ہے جیسا کہ اس کا بیان اس کے بعد اسی آیت میں آئے گا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات سورہ "آل عمران" کی آخری دس آیات پڑھتے تھے، اسے حافظ ابو نصر وائلی سجستانی نے کتاب "الابانہ" میں سلیمان بن موسیٰ عن مظاہر بن اسلم مخزومی عن المقبری عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کیا ہے اور سورہ کی ابتدا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ پہلے گزر چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے آل

1۔ الکشاف، جلد 1، صفحہ 453، مکتب الاعلام الاسلامی۔ ایضاً صحیح بخاری، کتاب تفسیر سورۃ الفتح، حدیث نمبر 4460، حدیث عائشہ، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

عمران کی آخری آیات ہر رات پڑھیں اس کے لئے پوری رات قیام کرنے کا ثواب لکھ دیا گیا۔

مسئلہ نمبر 3۔ قولہ تعالیٰ: الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ اللہ تعالیٰ نے تین ہیئتیں ذکر فرمائی ہیں انسان اپنے غالب معاملات میں ان سے خالی نہیں ہوتا، تو گویا کہ یہ کیفیات اس کے جملہ اوقات کو محیط ہیں۔ اور اس معنی کے مطابق ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ علی کل أحیانہ۔ (1)

اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ پس اس میں بیت الخلا میں اور دوسرے مقامات پر ہونا بھی داخل ہے، حالانکہ علماء نے اس میں اختلاف کیا ہے، اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، ابن سیرین اور نخعی رحمۃ اللہ علیہم نے اسے جائز قرار دیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عطا اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہما نے اسے مکروہ قرار دیا ہے۔ آیت اور حدیث کے عام ہونے کی بنا پر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ حضرت نخعی نے کہا ہے: بیت الخلا میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اس کا معنی ہے کہ ملائکہ اس ذکر کو لے کر بلندیوں کی جانب چڑھ جاتے ہیں اس حال میں کہ وہ ان کے صحف میں لکھا ہوتا ہے، پس مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ (ق) (نہیں نکالتا اپنی زبان سے کوئی بات مگر اس کے پاس ایک نگہبان (لکھنے کے لئے) تیار ہوتا ہے) اور مزید فرمایا: وَ اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ (الانفطار) (حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں جو معزز ہیں (حرف بحرف) لکھنے والے ہیں) اور اس لئے بھی کہ اللہ عزوجل نے اپنے بندوں کو ہر حال میں ذکر کرنے کا حکم ارشاد فرمایا ہے اور کوئی استثنیٰ نہیں کی۔ پس فرمایا: اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب) (یاد کیا کرو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے) مزید فرمایا: فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ:152) (سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا) اور پھر فرمایا: اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ (الکہف) ((تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے) پس یہ سب عام ہے۔ پس ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا ماجور ہوگا اور اسے ثواب دیا جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اور ابونعیم نے ذکر کیا ہے کہ ابوبکر بن مالک، عبداللہ بن احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم نے ہمیں بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے میرے باپ (مراد احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ) نے بتایا کہ وکیع نے بیان کیا کہ سفیان نے عطا بن ابی مروان سے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت کعب الاحبار رحمۃ اللہ علیہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا (کہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: "اے میرے پروردگار! کیا تو قریب ہے کہ میں تیرے ساتھ سرگوشی کروں یا تو بعید ہے کہ میں تجھے ندا دوں تو رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ أنا جلیس من ذکرنی (اے موسیٰ علیہ السلام میں اس کا ہمنشین ہوتا ہوں جو میرا ذکر کرے) عرض کی: اے میرے رب! بلاشبہ ہم تو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں (اور اس میں) ہم تجھے اس سے برتر اور عظیم تر سمجھتے ہیں کہ ہم اس میں تیرا ذکر کریں۔ رب کریم نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ عرض کی: وہ جنابت اور قضائے

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 162۔

حاجت کی حالت ہے۔ رب کریم نے فرمایا: یا موسیٰ اذ کرنی علی کل حال (☆) (اے موسیٰ! تو ہر حال میں میرا ذکر کر۔) اور جنہوں نے اسے مکروہ قرار دیا ہے ان کے نزدیک کراہیت کا سبب یا تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اس سے بلند اور منزہ ہے کہ وہ ایسی جگہوں میں کیا جائے جن میں اس کے ذکر سے اعراض برتا گیا ہے جیسے کہ حمام میں قرآن کریم کی قرأت کا مکروہ ہونا، یا پھر کراماً کاتبین پر اس بناء پر رحم کھانا ہے کہ وہ انہیں غلاظت اور نجاست کی جگہ پر اتارے تا کہ وہ اس کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو لکھیں۔ واللہ اعلم۔

اور قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا ترکیب کلام میں حال ہونے کی بنا پر یہ منصوب ہیں۔ وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ یہ بھی حال کے محل میں ہے، یعنی بمعنی و مضطجعین ہے۔ اور اسی کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: دعانا لجنبه او قاعدا او قائما اس میں ترتیب پہلی آیت کے برعکس ہے، بمعنی دعانا مضطجعا علی جنبه۔ (اس نے ہم سے دعا مانگی اس حال میں کہ وہ اپنے پہلو کے بل لیٹے ہوئے تھا۔)

مفسرین کی ایک جماعت جن میں سے حسن وغیرہ ہیں وہ اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قول یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ آخر تک اس میں ذکر سے مراد نماز ہے، یعنی وہ نماز ضائع نہیں کرتے، پس وہ عذر کی حالت میں بیٹھ کر یا اپنے پہلوؤں کے بل لیٹ کر نماز پڑھتے ہیں (1)۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی مثل ہے: فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ (النساء:103) (جب تم ادا کر چکو نماز تو ذکر کرو اللہ تعالیٰ کا کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے))

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول میں اس کا بیان آ رہا ہے اور جب آیت نماز کے بارے میں ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان نماز پڑھتا ہے کھڑے ہو کر، اور اگر وہ استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنے پہلو کے بل لیٹ کر نماز پڑھتا ہے، جیسا کہ حضرت عمران بن حصین سے ثابت ہے۔ انہوں نے بیان کیا: مجھے بواسیر تھی تو میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے بارے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ، اور اگر تو اس کی استطاعت نہ رکھے تو بیٹھ کر، اور اگر تو اس کی استطاعت بھی نہ رکھے تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر (نماز پڑھ لے۔) (2)'' اسے ائمہ نے روایت کیا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال سے ایک سال پہلے نفل نماز بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔ اور نسائی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چار زانو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے (3)۔ ابو عبد الرحمن نے کہا ہے: میں کسی کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کو روایت کیا ہو سوائے ابوداؤد حضری کے اور وہ ثقہ راوی ہے اور اس حدیث کو خطا گمان کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 4۔ علماء نے مریض اور بیٹھ کر نماز پڑھنے والے کی نماز کی کیفیت اور اس کی ہیئت میں اختلاف کیا ہے، پس ابن عبد الحکم نے مالک سے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے قیام میں چار زانو بیٹھ سکتا ہے، البویطی نے امام شافعی سے یہی بیان کیا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ

2۔ سنن ابن ماجہ، اقامۃ الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 87۔ ایضاً، ابن ماجہ، حدیث نمبر 1212، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

3۔ سنن نسائی، ال[illegible] 245　☆ حلیۃ الاولیاء، ابو نعیم، جلد 6، صفحہ 42

ہے۔ اور جب وہ سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو وہ جس قدر طاقت رکھتا ہو وہ سجدہ کرنے کی تیاری اور کوشش کرے، فرمایا: اسی طرح نفل پڑھنے والے کا حکم بھی ہے۔ اور اسی طرح ثوری کا قول بھی ہے، اور اسی طرح لیث، امام احمد، اسحاق، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے۔ اور امام شافعی نے مزنی کی روایت میں کہا ہے: وہ اپنی ساری نماز میں تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھ سکتا ہے۔ اور یہی امام مالک اور ان کے اصحاب سے روایت کیا گیا ہے، پہلا قول مشہور ہے اور یہی مدونہ کا ظاہر ہے (1) اور امام اعظم ابو حنیفہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ تشہد میں بیٹھنے کی طرح بیٹھے گا، اور اسی طرح وہ رکوع اور سجود بھی کرے گا۔

مسئلہ نمبر 5۔ فرمایا: اگر وہ بیٹھنے کی استطاعت نہ رکھے تو وہ اپنے پہلو کے بل یا اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے یہ اسے اختیار ہے، یہی مدونہ کا مذہب ہے اور ابن حبیب نے ابن قاسم سے بیان کیا ہے کہ وہ اپنی پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو اپنے دائیں پہلو پر لیٹ کر (اور اگر اس پر قادر نہ ہو) تو پھر اپنے بائیں پہلو پر لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور ابن المواز کی کتاب میں اس کے برعکس ہے، (یعنی) وہ اپنے دائیں پہلو پر نماز پڑھے ورنہ اپنے بائیں پہلو پر نماز پڑھے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ پیٹھ کے بل لیٹ کر نماز پڑھے۔ اور سحنون نے کہا ہے: وہ دائیں پہلو پر نماز پڑھے گا جس طرح اسے اپنی لحد میں رکھا جائے گا، اور اگر وہ اس پر قادر نہ ہو تو پھر اپنی پیٹھ پر لیٹ کر نماز پڑھ لے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر بائیں پہلو پر نماز پڑھے گا (2)۔ اور امام مالک اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: جب وہ چت لیٹ کر نماز پڑھے تو اس کے دونوں پاؤں قبلہ سمت ہوں گے اور امام شافعی او ثوری رحمۃ اللہ علیہما نے کہا ہے: وہ اپنے پہلو پر نماز پڑھے گا اور اس کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوگا۔

مسئلہ نمبر 6۔ اور اگر وہ مرض کم ہونے کی وجہ سے قوی اور طاقتور ہو جائے درآنحالیکہ وہ نماز میں ہو، تو اس کے بارے ابن القاسم نے کہا ہے: وہ اپنی مابقی نماز میں کھڑا ہو جائے گا اور اپنی پہلی نماز پر ہی اس کی بنا کرے گا، یہی قول امام شافعی، زفر اور طبری رحمۃ اللہ علیہم کا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے صاحبین یعقوب اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم نے اس کے بارے میں کہا ہے: جس نے ایک رکعت لیٹ کر نماز پڑھی پھر وہ تندرست ہو گیا وہ اپنی نماز نئے سرے سے پڑھے گا۔ اور اگر وہ بیٹھ کر رکوع و سجود کر رہا ہے پھر وہ تندرست ہو جائے تو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ اسی پر بنا کرے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ بنا نہ کرے۔ اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: جب کسی نے کھڑے ہو کر نماز شروع کی پھر وہ اشارے کی حد تک پہنچ گیا تو اسے بنا کر لینی چاہیے، اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مروی ہے۔ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے مریض کے بارے میں کہا ہے جو رکوع اور سجود کی استطاعت نہ رکھتا ہو حالانکہ وہ کھڑا ہونے اور بیٹھنے کی قدرت رکھتا ہو کہ وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے گا اور رکوع کے لئے اشارہ کرے گا اور جب سجدہ کرنے کا ارادہ کرے تو بیٹھ جائے اور سجود کے لئے اشارہ کرے، اور یہی امام ابو یوسف کا قول ہے اور امام شافعی کے قول کا قیاس ہے، اور امام اعظم ابو حنیفہ اور آپ کے اصحاب نے کہا ہے: وہ بیٹھ کر نماز پڑھے گا۔

مسئلہ نمبر 7۔ اور جہاں تک تندرست لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز کا تعلق ہے تو عمران بن حصین کی حدیث سے یہ ز

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 554، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً

یادتی مروی ہے جو کسی اور کی روایت میں موجود نہیں، اور وہ یہ ہے صلاۃ الراقد مثل نصف صلاۃ القاعد (1) (لیٹ کر پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز کے نصف کی مثل ہے۔) ابو عمر نے کہا ہے کہ جمہور اہل علم نفلی نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے، اور وہ حدیث ہے جسے حسین المعلم کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا اور وہ حسین ابن ذکوان ہے جس نے عبداللہ بن بریدہ سے اور انہوں نے عمران بن حصین سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کی سند اور متن میں حسین پر ایسا اختلاف کیا گیا ہے جو اس کے بارے توقف کو ثابت کرتا ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو میں نہیں جانتا اس کی وجہ کیا ہے، پس اگر اہل علم میں سے کسی ایک نے ایسے آدمی کے لئے نفل نماز لیٹ کر پڑھنے کی اجازت دی ہے جو بیٹھنے پر قادر ہو یا قیام پر قادر ہو تو پھر اس کی وجہ یہی زیادتی ہے جو اس حدیث میں ہے اور یہی اس کی حجت اور دلیل ہے جس نے یہ موقف اختیار کیا ہے اور اگر انہوں نے ایسے آدمی کے لئے جو بیٹھنے یا کھڑا ہونے پر قادر ہو لیٹ کر نفل نماز پڑھنے کے مکروہ ہونے پر اجماع کیا ہے، تو پھر حسین کی یہ حدیث یا غلط ہے یا پھر منسوخ ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: اس آیت سے مراد وہ لوگ ہیں جو خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے اس پر استدلال کرتے ہیں کہ تبدیل ہونے والے کے لئے تبدیل کرنے والے کا ہونا ضروری ہے، اور اس تبدیلی لانے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ قدرت کاملہ رکھتا ہو، اور اس کا اختیار ہو کہ وہ رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے، پس اگر وہ کوئی رسول مبعوث فرمائے اور اس کی صداقت پر ایک معجزہ کے ساتھ دلیل بھی بیان کر دے تو پھر کسی کے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہتا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 8۔ قولہ تعالیٰ: وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تحقیق ہم نے وید کہن کا معنی بیان کر دیا ہے اور اس سے مراد یا تو زبان کا ذکر ہے یا پھر فرضی اور نفلی نماز ہے، تو اللہ تعالیٰ نے دوسری عبادت کو ان میں سے ایک پر دوسری عبادت کے ساتھ عطف کیا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں اور اس کی مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور لوگوں کی اس جماعت میں غور و فکر کرنا جو بکھری ہوئی ہے، تاکہ ان کی بصیرت میں اضافہ کرے:

و فی کل شیٔ لہ آیۃ تَدُلُّ علی أَنَّهُ واحدُ

اور ہر شے میں اس کے لئے نشانی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ یکتا ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے: يَتَفَكَّرُوْنَ کا حال پر عطف ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ منقطع ہے۔ پہلا قول زیادہ مناسب ہے اور فکر کا معنی ہے: تردد القلب فی الشیٔ (کسی شے میں دل کا متردد ہونا) کہا جاتا ہے: تفکر، اور رجل فکیر یعنی ایسا آدمی جو بہت زیادہ فکر کرنے والا ہو۔ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم کے پاس سے گزرے وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تفکروا فی الخلق ولا تتفکروا فی الخالق فانکم لا تقدرون قدرہ (2) (تم مخلوق میں غور و فکر کرو

1۔ صحیح بخاری، تقصیر الصلوٰۃ، جلد 1، صفحہ 150۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 1048، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ کنز العمال، التفکر، جلد 3، صفحہ 108، حدیث نمبر 5706

اور خالق میں غور و فکر نہ کرو کیونکہ تم اس کی قدرت اور عظمت (کو پہنچاننے) کی قدرت نہیں رکھتے۔) بلاشبہ تفکر مخلوقات میں غور و فکر کرنا اور ذہن کو اس میں گھمانا ہے جیسا کہ فرمایا: وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت سفیان ثوری نے مقام کے پیچھے دو رکعتیں پڑھیں، پھر اپنا سر آسمان کی طرف اٹھایا، اور جب ستاروں کو دیکھا تو آپ پر غشی طاری ہو گئی، اور انتہائی حزن و غم اور فکر کی وجہ سے پیشاب میں خون بہنے لگا۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس اثنا میں کہ آدمی اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہو اور وہ ستاروں اور آسمان کی طرف دیکھے اور پھر یہ کہے اشهد ان لك ربا و خالقا اللّٰهم اغفرلي فنظر الله اليه فغفرله (1) (میں شہادت دیتا ہوں کہ تمہارا رب اور خالق ہے اے اللہ! میری مغفرت فرما پس اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر (رحمت) فرماتا ہے اور اسے بخشش دیتا ہے۔)

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لاعبادة كتفكر (2) (فکر کرنے کی طرح کوئی عبادت نہیں) اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا: تفكر ساعة خير من عبادة سنة (3) (ایک ساعت کی غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے)

اور ابن القاسم نے حضرت امام مالک سے روایت کیا ہے انہوں نے کہا: حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا زیادہ تر عمل کیا تھا؟ تو انہوں نے بتایا: ان کا اکثر عمل غور و فکر میں مشغول رہنا تھا۔ تو ان سے پوچھا گیا: کیا آپ تفکر کو اعمال میں سے ایک عمل گمان کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں، یہ تو یقین ہے۔ حضرت ابن مسیب سے ظہر اور عصر کے درمیان نماز کے بارے پوچھا گیا، تو انہوں نے فرمایا: یہ عبادت نہیں ہے، بلاشبہ عبادت اس عمل سے بچنا اور دور رہنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، در تفکر (غور و فکر کرنا) اللہ تعالیٰ کے امر میں داخل ہے۔

اور حسن نے بیان کیا ہے: ایک ساعت کی غور و فکر رات بھر قیام کرنے سے بہتر ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہم نے یہی کہا ہے (4)۔

اور حسن نے کہا ہے: فکر کرنا مومن کا آئینہ ہے جس میں وہ اپنی نیکیوں اور اپنی برائیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ان میں سے جن میں وہ غور و فکر کرتا ہے آخرت کے خوف ہیں مثلاً حشر و نشر، جنت اور اس کی نعمتیں، اور جہنم اور اس کا عذاب اور یہ بھی روایت کیا جاتا ہے کہ ابو سلیمان دارانی رضی اللہ عنہ نے پانی کا برتن اٹھایا تاکہ آپ رات کی نماز کے لئے وضو کریں اور ان کے پاس ایک مہمان بھی تھا، تو اس نے آپ کو دیکھا کہ جب اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو اسی طرح غور و فکر کرتے ہوئے کھڑے رہے یہاں تک فجر طلوع ہو گئی، تو اس نے ان سے کہا: اے ابا سلیمان یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: جب میں نے اپنا ہاتھ کوزے کے دستے پر رکھا تو میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور و فکر کرنے لگا اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝ (المومن) (جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، انہیں گھسیٹ کر لے جایا جائے گا) تو میں اپنی حالت کے بارے میں سوچنے لگا میں طوق سے ملوں گا اگر قیامت کے دن میری گردن میں ڈال دیا گیا، پس میں یہی سوچتا رہا یہاں تک

1۔ الکشاف، جلد 2، صفحہ 454
2۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 4، صفحہ 221، دار المسیرہ بیروت
3۔ الاسرار المرفوعة الاخبار الموضوعة، صفحہ 175، حدیث نمبر 114
4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ

کہ صبح ہوگئی۔ ابن عطیہ نے کہا ہے: ''یہ خوف کی انتہا ہے، اور امور میں بہتر میانہ روی ہے، اور امت کے علماء وہ نہیں ہیں جو اس راستے پر جحت ہیں، اللہ تعالیٰ کی کتاب کا علم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے معانی اس کے لئے پڑھنا اور سیکھنا جو سمجھ سکتا ہو اور اس کے لئے نفع کی امید کی جاسکتی ہو اس سے افضل ہے'' ابن العربی نے کہا ہے: لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ دونوں عملوں میں سے کون سا افضل ہے فکر کرنا یا نماز پڑھنا، صوفیہ کا نظریہ یہ ہے کہ فکر کرنا افضل ہے، کیونکہ اس کا پھل اور نتیجہ معرفت ہے اور یہ مقامات شرعیہ میں سے افضل مقام ہے۔

اور فقہاء نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نماز افضل ہے، کیونکہ حدیث طیبہ میں اس پر برانگیختہ کرنا، اس کی طرف دعوت دینے اور اس کی ترغیب دلانے کا ذکر موجود ہے اور صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ نے ایک رات اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گزاری، اور آپ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت اٹھے اور آپ نے اپنے چہرہ اقدس سے نیند جھاڑی پھر سورہ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھیں، اور لٹکے ہوئے مشکیزے کے پاس کھڑے ہوئے اور خفیف سا وضو فرمایا اور پھر تیرہ رکعتیں نماز ادا فرمائی (1)، الحدیث۔ تم پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی طرف دیکھو تو یہ مخلوقات میں تفکر اور پھر اس کے بعد آپ کی نماز کی طرف متوجہ ہونے کا مجموعہ ہے، اور یہی وہ سنت ہے جس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ پس رہا صوفیہ کا طریقہ کہ ان میں سے ایک شیخ دن، رات اور مہینہ فکر کرنے والا ہوتا ہے وہ سست اور ڈھیلا نہیں پڑتا، لیکن یہ طریقہ راہ صواب سے بہت دور ہے عام انسان کے لائق اور مناسب نہیں ہے اور نہ آدمی اس پر مسلسل عمل پیرا رہ سکتا ہے۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: میرے باپ نے مجھے بعض علماء مشرق سے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ میں ایک رات مصر کی مسجد الاقدام میں تھا، میں نے عشاء کی نماز پڑھی تو میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اپنے اوپر ہر طرف سے کمبل لپیٹ کر لیٹا ہوا ہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی، اور ہم نے اس رات نماز (تہجد) پڑھی، پس جب صبح کی نماز کھڑی ہوئی تو وہ آدمی اٹھا، قبلہ شریف کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے لوگوں کے ساتھ مل کر نماز پڑھی۔ میں نے یہ اس کی بہت بڑی جرأت قرار دی کہ اس نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی ہے، چنانچہ جب میں نماز سے فارغ ہوا اور وہ باہر نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا تاکہ میں اسے نصیحت کروں، پس جب میں اس کے قریب ہوا تو میں نے اسے یہ شعر کہتے ہوئے سنا:

مستغی الجسم غائب حاضر منتبه القلب صامت ذاكر

جسم کو ڈھانپنے والا غائب بھی ہے اور حاضر بھی اس کا دل بیدار ہے وہ خاموش بھی ہے اور ذاکر بھی۔

منقبض فی الغیوب منبسط كذاك من كان عارفا ذاكر

وہ غیب کے پردوں میں سمٹنے والا بھی ہے اور پھیلنے والا بھی اسی طرح وہ ہوتا ہے جو عارف ذاکر ہو۔

يَبِيتُ فی لیلِهِ أخا فِكَرٍ فهو مَدَی اللیل نائمٌ ساهر

1۔ صحیح بخاری، التفسیر، جلد 2، صفحہ 651۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 177، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

وہ اپنی رات فکر کرتے ہوئے گزار دیتا ہے پس وہ رات کے وقت سونے والا جاگ رہا ہوتا ہے۔
انہوں نے بیان کیا: پس میں جان گیا کہ یہ ان میں سے ہے جو فکر کے ساتھ عبادت کرتے ہیں تو پھر میں اس سے واپس چلا گیا(1)۔

مسئلہ نمبر 9۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا یعنی وہ عرض کرتے ہیں: تو نے کسی شے کو عبث اور بے کار پیدا نہیں کیا، بلکہ تو نے اسے اپنی قدرت اور اپنی حکمت پر بطور دلیل پیدا کیا ہے اور باطل کا معنی زائل ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔

اور اسی سے لبید کا قول ہے:

الا کل شئ ما خلا اللہ باطل

خبردار جان لو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے فناہ ہونے والی اور ختم ہونے والی ہے۔ اس میں باطل بمعنی زائل ہے۔
اور بَاطِلًا کو نصب دی گئی ہے کیونکہ وہ مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی اصل میں خلقاً باطلاً ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرف جر کے حذف ہونے کی بنا پر منصوب ہے، یعنی یہ ماخلقتہا للباطل تھا۔ اور یہ قول بھی ہے کہ یہ مفعول ثانی ہونے کی بنا پر منصوب ہے اور خلق بمعنی جعل ہوگا۔ سُبْحٰنَكَ نحاس نے موسیٰ بن طلحہ سے مسند روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سبحان اللہ کے معنی کے بارے عرض کی گئی، تو آپ نے فرمایا: تنزیہ اللہ عن السوء (2) (ہر عیب اور کمزوری سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا۔) اس کے بارے مکمل بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے۔
فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور ہمیں جہنم کے عذاب سے پناہ عطا فرما، اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 10۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ (اے ہمارے رب بے شک تو نے جسے آگ میں داخل کر دیا) تو تو نے اسے ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور مفضل نے کہا ہے: تو تو نے اسے ہلاک و برباد کر دیا۔

اور انہوں نے یہ شعر بھی کہا ہے:

أخزى الإلهُ من الصليب عبيدَه　واللابسين قلانس الرهبانِ

اللہ تعالیٰ نے صلیب سے اپنے بندوں کو ہلاک کیا ہے حالانکہ وہ راہبوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور بعض نے کہا ہے (کہ اَخْزَيْتَهٗ کا معنی ہے) تو نے اسے رسوا کر دیا ہے اور تو نے اسے دور کر دیا ہے، کہا جاتا ہے: أخزاہ اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دور کر دیا اور اسے ہلاک کر دیا۔
اور اس سے اسم الخِزْیُ ہے۔ ابن السکیت نے کہا ہے: خَزِيَ يَخْزَى خِزْيًا جب کوئی کسی آزمائش اور مصیبت میں پڑ جائے، واقع ہو جائے۔ اصحاب وعید نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اور کہا ہے: جسے آتش جہنم میں داخل کیا جائے گا (اس کے بارے میں یہ کہنا مناسب ہوگا) کہ وہ مومن نہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ اور باشبہ اللہ تعالیٰ فرماتا

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 555، دار الکتب العلمیہ　2۔ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، الاذکار، جلد 10، صفحہ 102، حدیث نمبر 16849۔

ہے: يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (التحریم:8) (اس روز رسوا نہیں کرے گا اللہ تعالیٰ (اپنے) نبی کو اور ان لوگوں کو جو آپ کے ساتھ ایمان لائے) اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے مردود ہے، کیونکہ اس پر دلائل قائم ہیں کہ جس نے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا اس سے ایمان کا اسم زائل نہ ہوگا۔ (یعنی گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن باقی رہتا ہے۔) جیسا کہ اس کے بارے کچھ گزر چکا ہے اور کچھ آگے آئے گا۔ لہٰذا قول باری تعالیٰ: مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ سے مراد وہ ہے جو ہمیشہ جہنم میں رہے گا (1)، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: تدخل تخلد کا مقلوب ہے (2)، اور ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح اہل حروراء نے کہا۔ اور حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں خاص ہے جنہیں آگ سے نہیں نکالا جائے گا (3)، اسی لئے یہ فرمایا ہے: وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ یعنی کفار کا کوئی مددگار نہیں ہے اور اہل معانی نے کہا ہے: الخزی یہ احتمال رکھتا ہے کہ یہ حیاء کے معنی میں ہو، کہا جاتا ہے: خَزِيَ يَخْزَى خِزَايَةً جب وہ شرم اور حیا محسوس کرے، فهو خذیان (شرمندہ ہونے والا)۔

ذوالرمہ نے کہا ہے:

خِزَايَةٌ أدركتْه عِنْدَ جَوْلَتِه　　　من جانبِ الحَبْلِ مخلوطا بها الغضبُ

اس میں خزایۃ شرم وحیاء کے معنی میں ذکر کیا گیا ہے۔

پس اس دن خزی المومنین سے مراد تمام اہل ادیان کے سامنے ان کا دخول نار میں شرم وحیاء محسوس کرنا ہے یہاں تک کہ وہ اس سے باہر نکل آئیں۔ اور خزی للکافرین سے مراد اللہ تعالیٰ کا انہیں بغیر موت کے جہنم میں ہلاک اور برباد کرنا ہے اور مومنین مر جائیں گے، تو اس طرح دونوں فریق جدا جدا ہو گئے۔ صحیح سنت میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اسی طرح ثابت ہے، اسے مسلم نے روایت کیا ہے۔ یہ پہلے بھی گزر چکا ہے اور آگے بھی رہا ہے۔

مسئلہ نمبر 11۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اس میں منادی سے مراد حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم اور اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے (4)۔ اور حضرت قتادہ اور محمد بن کعب القرظی نے کہا ہے: اس سے مراد قرآن ہے، کیونکہ ان تمام نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع نہیں کیا (5)۔ اس قول کی دلیل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے جنوں کے بارے میں خبر دی ہے جبکہ انہوں نے کہا: اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ يَّهْدِيْۤ اِلَى الرُّشْدِ (الجن:) (کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے راہ دکھاتا ہے ہدایت کی) اور پہلے قول والوں نے جواب دیا اور کہا: جنہوں نے قرآن کریم سنا گویا انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی، اور یہ معنوی طور پر صحیح ہے۔

اور اَنْ اٰمِنُوْا میں اَنْ حرف جر حذف ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے، یعنی یہ اصل میں بِاَنْ اٰمِنُوْا ہے۔ اور کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی سمعنا منادیا للایمان ینادی، یہ ابو عبیدہ سے منقول ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لام بمعنی الی ہے۔ یعنی

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ　2۔ زاد المسیر، جلد 1-2، صفحہ 418　3۔ جامع البیان للطبری، جلد 3-4، صفحہ 262

4۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ　5۔ ایضاً

لِلْاِیْمَانِ سے مراد الی الایمان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (المجادلہ:8) اور یہ ارشاد گرامی: بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (الزلزلۃ:5) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا (الاعراف:43) یعنی مراد الی هذا ہے، اور اس کی مثالیں کثیر ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ لام أجل ہے یعنی مراد لأجل الایمان ہے۔

مسئلہ نمبر 12۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا یہ دعا میں تاکید اور مبالغہ ہے اور دونوں لفظوں کا معنی ایک ہے، کیونکہ غفر اور کفر دونوں کا معنی ستر (ڈھانپنا اور چھپانا) ہے۔ وتوفنا مع الابرار یعنی ہمیں موت دے نیکیاں کرنے والے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ، یعنی ان کے گروہ اور زمرہ میں، ابرار کی واحد بَرٌّ اور بَارٌّ ہے اور اس کی اصل الاتساع (وسعت ہونا) سے ہے۔ فکان البر متسع فی طاعة الله و متسعة له رحمة الله۔ یعنی گویا کہ نیکی کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طاعت وعبادت میں وسیع ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے لئے وسیع ہوتی ہے۔

مسئلہ نمبر 13۔ قولہ تعالیٰ: رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ یعنی علی السنة رسلك (اے ہمارے رب! ہمیں وہ عطا فرما جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانوں سے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا۔) یعنی یہ وَ سْـَٔلِ الْقَرْیَةَ (یوسف:82) ای اهل القریة کی مثل ہے۔ اعمش اور زہری نے تخفیف کے ساتھ رُسْلِكَ پڑھا ہے(1)، اور اس سے مراد وہ ہے جو کچھ مومنین کے لئے انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ کے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے، اور ملائکہ زمین میں رہنے والوں کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور وہ مراد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا مومنین کے لئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کے لئے استغفار کرنے کے بارے ذکر کیا گیا ہے۔ وَ لَا تُخْزِنَا یعنی تو ہمیں عذاب نہ دے، اور تو ہمیں ہلاک نہ کر اور تو ہمیں رسوا نہ کر، اور تو ہمیں ذلیل نہ کر، اور تو ہمیں دور نہ کر اور تو ہمیں قیامت کے دن ناپسند نہ کر۔ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ اگر کہا جائے: ان کے اس قول کی وجہ کیا ہے ربنا واتنا ما وعدتنا علی رسلك حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا، تو اس کے جواب کی تین وجوہ ہیں:

(۱) بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں کے ساتھ جنت کا وعدہ فرمایا ہے، پس انہوں نے سوال کیا کہ وہ ان میں سے ہو جائیں جن کے ساتھ یہ وعدہ کیا گیا ہے نہ کہ ان کے ساتھ جس سے رسوائی، ذلت اور سزا کا وعدہ کیا گیا ہے۔

(۲) کہ انہوں نے یہ دعا عبادت اور خضوع کی جہت پر مانگی، اور دعا عبادت کا مغز ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ (الانبیاء:112) (آپ نے عرض کی میرے رب فیصلہ فرما دے (ہمارے درمیان) حق کے ساتھ) اگرچہ وہ حق کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔

(۳) انہوں نے یہ التجا کی کہ انہیں وہ کچھ جلدی عطا کیا جائے جو دشمن کے خلاف ان کی مدد و نصرت کا وعدہ ان سے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے بارے میں یہ بیان ہے، کہ انہوں نے دین کے غلبے کے لئے یہ التجا کی۔ واللہ اعلم۔

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 556، دار الکتب العلمیہ

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس سے اللہ تعالیٰ نے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ فرمایا ہے تو وہ بطور رحمت کے اس کے لئے اسے پورا کرے گا اور جس کے لئے کسی عمل پر سزا کا وعدہ کیا ہے تو اس میں اس کا اختیار اور مرضی ہے (1)۔'' عرب وعدہ خلافی پر مذمت کرتے ہیں اور وعید خلافی میں مدح اور تعریف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے کہا ہے:

ولا یرھبُ ابن العم ما عِشتُ صَوْلَتِی　　ولا اختَفِی من خشیَۃ المتھدِّد

ابن العم کو کوئی خوف نہ ہوگا جب تک میں رعب وسطوت کے ساتھ زندہ رہا اور میں کسی ڈرانے والے کے خوف سے نہیں چھپتا۔

وانی متی أوعدتُہ او وعدتہ　　لَمخلِفُ ایعادِی و مُنجِزُ مَوْعِدِی

اور میں نے جب اسے دھمکایا یا اس سے وعدہ کیا تو وہ میری وعید کے خلاف کرتا ہے اور وعدہ کو پورا کرتا ہے۔

مسئلہ نمبر 14۔ قولہ تعالیٰ: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ پس ان کے رب نے ان کی دعا کو قبول کرلیا۔

حسن نے کہا ہے: وہ مسلسل کہتے رہے ربنا ربنا (اے ہمارے رب، اے ہمارے رب) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے: جسے کوئی اہم در پیش ہو (یا کسی کو غم لاحق ہو) تو وہ پانچ مرتبہ کہے ربنا تو اللہ تعالیٰ اسے اس سے نجات عطا فرمادے گا جس سے وہ ڈر رہا ہے اور وہ چیز اسے عطا فرمادے جس کا وہ ارادہ رکھتا ہے آپ سے عرض کی گئی: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

مسئلہ نمبر 15۔ قولہ تعالیٰ: اَنِّیْ یہ اصل میں بانی تھا۔ اور عیسیٰ بن عمر نے اِنی ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی پس کہا: انی۔ (2) اور حاکم ابو عبداللہ نے اپنی صحیح میں حضرت ام سلمہ سے حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے عرض کی: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بارے میں کسی شی کے ساتھ عورتوں کا ذکر نہیں کیا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَاۤ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى الآیہ (3) اور اسے ترمذی نے بیان کیا ہے اور مِنْ تاکید کے لئے داخل ہے، کیونکہ اس سے پہلے حرف نفی ہے۔ اور کوفیوں نے کہا ہے: یہ تفسیر کے لئے ہے اور اس کا حذف

1۔ مسند ابو یعلیٰ، مسند انس بن مالک، جلد 3، صفحہ 180، حدیث نمبر 3303　2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ

3۔ المستدرک، التفسیر، جلد 2، صفحہ 328، حدیث نمبر 3174۔ ایضاً، جامع ترمذی، باب من سورۃ النساء، حدیث 2949، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ اس معنی کے لئے داخل ہے جو اس کے بغیر کلام ادا نہیں کر سکتی اور اسے حذف کیا جا سکتا جب یہ نفی کی تاکید کے لئے ہوتا۔ بَعۡضُكُم مِّنۢ بَعۡضٍ یہ مبتدا خبر ہے۔ یعنی تمہارا دین ایک ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: تم میں سے بعض بعض کی جز ہیں ثواب میں، احکام میں، اور مدد و نصرت اور اسی طرح کے دیگر معاملات میں اور حضرت ضحاک نے کہا ہے: تمہارے مرد طاعت میں تمہاری عورتوں کی مثل ہیں، اور تمہاری عورتیں طاعت (وعبادت) میں تمہارے مردوں کے مشابہ ہیں، اس کی نظیر الله تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَالۡمُؤۡمِنُونَ وَالۡمُؤۡمِنَٰتُ بَعۡضُهُمۡ أَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ (التوبہ: 71) (نیز مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔) اور کہا جاتا ہے: فلان منی، یعنی فلاں میرے مذہب اور میرے اخلاق پر ہے۔

مسئلہ نمبر 16۔ قولہ تعالیٰ: فَٱلَّذِينَ هَاجَرُواْ یہ مبتدا اور خبر ہے، یعنی جنہوں نے اپنے وطنوں کو چھوڑا اور مدینہ طیبہ کی طرف چلے گئے۔ وَأُخۡرِجُواْ مِن دِيَٰرِهِمۡ اور وہ الله عزوجل کی طاعت و عبادت کے سبب اپنے گھروں سے نکالے گئے۔ وَقَٰتَلُواْ اور انہوں نے میرے دشمنوں کے خلاف جنگ کی۔ وَقُتِلُواْ اور میری راہ میں قتل کر دیئے گئے۔ ابن کثیر اور ابن عامر نے پڑھا ہے وقاتلوا وقتلوا(1) کثرت کی بنا پر۔ اور اعمش نے قرأت کی ہے وقتلوا و قاتلوا کیونکہ واؤ اس معنی پر دلالت نہیں کرتی کہ دوسرا پہلے کے بعد ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: کلام میں قد مضمر ہے یعنی قتلوا و قد قاتلوا۔

اور اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

تصابی و أمسی علاه الکبر

یہ اصل میں و قد علاہ الکبر ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: و قد قاتل من بقی منهم (جو ان سے باقی بچا اس نے قتال کیا۔) عرب کہتے ہیں: قتلنا بنی تمیم، ہم نے بنی تمیم کو قتل کیا، اور بلاشبہ ان میں سے بعض قتل کئے گئے اور امرؤ القیس نے کہا ہے: فإن تقتلونا نقتلكم (پس اگر تم ہمارے ساتھ لڑو گے تو ہم تمہیں قتل کر دیں گے)

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے و قتلوا و قتلوا بغیر الف کے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لَأُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّـَٔاتِهِمۡ یعنی میں آخرت میں ان پر ان کے گناہوں کو چھپا دوں گا، پس میں انہیں ان کے سبب زجر و توبیخ نہ کروں گا اور نہ ان پر انہیں کوئی سزا دوں گا۔ ثَوَابٗا مِّنۡ عِندِ ٱللَّهِ بصریوں کے نزدیک یہ مصدر مؤکد ہے، کیونکہ "میں انہیں ضرور داخل کروں گا ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی" کا معنی یہ ہے میں انہیں ضرور ضرور ثواب عطا کروں گا۔ کسائی نے کہا ہے: یہ قطعاً منصوب ہے اور فراء نے کہا ہے: یہ بطور تفسیر منصوب ہے۔ وَٱللَّهُ عِندَهُۥ حُسۡنُ ٱلثَّوَابِ یعنی یہ اچھی جزا ہے الله تعالیٰ کے پاس اور اس سے مراد وہ (اجر و ثواب) ہے جو عامل کی طرف اس کے عمل کی جزا کے طور پر لوٹے گا، اور یہ ثاب یثوب سے ہے۔

مسئلہ نمبر 17۔ قولہ تعالیٰ: لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فِي ٱلۡبِلَٰدِ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور مراد امت ہے (2) اور یہ بھی کہا گیا ہے: یہ خطاب تمام کو ہے اور وہ اس طرح کہ مسلمانوں نے کہا: یہ کفار ہیں ان کے لئے سامان تجارت بھی ہے اور اموال بھی اور ان کا ملکوں میں گھومنا پھرنا بھی ہے، اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم بھوک سے ہلاک

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 557، دار الکتب العلمیہ
2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 558

ہو گئے، تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی تمہیں ان کا سلامتی کے ساتھ اپنے سفروں میں گھومنا پھرنا دھوکہ میں نہ ڈالے۔ **مَتَاعٌ قَلِيْلٌ** یعنی ان کا یہ گھومنا پھرنا تھوڑی مدت کے لئے ہے۔ اور یعقوب نے نون ساکنہ کے ساتھ **يَغُرَّنْكَ** پڑھا ہے۔

اور شاعر نے کہا ہے:

لا **يَغُرَّنْكَ** عِشَاءٌ ساكِنٌ قَدْ يُوَافِي بِالمنيَّاتِ السَّحَرْ

اس میں بھی لا **يغُرَّنْكَ** نون ساکنہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

اور اس آیت کی مثل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ** ﴿﴾ (المومن) (پس نہ دھوکہ میں ڈالے تمہیں ان لوگوں کا (بڑے کروفر سے) آنا جانا مختلف شہروں میں) اور متاع سے مراد وہ شے ہے جس سے جلدی نفع حاصل کیا جا سکتا ہو، اور اس کا نام قلیل اس لئے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ (سامان دنیا) فناہ ہونے والا ہے، اور ہر فناہ ہونے والی شے اگرچہ کثیر ہو وہ قلیل ہوتی ہے۔ اور صحیح ترمذی میں مستورفہری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے بیان کیا ہے: میں نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''آخرت میں دنیا کی مثال اس طرح ہے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی سمندر میں ڈالے، پھر وہ اس (پانی) کی طرف دیکھے جو وہ اس کے ساتھ نکالتا ہے'' (یعنی اس انگلی کے ساتھ لگنے والے پانی کو جو نسبت سمندر کے ساتھ ہے وہی دنیا کو آخرت کے ساتھ ہے) کہا گیا ہے: کہ اس حدیث میں لفظ یرجع یا اور تا دونوں کے ساتھ ہے۔ (حدیث طیبہ کے الفاظ یہ ہیں)

• ما الدنیا فی الآخرۃ الا مثل ما یجعل احدکم اصبعہ فی الیم، فلینظر بما ذا یرجع۔ (1)

وَبِئْسَ الْمِهَادُ یعنی کتنا برا وہ ٹھکانا جو انہوں نے اپنے کفر کے سبب اپنے لئے بنایا ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے جہنم میں سے ٹھکانا بنایا ہے۔

مسئلہ نمبر 18۔ اس آیت میں اور اس طرح کی دیگر آیات میں مثلاً قول باری تعالیٰ: **اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ** الآیہ (آل عمران: 178) (کہ ہم جو مہلت دے رہے ہیں انہیں یہ بہتر ہے ان کے لئے) **وَ اُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ** ﴿۴۵﴾ (القلم) (اور میں نے (سردست) انہیں مہلت دے رکھی ہے میری (خفیہ) تدبیر بڑی پختہ ہے۔) **اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ** ﴿۵۵﴾ (المومنون) (کیا یہ تفرقہ باز خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد کر رہے ہیں مال و اولاد کی کثرت سے) **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ** ﴿۱۸۲﴾ (الاعراف) (تو ہم آہستہ آہستہ پستی میں گرا دیں گے انہیں اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہو گا) اس پر دلیل موجود ہے کہ کفار پر دنیا میں کوئی انعام نہیں کیا گیا، کیونکہ حقیقی نعمت وہ ہے جو دنیا اور آخرت کے ضرر کی آمیزش سے پاک ہو، اور کفار کی نعمتوں میں درد و آلام اور عذاب و سزا کی آمیزش ہے، پس یہ اس آدمی کی طرح ہیں جس کے سامنے کسی کی طرف سے شہد کا حلوہ رکھا جائے جس میں زہر کی آمیزش ہو، پس اگرچہ کھانے والا لطف اندوز ہو لیکن اسے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر انعام کیا گیا، کیونکہ اس میں اس کی جان کی ہلاکت ہے۔ علماء کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور یہی شیخ ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ اور ان میں سے ایک جماعت سیف السنہ ولسان الامۃ القاضی

1۔ جامع ترمذی، کتاب الزہد، جلد 2، صفحہ 56۔ ایضاً، جامع ترمذی، حدیث نمبر 2245، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

ابو بکر نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: نعمت کا اصل نَعمة بفتح النون سے ہے، اور اس کا معنی ہے خوشحال زندگی، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ (الدخان) (اور بہت سارا ساز و سامان جس سے وہ عیش کیا کرتے تھے) کہا جاتا ہے: دقیق ناعم، جب آٹا بہت باریک پسا ہوا ہو اور اچھے طریقے سے گوندھا جا سکتا ہو۔ یعنی معنی صحیح ہو، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار پر اور تمام مکلفین پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ اس کا شکر ادا کریں اور فرمایا ہے: فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ (اعراف: 69) (پس تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرو) یعنی شکر ادا کرنے کے لئے۔ اور فرمایا واشکروا اللہ (اور تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو) اور شکر صرف نعمت پر ہی ہوتا ہے۔

اور فرمایا: وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص: 77) (اور احسان کیا کر (غریبوں پر) جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے) یہ خطاب قارون کو ہے۔ اور ارشاد فرمایا: وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً (النحل: 112) (اور بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے ایک مثال وہ یہ کہ ایک بستی تھی جو امن (اور) چین سے (آباد) تھی۔) پس اللہ تعالیٰ نے متنبہ فرمایا کہ اس نے انہیں دنیوی نعمتیں عطا فرمائیں تو انہوں نے ان کا انکار کر دیا۔ اور مزید فرمایا: يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا (النحل: 83) (وہ پہچانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو (اس کے باوجود) وہ انکار کرتے ہیں اس کا) اور مزید فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ (فاطر: 3) (اے لوگو! یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو اس نے تم پر فرمائی۔) یہ (حکم) کفار اور دوسروں کے لئے عام ہے۔ لیکن جب کوئی کسی دوسرے کو کھانا پیش کرے جس میں زہر کی آمیزش ہو تو فی الحال اس نے اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا، کیونکہ اس نے اسے خالص زہر نہیں پلائی، بلکہ اس نے اسے حلاوۃ (مٹھاس) میں چھپا دیا، لہٰذا یہ بعید نہیں کہ یہ کہا جائے: تحقیق اس نے اس پر انعام کیا، اور جب یہ ثابت ہو گیا تو پھر نعمت کی دو قسمیں ہیں نفع پہنچانے والی نعمتیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں، پس نفع بخش نعمتیں وہ ہیں جو فنون لذات میں سے ان تک پہنچیں، اور دفاع کرنے والی نعمتیں وہ ہیں جو ان سے طرح طرح کی آفات کو پھیر دیں، تو اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے کفار کو دفاع کی نعمتیں عطا فرمائیں یہ ایک قول ہے، اور وہ یہ کہ ان سے درد و آلام اور بیماریوں کو دور ہٹا دیا گیا، اور ان کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو نعمت دینیہ عطا نہیں فرمائی۔ والحمد للہ۔

مسئلہ نمبر 19۔ قولہ تعالیٰ: لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ یہ استدراک ہے اس کلام کے بعد جس میں نفی کا معنی پہلے گزر چکا ہے، کیونکہ سابقہ کلام کا معنی یہ ہے کہ ان کے لئے ملکوں کے چکر کاٹنے اور گھومنے پھرنے میں کوئی بڑا فائدہ نہیں ہے، لیکن متقی لوگوں کے لئے بہت بڑا نفع ہے اور ہمیشہ کی بقا ہے۔ لٰكِنِ مبتدا ہونے کے سبب محل رفع میں ہے۔ اور یزید بن قعقاع نے لکنّ نون کو تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔

مسئلہ نمبر 20۔ قولہ تعالیٰ: نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ بصریوں کے نزدیک نُزُلًا ثوابًا کی مثل ہے اور کسائی کے نزدیک یہ مصدر ہو گا۔ اور فراء نے کہا ہے: یہ مفسر ہے۔ اور حسن اور نخعی نے نُزْلًا کو تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ دو ضمے ثقیل ہوتے ہیں اور باقیوں نے اسے ثقیل قرار دیا ہے، اور النُّزُلُ سے مراد وہ شے ہے جو مہمان کے لئے تیار کی جاتی ہے۔ نزیل کا معنی

مہمان ہے۔

شاعر نے کہا ہے:

نَزِیلُ القوم اعظمُهم حقوقا و حقُّ اللهِ فی حقِّ النزِیلِ

قوم کا مہمان حقوق کے اعتبار سے ان سب سے بڑھ کر ہے اور مہمان کے حق میں اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔

اس کی جمع انزال ہے اور حظ نزیل کا معنی اکٹھ اور اجتماع ہے اور النزل کا معنی بھی کثرت اور زیادتی ہے، کہا جاتا ہے، طعام کثیر النَّزَل و النُّزُل۔ (وافر مقدار کھانا)

مسئلہ نمبر 21۔ میں (مفسر) کہتا ہوں: شاید النزل...... واللہ اعلم...... وہی ہے جو صحیح مسلم میں حضرت ثوبان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے اس عالم کے قصہ میں آیا ہے جس نے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اس دن لوگ کہاں ہوں گے جس دن زمین کو غیر ارض سے اور آسمانوں کو بدل دیا جائے گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ پل کے قریب اندھیرے میں ہوں گے۔'' تو اس نے پوچھا: لوگوں میں سے پہلے کس کو اجازت ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مہاجرین فقراء کو'' یہودی نے کہا: ''ان کا کیا تحفہ ہوگا جب وہ جنت میں داخل ہوں گے؟ آپ نے فرمایا'' مچھلی کے جگر کی کثیر مقدار''۔ پھر پوچھا: اس کے بعد ان کی غذا کیا ہوگی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان کے لئے جنت کا وہ بیل ذبح کیا جائے گا جو اس کی اطراف سے کھاتا رہتا ہے۔'' پھر عرض کی: اس پر ان کا مشروب کیا ہوگا؟ فرمایا: ''جنت کے ایک چشمہ سے (وہ سیراب ہوں گے) جس کا نام سلسبیل ہے(1)'' اور آگے حدیث ذکر کی۔ اہل لغت نے کہا ہے: التحفة سے مراد وہ شے ہے جسے پھلوں وغیرہ میں سے انسان بطور ہدیہ اور تحفہ پیش کرتا ہے اور طرف سے مراد اس کے محاسن اور لطف اندوز ہونے کی جگہیں ہیں۔ اور یہ اس مفہوم کے مطابق ہے جو ہم نے نزل کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ واللہ اعلم

اور زیادۃ الکبد سے مراد جگر کا ٹکڑا ہے جو انگلی کی طرح ہو۔ ہروی نے کہا ہے: نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ثواب ہے۔ اور بعض نے کہا ہے اس کا معنی رزق ہے۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس نیکوکاروں کے لئے ہے وہ اس سے بہتر ہے جس کے ساتھ کفار دنیا میں لوٹ پوٹ (اور لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں)۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 22۔ قولہ تعالیٰ: وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ الآیہ۔ حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت قتادہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ فوت ہوا اور حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے اس کی موت کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی، تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ارشاد فرمایا: قوموا فصلوا علی اخیکم النجاشی (اٹھو اور اپنے بھائی نجاشی کی نماز جنازہ ادا کرو) تو ان میں سے بعض نے بعض کو کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم ارشاد فرما رہے ہیں کہ ہم حبشہ کے کافروں میں سے ایک بڑے کافر پر نماز جنازہ پڑھیں (2)، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ

1۔ صحیح مسلم، کتاب الحیض، جلد 1، صفحہ 146 2۔ معالم التنزیل، جلد 1، صفحہ 609

مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِمۡ حضرت ضحاک نے کہا ہے: وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ سے مراد قرآن کریم ہے۔ اور وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡهِمۡ سے مراد تورات اور انجیل ہیں۔ اور قرآن کریم میں ہے: اُولٰٓئِكَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَیۡنِ (القصص: 54) (یہ لوگ ہیں جنہیں دیا جائے گا ان کا اجر دو مرتبہ)

اور صحیح مسلم میں ہے: ''تین قسم کے (لوگ) ہیں جنہیں دو بار اجر دیا جائے گا پھر بیان فرمایا اہل کتاب میں سے ایسا آدمی جو اپنے نبی علیہ السلام کے ساتھ ایمان لایا پھر اس نے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لے آیا اور آپ کی اتباع و پیروی کی اور آپ کی تصدیق کی تو اس کے لئے دو اجر ہوں گے (1)۔'' اور آگے حدیث ذکر کی اور نجاشی پر نماز کے بارے۔ بحث سورۃ البقرہ میں گزر چکی ہے اور غائب میت پر نماز جنازہ کے بارے علماء کا اختلاف بھی گزر چکا ہے لہٰذا اسے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

حضرت مجاہد، ابن جریج، اور ابن زید رحمۃ اللہ علیہم نے کہا ہے: یہ آیت اہل کتاب میں سے ایمان لانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی، اور یہ عام ہے اور نجاشی ان میں سے ایک ہے۔ اور اس کا نام اصحمہ تھا اور وہ عربی میں عطیہ ہے (2) اور خٰشِعِیۡنَ کا معنی ہے عجز و انکساری کرنے والے۔ اور ترکیب کلام میں یہ یؤمن میں مضمر ضمیر سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اِلَیۡهِمۡ یا اِلَیۡکُمۡ کی ضمیر سے حال ہے اور جو کچھ آیات میں ہے وہ بالکل بین اور واضح ہے۔ اور پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

مسئلہ نمبر 23۔ قولہ تعالیٰ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا الآیہ۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کا اختتام ایسی نصیحت کے ساتھ کیا ہے جسے یہ دسویں آیت متضمن ہے اور یہ ان نصیحتوں میں سے ہے جو دنیا میں دشمنوں پر غالب آنے اور اخروی نعمتوں کے ساتھ کامیاب ہونے کو جامع ہے، اور طاعات پر ڈٹے رہنے اور شہوات سے اجتناب کرنے پر برانگیختہ کیا ہے اور صبر کا معنی رکنا ہے اور سورۃ البقرہ میں اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مصابرہ کا حکم دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ مصابرہ کا معنی ہے دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانا اور صبر میں ان پر غالب آنا، زید بن اسلم نے یہی کہا ہے (3)، اور حسن نے کہا ہے: پانچ نمازوں کی ادائیگی پر ثابت قدم رہنا اور یہ بھی کہا گیا ہے: ہمیشہ نفس کی مخالفت کرنا شہوات کی پیروی میں کہ وہ ان کی طرف دعوت دیتا ہے اور یہ ان سے دور ہے اور حضرت عطا اور قرظی نے کہا ہے: تم اس وعدہ پر ثابت قدم رہو جو تم سے کیا گیا ہے یعنی تم مایوس اور ناامید نہ ہو اور وسعت و خوشحالی کا انتظار کرو (4)، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''صبر کے ساتھ کشادگی اور وسعت کا انتظار کرنا عبادت ہے (5)۔'' اس قول کو ابو عمر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور پہلا قول جمہور کا ہے۔

اور اسی کے مطابق عنترہ کا قول ہے:

1۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، جلد 1، صفحہ 86۔ ایضاً صحیح بخاری، باب تعلیم الرجل امتہ واہلہ، حدیث نمبر 95، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

5۔ جامع ترمذی، کتاب الدعوات، جلد 2، صفحہ 197

فلم أر حيًا صابروا مثل صبرنا ولا كافحوا مثل الذين نكافح

میں نے کوئی زندہ نہیں دیکھا جنہوں نے ہمارے صبر کی مثل صبر کیا ہو اور نہ ہی (وہ دیکھے ہیں) جنہوں نے ان کی مثل کا دفاع کیا ہو جن کا دفاع ہم کرتے ہیں۔

ان کے قول صابروا مثل صبرنا کا معنی ہے وہ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہے اور ان میں کوئی بزدلی اور کمزوری ظاہر نہ ہوئی۔ اور مکافحۃ کا معنی ہے، جنگ میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونا اور بالمقابل ہونا، اسی لئے اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَ رَابِطُوْا کے معنی میں اختلاف ہے۔ پس جمہور الامہ نے کہا ہے: تم اپنے دشمن کے سامنے مختلف حیلوں کے ساتھ کمربستہ رہو، یعنی تم جنگ کے لئے اس طرح تیار رہو جس طرح تمہارا دشمن اس کی تیاری کرتا ہے، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وَ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (1) (اور گھوڑے باندھنے کے ساتھ)

اور مؤطا میں امام مالک نے حضرت زید بن اسلم سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف خط لکھا اور اس میں روم کے لشکر کا ذکر کیا اور اس کا جوان سے خوف اور خطرہ تھا، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف لکھا: اما بعد، جہاں کہیں بندہ مومن پر اللہ تعالیٰ شدید تکلیف اور پریشانی نازل کرتا ہے تو اس کے بعد اسے اللہ تعالیٰ کشادگی بھی عطا فرما دیتا ہے، کیونکہ ایک تنگی دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہیں آسکتی، اور اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ۔(2)

اور ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا ہے: یہ آیت ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کے بارے میں ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کوئی غزوہ نہ تھا جس میں لشکر سرحدوں پر آمنے سامنے بیٹھتے ہوں، اسے حاکم ابوعبداللہ (3) نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور ابوسلمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''کیا میں تمہاری اس پر راہنمائی نہ کروں جس کے سبب اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹا ڈالتا ہے، اور درجات کو بلند فرماتا ہے (وہ) مشقت اور مصائب میں اچھے طریقہ سے وضو کرنا ہے، اور مساجد کی طرف کثرت سے چل کر جانا ہے، اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے پس تم پر اسے پکڑنا لازم ہے'' آپ نے اسے تین بار فرمایا، اسے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے (4)۔

ابن عطیہ نے کہا ہے: صحیح قول یہ ہے کہ رباط کا معنی الملازمۃ فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ کو لازم پکڑنا) ہے۔ اس کی اصل ربط الخیل (گھوڑا باندھنا) سے ہے، پھر اسلام کی سرحدوں میں سے کسی سرحد کو ہر لازم پکڑنے والے کا نام مرابط رکھ دیا گیا ہے، چاہے وہ گھوڑ سوار ہو یا پیدل ہو۔ اور یہ لفظ الربط سے ماخوذ ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد فذالکم الرباط بالاشبہ یہ رباط فی سبیل اللہ کے ساتھ تشبیہ ہے۔ اور رباط کا لغوی معنی وہی پہلا ہے، اور یہ اس قول کی طرح ہے: لیس الشدید

1۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 559، دار الکتب العلمیہ

2۔ مؤطا امام مالک، کتاب الجہاد، صفحہ 464

3۔ المستدرک، التفسیر، جلد 2، صفحہ 329، حدیث نمبر 3177

4۔ مؤطا امام مالک، قصر الصلوٰۃ فی السفر، صفحہ 145

بالصرعة(1) (طاقتور پچھاڑ دینے کے ساتھ ثابت نہیں ہوتا) اور اس قول کی طرح ہے: لیس المسکین بھذا الطواف(2) (اس چکر لگانے کے ساتھ مسکین ثابت نہیں ہوتا) اسی طرح کے اور اقوال بھی ہیں۔

میں (مفسر) کہتا ہوں: ان کا قول "رباط کا لغوی معنی وہی پہلا ہی ہے" یہ مسلم نہیں ہے، کیونکہ خلیل بن احمد ائمہ لغت میں سے ایک ہیں اور ثقہ ہیں۔ انہوں نے کہا ہے: رباط کا معنی سرحدوں کو لازم پکڑنا اور ان پر بیٹھے رہنا ہے اور نماز کے لئے مواظبت اختیار کرنا بھی ہے۔ پس اس سے ثابت ہو گیا کہ نماز کا انتظار کرنا بھی حقیقتاً رباط کا لغوی معنی ہی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ اور اس سے زیادہ وہ ہے جو شیبانی نے بیان کیا ہے کہ کہا جاتا ہے: ماءٌ مترابط ای دائم لا ینزح۔ یعنی ماء مترابط اس ہمیشہ رہنے والے پانی کو کہا جاتا ہے جو ختم نہ ہوتا ہو، اسے ابن فارس نے بیان کیا ہے اور یہ لغتہً رباط کے اس کے سوا معنی کی طرف متعدی ہونے کا تقاضا کرتا ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے کیونکہ اہل عرب کے نزدیک مرابطہ کسی شے پر ایسی گرہ لگانا ہے جو کھل نہ سکتی ہو، پس یہ اس کی طرف راجع ہے جس پر آدمی ڈٹ جائے اور صبر کرے، اور وہ دل کو اچھی نیت پر اور جسم کو فعل طاعت پر روک لینا اور لگا لینا ہے۔ اور اس کا عظیم تر اور اہم ترین معنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد کے لئے) گھوڑے کو باندھنا (تیار کرنا) ہے۔ جیسا کہ اس پر قرآن کریم میں نص موجود ہے: ومن رباط الخیل اس کا بیان آگے آئے گا۔ اور نفس کو نمازوں پر لگانا اور متوجہ کرنا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے، اسے حضرت ابو ہریرہ، حضرت جابر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے اور شادی کے بعد خوشبو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ولا عِطرَ بعد عَرُوسٍ۔

مسئلہ نمبر 24۔ فقہاء کے نزدیک المرابط فی سبیل وہ ہے جو سرحدوں میں سے ایک سرحد کو معین کر لیتا ہے تاکہ وہ اس کی حفاظت کے لئے ایک مدت تک اس پر ثابت قدم رہے، اور اسے محمد بن مواز نے بیان کیا ہے [اور اسے روایت کیا ہے] اور رہے وہ لوگ جو سرحدوں پر اپنے اہل و عیال کے ساتھ ہمیشہ رہتے ہیں وہیں وہ آباد ہوتے ہیں اور وہیں کاروبار کرتے ہیں، پس اگر وہ وہاں محفوظ ہوں تو وہ مرابطین میں سے نہیں ہیں۔ ابن عطیہ نے یہی کہا ہے(3)۔ ابن خویز منداد نے کہا ہے: رباط کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت یہ ہے کہ سرحد مامون اور محفوظ ہوتی ہے اور وہاں اہل و عیال کے ساتھ سکونت اختیار کرنا جائز ہوتا ہے اور اگر وہ مامون و محفوظ نہ ہو تو پھر جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو وہیں کمربستہ رکھے بشرطیکہ وہ جنگ لڑنے والوں میں سے ہو، اور وہ اپنے اہل و عیال کو وہاں منتقل نہ کرے تاکہ ایسا نہ ہو کہ دشمن غالب آجائے اور وہ قید کرلے اور غلام بنالے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ نمبر 25۔ رباط کی فضیلت میں کثیر احادیث موجود ہیں، ان میں سے وہ ہے جسے امام بخاری نے حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن سرحد پر (حفاظت کے لئے) رہنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہے(4)۔" اور صحیح مسلم میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں

1۔ صحیح مسلم، البر والصلۃ والادب، جلد 2، صفحہ 326　2۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، جلد 1، صفحہ 333

3۔ المحرر الوجیز، جلد 1، صفحہ 560، دار الکتب العلمیہ

4۔ صحیح بخاری، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 405۔ ایضاً صحیح بخاری، حدیث نمبر 2678، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''ایک دن اور ایک رات سرحد پر ثابت قدم رہنا ایک مہینہ روزے رکھنے اور قیام کرنے سے بہتر ہے اور اگر وہ فوت ہو گیا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا جو وہ کر رہا تھا اور اس کا رزق بھی اسے عطا کیا جائے گا اور شیاطین سے محفوظ رکھا جائے گا (1)۔''

ابوداؤد نے اپنی سنن میں حضرت فضالہ بن عبید سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر میت کا عمل ختم کر دیا جاتا ہے سوائے مرابط (سرحد پر ثابت قدم رہنے والے) کے کیونکہ اس کا عمل یوم قیامت تک بڑھتا رہے گا اور وہ قبر کے فتنہ سے مامون و محفوظ رہے گا (2)''۔ ان دونوں حدیثوں میں اس پر دلیل موجود ہے کہ رباط ان افضل ترین اعمال میں سے ہے جن کا ثواب موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے، جیسا کہ حضرت علا بن عبدالرحمن کی حدیث میں ہے انہوں نے اپنے باپ سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور نبی مکرم ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة الا من صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوله (3) (جب آدمی فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین کے (اور) سوائے صدقہ جاریہ کے یا اس علم کے جس سے نفع اٹھایا جاتا ہے یا نیک اور صالح بچے کے جو اس کے لئے دعا کرتا ہو) یہ حدیث صحیح ہے اور اسے روایت کرنے میں مسلم منفرد ہیں اور بلاشبہ صدقہ جاریہ، نفع دینے والا علم اور وہ صالح بیٹا جو اپنے والدین کیلئے دعا کرتا ہے یہ (اعمال) صدقات کے ختم ہونے، علم ضائع ہو جانے، اور بیٹے کی موت کے سبب منقطع ہو جاتے ہیں۔ اور رباط کا اجر یوم قیامت تک کئی گناہ کر دیا جاتا ہے، کیونکہ نماء کا معنی سوائے دوگناہ کرنے کے اور کوئی نہیں ہے، اور یہ کسی سبب پر موقوف نہیں کہ اس کے منقطع ہونے کے سبب یہ بھی منقطع ہو جائے، بلکہ یہ یوم قیامت تک اللہ تعالیٰ کی جانب سے دائمی فضل ہے۔ اور یہ اس لئے کہ نیکی کے تمام اعمال پر قدرت تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب دشمن سے امن و سلامتی حاصل ہو اور دین کے نور کی حفاظت اور شعائر اسلام کو قائم کرنے کے سبب دشمن سے مکمل تحفظ اور بچاؤ حاصل ہو اور یہ وہ عمل ہے جس پر ثواب جاری رہتا ہے (اور) یہ ان اعمال صالحہ میں سے ہے جو وہ کرتا رہتا ہے، اسے ابن ماجہ نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من مات مرابطا فی سبیل الله اجری علیه اجر عمله الصالح الذین کان یعمل و اجری علیه رزقه و امن من الفتان و بعثه الله یوم القیامة امنا من الفزع (4) (وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے فوت ہو گیا تو اس پر اس کے اس عمل صالح کا اجر جاری رہتا ہے جو وہ کرتا ہے اور اس پر اس کا رزق بھی جاری رکھا جاتا ہے اور اسے شیاطین سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اٹھائے گا اس حال میں کہ وہ گھبراہٹ سے پر امن اور محفوظ ہوگا۔) اس حدیث میں ایک دوسری قید ہے اور وہ ہے حالت رباط میں موت کا آجانا۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے بیان فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا

1۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، جلد 2، صفحہ 142
2۔ سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 338
3۔ صحیح مسلم، کتاب الوصیۃ، جلد 2، صفحہ 41
4۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الجہاد، جلد 1، صفحہ 203

ہے: ''جس نے ایک رات اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد کی حفاظت کرتے ہوئے گزاری تو وہ اس کے لئے ہزار (دن اور) رات کے روزوں اور قیام کی مثل ہے(1)۔''

اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں کے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک دن رمضان المبارک کے مہینے کے علاوہ پورے اخلاص کے ساتھ سرحد کی حفاظت کے لئے کمربستہ ہونا اجر وثواب میں ایک سال کے روزوں اور قیام کی عبادت سے زیادہ اور افضل ہے اور رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن مسلمانوں کے خوف کی صورت میں پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں سرحد پر ڈٹ جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اجر وثواب میں ایک ہزار برس کے روزوں اور قیام کی عبادت سے افضل اور زیادہ ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے اسے صحیح سالم اپنے گھر والوں کی طرف لوٹا دیا تو اس پر ہزار برس کے گناہ نہیں لکھے جائیں گے اور اس کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے لئے رباط کا اجر قیامت کے دن تک جاری رکھا جائے گا(2)۔'' یہ حدیث اس پر دلیل ہے کہ رمضان المبارک کے مہینے میں ایک دن (دشمن کے مقابلے میں) سرحد پر ڈٹ جانا دائمی ثواب کے حصول کا سبب بنتا ہے اگرچہ وہ اسی حال میں مرجائے۔ واللہ اعلم۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایک رات پہرہ دینا ایک آدمی کے اپنے گھر میں ہزار برس روزے رکھنے اور قیام کرنے سے افضل ہے (ان میں) ایک سال تین سو ساٹھ دن کا ہے اور ایک دن ہزار برس کا ہے۔''

میں (مفسر) کہتا ہوں: ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کرنے کے بارے میں بھی یہ موجود ہے کہ وہ بھی رباط ہے، اور نمازوں کا انتظار کرنے والے کو وہی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے ابونعیم الحافظ نے روایت نقل کی ہے کہ سلیمان بن احمد، علی بن عبد العزیز، حجاج بن منہال دوسری سند ابوبکر بن مالک، عبداللہ بن احمد بن حنبل نے بیان کیا ہے کہ مجھے میرے باپ نے بتایا اور کہا کہ مجھے حسن بن موسیٰ نے بیان کیا ہے کہ حماد بن سلمہ نے ثابت بنانی سے اور انہوں نے ابو ایوب ازدی سے، انہوں نے نوف بکالی سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات مغرب کی نماز پڑھائی اور ہم نے بھی آپ کی معیت میں نماز پڑھی پس پیچھے رہ گیا جو پیچھے رہا اور واپس لوٹ گیا جو لوٹ گیا (یعنی کچھ لوگ وہیں پیچھے رہ گئے اور کچھ اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے) پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو نماز عشاء کے لئے تثویب کرنے سے پہلے تشریف لائے۔

پس آپ اپنی انگلی اٹھاتے ہوئے آئے حالانکہ لوگ آپ کے پاس حاضر تھے اور آپ نے سبابہ انگلی کے ساتھ آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتیس گنے اور اپنا کپڑا اپنے گھٹنوں سے اوپر چڑھالیا اور آپ کہنے لگے: ''اے مسلمانوں کے گر

1۔ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 2755، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

2۔ ایضاً۔ ابن ماجہ، کتاب الجہاد، حدیث نمبر 2759، ضیاء القرآن پبلی کیشنز

تمہیں بشارت ہو یہ تمہارا رب ہے اس نے آسمان کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھول دیا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ملائکہ پر اظہار فخر کر رہا ہے وہ کہہ رہا ہے اے میرے ملائکہ! تم میرے ان بندوں کی طرف دیکھو یہ ایک فریضہ ادا کر چکے ہیں اور دوسرے کا انتظار کر رہے ہیں (1)۔'' اور اسے حماد بن سلمہ نے علی بن زید سے اور انہوں نے مطرف بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ نوف اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما دونوں اکٹھے ہوئے تو نوف نے تورات سے (یہ) بیان کیا اور حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث بیان کی۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ یعنی تمہیں بغیر تقویٰ کے جہاد کے بارے حکم نہیں دیا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ تاکہ تم فلاح وکامرانی کے امیدوار ہو جاؤ۔ کہا گیا ہے: کہ لعل بمعنی لکی (تاکہ) ہے اور فلاح بمعنی بقاء (باقی رہنا) ہے۔ یہ سب سورۃ البقرہ میں مکمل طور پر گزر چکا ہے۔

تمت بالخیر

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل واحسان سے آج مورخہ ۲۲ جنوری ۲۰۰۷ء بمطابق ۲ محرم الحرام ۱۴۲۸ھ بروز پیر دس بجے شب سورہ آلعمران کی تفسیر کا ترجمہ اختتام پذیر ہوا۔ یہ بندہ پر تقصیر اپنے کریم رب کی بارگاہ میں سراپا التجا ہے کہ اے میرے کریم پروردگار! اس کرم اور عنایت کو بار بار فرمانا، اپنی توفیقات سے نوازتے رہنا، اور تادم واپسیں اپنی بندگی کا ذوق، اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا شرف، اور اپنے دین متین کی خدمت کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے رکھنا۔ امین بجاہ نبیك الکریم علیه الصلواۃ والتسلیم ثم الحمد للہ رب العالمین والصلواۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین و علی آله و اصحابه اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

محمد انور مگھالوی

1۔ حلیۃ الاولیاء، طبقات الاصفیاء، جلد 6، صفحہ 54، مکتبۃ الخانجی مصر